المعارف
لائبریری
Acc. No. 21152

24141
لاصل - ت

تدبرِ حدیث

شرح موطا امام مالکؒ

(منتخب ابواب)

جلد اوّل

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

ترتیب و تدوین

خالد مسعود - سعید احمد

ادارہ تدبرِ قرآن و حدیث لاہور

جملہ حقوق حق ادارہ تدبر قرآن وحدیث محفوظ ہیں

نام کتاب : تدبر حدیث (جلد اول)

شرح موطا امام مالکؒ۔ منتخب ابواب

دروس : مولانا امین احسن اصلاحیؒ

ترتیب وتدوین : خالد مسعود۔ سعید احمد

اشاعت : بار اول ۲۰۰۰ء

تعداد : ۱۰۰۰

ناشر : ادارہ تدبر قرآن وحدیث، لاہور

کمپیوٹر کمپوزنگ : محمد اکرام الحق

پریس: شرکت پرنٹنگ پریس

43- نسبت روڈ۔ لاہور

ہدیہ: 350 روپے

ملنے کا پتہ

۱۔ ادارہ تدبر قرآن وحدیث، رحمان سٹریٹ، مسلم روڈ سمن آباد لاہور

۲۔ دارالتذکیر، رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

فہرست

پیش لفظ 9

امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ 13

تذکرہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ 17

کتاب الزکوٰۃ

زکوٰۃ کس مقدار پر واجب ہوتی ہے؟ 23

سونے اور چاندی کی نصاب میں زکوٰۃ 26

معدنیات میں زکوٰۃ 30

سونے، چاندی، زیور اور جنر میں سے کن چیزوں میں زکوٰۃ نہیں؟ 32

بچوں کے مال کی زکوٰۃ اور ان کے لیے اس میں تجارت 34

تاجر کی زکوٰۃ 35

ترکہ کی زکوٰۃ 36

سامان تجارت میں زکوٰۃ 38

غلہ کے بارے میں روایات 41

جانوروں کی زکوٰۃ 43

گایوں کی زکوٰۃ کے بارے میں 47

زکوٰۃ میں بھینسوں کو شمار کرنے کے بارے میں روایات 49

معمولی زکوٰۃ میں لوگوں کو تنگ کرنے کی ممانعت 51

صدقہ لینے والے کے لیے کیا لینا جائز ہے؟ 52

صدقے کی وصولی اور اس میں سختی کے بارے میں روایات 54

کھجوروں اور انگوروں کے تخمینہ سے زکوٰۃ 57

غلام، گھوڑے اور شہد کی زکوٰۃ کے بارے میں روایات 63

مال کتاب اور مجوسیوں کا جزیہ 65

کتاب البیوع

بیع کا مفہوم 71

دیہات کے معاملہ میں روایت 71

غلام کے بارے میں حکم 73

گمراہی کے بارے میں روایت 74

غلام کا عیب دار ہونا 76

اس ہونی کے متعلق حکم جو شرط کے ساتھ پائی جائے 77

جو درخت پکڑ دیے گئے ہوں ان کے پھل کے بارے میں 78

صلاحیت ظاہر ہونے سے پہلے پھل فروخت کرنے کی ممانعت 79

غریب کی فروخت کے بارے میں حکم 83

پھلوں اور کھیتی کی بیع میں آفت سے نقصان 84
باغ کے پھل مستثنیٰ کرنے کے باب میں 86
کھجور کی فروخت کی مکروہ شکل 87
مزابنہ اور محاقلہ کے بارے میں حکم 91
سونے کی بیع چاندی سے، خواہ ٹکڑوں کی شکل
میں ہو یا نقدی کی صورت میں 93
نقدی کے مبادلہ کے بارے میں 99
مسکوک اور غیر مسکوک کا تبادلہ 101
ادھار پر خرید اور نقد پر فروخت جیسے سودوں
کے بارے میں 102
غلے کو ادھار بیچنے کی کراہت کی ایک شکل 107
غلے کی خرید میں پیشگی رقم کی ادائیگی 108
تقابض کے بغیر غلے کے بدلے غلے کی فروخت 109
ذخیرہ اندوزی اور انتظار 110
ایک جانور کی دوسرے جانور کے بدلے میں خرید و
فروخت اور اس میں ادھار کرنے کا جواز 112
کن جانوروں کی بیع کا جواز نہیں ہے 113
جانور کو گوشت کے بدلے فروخت کرنا 114
کتے کی قیمت کے بارے میں روایت 115
پیشگی ادائیگی کے ساتھ سامان کی بیع 116
سامان کے ضمن میں پیشگی 117
ایک بیع کے اندر دو بیع کی ممانعت 118
دھوکا بازی کی بیع 119
ہاتھ لگا کر اور چیز پھینک کر سودا کرنا 120
منافع پر بیچنا 121
فہرست کے مطابق بیع 122
بیع جس میں مال واپس کرنے کا اختیار ہو 122
قرضے میں ربا کے بارے میں 124
قرض اور حوالہ کے بارے میں جامع باب 126
خریدار کے دیوالیہ ہو جانے کے بارے میں 127
پیشگی دینے کی جائز شکلیں 128
پیشگی دینے کی ناجائز شکلیں 130
مول بھاؤ کرنے کے معاملے میں جن چیزوں
سے روکا گیا ہے 133
معاملات پر جامع باب 135

کتاب القراض

قراض کے بارے میں روایات 139

کتاب المساقاۃ

بٹائی پر زراعت کے بارے میں روایات 142

کتاب کراء الارض

زرعی زمین کرایہ پر دینا 145

کتاب الشفعہ

وہ چیزیں جن میں شفعہ ہو سکتا ہے 146
وہ چیزیں جن میں شفعہ نہیں ہو سکتا 148

کتاب الاقضیہ

حق کے مطابق فیصلہ کرنے کی ترغیب 151

گواہوں کے بارے میں روایات 153
جس پر حد جاری ہو چکی ہو اس کی گواہی کے
بارے میں فیصلہ 156
گواہ کے ساتھ قسم کو ملا کر فیصلہ 158
دعوی میں فیصلہ کا اصول 160
بچوں کی شہادت کے متعلق فیصلہ 161
منبر رسول پر جھوٹی قسم کھانے کے
متعلق روایات 161
منبر پر قسم کے بارے میں جامع باب 163
رہن کے ضبط کا جواز نہ ہونے کے بارے میں 164
اس عورت کے بارے میں فیصلہ جس کے ساتھ
بالجبر زنا کی گئی ہو 166
اسلام سے مرتد کے متعلق فیصلہ 167
اس شخص کے بارے میں جو اپنی بیوی کو
دوسرے آدمی کے ساتھ دیکھ لے 170
چھینکے ہوئے بچے کے متعلق فیصلہ 173
بچے کو باپ کی طرف منسوب کرنے کے بارے
میں فیصلہ 174
ماں بیٹے والی لونڈیوں کے بارے میں فیصلہ 179
مردہ زمینوں کو آباد کرنے کے بارے میں فیصلہ 180
پانی کے بارے میں فیصلے 181
ضوائع کے متعلق فیصلہ 183
ماؤں کی تقسیم کے بارے میں فیصلہ 187
کون سا عطیہ جائز نہیں 188
ہبہ کے بارے میں فیصلہ 189
عین حیات کے لیے دی ہوئی چیز کے
متعلق فیصلہ 190
گرے پڑے مال کے بارے میں فیصلہ 192
گمشدہ یا آوارہ جانوروں کے متعلق فیصلہ 194
زندہ کا مردہ کی طرف سے صدقہ 196
وصیت کے متعلق حکم 199
بچے، کمزور، ناسمجھ اور پاگل کی وصیت کے جواز کے
بارے میں 199
ایک ثلث سے زیادہ میں وصیت نہیں کر سکتے 200
حاملہ، مریض اور محاذ جنگ پر سپاہی کے
مالی معاملات 203
وارث کو وصیت کرنے اور قبضہ کے بارے میں 204
منصب قضا اور اس کے مکروہ ہونے کے
بارے میں 205

کتاب الحدود

رجم کے بارے میں روایات 211
اس شخص کے بارے میں جس نے اپنے متعلق
زنا کا اعتراف کر لیا 226
زنا کی سزا کے بارے میں جامع باب 230
تہمت لگانے، باپ کا بیٹا ہونے کی نفی کرنے اور
ایسا جملہ بولنے پر جس سے تہمت کا
مفہوم پیدا ہوتا ہو، کیا حد جاری ہو گی 234
جس صورت میں حد نافذ نہیں ہو گی 238

کتنی مقدار کی چوری پر ہاتھ کاٹا جائے گا 239
مضرور غلام، جو چور ہو، کے ہاتھ کاٹنے سے
متعلق روایات 243
معاملہ صاحب امر تک پہنچ جائے تو چور کے حق
میں سفارش نہیں کی جا سکتی 245
ہاتھ کاٹنے سے متعلق جامع باب 247
جس میں قطع ید کا جواز نہیں 249

کتاب الاشربہ

شراب خوری کی حد 255
کن درختوں میں خیفہ بنانا ممنوع ہے 259
کن چیزوں کو ملا کر خیفہ بنانا مکروہ ہے 260
شراب کی حرمت 261
شراب کی حرمت سے متعلق جامع باب 263

کتاب العقول

دیت کا بیان 269
دیت پر عمل کس طریقہ سے ہوگا 270
قتل عمد کی دیت جب ورثا اس کا دیا قبول کر لیں،
اور مجنون کی سزا 272
غلطی سے قتل ہو جائے تو اس کی دیت 273
عورت کی دیت 275
جنس کے بچے کی دیت 277
جس میں کامل دیت ہوگی 279
آنکھ کی دیت جب اس کی بینائی جاتی رہے 280
سر اور چہرہ پر زخم کی دیت کیا ہوگی 280
انگلیوں کی دیت کیا ہوگی 281
دانتوں کی دیت کے بارے میں جامع باب 283
دانتوں کی دیت کے بارے میں محمل 284
غلاموں کے زخموں کی دیت 285
ذمیوں کی دیت 285
ایسی صورتیں جن میں آدمی کی دیت خاص اسی
کے مال سے دی جائے گی 287
دیت کی میراث اور اس میں قتل کے بارے میں 288
دیت کے بارے میں جامع باب 291
دھوکے سے قتل کرنے اور جادو کرنے کے
بارے میں 293
قتل عمد کے بارے میں حکم 295
قتل کے قصاص کے بارے میں 297

کتاب القسامہ

قسامہ کا آغاز مدعیوں سے کیا جائے گا 301

کتاب الجامع

مدینہ اور اس کے لوگوں کے لیے دعا 307
مدینہ کی رہائش اور اس سے نکلنے کے بارے میں 308
مدینہ کی حرمت کے بارے میں 316
مدینہ کی وبا کے بارے میں 318
یہود کے مدینہ سے جلاوطن کرنے کی روایات 321
مدینہ کے بارے میں جامع باب 323
طاعون کے بارے میں روایات 325
تقدیر پر کلام کی ممانعت 331

ل قدر کے بارے میں جامع باب 340
س اخلاق کے بارے میں روایات 343
ے بارے میں روایات 351
نے کے بارے میں روایات 353
و کر چھوڑنے کے بارے میں 355
ت کے لیے لباس پہننے کے بارے میں 360
ب دار کپڑے اور سونا پہننے کے بارے میں 364
یم پہننے کے بارے میں 365
ورتوں کے لیے کون سا کپڑا پہننا مکروہ ہے 366
ے اپنی تعریف کرنے کے بارے میں 368
ورت کے کپڑا لٹکانے کے بارے میں 370
ہ پہننے کے بارے میں 371
ہ ں کے پہننے کے بارے میں 372
ی ﷺ کے حلیہ کے بارے میں 375
ضرت عیسیٰ بن مریم اور دجال کے حلیہ
کے بارے میں 376
ضرت کی سنت کے بارے میں 378
ں ہاتھ سے کھانے کی ممانعت کے بارے میں 381
مسا کین کے بارے میں 382
د کی آنکھوں کے بارے میں 383
ہ ندی کے برتن میں پینے اور پینے کی چیز میں
پھونک مارنے کی ممانعت 385
ھڑے کھڑے پانی پینے کے بارے میں روایات 387
پینے اور دانتے سے پکڑنے کے بارے میں سنت 388
کھانے اور پینے کے بارے میں جامع باب 389
گوشت کھانے کے بارے میں 408
انگور بھی پہننے کے بارے میں روایات 409
نظر بد سے بچنے کے لیے بچے اور گھنٹیاں اتارنے
کے بارے میں 410
نظر بد کے سبب سے وضو کا حکم 411
نظر بد کے لیے جھاڑ پھونک کرنا 414
بیمار کے اجر کے بارے میں 416
مرض سے پناہ مانگنا اور جھاڑ پھونک کرنا 418
مریض کے علاج کے بارے میں 421
طار میں پانی سے غسل کے بارے میں 422
مریض کی عیادت اور شگون کے بارے میں 425
بالوں کے بارے میں سنت 427
بالوں کو سنوارنے کے بارے میں 431
بال رنگنے کے بارے میں 432
تعوذ کے بارے میں کیا حکم ہے؟ 434
ان لوگوں کے بارے میں جو اللہ کے لیے محبت
کرتے ہیں 438
خواب کے بارے میں روایات 445
ذر کے بارے میں روایات 449
سلام کرنے کا طریقہ 452
کسی یہودی اور نصرانی کو سلام کرنے کے
بارے میں 454
سلام کے بارے میں جامع باب 455

اجازت لینے کے بارے میں باب 459
چھینک آنے پر دعائیہ کلمات کہنے کے بارے میں 462
تصویروں اور مورتیوں کے بارے میں روایات 463
گود کھانے کے بارے میں 466
کتوں کے بارے میں روایات 470
ہڈیوں کے بارے میں روایات 472
چوہیا کے گھی میں گر جانے اور نماز سے پہلے کھانا
شروع کرنے کے بارے میں 476
نحوست سے بچنے کے لیے کیا کیا جائے 477
ایسے کام جن میں ناگواری ہوتی ہے 478
پچھنا لگانے اور پچھنا لگانے والے کی اجرت سے
متعلق روایات 481
مشرق کے بارے میں روایات 483
سانپوں کے مارنے کے بارے میں کیا احکام
اور اقوال ہیں 484
سفر میں کلام کے بارے میں احکام 489
مردوں اور عورتوں کے اکیلے سفر کرنے کے
بارے میں روایات 491
سفر میں کیا کرنے کا حکم ہے 492
غلام کے ساتھ نرم رویہ کا حکم 495
غلام اور اس کی وفات کے بارے میں روایات 497
وفات کے بارے میں روایات 498
کیا باتیں ہیں جو مکروہ ہیں 501
بات کرنے میں احتیاط کے بارے میں حکم 503
اللہ کے ذکر کے بغیر کہی ہوئی بات کا
ناپسندیدہ ہونا 505
غیبت کے بارے میں حکم 507
زبان کے فتنے سے اندیشہ کے بارے میں روایات 508
تیسرے ساتھی کو چھوڑ کر دو آدمیوں کے سرگوشی
کرنے کے بارے میں روایات 510
جھوٹ اور سچ کے بارے میں روایات 511
مال کے ضائع کرنے اور دو ہر اچرر کھنے کے
بارے میں 516
خاص لوگوں کے گناہوں کے باعث عام عذاب
نازل ہونے کے بارے میں روایات 518
خدا ترسی اور خشیت الٰہی کے بارے میں روایات 520
گڑگانے پر کیا کہنا چاہیے 521
نبی ﷺ کے ترکہ کے بارے میں 521
جہنم کی خصوصیات کے بارے میں روایات 524
صدقہ کے بارے میں ترغیب 525
سوال سے احتراز کے بارے میں روایات 531
صدقہ میں کیا چیز مکروہ ہے 537
طلب علم کے بارے میں 540
مظلوم کی بددعا سے بچنے کے بارے میں 541
نبی ﷺ کے اسماء 543

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

مؤطا امام مالک کی یہ شرح مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ کے ان دروس پر مبنی ہے جو انہوں نے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں اپنے قائم کردہ ادارہ ادارہ تدبر قرآن و حدیث میں دیے۔ یہ ادارہ ان کی تفسیر تدبر قرآن کی تکمیل کے بعد خاص اس مقصد سے قائم کیا گیا کہ جب تک مولاناؒ کے قوی اجازت دیں وہ حدیث کا درس دیں گے اور اس پر جو تحقیق انہوں نے کی ہے اس کے نتائج منظر عام پر لائیں گے۔ چنانچہ مولاناؒ نے پہلے اصول حدیث پر متعدد لیکچر دیے جن میں وہ اصول و مبادی بیان کیے جو فہم حدیث اور روایات کے صحت و سقم کا فیصلہ کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ اس کے بعد تعلیم حدیث کے لیے مؤطا امام مالک کا انتخاب کیا کیونکہ یہ ایک مختصر مجموعہ حدیث ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فقہی مسلک کی نمائندہ کتاب بھی ہے، نیز یہ متعدد دینی درس گاہوں کے نصاب میں شامل ہے۔ ولی اللہی مکتب فکر میں اس کی اہمیت اس حقیقت سے واضح ہو جاتی ہے کہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں اس کی شرحیں لکھیں۔

مولانا اصلاحی رحمہ اللہ نے حدیث پر کام کا آغاز کرتے ہوئے لکھا:

"قرآن پر غور کرنے کا جو صحیح طریقہ ہے وہ میں نے تفسیر تدبر قرآن میں واضح کر دیا ہے اور پورے قرآن کی تفسیر کر کے یہ دکھا بھی دیا ہے کہ اگر یہ راہ اختیار کی جائے تو وہ تمام اختلافات آپ سے آپ رفع ہو جاتے ہیں جو محض قرآن کا صحیح علم نہ ہونے کے سبب سے پیدا ہو گئے ہیں۔ میرے نزدیک حدیث پر غور کرنے کے طریقے میں بھی بنیادی اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس وقت حدیث کی تعلیم ہر مکتب فکر کے علماء اپنے اپنے تقیدات کے تحت دے رہے ہیں۔ کلام و عقائد اور فقہیات میں جس گروہ کا جو مسلک ہے وہ کوشش کرتا ہے کہ قرآن و حدیث دونوں سے وہ اپنی تائید حاصل کرے، اگرچہ اس کے لیے اسے کتنا ہی ظلم کرنا پڑے۔ حالانکہ صحیح علمی طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی طرح پورے ذخیرۂ حدیث پر بھی براہ راست ان کے الفاظ، ان کے موقع و محل، ان کے سیاق و سباق، ان کے قرائن و شواہد اور قرآن کے

ساتھ ان کی موافقت یا عدم موافقت کے پہلو سے غور کیا جائے اور بغیر کسی گروہی تعصب کے وہ حدیثیں اختیار کی جائیں جو مذکورہ کسوٹی پر پوری اترتی ہوں، اگرچہ وہ ہماری خواہشوں کے خلاف ہوں۔ ہمیں اتباع بہر حال رسول اللہ ﷺ کی کرنی ہے نہ کہ اپنی خواہشوں کی یا کسی خاص فقہ و کلام کی"۔

مولانا کے مذکورہ بالا فکر جن میں انہوں نے حدیث پر غور و فکر کے اصول کی وضاحت کی مرتب ہو کر کتابی صورت میں "مبادی تدبر حدیث" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ "ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس میں کوئی مجھے منفرد قرار دے سکے۔ یہ ساری باتیں ہمارے ائمہ حدیث کی متعدد کتابوں سے ماخوذ ہیں اور یہ ایسی معقول اور فطری ہیں کہ کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کر سکتا"۔

محدثین کے ہاں کسی حدیث کو پرکھنے کے لیے سند کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے۔ اگر سند کے رجال میں کوئی خرابی نظر نہ آتی ہو تو روایت کو حدیث رسول مان لیا جاتا ہے اور متن میں بکثرت اضطرابات پیدا ہوتے ہوں جب بھی روایت کے خلاف کچھ کہنا بھی کفر قرار پاتا ہے۔ مولانا اصلاحیؒ کے نزدیک یہ رویہ غلو پر مبنی ہے کیونکہ سند کے تمام محاسن، لطائف، عظمت، اہمیت اور اس کے مطابق معیار ہونے کے باوجود اس میں کئی فطری خلا موجود رہتے ہیں۔ لہٰذا مولانا مجرد سند کو کسی روایت کی تحقیق کا صرف ایک ذریعہ سمجھتے ہیں جبکہ متن حدیث کو پرکھنے کے لیے درایت کے اصولوں کو کام میں لاتے ہیں۔ چونکہ سند کے اعتبار سے امت نے مؤطا، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا بلند درجہ تسلیم کیا ہے، لہٰذا مولانا فی الجملہ ان کی تحقیق رجال کو کافی سمجھتے لیکن متن حدیث کو محل تدبر قرار دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخبار آحاد کے غالب حصہ میں روایت بالمعنی ہوئی ہے جس میں نبی ﷺ کے اقوال کو نقل کرنے میں غلطی کا احتمال ہو سکتا ہے۔

متن حدیث کو پرکھنے کے لیے مولانا نے جو طریق کار تجویز کیا اور اپنایا ہے وہ حسب ذیل نکات پر مشتمل ہے:-

(ا) حق و باطل میں امتیاز اور دین و شریعت کی ہر چیز کی جانچ کے لیے کسوٹی قرآن مجید ہے۔ لہٰذا متن حدیث میں تردد ہونے کی صورت میں روایت قرآن مجید ہی کی ترازو میں تولی جائے گی۔ اس کسوٹی پر پرکھے بغیر قبول کی ہوئی روایت میں یہ امکان موجود ہوتا ہے کہ کوئی اس چیز کو دین بنا لے جو دین نہیں ہے۔

(ب) جس طرح قرآن کی تمام دعوت عقل و فطرت پر مبنی ہے اور اپنے دعاوی پر شہادت انہی سے پیش کرتی ہے اسی طرح صحیح حدیث کی کوئی بات عقل و فطرت کے منافی نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی روایت اس کے منافی نظر آئے تو اس پر اچھی طرح غور کرنا ہوگا، یہاں تک کہ اپنی عقل کی کوتاہی واضح ہو جائے یا روایت کا ضعف سمجھ میں آ جائے۔

(ج) حدیث کی اصل زبان کسوٹی عربی ہے۔ لہٰذا ابواب میں ان احادیث کو مقدم رکھا جائے گا جن کی زبان عہد نبوت و عہد صحابہ کی زبان سے ہم آہنگ ہو۔

(د) راوی حضرات اپنے ذوق کے مطابق واقعہ کے کسی حصہ کی روایت کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں بعض اوقات اور ضروری حصے چھوٹ جاتے ہیں۔ لہٰذا کسی ناتمام روایت کی تاویل اس قسم کی دوسری روایات کے ساتھ ملا کر کرنی ہوگی۔ اس طرح جو مضمون متعین ہوگا وہ اصل ہوگا۔

(ہ) متن میں کلام کے عموم و خصوص، موقع و محل اور خطاب کا فہم حاصل کرنا ضروری ہوگا۔ اس سے صرف نظر کرنے سے بعض روایات کی توجیہ اس قدر غلط ہو گئی کہ اسلام کو مطعون کرنے کی راہ کھل گئی۔

مولانا کی رائے میں جو لوگ صرف اپنے فقہی مسلک ہی کی حدیثیں چننے پڑھانے پر قانع ہیں ان کا کام ختم نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ ان اصولوں کی قدر و قیمت کا اندازہ نہ کر سکیں بلکہ اندیشہ ہے کہ وہ ان سے متوحش ہوں۔ لیکن جن لوگوں کو پورے ذخیرۂ حدیث کی چھان بین کرنا اور اس کو دین کے ماخذ کی حیثیت سے تمام خلق کے سامنے پیش بھی کرنا ہو ان کے ہاتھوں میں ایسی کسوٹی کا ہونا ضروری ہے جس کو ایک کسوٹی تسلیم کرنے سے کوئی صاحب انصاف انکار نہ کر سکے۔ مولانا نے عملاً ان اصولوں کی روشنی میں مؤطا کے متون حدیث کا مطالعہ کیا اور ان کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی ہے جو قارئین کو اس کتاب میں ملے گی۔ سند پر مولانا نے بہت کم کلام کیا ہے البتہ اس میں بھی کہیں کہیں بعض اسقام کی نشاندہی کی ہے۔

مؤطا چونکہ اصلاً مالکی فقہ کی کتاب ہے اس لیے مولانا نے امام مالک رحمہ اللہ کے فتاویٰ اور تراجم کا محاکمہ بھی کیا ہے۔ چنانچہ متون کی وضاحتوں میں فقہی مسالک کا تقابلی مطالعہ بھی ہو گیا ہے۔

مولانا نے مؤطا کے یہ دروس پیرانہ سالی میں دیے جب ان کی عمر اسی سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ اس وقت ان کے لیے احادیث و روایات کی شرح خود لکھنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ دروس کو ٹیپ کر لیا گیا۔ بعد ازاں ان کو ٹیپ سے اتار کر تحریر کے اسلوب میں مرتب کرنے کا کام کیا گیا۔ ان دروس کا معتدبہ حصہ مولانا کی حیات میں اور بقیہ

قرآن وحدیث کے ترجمان رسالہ "تدبر" میں چھپا اور برادران کی نظر سے گزرتا رہا۔ مولانا نے اس کوشش پر ہمیشہ اطمینان کا اظہار کیا۔ گویا اس کتاب میں دی گئی وضاحتیں مولاناؒ کے اپنے قلم سے نہیں نکلیں بلکہ ٹیپ کی مدد سے مرتب کر کے اور تحریر کے اسلوب میں ان کو اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے اور یہ کام برادرم سعید احمد صاحب نے بڑے شوق اور انہماک کے ساتھ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس سعی کو مشکور فرمائے۔ یہ کتاب پوری مؤطا پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس کو منتخب ابواب پر مشتمل کہا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا کی پیرانہ سالی اور گرتی ہوئی صحت کے پیش نظر بعض ایسے ابواب کو چھوڑ دیا گیا جن میں صرف امام مالکؒ کے فتاویٰ بیان ہوئے ہیں اور ایسے ابواب کی تعداد مؤطا میں کم نہیں ہے اور جن کا موضوع اب عملی زندگی سے تقریباً ختم ہو چکا ہے، جیسے غلامی کا مسئلہ۔ لہٰذا ایسے عنوانات پر وقت صرف کرنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ عبادات سے متعلق ابواب ناتمام رہ گئے تھے اس لیے ان کو بھی اس مجموعہ میں شامل نہیں کیا گیا۔ بعد میں اگر محسوس ہوا کہ ان کے دروس میں سے کوئی مفید مجموعہ مرتب کیا جا سکتا ہے تو اس کو بھی ان شاء اللہ افادہ عام کے لیے شائع کر دیا جائے گا۔

امید ہے کہ مؤطا امام مالک کے منتخب ابواب کی یہ شرح حدیث پر غور کرنے والوں کے لیے بے حد مفید ثابت ہو گی۔ یہ ان کو مطالعۂ حدیث کے ایک نئے نہج سے آشنا کرے گی جو بالکل فطری ہونے کے باعث ان کو اطمینان کی دولت سے مالا مال کرے گا۔ رب کریم مولانا رحمہ اللہ کی پیرانہ سالی کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور یہ شرح فہم حدیث کے لیے مشعل راہ ثابت ہو۔ اللہ تعالیٰ ان کارکنان ادارہ کی محنت کا بھی اجر عطا فرمائے جنھوں نے اس کو منظر عام پر لانے میں کسی طرح کا تعاون کیا ہے۔

خالد مسعود

۵۔ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ

ناظم ادارہ تدبر قرآن و حدیث

لاہور

امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ

مؤطا امام دار الہجرہ ابو عبد اللہ مالکؒ بن انسؒ بن مالکؒ بن ابی عامر انسؒ کی تصنیف ہے جو ۹۳ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ بزرگوں کا وطن یمن تھا اور وہ حمیر کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ امام صاحب کے پردادا ابو عامر انسؓ مشرف بہ اسلام ہو کر مدینہ آ گئے۔ بعض محدثین کے نزدیک انھوں نے نبی ﷺ کے ہمراہ غزوات میں شرکت کی لیکن دوسرے محدثین آنحضرتؐ سے ان کی ملاقات کی نفی کرتے ہیں۔ امام صاحب کے دادا مالکؓ صحابی تھے اور وہ ان چند لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے امیر المومنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی تدفین میں شرکت کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں دار الخلافہ کوفہ منتقل ہو گیا اور ان کے بعد اموی خلفاء نے دمشق کو دار الحکومت قرار دیا۔ سیاست و حکومت کے مراکز بدلنے سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں، لہٰذا دار الخلافہ کی تبدیلی نے مدینہ منورہ کی مرکزیت کو بھی متاثر کیا اور علم کے مراکز دوسرے شہروں میں منتقل ہو گئے۔ تاہم امام صاحب کے زمانہ تک مدینہ میں اہل علم بھی موجود تھے اور علم کا چرچا بھی تھا۔ امام مالکؒ نافع رحمہ اللہ کے درس میں شامل رہے اور مدنی علماء و فقہاء سے استفادہ کیا لیکن تحصیل علم کے لیے مدینہ منورہ سے باہر نہیں نکلے۔ اسی لیے ان کے شیوخ میں غیر مدنی شیوخ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ نافع کے بعد ان کی مسند امام مالکؒ نے سنبھالی اور باسٹھ سال تک حدیث کا درس دیتے رہے۔ چھیاسی برس کی عمر میں ۱۷۹ھ میں انتقال ہوا اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

مؤطا کی تالیف:

امام صاحب کی تالیفات میں مؤطا کو خاص مقام حاصل ہے۔ اس کتاب کو انھوں نے فقہی عنوانات کے تحت مرتب فرمایا۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ مؤطا کی ترتیب امام ابو حنیفہؒ کی کتاب الآثار کی طرز پر ہے

جو اس سے قبل تصنیف ہو چکی تھی البتہ نوعیت اس کی بالکل مختلف ہے۔ کتاب الآثار میں صرف روایات ہیں لیکن موطا فقہ مالکی کی کتاب ہے جو احادیث کے علاوہ آثار صحابہ اور اہل مدینہ کے علم و عمل کی خبر پر مشتمل ہے۔ چونکہ امام صاحب ہمیشہ مدینہ منورہ ہی میں مقیم رہے اس لیے ان کو فقہی امور میں خلفائے راشدینؓ کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ اور فقہائے مدینہ سعید بن المسیبؒ، عبیداللہ بن عتبہ بن مسعودؒ، عروہ بن زبیرؒ، قاسم بن محمدؒ، ابوبکر بن عبدالرحمٰنؒ، سلیمان بن یسارؒ اور خارجہ بن زیدؓ کے فیصلوں سے رہنمائی حاصل کرنے کا موقع ملا۔ امام مالک کی فقہ کی بنیاد انہی فقہاء کے علم اور اہل مدینہ کے عمل پر ہے اور انہی کے آثار و فتاویٰ موطا میں جمع کیے گئے ہیں۔

مملکت اسلامیہ میں جب تیزی سے وسعت ہوئی تو ایک طرف فیصلہ طلب مسائل کی کثرت ہوئی اور دوسری طرف مفتیوں اور قاضیوں کا محض اپنے علم کی مدد سے مقدمات کے فیصلے صادر کرنا مشکل ہو گیا۔ ان کے سامنے مجتہدین کی آراء کسی مرتب صورت میں موجود نہ تھیں۔ عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کو فقہ اسلامی مرتب کرانے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ ۱۴۳ھ میں جب وہ حج کے لیے گیا تو اس نے امام مالکؒ سے ملاقات میں یہ خواہش کی کہ وہ اپنی فقہ اگر مرتب کر دیں تو وہ اس کو پوری مملکت اسلامیہ میں نافذ کرنے کو تیار ہے۔ اس نے تدوین فقہ سے متعلق اپنا نقطہ نظر امام صاحب کے سامنے ان الفاظ میں رکھا:۔

"اے ابو عبداللہ! آپ علم فقہ کو اپنے ہاتھ میں لیجئے اور اس کو الگ الگ ابواب کی صورت میں مدون کر ڈالیے۔ عبداللہ بن عمرؓ کے تشددات، عبداللہ بن عباسؓ کی رخصتوں اور عبداللہ بن مسعودؓ کی انفرادیات سے بچتے ہوئے ایک ایسا ضابطہ مدون کیجئے جو خیر الامور اوسطھا کے اصول پر مبنی ہو اور جو ائمہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے فتووں اور مسائل کا مجموعہ ہو۔ اگر آپ نے یہ خدمت انجام دے دی تو ان شاء اللہ آپ کی فقہ پر ہم

مسلمانوں کو مجتمع کر دیں گے اور اپنی تمام مملکت میں اس کو جاری کر کے اعلان کر دیں گے کہ کسی صورت میں اس کی خلاف ورزی نہ کی جائے"۔

عام خیال یہ ہے کہ امام مالکؒ نے ابو جعفر منصور کی تجویز کو پسند کیا اور اس کی خواہش کے مطابق موطا مرتب کر دی لیکن کتاب کی تکمیل سے قبل ہی خلیفہ کا انتقال ہو گیا، لہٰذا یہ کتاب پوری مملکت کے لیے مرتب قانون کی جگہ نہ لے سکی۔ یوں بھی امام صاحب اپنی فقہ کو سرکاری حکم نامہ کے ذریعہ سے نافذ کرنے کے حق میں نہ تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ بلاد اسلامیہ میں ہر گروہ کے لوگ الگ الگ فقیہوں پر اعتماد کرتے ہیں اس وجہ سے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا ہی بہتر ہوگا۔

موطا کا سبب تالیف خود اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ یہ کتاب محض ایک مجموعہ احادیث نہیں بلکہ فقہ کی کتاب ہے جس میں امام صاحب نے اپنے مذہب کو احادیث، آثار صحابہؓ، فقہائے مدینہ کے فتاویٰ اور تابعینؒ کے اقوال کی مدد سے ثابت کیا ہے۔ چنانچہ ابوبکر ابہری کے نزدیک موطا کی روایات کی کل تعداد ۱۷۲۰ ہے جن میں احادیث صرف چھ سو ہیں۔ باقی تمام اسناد کے ساتھ ۸۳۵ روایات آئی ہیں جن میں ۲۲۲ مرسل اور ۶۱۲ موقوف ہیں۔ تابعین کے اقوال و فتاویٰ کی تعداد ۲۸۵ ہے۔ چونکہ امام صاحب عمل اہل مدینہ کو اجتہاد کی ایک بنیاد مانتے ہیں اس لیے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انہوں نے اتنی کثرت سے آثار صحابہ و تابعین سے استدلال کیوں کیا ہے۔ روایات نقل کرنے کے بعد وہ خود اپنے فتوے بیان کرتے ہیں اور کتاب کے بے شمار ابواب تو ایسے ہیں جن میں امام صاحب کو نہ کوئی حدیث ملی اور نہ آثار صحابہ میں کوئی رہنمائی ملی چنانچہ انہوں نے اپنے اجتہاد سے مسائل بیان کیے ہیں۔

موطا میں چونکہ مرسل، منقطع اور معضل روایات جمع کر دی گئی تھیں اس لیے بعد میں محدثین نے ان پر تحقیق کر کے روایات کو متصل اور مرفوع کرنے کی سعی بلیغ کی۔ کتاب کو حسن قبول عطا ہوا اور امام مالکؒ سے اس کتاب کو بکثرت لوگوں نے روایت کیا۔ چنانچہ کتاب کی ترتیب میں تقدیم و تاخیر اور کمی و زیادتی واقع

ہو گئی ہے۔ سب سے مشہور و متداول نسخہ یحییٰ بن یحییٰ مصمودی اندلسی کا نسخہ ہے جس کی شرحیں امام سیوطیؒ، زرقانی اور شاہ ولی اللہؒ نے لکھیں۔ جہاں تک موطا کی کل شرحوں کا تعلق ہے تو ان کی تعداد ایک سو سے متجاوز بیان کی جاتی ہے۔ دور حاضر کی نہایت جامع شرح مولانا محمد زکریا کی اوجز المسالک الی مؤطا امام مالک ہے۔

امام مالک کا قول نقل ہوا ہے کہ اس کتاب کو لکھ کر میں نے مدینہ کے ستر فقہاء کے سامنے پیش کیا اور ان سب نے مجھ سے اتفاق کیا۔ اس لیے میں نے کتاب کا نام مؤطا رکھا۔ گویا مؤطا دو جماعتی فراہم کرتی ہے جس پر علماء و فقہاء چلے ہوں اور اس سے اتفاق کرتے ہوں۔ مؤطا کے لفظی معنی روندی ہوئی چیز کے ہیں جس پر لوگ چلے ہوں۔

امام صاحب کے شاگردوں میں ہزاروں لوگ ہیں۔ ان میں بڑے نام امام شافعیؒ، امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کے ہیں۔ امام محمدؒ نے بھی مؤطا کی الگ روایت کی ہے اور اس میں امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور دیگر حضرات سے بھی روایات نقل کی ہیں۔ اس لیے اس میں روایات کی تعداد زیادہ ہے۔

خالد مسعود

تذکرہ مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ ہندوستان کے ضلع اعظم گڑھ (یو۔پی) کے ایک گاؤں ہمبور کے ایک متوسط زمیندار گھرانے میں ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حافظ محمد مرتضیٰ ایک دیندار، متبع سنت اور متہجد گزار شخص تھے جنہوں نے بچے کو ابتدائی دینی تعلیم اپنے گاؤں کے مکتب میں دلوائی۔ مولانا دس برس کے ہوئے تو انہیں ضلع اعظم گڑھ کی مشہور دینی درس گاہ ــــ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ــــ کے تیسرے درجہ میں داخل کرا دیا گیا۔ یہ مدرسہ مولانا شبلی نعمانی کی نگرانی میں رہا تھا اور اس وقت اس کے مہتمم علامہ شبلیؒ کے عزیز شاگرد مولانا شبلی متکلم ندوی تھے۔ مدرسہ میں مولانا کو جو ماحول ملا وہ ان کے لیے بے حد سازگار ثابت ہوا۔ اس نے مولانا کے علم و عمل کو جلا بخشی اور ان کی تحریر و تقریر کی صلاحیتوں میں نکھار پیدا کیا۔ مولانا مدرسہ کا تعلیمی کورس آٹھ برس میں مکمل کر کے ۱۹۲۲ء میں فارغ ہوئے۔ عملی زندگی میں اپنے استاذ و مربی مولانا عبدالرحمن نگرامی کے مشورہ سے انہوں نے اخبار "مدینہ" بجنور کے عملہ ادارت میں شمولیت اختیار کی اور اڑھائی تین سال صحافت کے پیشہ میں رہے۔

۱۹۲۵ء میں مدرسۃ الاصلاح کا انتظام مولانا حمید الدین فراہیؒ نے سنبھالا تو مدرسہ کے کورس میں کئی بنیادی تبدیلیاں کیں اور قرآن مجید کی تحقیقی تعلیم کو خاص اہمیت دی۔ انہوں نے قرآن کو سمجھنے پر پوری زندگی صرف کی تھی اور فہم قرآن کے لیے نصوص پر مبنی اصول تفسیر قائم کرنے کے علاوہ متعدد سورتوں کی منفرد تفسیر لکھی تھی۔ ان کے ایماء پر مولانا اصلاحی اخبار نویسی کا لاطائل مشغلہ چھوڑ کر بطور مدرس مدرسۃ الاصلاح میں آ گئے۔ مولانا فراہیؒ نے مدرسہ کے اساتذہ کو قرآن فہمی کی تربیت دینے کے لیے درس کا سلسلہ شروع کیا جو ۱۹۳۰ء میں ان کی وفات تک جاری رہا۔ اس درس سے خاص طور پر جن دو اساتذہ نے تحقیقی فائدہ اٹھایا ان میں مولانا اختر احسن اور مولانا امین

احسن کے نام آتے ہیں۔ ان دونوں کے ذریعے استاذ کا فکر خوب پھیلا لیکن اس فکر کو ترقی دینے اور علمی دنیا کو اس سے متعارف کرانے میں مولانا امین احسنؒ کی جو شاندار خدمات ہیں ان کی بدولت وہ بجا طور پر مولانا فراہیؒ کے جانشین سمجھے جاتے ہیں۔

مولانا حمید الدین فراہیؒ کے انتقال کے بعد مولانا اصلاحیؒ کی خواہش ہوئی کہ جس پایہ کے استاذ سے انہوں نے قرآن فہمی کے رموز سیکھے اسی پایہ کے کسی شیخ الحدیث سے حدیث کی تعلیم حاصل کریں۔ وہ اپنی کتاب 'مبادی تدبر حدیث' میں لکھتے ہیں :۔

> "اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ مجھے ابتدا ہی سے قرآن شریف کی طرح حدیث شریف سے بھی تھوڑا بہت شغف رہا ہے۔ چنانچہ مولانا فراہی رحمہ اللہ علیہ کی وفات کے بعد میرے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک امام فن سے قرآن مجید سمجھنے اور سمجھنے کی توفیق بخشی اسی طرح کسی صاحب فن سے حدیث کے سیکھنے اور سمجھنے کا بھی انتظام فرما دے"۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا اصلاحیؒ کی یہ آرزو پوری کی۔ ۱۹۳۱ء میں اپنے دیار کے جید شیخ الحدیث اور جامع ترمذی کے شارح مولانا محمد عبدالرحمٰن بن عبدالرحیم مبارکپوریؒ کی خدمت میں شرف تلمذ کے لیے حاضر ہوئے۔ مولانا مبارک پوری نہایت عالی سند رکھتے تھے۔ وہ سید محمد نذیر حسینؒ محدث دہلوی کے شاگرد تھے جن کا سلسلہ سند مولانا محمد اسحاق دہلویؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی کے واسطہ سے شاہ ولی اللہؒ تک پہنچتا ہے، جنہوں نے شیخ ابوالطاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی سے اجازت حدیث لی تھی۔ مولانا مبارک پوریؒ کو جب معلوم ہوا کہ ان سے شرف تلمذ حاصل کرنے کے خواہشمند نوجوان مدرسۃ الاصلاح کے فارغ التحصیل ہیں تو انہوں نے تبرکاً ایک سبق پڑھا کر ان کو اجازت حدیث مرحمت فرمانا چاہی لیکن مولانا اصلاحیؒ نے درخواست کی کہ محض اجازت کے حصول کے لیے میں آپ کے پاس نہیں آیا بلکہ چاہتا ہوں کہ سبقاً سبقاً آپ سے علم حدیث حاصل کروں۔ چونکہ آپ جامع ترمذی میں اختصاص رکھتے ہیں اس لیے یہی کتاب پڑھا دیجئے۔ اس پر مولانا مبارک پوری نے پوری جامع ترمذی کا درس دیا اور

اصول میں شرح نخبۃ الفکر پڑھائی، نیز رجال کی تحقیق کا سلیقہ بتایا۔ آخر میں بطور سند جامع ترمذی کا ایک نسخہ اپنے دستخط سے مزین فرما کر شاگرد کو عنایت کیا۔ مولانا اصلاحی بیان کرتے تھے کہ مولانا مبارک پوری سے شرف تلمذ حاصل ہونے کے بعد میرے اندر یہ شوق پیدا ہوا کہ صحیحین میں سے کسی ایک کتاب کی شرح تمام صحاح کو سامنے رکھ کر بعض جوانب حدیث پر غور و تدبر اور ان کی تحقیق و تنقید کی چھوٹی اختیار کی لیکن عملاً اس منصوبے پر کام کرنا جلد ممکن نہ ہو سکا۔

مولانا اصلاحیؒ نے مدرسہ میں قیام کے دوران ۱۹۳۵ء میں دائرہ حمیدیہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کا کام مولانا فراہی کی عربی تفسیر کا اردو میں ترجمہ کرنا، ان کی غیر مطبوعہ تصانیف کی ترتیب و تہذیب و اشاعت اور ان کے فکر کی ترویج کے لیے ایک ماہنامہ کا اجرا تھا۔ 'الاصلاح' کے نام سے شائع ہونے والا یہ ماہنامہ چار سال بڑی باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ مدرسہ میں قیام کے دوران میں مولانا نے حقیقت شرک، حقیقت توحید، حقیقت تقویٰ اور حقیقت نماز کے نام سے کتب تحریر کیں۔ ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی قائم ہوئی تو مولانا اصلاحی اس میں شامل ہوئے اور اپنے علمی مرتبہ و مقام کی بدولت اس کے صف اول کے قائدین میں شمار ہونے لگے۔ ۱۹۴۵ء کے اوائل میں مولانا مودودیؒ کی ہدایت پر مرکز جماعت میں خدمات سرانجام دینے کے لیے وہ مدرسہ کو خیرباد کہہ کر پٹھانکوٹ منتقل ہو گئے۔ پاکستان وجود میں آیا تو جماعت اسلامی کے دفاتر لاہور میں قائم کیے گئے اور مولانا بھی لاہور میں مقیم ہو گئے۔ وہ نائب امیر جماعت اور رکن مجلس شوریٰ کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے۔ سولہ سترہ سال کی رفاقت و وابستگی کے بعد بعض اصولی اختلافات کی بنا پر جنوری ۱۹۵۸ء میں جماعت کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے۔ اس دوران میں انہوں نے نئی اسلامی مملکت کی ضروریات کے پیش نظر اسلامی ریاست کے نام سے ایک مبسوط کتاب لکھی جس میں شہریت کے حقوق و فرائض، غیر مسلموں کے حقوق، کارکنوں کی ذمہ داریاں اور ان کے اوصاف، فقہی اختلافات کا حل، اور اطاعت کے شرائط اور حدود اہم عنوان تھے۔ اس کے علاوہ اسلامی قانون کی تدوین، اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام، عائلی کمیشن رپورٹ پر تبصرہ اور قرآن میں پردہ کے احکام کے ناموں سے ان کی تصانیف

سامنے آئیں۔ جماعتی ضرورت کے تحت مولانا نے دعوت دین اور اس کا طریق کار اور تزکیہ نفس کے موضوعات پر کتابیں لکھیں۔

جماعت اسلامی کو خیرباد کہنے کے بعد مولانا اصلاحی قرآن مجید کی تفسیر لکھنے میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ اس کے علاوہ اپنے افکار کی اشاعت کے لیے انہوں نے ماہنامہ میثاق جاری کیا، نیز علمی و دینی تربیت کے لیے حلقہ ہائے درس قائم کیے جن سے بیسیوں نوجوانوں نے فائدہ اٹھایا۔ مولانا کی عظیم تفسیر 'تدبر قرآن' نو جلدوں میں تیار ہوئی۔ یہ تفسیر ان کی غیر معمولی محنت اور فکر و تدبر کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس میں مولانا کی تحقیق کا رنگ، اسلوب نگارش، طرز استدلال ہر چیز ایسی ہے جو اس کارنامہ کو منفرد بنا دیتی ہے۔ مولانا قرآن مجید کو ایک مربوط و منظم کلام مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر سورہ ایک اکائی ہے جس کا ایک ہی مرکزی مضمون ہوتا ہے اور سورہ کی تمام آیات اسی مضمون سے متعلق اور مربوط ہوتی ہیں۔ اس طرح ہر آیت اپنے سیاق و سباق میں ایک ہی معنی کی حامل ہوتی ہے۔ یہ تفسیر دین میں وحدت فکر پیدا کرنے کا اہم ذریعہ بن گئی ہے۔

مولانا نے جو حلقہ ہائے درس قائم کیے ان میں قرآن مجید اور حدیث شریف کا باقاعدہ درس ہوتا رہا۔ حدیث میں مولانا نے مؤطا امام مالکؒ، صحیح مسلم اور صحیح بخاری کا درس دیا۔ قرآن و حدیث کی تعلیم کا یہ سلسلہ ۱۹۹۳ء تک جاری رہا جس کے بعد مولانا کی پیرانہ سالی اور جسمانی کمزوری اور نقاہت کے باعث اس کو منقطع کرنا پڑا۔ آخری دس سالوں میں مولانا کی کتابیں۔۔۔ مبادی تدبر قرآن، مبادی تدبر حدیث، فلسفہ کے بنیادی مسائل قرآن کی روشنی میں، مقالات اصلاحی، تعلیم دین، اصول فہم قرآن۔۔۔ منظر عام پر آئیں۔ قرآن و حدیث کا یہ عظیم شارح، خادم ۱۵ دسمبر ۱۹۹۷ کو اپنے رب سے جا ملا۔ دعا ہے کہ رب کریم مولانا اصلاحی کی علمی و دینی خدمات اور صدقات جاریہ کو شرف قبولیت عطا فرمائے، ان کے درجات کو بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں ان کو مقام نصیب فرمائے۔

خالد مسعود

کتاب الزکوٰۃ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مَا تَجِبُ فِيْهِ الزَّكَاةُ

زکوٰۃ کس مقدار پر واجب ہوتی ہے

حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَمْرِو بْنِ يَحْيَى الْمَازِنِيِّ عَنْ اَبِيهِ اَنَّهُ قَالَ: سَمِعْتُ اَبَا سَعِيدٍ الْخُدْرِيَّ يَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: لَيْسَ فِيمَا دُوْنَ خَمْسِ ذَوْدٍ صَدَقَةٌ وَ لَيْسَ فِيمَا دُوْنَ خَمْسِ اَوَاقٍ صَدَقَةٌ وَ لَيْسَ فِيمَا دُوْنَ خَمْسَةِ اَوْسُقٍ صَدَقَةٌ۔

﴿حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پانچ اونٹوں سے کم پر صدقہ نہیں، پانچ اوقیہ سے کم میں صدقہ نہیں اور پانچ وسق سے کم میں صدقہ نہیں﴾

وضاحت:

یہ حدیث امام بخاریؒ نے حضرت ابو سعید خدریؓ سے مختلف واسطوں سے نقل کی ہے۔ اس میں جملوں کی ترتیب بدلی ہوئی ہے اور خمس اواق کا ذکر پہلے ہے۔ امام مسلم نے یہی حدیث حضرت ابو سعید خدریؓ سے مختلف واسطوں سے نقل کی ہے۔ جملوں کی ترتیب بخاری کی طرح ہے۔ (صحیح مسلم: کتاب الزکوٰۃ باب ۱)

"صدقۃ" اس روایت میں زکوٰۃ کے معنی میں آیا ہے۔

"ذود" اصل میں تین سال سے لے کر دس سال کے اونٹوں کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کا واحد نہیں۔ یہاں اس لفظ سے اونٹ اور اونٹنیاں دونوں مراد لی گئی ہیں۔

"اواق" اوقیہ کی جمع ہے اور یہ چاندی کی مقدار بیان ہوئی ہے، جیسا کہ اگلی روایت میں وضاحت ہے۔ ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر یوسف قرضاوی کی تحقیق کے مطابق دس درہم سات مثقال سونے کے ہم وزن ہوتے تھے۔ اس طرح درہم ویبر کا ۱۰/۷ ہوا۔ ویبر کا وزن ۴۲۵ء۲ گرام کے برابر تھا۔ اس طرح درہم کا وزن ۵۹۵ء۲ گرام ہوا۔ اس تحقیق کی رو سے چاندی کا نصاب ۵۹۵ گرام ہے۔ یہ ہمارے ہاں معروف نصاب ساڑھے باون تولے سے تقریباً ڈیڑھ تولہ کم ہے۔

"اوسُق" وسق کی جمع ہے۔ وسق ساٹھ صاع کا ہوتا تھا۔ ڈاکٹر یوسف قرضاوی کی تحقیق کے مطابق صاع ۲۰۴۸ رطل گیہوں کے برابر تھا۔ اور یہ مقدار ۱۲۰۷ گرام کے برابر ہوتی ہے۔ لہذا مصری رطل کے مطابق نصاب ۱۴۴۰ رطل اور کلوگرام کے حساب سے ۱۲۰۷×۳۰۰ یعنی ۶۵۲٫۸ یا ۶۵۳ کلوگرام ہوگا۔ اس طرح پانچ وسق ۱۷۰۵ من ہوتے ہیں۔

یہ روایت اونٹوں، غلہ اور چاندی پر زکوۃ عائد کرنے کے لیے ایک نصاب کا تعین کرتی ہے۔ اس سے کم مقدار میں زکوۃ عائد نہیں ہوگی۔ زکوۃ کے نصاب کے بارے میں صرف یہی ایک مرفوع حدیث ہے۔ باقی سب آثار صحابہ یا فتوے ہیں۔ نصاب مقرر کرنے کی حکمت یہ ہے کہ معمولی آمدنی والوں پر کسی قسم کا بوجھ نہ ہو کیونکہ زکوۃ کا مقصد امراء سے مال وصول کر کے غرباء میں تقسیم کرنا ہے تاکہ دولت صرف اغنیاء میں مرتکز ہو کر نہ رہ جائے۔

اس روایت میں صرف اونٹ کا نصاب بیان ہوا ہے، دوسرے جانوروں کا نہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بات کسی خاص موقع پر کسی سوال کے جواب میں کہی گئی ہے۔ ویسے ہر قسم کے جانوروں میں زکوۃ ہے بشرطیکہ وہ معین مقدار سے زائد ہوں اور ان کی حیثیت مویشی کی ہو۔ ہل چلانے والے، گنا کھینچنے والے یا بار برداری کے اونٹ یا دوسرے جانور شمار نہ ہوں گے۔ بھیڑ بکریوں اور گایوں کا نصاب بعض دوسری روایات میں بیان ہوا ہے۔

زکوۃ انفاق سے الگ چیز ہے۔ اس کی نوعیت فرض کی ہے جس کو حکومت ہر حال میں وصول کرے گی اور مستحقین زکوۃ میں تقسیم کرے گی۔ اس کی نوعیت اس ٹیکس کی نہیں جو حکومت اپنے مصارف کے لیے لگاتی ہے۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ أَبِي صَعْصَعَةَ الْأَنْصَارِيِّ ثُمَّ الْمَازِنِيِّ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَيْسَ فِيمَا دُوْنَ خَمْسَةِ أَوْسُقٍ مِنَ التَّمْرِ صَدَقَةٌ وَ لَيْسَ فِيمَا دُوْنَ خَمْسِ أَوَاقٍ مِنَ الْوَرِقِ صَدَقَةٌ وَ لَيْسَ فِيمَا دُوْنَ خَمْسِ ذَوْدٍ مِنَ الْإِبِلِ صَدَقَةٌ۔

﴿حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پانچ وسق سے کم کھجور میں زکوۃ نہیں اور پانچ اوقیہ سے کم چاندی میں زکوۃ نہیں اور پانچ عدد اونٹ سے کم میں زکوۃ نہیں﴾

وضاحت:

اس روایت میں چند الفاظ کا اضافہ ہے۔ اس میں کھجور کا ذکر ہے۔ مدینہ میں اصل فصل کھجور کی ہی تھی باقی فصلیں ثانوی تھیں۔ وہاں اس کی حیثیت غلے کی تھی۔ اس کے لیے بھی نصاب پانچ وسق ہی رکھا گیا۔

ق سے مراد چاندی ہے۔ چاندی کا نصاب پانچ اوقیہ ہے۔ اوقیہ کی شرح پہلی حدیث میں گزر چکی ہے۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيزِ كَتَبَ إِلَى عَامِلِهِ عَلَى دِمَشْقَ فِي الصَّدَقَةِ إِنَّمَا الصَّدَقَةُ فِي الْحَرْثِ وَالْعَيْنِ وَالْمَاشِيَةِ۔

﴿امام مالک روایت کرتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے دمشق کے عامل کو زکوۃ کے بارے میں لکھا کہ زکوۃ کھیتی، نقدی اور مویشیوں میں ہے﴾

وضاحت:

"حرث" کا معنی کھیتی ہے۔ ایک تو اصل فصل (MAIN CROP) ہوتی ہے جیسے گیہوں، جو وغیرہ اور دوسری ثانوی فصلیں ہوتی ہیں جیسے ہنری، دالیں وغیرہ۔ تو اصل فصل کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ اگر کسی نے ایک کیاری میں لہسن، سونف وغیرہ اپنی ضرورت کے لیے لگائی ہو تو وہ شمار نہ ہوگی۔ جو فصلیں ایک جنس اور ایک نوعیت کی ہوں اور ان کا مقصد غلے کا ہو تو وہ یکجا شمار ہوں گی۔ مثلاً اگر گندم پانچ وسق نہیں اور کچھ جو مل کر پانچ وسق سے زیادہ ہو جاتے ہیں تو زکوۃ ادا کرنی ہوگی۔ دالیں مونگ، ماش، مسور وغیرہ اگر پانچ وسق سے کم ہوں تو شمار میں نہیں آئیں گی۔ لیکن اگر سب مل کر پانچ وسق سے زائد ہو جائیں تو زکوۃ واجب ہوگی۔ اسی طرح دھان کی فصل اصل ہے۔ مختلف قسم کے دھان یکجا شمار ہوں گے لیکن گندم کی فصل دھان کے ساتھ شمار نہ ہوگی۔ خربوزہ، تربوز اور سبزیوں کی فصلیں اور باغوں کی پیداوار میرے نزدیک "حرث" کے مفہوم میں شامل ہے اور ان پر زکوۃ عائد ہوگی بشرطیکہ وہ نصاب سے زائد ہوں۔ حنفیہ نے کھیتی کے بارے میں قوت (نشوونما کی صلاحیت) اور ذخیرہ کرنے کی شرط لگائی ہے۔ اس زمرہ میں غلوں کے علاوہ دوسری اجناس مثلاً پیاز، لہسن، سردہ، گرما وغیرہ غلے سے بھی زیادہ نقد آور ہو گئی ہیں۔ زکوۃ اسلام نے تمام اموال پر عائد ہوتی ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اسلامی حکومت گنے پر، تمباکو پر، سبزیوں اور پھلوں اور دیگر تمام اجناس پر زکوۃ وصول نہ کرے جو آج آمدنی کا اہم ذریعہ ہیں۔ میرے نزدیک اصول یہ ہے کہ کھیتی میں جو کچھ

بھی ہے اس پر زکوٰۃ ہے بشرطیکہ مقدار اتنی ہو کہ صدقہ لینے والا اس میں مداخلت کر سکے۔

"عین" کا مطلب ہے نقدی۔ جس میں چاندی، سونا اور رائج الوقت کرنسی شامل ہے۔ یعنی درہم، دینار اور اس زمانہ میں روپیہ، پونڈ، ڈالر وغیرہ۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں رائج الوقت سکے چاندی اور سونے کے تھے۔ درہم چاندی کا اور دینار سونے کا ہوتا تھا۔ اب سکے کی جگہ نوٹوں نے لے لی ہے لیکن یہ نوٹ حکومت کی ضمانت سے جاری ہوتے ہیں اور سونے اور چاندی کے ہی قائم مقام ہیں لہٰذا چاندی اور سونے کے نصاب کے برابر اگر کسی کے پاس نوٹوں کی نقدی ہوگی تو اس پر زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی یا اگر چاندی، سونا اور نوٹوں کی نقدی مل کر نصاب سے زائد ہوگی تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

"ماشیۃ" سے مراد وہ سب جانور ہیں جو گلے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم جنس جانوروں کی ایک فہرست ہوگی۔ مثلاً بھیڑ بکری ایک قسم اور دودھ دینے والے جانور بھینس گائے وغیرہ ایک قسم شمار ہوں گے۔ اس زمانہ میں ان معروف مویشیوں کے علاوہ کئی جانوروں کو تجارتی پیمانہ پر نشوونما دی جاتی ہے۔ مثلاً پولٹری فارم جگہ جگہ قائم ہو گئے ہیں۔ گھوڑوں کی نسل کشی کا وسیع کاروبار ہے۔ میرے نزدیک پولٹری کے جانور، گھوڑے اور خچر، طرح طرح کے پرندے مثلاً کبوتر، طوطے اور بٹیر غرضیکہ جو جانور بھی تجارت کے لیے پالے جاتے ہیں ان پر مقررہ مقدار کو چھوڑ کر زکوٰۃ ہوگی اور یہ ماشیہ کے مفہوم میں سمجھے جائیں گے۔

اَلزَّكَاةُ فِي الْعَيْنِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْوَرِقِ

سونے اور چاندی کی نقدی میں زکوٰۃ

❐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عُقْبَةَ مَوْلَى الزُّبَيْرِ اَنَّهُ سَاَلَ الْقَاسِمَ بْنَ مُحَمَّدٍ عَنْ مُكَاتَبٍ لَهُ فَاَقْطَعَهُ بِمَالٍ عَظِيمٍ هَلْ عَلَيْهِ فِيْهِ زَكٰوةٌ؟ فَقَالَ الْقَاسِمُ: اِنَّ اَبَابَكْرٍ الصِّدِّيْقَ لَمْ يَكُنْ يَاْخُذُ مِنْ مَالٍ زَكٰوةً حَتّٰى يَحُوْلَ عَلَيْهِ الْحَوْلُ۔ قَالَ الْقَاسِمُ بْنُ مُحَمَّدٍ وَكَانَ اَبُوْبَكْرٍ اِذَا اَعْطَى النَّاسَ اَعْطِيَاتِهِمْ يَسْاَلُ الرَّجُلَ هَلْ عِنْدَكَ مِنْ مَالٍ وَجَبَتْ عَلَيْكَ فِيْهِ الزَّكٰوةُ؟ فَاِذَا قَالَ: نَعَمْ اَخَذَ مِنْ عَطَائِهِ زَكٰوةَ ذٰلِكَ الْمَالِ۔ وَاِنْ قَالَ: لَا۔ اَسْلَمَ اِلَيْهِ

عطاءہ وَلَمْ يَاْخُذْ مِنْهُ شَيْئًا۔

﴿زبیر کے آزاد کردہ غلام محمد بن عقبہ سے روایت ہے کہ انہوں نے قاسم بن محمد سے پوچھا کہ ان کے مکاتب نے ان کو ایک بڑی رقم پیشگی ادا کر دی ہے۔ کیا ان پر اس میں زکوٰۃ واجب ہو گی تو قاسم نے کہا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کسی مال سے زکوٰۃ نہ لیتے جب تک کہ اس پر ایک سال نہ گزر جاتا۔ جب وہ لوگوں کو وظائف دینے لگتے تو پوچھتے: تمہارے پاس کوئی ایسا مال تو نہیں جس پر زکوٰۃ واجب ہو؟ اگر کوئی شخص اثبات میں جواب دیتا تو وظیفہ میں سے زکوٰۃ وضع کر لیتے۔ اگر نفی میں جواب دیتا تو پورا وظیفہ اس کے حوالے کر دیتے اور اس میں سے کچھ نہ کاٹتے﴾

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عُمَرَ بْنِ حُسَيْنٍ عَنْ عَائِشَةَ بِنْتِ قُدَامَةَ عَنْ اَبِيْهَا اَنَّهُ قَالَ: كُنْتُ اِذَا جِئْتُ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ اَقْبِضُ عَطَائِي سَاَلَنِي: هَلْ عِنْدَكَ مِنْ مَالٍ وَجَبَتْ عَلَيْكَ فِيْهِ الزَّكٰوةُ؟ قَالَ: فَاِنْ قُلْتُ: نَعَمْ اَخَذَ مِنْ عَطَائِي زَكٰوةَ ذٰلِكَ الْمَالِ: وَاِنْ قُلْتُ: لَا دَفَعَ اِلَيَّ عَطَائِي۔

﴿عائشہ بنت قدامہ اپنے باپ سے روایت کرتی ہیں کہ انہوں نے کہا کہ جب میں حضرت عثمان بن عفانؓ کے پاس اپنا وظیفہ لینے جاتا تو وہ مجھ سے پوچھتے کہ تیرے پاس کوئی ایسا مال تو نہیں جس پر زکوٰۃ واجب ہو چکی ہے۔ اگر میں کہتا ہاں تو وہ میرے وظیفے میں سے زکوٰۃ کاٹ لیتے اور اگر کہتا نہیں تو میرا وظیفہ مجھے دے دیتے﴾

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ يَقُوْلُ: لَا تَجِبُ فِي مَالٍ زَكٰوةٌ حَتّٰى يَحُوْلَ عَلَيْهِ الْحَوْلُ۔

﴿نافع روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فتویٰ دیتے تھے کہ کسی مال میں زکوٰۃ نہیں جب تک کہ اس پر ایک سال نہ گزر جائے﴾

وضاحت :

ان تمام روایتوں میں حوالان حول کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔اسلام میں مجرد آمدنی پر زکوٰۃ نہیں بلکہ زکوٰۃ اس مال پر ہے جو کسی مسلمان کے قبضہ میں ایک سال تک رہے، نشیب و فراز سے گزرے، سرد و گرم چکھے، نفع حاصل کرنے میں اس کو لگایا جا سکے، اسے نقصان سے دوچار ہونا ہو تو ہو جائے۔تمام مراحل سے گزرنے کے بعد جو مال بچے اس پر زکوٰۃ ہوگی۔اصول یہ ہے کہ جو رقم آئے اس پر فوری طور پر مصدق نہ چڑھ دوڑے، جیسا کہ انکم ٹیکس کا معاملہ ہے۔سال کا گزرنا ضروری ہے۔زکوٰۃ بہت پر ہے آمدنی پر نہیں۔موجودہ ٹیکسوں کے نظام اور اسلام کے نظام میں یہ بنیادی فرق ہے۔

روایت میں حضرت عبدالرحمٰن عوفؓ کا فتویٰ ہے جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عمل کے مطابق ہے۔اس فتوے کا تعلق صرف مال سے ہے۔زرعی پیداوار سے نہیں کیونکہ فصل سے متعلق تو حکم ہے کہ اس پر زکوٰۃ ادا کرو جن دنوں میں اس کو کاٹو۔(اٰتوا حقہٗ یوم حصادہ) گویا فصل کی برداشت کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے۔

وظیفہ سے زکوٰۃ کاٹ لینا سہولت کے لحاظ سے ہے۔یہ عمل حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عثمان بن عفانؓ کا رہا ہے۔یہ زکوٰۃ پچھلے مال پر لی جاتی تھی تاکہ دینے والے اور لینے والے کو سہولت رہے۔خلفائے راشدین کا یہ عمل وضع زکوٰۃ میں مجرد زکوٰۃ دینے والے کے بیان پر اعتماد کرنے کی اعلیٰ مثال ہے۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ أَنَّهُ قَالَ: أَوَّلُ مَنْ أَخَذَ مِنَ الْأَعْطِيَةِ الزَّكَوٰةَ مُعَاوِيَةُ بْنُ أَبِي سُفْيَانَ۔

﴿ابن شہاب سے روایت ہے کہ سب سے پہلے جس خلیفہ نے وظائف میں سے زکوٰۃ وصول کی وہ معاویہ بن ابی سفیانؓ ہیں۔﴾

وضاحت :

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ کا عمل اوپر کی روایات میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ وظیفہ عطا کرنے سے پہلے وصول کنندہ سے یہ معلوم کرتے کہ اس کے ذمہ زکوٰۃ تو باقی نہیں۔اگر وہ بتاتا کہ زکوٰۃ واجب الادا ہے تو وہ وظیفہ کی رقم میں سے کاٹ لیتے ورنہ علیحدہ پورا دے دیتے۔ابن شہاب کی اس روایت میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کا

عمل اس سے مختلف تھا۔وہ جب وظیفہ عطا کرتے تو اس پر جتنی زکوٰۃ بنتی وہ اسی میں سے وصول کر لیا کرتے۔ان کی دلیل یہ تھی کہ وظیفہ ایک مشترک کھاتے کی حیثیت رکھتا ہے اور پہلے سے معلوم آمدنی ہے اس لیے اس کا نظم ایک مشترک کھاتے کا ہونا چاہیے اور اس پر حوالان حول کی شرط نہیں ہونی چاہیے۔

حضرت معاویہؓ کا اختیار کردہ راستہ آسان ہے۔وقفوں کے ساتھ حاصل ہونے والی رقموں پر حوالان حول کا حساب رکھنا نہایت پیچیدہ ہو جاتا ہے۔اگر ہر رقم پر سال گزرنے کی مدت کا الگ الگ حساب رکھا جائے تو حساب کی ایسی مشکلیں پیش آئیں گی کہ عام آدمی ان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔لیکن حضرت معاویہؓ کے اس عمل پر فقہاء نے فتویٰ نہیں دیا۔

امام مالکؒ کے فتوے :

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ سنت، جس کے بارے میں ہمارے ہاں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا، یہ ہے کہ جس طرح دو سو درہم چاندی میں زکوٰۃ ہوگی اسی طرح بیس دینار میں بھی زکوٰۃ ہوگی۔ڈاکٹر قرضاوی کی تحقیق کے مطابق بیس دینار سونے کا ہوتا تھا اور اس کا وزن ۸۵ء۴ گرام تھا۔اس طرح سونے کا نصاب ۸۵ گرام ہوا جو تقریباً ساڑھے سات تولے کے برابر ہے۔

امام مالکؒ کے زمانہ میں دینار و درہم مسکوک بھی ہوتے تھے اور غیر مسکوک بھی۔اس لیے ان کے وزن میں معیاری وزن کے لحاظ سے فرق ہوتا تھا۔امام صاحب کا فتویٰ یہ تھا کہ اگر بیس دینار اور دو سو درہم تعداد صحیح ہونے کے باوجود وزن میں پورے نہ اتریں تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہوگی۔گویا اصل معیار سونا یا چاندی کی مقدار ہے، سکوں کی تعداد نہیں۔

اس زمانہ میں دینار و درہم کا مبادلہ بھی ہر جگہ ایک جیسا نہ ہوتا تھا۔امام مالکؒ کا فتویٰ یہ تھا کہ اگر کسی مقام پر بیس دینار ایک سو ساٹھ درہم کے برابر ہوتے ہوں تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہوگی۔گویا امام صاحب چاندی کو سٹینڈرڈ مانتے تھے۔کاغذ کرنسی کے اس دور میں اب یہ مسائل پیدا نہیں ہوتے۔

امام مالکؒ کے نزدیک اگر کسی کے پاس فائدہ کی رقم ہو یعنی ایسا مال جو تجارت سے حاصل نہیں ہوا مثلاً مکانوں کی اجرت یا مکانوں کا کرایہ وغیرہ، یہ رقم نصاب سے کم ہو اور وہ شخص اس سے تجارت شروع کر دے تو سال

پورا ہونے سے پہلے اگر دو بڑھ کر نصاب کے برابر ہو جائے تو اسی روز اس پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی اور اس دن سے حولان حول کا حساب رکھا جائے گا۔ اگر یہ رقم نصاب سے زیادہ ہے تو زکوٰۃ ایک سال گزرنے کے بعد واجب ہو گی۔ گویا امام صاحب تجارتی منافع پر فوری زکوٰۃ عائد کرنے کے حق میں ہیں۔

امام صاحب کئی قوموں کے مشترک کھاتے کے بارے میں یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ ان اشخاص میں سے جس شخص کا حصہ بیس دینار یا دو سو درہم ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہو گی اور جس کا حصہ اس سے کم رہ جائے گا اس پر زکوٰۃ نہ ہو گی۔ امام شافعیؒ مشترک کھاتے میں مجموعہ پر زکوٰۃ مانتے ہیں۔ میرے نزدیک جب ملکیت معین نہ ہو تو مجموعہ پر زکوٰۃ عائد ہونی چاہیے اور جب حصص معلوم ہوں تو ہر حصہ کو دیکھا جائے گا کہ وہ بقدر نصاب ہے یا نہیں۔

امام صاحب کے نزدیک جب کسی شخص کا سونا چاندی مختلف لوگوں کے پاس رکھا ہوا ہو تو وہ ان کو اکٹھا شمار کر کے زکوٰۃ ادا کرے گا۔ میرے نزدیک یہ فتویٰ اس صورت میں ہے جب اس کا مال دوسروں کے پاس بطور امانت جمع ہو۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ ہر امانت نصاب کی مقدار سے کم ہے اس لیے اس پر زکوٰۃ نہیں۔

میرے نزدیک مال اگر قرض دیا ہوا ہے تو قرض کی وصولی تک وہ معاشرہ کی خدمت کر رہا ہوتا ہے۔ اس لیے اس دوران میں اس پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی۔ جب قرض وصول ہو گا تو اس کی حیثیت 'فائدہ' کی ہو گی۔ وصولی کے دن سے اس پر حولانِ حول کا اطلاق ہو گا اور ایک سال کا عرصہ گزرنے پر زکوٰۃ دی جائے گی۔

اَلزَّكَاةُ فِي الْمَعَادِنِ

معدنیات میں زکوٰۃ

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ أَبِي عَبْدِالرَّحْمٰنِ عَنْ غَيْرِ وَاحِدٍ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَطَعَ لِبِلَالِ بْنِ الْحَارِثِ الْمُزَنِيِّ مَعَادِنَ الْقَبَلِيَّةِ وَهِيَ مِنْ نَاحِيَةِ الْفَرْعِ فَتِلْكَ الْمَعَادِنُ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا إِلَى الْيَوْمِ إِلَّا الزَّكٰوةُ۔

﴿ابو عبدالرحمٰن ایک سے زائد راویوں سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بلال بن حارث مزنی کو قبل میں، جو فرع کے جوار میں ہے، اس کی کانیں جاگیر میں دے دیں۔ ان کانوں میں سے آج

تک زکوٰۃ کے سوا کوئی چیز نہیں لی گئی﴾

وضاحت:

قبل مکہ اور مدینہ کے درمیان کسی مقام کا نام ہے۔ اکثر فقہاء کے نزدیک معادن میں صرف سونے اور چاندی کی کانیں شمار ہوں گی۔ یہ بات عقل کے خلاف ہے۔ نقدین کے علاوہ دوسری بہت سی چیزیں مثلاً لوہا، کوئلہ، تانبا، گیس، تیل، سنگ مرمر اور دوسرے قیمتی پتھر اور اس زمانہ میں یورینیم اور دوسری معدنیات جو ایٹم بنانے کے کام آتی ہیں، سب معادن میں شامل ہونی چاہئیں۔

امام مالکؒ کی رائے میں معادن میں سے کچھ نہیں لیا جائے گا جب تک کہ جو معادن میں سے نکلے وہ بیس دینار یا دو سو درہم کے برابر نہ ہو جائے۔ جب وہ اس مقدار کو پہنچ جائے تو اس میں سے اسی وقت زکوٰۃ کاٹ لی جائے گی اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اس میں یافت ہوتی رہے۔ جب یافت ختم ہو جائے تو زکوٰۃ کی کٹوتی بند کر دی جائے گی۔ اگر دوبارہ یافت شروع ہو جائے تو پھر نئے سرے سے اسی اصول پر زکوٰۃ کاٹی جائے گی۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ معدن بھی محصولہ زرعی زمین کے ہے۔ جس طرح زمینی پیداوار پر فصل کٹتے ہی زکوٰۃ لی جاتی ہے اسی طرح جب معدن سے کچھ نکلے گا تو اس میں سے زکوٰۃ لی جائے گی اور سال گزرنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔

حنفیہ کی رائے مالکیہ سے مختلف ہے۔ وہ معدن کو زرعی زمین کے بجائے دفینہ کے حکم میں رکھتے ہیں اور جو یافت ہو اس میں سے پانچواں حصہ لیتے ہیں۔ وہ نہ تو نصاب کی شرط مانتے ہیں اور نہ سال گزرنے کی۔ میرے نزدیک دفینہ جنگ کے مال غنیمت کی طرح ایک اتفاقی دولت ہے۔ اس کے برعکس معدن کی تہہ پر سرمایہ لگانا پڑتا ہے۔ معدنیات نکالنے کے لیے مزدوروں اور کاریگروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح خاصی مشقت اور سرمائے کے صرف کے بعد یافت ہوتی ہے۔ شریعت کے اصولوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جن چیزوں کے حاصل کرنے پر بڑی لاگت آتی ہو تو اس میں زکوٰۃ کی مقدار کم ہوتی ہے اور جس میں لاگت نہ آتی ہو تو اس میں زکوٰۃ کی شرح زیادہ ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ میں حنفیہ کی رائے مجھے صائب نہیں معلوم ہوتی۔

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ وَعَنْ أَبِي سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ فِي الرِّكَازِ الْخُمُسُ

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دفینے میں پانچواں حصہ زکوٰۃ ہے﴾

وضاحت :

یہ روایت امام بخاری نے باب الزکاۃ الرکاز الخمس میں لی ہے۔

اس روایت کو نقل کر کے امام مالکؒ رکاز کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس بات میں اہل مدینہ میں کوئی اختلاف نہیں اور میں نے اہل علم سے سنا ہے کہ دفینہ وہ ہے جو جاہلیت کے دفینوں میں سے پایا جائے۔ جس کو پانے کے لیے نہ مال خرچ کرنا پڑے، نہ کوئی بڑی جدوجہد کرنی پڑے اور نہ کوئی ذمہ داری اٹھانی پڑے۔ رہی وہ چیز جس پر مال خرچ کرنا پڑے، بڑی محنت کرنی پڑے اور وہ کبھی مل جائے اور کبھی نہ ملے تو وہ رکاز نہیں۔

میرے نزدیک امام مالکؒ نے یہ فرق جو بیان کیا ہے درست ہے۔ مثال کے طور پر تیل کا کنواں کھودا جا رہا ہے۔ ممکن ہے تیل مل جائے لیکن اس کا بھی قوی امکان ہے کہ تیل نہ ملے تو یہ رکاز کے حکم میں نہ ہو گا بلکہ معادن میں شامل ہو گا۔ اس کے برعکس اگر دیوار کے لیے کھدائی کی جا رہی ہو اور زمین میں سے اشرفیوں کا صندوق نکل آئے جو بغیر اہتمام کے مل جائے تو یہ دفینہ کے حکم میں ہو گا۔ اس میں سے پانچواں حصہ زکوٰۃ کی مد میں لے لیا جائے گا۔

مَالَا زَكٰوةَ فِيهِ مِنَ التِّبْرِ وَ الْحَلْيِ وَالْعَنْبَرِ

سونے چاندی، زیور اور عنبر میں سے کن چیزوں میں زکوٰۃ نہیں

□ حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ الْقَاسِمِ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ كَانَتْ تَلِي بَنَاتِ اَخِيْهَا يَتَامٰى فِي حَجْرِهَا لَهُنَّ الْحَلْيُ فَلَا تُخْرِجُ مِنْ حَلْيِهِنَّ الزَّكَاةَ

﴿عبدالرحمٰن بن قاسم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کی زوجہ محترمہ، حضرت عائشہؓ، اپنے بھائی کی لڑکیوں کی متولیہ تھیں۔ وہ لڑکیاں یتیم اور ان کے زیر تولیت تھیں، حضرت عائشہؓ ان کے زیورات سے زکوٰۃ نہیں نکالتی تھیں﴾

وضاحت :

اس روایت کی رو سے مالکیہ پہننے کے زیورات میں زکوٰۃ نہیں مانتے۔ لیکن حنفیہ پہننے یا نہ پہننے کے زیورات میں فرق کے قائل نہیں۔ حنفیہ کا استدلال یہ ہے کہ قیموں کے مال میں سے متولی کو زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے، کیونکہ حضرت عائشہؓ خود قیموں کے مال میں سے زکوٰۃ ادا کیا کرتی تھیں۔ ان کا انحصار ابوداؤد کی اس روایت پر ہے جس کی حضرت عائشہؓ خود ہی راوی ہیں کہ ایک عورت نبی ﷺ کی خدمت میں آئی۔ اس نے اپنی بچی کو سونے کے کنگن پہنا رکھے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے پوچھا تم اس کی زکوٰۃ دیتی ہو، اس نے کہا نہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا، کیا تم چاہتی ہو کہ قیامت کے دن تم کو آگ کے کنگن پہنائے جائیں۔ اس پر اس خاتون نے کنگن بچی کے ہاتھ سے اتار کر پھینک دیے کہ یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے ہیں۔ اس روایت کی رو سے حنفیہ زیورات پر زکوٰۃ واجب قرار دیتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ قیاس کے خلاف ہے۔ استعمال کی جتنی چیزیں ہیں شریعت نے ان کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ سواری اور بار برداری کے گھوڑے، خچر، اونٹ، دودھ کے لیے پالی ہوئی بکری اور گائے پر زکوٰۃ نہیں تو آخر سونے اور چاندی میں کیا خاص بات ہے جب کہ الحلیۃ زینت یہ عورت کی ضروریات میں سے ہے۔ اسی طرح موتی، خوشبو اور عنبر وغیرہ میں زکوٰۃ نہیں۔

مالکیہ استعمال کے زیورات کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک صحیح مذہب یہی ہے۔ زیور پر زکوٰۃ اس وقت عائد ہو گی جب اس کا مقصد دولت کو ذخیرہ کرنا ہو۔ عید، بقر عید یا تقریبات پر پہننے کے زیورات سے زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ يُحَلِّي بَنَاتِهٖ وَ جَوَارِيَهُ الذَّهَبَ ثُمَّ لَا يُخْرِجُ مِنْ حُلِيِّهِنَّ الزَّكَاةَ

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنی بیٹیوں اور لونڈیوں کو سونے کے زیورات پہناتے تھے لیکن ان کے زیورات سے زکوٰۃ نہیں نکالتے تھے﴾

وضاحت :

اس اثر سے بھی مالکیہ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے اور حنفیہ کا مسلک درست معلوم نہیں ہوتا۔

امام مالک کا فتویٰ ہے کہ اگر کسی کے پاس کوئی گھڑا سونے یا چاندی کا ہو اور اس سے پینے کا کام نہ لیا جاتا ہو تو اس پر زکوۃ عائد ہو گی، الا آنکہ وہ نصاب سے کم ہو۔ امام مالک کے نزدیک اگر کوئی نوکا ہوا زیور ایسا ہو جس کی مالک اصلاح کرانا چاہتا ہو تو اس پر بھی زکوۃ نہیں کیونکہ یہ حکماً اس مال کے ہے جس پر زکوۃ نہیں ہوتی۔ اسی طرح امام مالک کہتے ہیں کہ موتی، خوشبو اور عنبر میں بھی زکوۃ نہیں کیونکہ یہ عورتوں کے استعمال کی چیزیں ہیں۔ اس معاملہ میں امام مالک کا فتویٰ احناف کے خلاف ہے لیکن میرے نزدیک یہ صحیح ہے۔

زَكٰوةُ اَمْوَالِ الْيَتَامٰى وَ التِّجَارَةُ لَهُمْ فِيْهَا

یتیموں کے مال کی زکوۃ اور ان کے لیے اس میں تجارت

□ حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ اتَّجِرُوْا فِي اَمْوَالِ الْيَتَامٰى لَا تَاْكُلُهَا الزَّكَاةُ۔

﴿امام مالک کو یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے اعلان فرمایا کہ یتیموں کے مال میں تجارت کرو تاکہ زکوۃ ان کو ختم نہ کر دے﴾

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ الْقَاسِمِ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّهٗ قَالَ كَانَتْ عَائِشَةُ تَلِيْنِي وَ اَخًا لِي يَتِيْمَيْنِ فِي حَجْرِهَا فَكَانَتْ تُخْرِجُ مِنْ اَمْوَالِنَا الزَّكَاةَ

﴿عبدالرحمٰن بن قاسم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ میری اور میرے بھائی کی متولیہ تھیں اور ہم ان کی گود میں پل رہے تھے۔ وہ ہمارے مال میں سے زکوۃ ادا کرتی تھیں۔﴾

اس اثر سے بھی اوپر والی روایت کی تائید ہو جاتی ہے۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ كَانَتْ تُعْطِي اَمْوَالَ الْيَتَامٰى الَّذِيْنَ فِي حَجْرِهَا مَنْ يَتَّجِرُ لَهُمْ فِيْهَا

﴿امام مالک کو یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عائشہؓ ان یتیموں کا مال جو ان کی تولیت میں تھے ایسے لوگوں کو

دیتی تھیں جو ان کے لیے ان اموال میں تجارت کریں۔﴾

وضاحت:

یہ بات قرآن سے بھی ثابت ہے اور عقلی طور پر بھی صحیح ہے کہ یتیموں کے ولی ان کا مال بڑھانے کی کوشش کریں۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ یتیم کا ولی از روئے شریعت مجاز ہے کہ تجارت کرے اور وہ نقصان کا ذمہ دار نہ ہو گا۔

یہ بات احناف کے مسلک کے خلاف ہے۔ وہ یتیم اور صغیر کے مال میں تجارت روا نہیں رکھتے۔ وہ زکوۃ کا مطلب مصرف لیتے ہیں جبکہ مصرف کے لیے زکوۃ کا لفظ درست نہیں۔ میرے نزدیک یتامیٰ کے مال میں سے زکوۃ ادا کی جانی چاہیے اور مال کو کاروبار میں لگا کر پروان چڑھانا چاہیے۔ یتامیٰ کے باغ یا کھیتی میں سے بھی زکوۃ دی جائے گی۔

زَكٰوةُ الْمِيْرَاثِ

ترکہ کی زکوۃ

ترکہ کی زکوۃ کے باب میں کوئی مرفوع حدیث یا اثر صحابہؓ نہیں۔ صرف امام مالکؒ کے فتوے ہیں۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص کی موت واقع ہو جائے اور اس نے اپنے مال کی زکوۃ ادا نہ کی ہو تو زکوۃ اس کے ثلث مال میں سے لے لی جائے، اس لیے کہ میت کے صرف ثلث مال میں ہی تصرف کیا جا سکتا ہے۔ باقی مال وارثوں کا حق ہے۔

میرے نزدیک میت کی دوسری وصیتیں اور فرض زکوۃ پر مقدم ہیں۔ زکوۃ کی ادائیگی کی وصیت اگر مرنے والے نے کی ہے تو وارثوں کو زکوۃ ادا کرنی ہو گی۔ لیکن اگر میت نے وصیت نہیں کی تو یہ ورثاء کے اوپر ہے۔ اگر وہ زکوۃ ادا کریں تو بہتر ہے اور اگر وہ ادا نہ کریں تو ان پر زکوۃ کی ادائیگی لازم نہیں کی جا سکتی۔ حکومت ان کی ملکیت وراثت میں تصرف نہیں کر سکتی۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ وارث کو جو مال ترکہ میں ملے تو اس پر زکوۃ اس وقت عائد ہو گی جب اس کی ملکیت پر ایک سال گزر جائے۔ اگر ترکہ میں اس کو زمین یا باغ یا فصل ملی ہے، تو جب فصل کٹنے پر اس سے عشر لیا جائے گا۔ میرے نزدیک یہ فتویٰ صحیح ہے۔

اَلزَّكَاةُ فِي الدَّيْنِ

قرض میں زکوٰۃ

❐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ اَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ كَانَ يَقُوْلُ: هٰذَا شَهْرُ زَكَاتِكُمْ فَمَنْ كَانَ عَلَيْهِ دَيْنٌ" فَلْيُؤَدِّ دَيْنَهُ حَتّٰى تَحْصُلَ اَمْوَالُكُمْ فَتُؤَدُّوْنَ عَنْهَا الزَّكٰوةَ۔

﴿سائب بن یزید کہتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفانؓ اعلان کیا کرتے تھے کہ ماہ زکوٰۃ آگیا ہے۔ جس کے ذمہ قرض ہو وہ ادا کردے تاکہ اس کا مال قرض سے آزاد ہو جائے اور تم اس میں زکوٰۃ ادا کر سکو﴾

وضاحت :

اس اثر کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تحصیل زکوٰۃ کے لیے ایک مہینہ مقرر تھا۔ اس عمل سے اصولی طور پر حولان حول کے مسائل بڑی حد تک حل ہو جاتے اور ضابطہ بندی ممکن ہو جاتی ہے۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَيُّوْبَ بْنِ اَبِي تَمِيْمَةَ السَّخْتِيَانِي اَنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِالْعَزِيْزِ كَتَبَ فِي مَالٍ قَبَضَهُ بَعْضُ الْوُلَاةِ ظُلْمًا يَاْمُرُ بِرَدِّهِ اِلٰى اَهْلِهٖ وَ يُؤْخَذُ زَكَاتُهُ لِمَا مَضٰى مِنَ السِّنِيْنَ ثُمَّ عَقَّبَ بَعْدَ ذٰلِكَ اَنْ لَّا يُؤْخَذَ مِنْهُ اِلَّا زَكٰوةٌ" وَاحِدَةٌ" فَاِنَّهُ كَانَ ضِمَارًا۔

﴿ایوب بن ابی تمیمہ سختیانی کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے کچھ مال کے بارے میں، جس پر ان کے تحصیلداروں نے زیادتی سے قبضہ کر لیا تھا، حکم دیا کہ مال ان کے مالکوں کو واپس کر دیا جائے اور اس میں سے پچھلے تمام سالوں کی زکوٰۃ کاٹ لی جائے۔ پھر فوراً ہی دوسرا حکم بھیجا کہ اس میں سے صرف ایک سال کی زکوٰۃ لی جائے کیوں کہ مال ضمار تھا یعنی ان کے قبضہ میں نہ تھا۔﴾

وضاحت :

ضمار اس مال کو کہتے ہیں جس کی وصولی مشتبہ ہو۔ مالک یہ نہ جانتا ہو کہ وہ وصول ہو گا یا نہیں۔ ایسے مال کے

بارے میں تین رائیں ہیں۔ ایک یہ کہ وصولی پر اس میں سے تمام سالوں کی زکوٰۃ لی جائے گی۔ دوسری یہ کہ صرف ایک سال کی زکوٰۃ لی جائے گی، جیسا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے رجوع کے بعد کیا۔ تیسری رائے یہ ہے کہ ایک سال کی زکوٰۃ بھی نہیں لی جائے گی بلکہ وصولی کے بعد ایک سال گزرنے پر زکوٰۃ ہو گی۔ کیونکہ یہ مال دراصل قرض کے حکم میں ہے جس پر وصولی کے بعد ایک سال گزرنا ضروری ہے۔ میری رائے میں تیسری صورت صحیح ہے اور یہی جمہور کی رائے بھی ہے۔ امام مالکؒ کی رائے میں ایک سال کی زکوٰۃ لی جائے گی۔ ان کا فتویٰ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے فتوے پر ہے۔

امام مالک کے فتوے :

امام مالکؒ سلیمان بن یسارؒ کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ وہ اس شخص پر زکوٰۃ عائد کرنے کا فتویٰ نہیں دیتے تھے جس کے پاس مال ہو لیکن اس کی مانند اس پر قرض بھی ہو۔ میرے نزدیک یہ فتویٰ درست ہے۔

امام مالکؒ صاحب قرض کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ شخص اس وقت تک زکوٰۃ ادا نہ کرے جب تک کہ قرض اس کو وصول نہ ہو جائے، خواہ اس پر کئی سال گزر جائیں۔ لیکن جب بھی قرض وصول ہو گا تو اس کے اوپر فوراً زکوٰۃ عائد ہو گی۔ میرے نزدیک اس صورت میں زکوٰۃ اس وقت تک نہ ہو گی جب تک کہ اس مال پر ایک سال نہ گزر جائے۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر قرض میں سے کچھ مال وصول ہو گیا لیکن وہ اتنا نہیں کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہو تو اگر صاحب مال کے پاس اور مال بھی ہو جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو وہ اس مال کے ساتھ اس کی بھی زکوٰۃ ادا کرے گا۔ میرے نزدیک یہ ایک واضح بات ہے۔

امام مالکؒ کے نزدیک اس بات کی دلیل کہ کئی سالوں کے بعد وصول ہونے والے قرض پر صرف ایک ہی زکوٰۃ ہو گی، یہ ہے کہ جس مال کی زکوٰۃ واجب ہو وہ صرف اسی مال ہی میں سے نکالی جائے گی، دوسرے مال میں سے نہیں نکالی جائے گی، جس طرح تجارتی سامان کسی کے پاس کئی سال رہتا ہے لیکن جب وہ اس کو بیچتا ہے تو اس پر صرف ایک ہی زکوٰۃ واجب ہے۔ میرے نزدیک یہ دلیل صحیح نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ مال کی زکوٰۃ صرف اسی مال ہی میں سے نکالی جائے۔ معاملہ یکطرفہ نہیں چل سکتا۔ زکوٰۃ جنس کا خیال رکھتے ہوئے دوسرے مال سے بھی نکالی جا سکتی ہے۔ گندم یا

جو دونوں ہوں تو گندم کی زکوٰۃ جو سے بھی پوری کرلی جائے گی۔ اسی طرح بھیڑوں کی زکوٰۃ بکریوں سے لی جاسکتی ہے۔

اس سامان تجارت کے متعلق جو کئی سال تک بچا نہیں گیا امام مالکؒ بیچنے پر ایک زکوٰۃ کے قائل ہیں۔ امام مالکؒ کا یہ فتویٰ بھی محل نظر ہے۔ اس سے احتکار کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک اس صورت میں مال کے مالک کو مجبور کرنا ہوگا کہ باوجود کوشش کے مال بک نہیں سکا۔ اگر وہ مجبور نہ کر سکے تو ہر سال کی زکوٰۃ وضع کی جائے گی۔ جمہور کا مذہب بھی یہی ہے۔

زَكَاةُ الْعُرُوضِ

سامان تجارت میں زکوٰۃ

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ زُرَيْقِ بْنِ حَيَّانَ وَ كَانَ زُرَيْقٌ عَلَى جَوَازِ مِصْرَ فِي زَمَانِ الْوَلِيْدِ بْنِ عَبْدِالْمَلِكِ وَ سُلَيْمَانَ وَ عُمَرَ بْنِ عَبْدِالْعَزِيْزِ فَذَكَرَ اَنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِالْعَزِيْزِ كَتَبَ اِلَيْهِ اَنِ انْظُرْ مَنْ مَرَّبِكَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَخُذْ مِمَّا ظَهَرَ مِنْ اَمْوَالِهِمْ مِمَّا يُرِيْدُوْنَ مِنَ التِّجَارَاتِ مِنْ كُلِّ اَرْبَعِيْنَ دِيْنَارٍ دِيْنَارًا فَمَا نَقَصَ فَبِحِسَابِ ذٰلِكَ حَتّٰى يَبْلُغَ عِشْرِيْنَ دِيْنَارًا، فَاِنْ نَقَصَتْ ثُلُثَ دِيْنَارٍ فَدَعْهَا وَلَا تَاْخُذْ مِنْهَا شَيْئًا، وَ مَنْ مَرَّبِكَ مِنْ اَهْلِ الذِّمَّةِ فَخُذْ مِمَّا يُرِيْدُوْنَ مِنَ التِّجَارَاتِ مِنْ كُلِّ عِشْرِيْنَ دِيْنَارًا دِيْنَارًا فَمَا نَقَصَ فَبِحِسَابِ ذٰلِكَ حَتّٰى يَبْلُغَ عَشَرَةَ دَنَانِيْرَ، فَاِنْ نَقَصَتْ ثُلُثَ دِيْنَارٍ فَدَعْهَا وَلَا تَاْخُذْ مِنْهَا شَيْئًا وَاكْتُبْ لَهُمْ بِمَا تَاْخُذُ مِنْهُمْ كِتَابًا اِلٰى مِثْلِهِ مِنَ الْحَوْلِ۔

﴿زریق بن حیان سے روایت ہے۔ اور یہ زریق مصر کے محصولات کے لوے پر ولید بن عبدالملک، سلیمان اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں تعینات تھے۔ وہ ذکر کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان کو ہدایت کی کہ جو مسلمان تمہارے پاس سے گزرے تو ان کے ظاہر اموال میں سے جو وہ تجارت کے لیے لے کر نکلے ہیں، ہر چالیس دینار کے بدلے ایک دینار وصول کرو اور اگر کم ہو تو

اسی حساب سے کم کر دو، یہاں تک کہ بیس دینار رہ جائیں۔ جب وصولی کم ہو کر ایک تہائی دینار رہ جائے تو چھوڑ دو اور کچھ نہ لو۔ اور اہل ذمہ میں سے جو شخص مال تجارت لے کر گزرے تو ان سے بیس دینار میں سے ایک دینار لو۔ اور اگر کم ہو تو اسی حساب سے کم لو یہاں تک کہ دس دینار رہ جائیں اور جب وصولی کم ہو کر ایک تہائی دینار تک رہ جائے تو چھوڑ دو اور کچھ نہ لو، اور جو کچھ ان سے وصول کرو اس کی رسید لکھ دو۔﴾

وضاحت:

عروض - مَا يُعْرَضُ لِلْبَيْعِ - یعنی وہ چیز جو فروخت کے لیے پیش کی جائے۔ یہ ان اموال سے متعلق ہے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائے جاتے ہیں۔ مقامی دکانوں کے اموال اس سے الگ ہیں۔

جواز - اس لوے کو کہتے ہیں جہاں محصول وغیرہ وصول کیا جاتا ہے، جیسے ہمارے ہاں محصول چونگی کا نظام ہے یا دوسرے ٹیکس وصول کرنے کے لیے دفاتر ہوتے ہیں۔

اگر یہ روایت صرف ولید بن عبدالملک اور سلیمان کے زمانے کے متعلق ہوتی تو امام مالکؒ غالباً اس کو یہاں نہ لاتے لیکن چونکہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی حیثیت خلیفہ راشد کی ہے اس لیے ان کا یہ اثر یہاں لائے ہیں۔ روایت کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ البتہ اس میں کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا حل ضروری ہے۔ میرے نزدیک تجارتی مال پر بھی زکوٰۃ کے دو ضابطے مقدم ہوں گے۔ پہلا یہ کہ مال تجارت نصاب سے زائد ہو۔ دوسرا یہ کہ اس پر ایک سال گزر چکا ہو۔ اگر یہ دونوں شرائط موجود نہ ہوں تو زکوٰۃ کی مد میں تاجر سے کچھ وصول نہیں کیا جائے گا۔

مال کے بقدر نصاب ہونے کا اندازہ کرنا تو کچھ مشکل نہیں البتہ حولان حول کے بارے میں آسانی اسی میں ہے کہ مال کے مالک کی تصدیق معتبر مانی جائے الا یہ کہ مصدق ثابت کر دے کہ یہ شخص جھوٹا ہے۔ آج کل یہ مسئلہ ٹیکس کی رسید دیکھنے سے حل ہو سکتا ہے۔ اہل ذمہ کے لیے رسید جاری کرنے کا حکم اس روایت میں بھی دیا گیا ہے۔ ایسی رسید مسلمانوں کو بھی جاری کی جاسکتی ہے تاکہ حولان حول کا جھگڑا نہ پیدا ہو۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم میں اہل ذمہ کے بارے میں فرق ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ان کے لیے نصاب نصف ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں ان

کو زکوٰۃ سے دوگنا دینا پڑے گا۔ یہ مسئلہ آج کل مشکلات پیدا کر سکتا ہے کیونکہ اقلیتوں کے لیے مالیات اور محصولات کا الگ نظام قائم کرنا پڑے گا۔ فقہا کہتے ہیں کہ امیر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اہل ذمہ پر بھی زکوٰۃ عائد کر دے لیکن وہ دوگنی ہوگی۔ اس کی دلیل صرف یہ ہے کہ ان کے نزدیک اس کا امیر کو اختیار ہے۔ میرے نزدیک یہ امر صرف امیر کی صوابدید پر ہونے کے لیے کوئی نص موجود نہیں، لہٰذا دوہز کوٰۃ کے برابر جزیہ بھی لگا سکتا ہے تاکہ تمام لوگوں کے لیے ایک ہی نظام ہو لیکن دوہز کوٰۃ سے کم نہیں لگا سکتا کیونکہ اس سے بیت المال کو نقصان ہوتا ہے۔

اہل ذمہ دو قسم کے ہیں۔ ایک مفتوح دوسرے معاہد۔ ہمارے ہاں کے اہل ذمہ معاہد ہیں کیونکہ ملک کی تقسیم ایک معاہدے کے تحت ہوئی ہے۔ صرف پرسنل لاء میں وہ آزاد ہیں۔ مالی معاملات میں جو ٹیکس بھی نافذ ہوں گے وہ ان کو ادا کریں گے۔ زکوٰۃ کے بدلے ان سے جو کچھ وصول کیا جائے وہ جزیہ ہے اور مسلمانوں سے جو وصول کیا جائے وہ زکوٰۃ ہوگی۔ دونوں کے مصارف ایک ہو سکتے ہیں۔ زکوٰۃ کے مصارف میں ایک حصہ مؤلفۃ القلوب کا بھی ہے۔ یہ خاص طور پر غیر مسلموں کے لیے ہے۔ جب ان کو اپنے ساتھ ہموار رکھنے کے لیے اور ان کی دشمنی سے بچنے کے لیے ہم زکوٰۃ میں سے خرچ کر سکتے ہیں تو دوسرے مصارف پر بدرجہ اولیٰ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا تمام ملک میں سب کے لیے ایک ہی نظام رائج کیا جا سکتا ہے۔

امام مالک کے فتوے :

اس باب کے آخر میں امام مالکؒ نے اپنے بعض فتوے نقل کیے ہیں۔ مثلاً یہ کہ :

اموال تجارت میں سے اگر مالک نے زکوٰۃ ادا کر دی، پھر اس مال کو فروخت کر کے اس سے کپڑے، غلام یا دوسرا مال خرید لیا تو اگر وہ اس مال کو فروخت کرے گا تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جب تک کہ اس پر ایک سال نہ گزر جائے۔ اگر وہ کئی سال تک سامان نہ بیچ پائے تو اس پر زکوٰۃ نہ ہوگی اگرچہ زمانہ بہت طویل ہو جائے۔ جب بھی وہ فروخت کرے گا اس پر ایک ہی زکوٰۃ ہوگی۔ میرے نزدیک امام مالکؒ کی رائے کا آخری حصہ اس اتصال کے ساتھ درست نہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اس سے احتکار کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ تاجر مال کو روک کر بازار کے بھاؤ کو اوپر چڑھا سکتا ہے، مال کے ساتھ بازی کھیل سکتا ہے اور لوگوں کو مصیبت میں ڈال سکتا ہے۔ تاجر اگر واقعی مال فروخت نہ کر پائے تو اس کو یہ بات تحصیلدار کے سامنے ثابت کرنی ہوگی۔ بیرونی تجارت میں تو سب کو معلوم ہوتا

ہے کہ فلاں کمپنی نے مال نہیں اٹھایا یا جہاز والوں سے معاملہ طے نہ ہو سکا۔ غرض جتنی مشکلیں ہیں دور نہیں ہو سکتیں۔ لیکن اندرون ملک تجارت میں ایسے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں جن میں احتکار کر کے اشیائے صرف کی مصنوعی قلت پیدا کی جا سکتی ہے۔ تاجروں کے اس عمل کا تدارک حکومت کو کرنا ہوگا۔

اگر ایک شخص سونے اور چاندی سے قطعہ یا کھجور یا دوسرا سامان خریدتا ہے، پھر اس کو روک لیتا ہے یہاں تک کہ اس پر ایک سال گزر جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کو فروخت کرتا ہے تو اس پر زکوٰۃ اس وقت عائد ہوگی جب وہ مال فروخت کرے گا، بشرطیکہ اس کی قیمت بقدر نصاب ہو۔

اگر کسی تاجر کے پاس مال تجارت ہو یا دکان میں مال ہو لیکن اس کی فروخت سے بیک وقت اس قدر نقد نہیں ملتا جس پر زکوٰۃ واجب ہو تو وہ سال میں ایک ماہ مقرر کرے گا جس میں وہ مال تجارت کی قیمت لگائے گا اور جو نقد اور سونا چاندی اس کے پاس ہوگا ان سب کو ملا کر اگر اتنا ہو جائے کہ جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔

یہ عام دکانداروں کا معاملہ ہے جن کی پھٹکل آمدنی تو ہوتی ہے لیکن اتنی نہیں کہ زکوٰۃ واجب ہو۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ کمپنیوں کے حساب میں سے تمام حاصل شدہ رقوم اور مال کا حساب لگا کر زکوٰۃ کاٹی جا سکتی ہے۔

مَاجَاءَ فِي الْكَنْزِ

کنز کے بارے میں روایات

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ أَنَّهُ قَالَ: سَمِعْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ وَهُوَ يُسْأَلُ عَنِ الْكَنْزِ مَا هُوَ، فَقَالَ هُوَ الْمَالُ الَّذِي لَا تُؤَدَّى مِنْهُ الزَّكَاةُ۔

﴿عبداللہ بن دینار سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو فرماتے سنا۔ جب ان سے سوال کیا گیا کہ کنز کیا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ کنز وہ مال ہے جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہو۔﴾

وضاحت :

"کنز" کا مطلب ہے مال جمع کرنا، خواہ گھر میں جمع کریں یا بنک میں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ سوال سورہ توبہ میں وارد کنز کے لفظ کی تفسیر کے بارے میں کیا گیا تھا۔ انہوں نے اس کی وضاحت یوں کی کہ کنز وہ مال ہے جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہو یعنی اگر کسی نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کر دی تو اب اس کو وہ جہاں چاہے رکھے، سرکاری حق اس سے ادا ہو گیا۔ اب مال جمع کرنے پر اس سے کوئی باز پرس نہ ہو گی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا جواب صرف ایک پہلو کو بیان کرتا ہے یعنی یہ کہ زکوٰۃ دینے والا سرکاری حق سے بری ہو جائے گا۔ اس طرح وہ قانون کی گرفت سے چھوٹ جائے گا۔ اس جواب میں یہ پہلو بیان ہونے سے رہ گیا ہے کہ اس کے بعد اگر وہ مال کو بنک میں جمع کر دے تو انفاق کی ذمہ داریوں سے بری نہیں ہو جائے گا اور اس کے ثواب اور اجر سے محروم رہے گا۔ متعدد اکابر صحابہ کا یہی مسلک رہا ہے۔ حضرت علیؓ اور ابوذر غفاریؓ اس مسلک کے قائل ہونے میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔

میرے نزدیک قرآن مجید کی سورہ توبہ آیت ۳۴ کی یہ تفسیر صحیح نہیں۔ آیت میں ہے وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ (اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے) الفاظ یہ نہیں ہیں کہ لَا يُؤَدُّونَ الزَّكٰوةَ (زکوٰۃ ادا نہیں کرتے) جہاں تک انفاق کا تعلق ہے وہ انہی شرائط کے ساتھ مطلوب ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔ یعنی یہ ضروری ہے کہ آدمی مال کفایت شعاری سے خرچ کرے۔ کسی فضول کام میں خرچ نہ کرے۔ اس میں بندوں کے حقوق ادا کرے۔ ان کو دینے کے بعد احسان نہ جتائے اور اس کے بدلے میں جزا یا شکریہ کی بھی تمنا نہ کرے۔ مزید برآں اس مال کو صحیح جگہوں پر خرچ کرے۔ اس کو جمع نہ کرے۔ مال کو جمع کیا جائے تو یہ فاسد خون ہے جس سے فساد ہی پیدا ہو گا۔ ان شرائط کے ساتھ انفاق کرنے والے لوگوں کے بارے میں ہے کہ ان کو جنت عطا کی جاتی ہے اور ان کا صلہ جنت ہے۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِيْنَارٍ عَنْ اَبِي صَالِحٍ السَّمَّانِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ مَنْ كَانَ عِنْدَهٗ مَالٌ لَمْ يُؤَدِّ زَكَاتَهٗ مُثِّلَ لَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شُجَاعًا اَقْرَعَ لَهٗ زَبِيْبَتَانِ يَطْلُبُهٗ حَتّٰى يُمَكِّنَهٗ يَقُوْلُ لَهٗ اَنَا كَنْزُكَ۔

﴿حضرت ابوہریرہؓ فرماتے تھے کہ جس کے پاس مال رہا ہو اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی ہو تو اس کا

مال قیامت کے روز ایک گنجے زہریلے سانپ کی مانند ہو گا جس کی آنکھوں کے پاس منتے کی طرح نشان ابھرے ہوں گے۔ وہ اس کو طلب کرے گا یہاں تک کہ وہ اس کو قابو میں کر لے گا اور کہے گا میں ہوں جناب کا مال۔﴾

وضاحت:

حضرت ابوہریرہؓ کی رائے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی رائے کی مانند ہے۔ میری رائے میں مال کی ساری ہی قسمیں انفاق سے ہیں۔ سورہ مزمل میں ہے کہ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا۔ (اور نماز کا اہتمام رکھو، زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کو قرض دو قرض اچھا) اگر زکوٰۃ ادا کرنے پر مال کا حق ادا ہو جاتا تو اٰتُوا الزَّكٰوةَ کے بعد اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا کہنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ یہ بات درست ہے کہ مال کی زکوٰۃ ادا ہو جانے کے بعد سوسائٹی اس میں مداخلت نہیں کر سکتی لیکن اللہ تعالیٰ کے حقوق اس میں ختم نہیں ہوتے۔

میرے نزدیک مال کو جمع کر کے رکھنا ناجائز ہے۔ کاروباری دولت جائز ہے اس لیے کہ وہ معاشرے کا حق ادا کر رہی ہے۔ وہ ہر وقت خطرے میں ہوتی ہے۔ مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ کا مقابلہ کرتی ہے اور لوگوں کو ضرورت کی چیزیں مہیا کر رہی ہوتی ہے۔ جو دولت بنک میں یا تجوریوں میں جمع ہے یا زمین میں گاڑی ہوئی ہے وہ سب کنز کے تحت آتی ہے۔ تمام صحابہ کرام کا یہی مذہب ہے اور قرآن کے مطابق ہے۔

صَدَقَةُ الْمَاشِيَةِ

جانوروں کی زکوٰۃ

□ حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ قَالَ: قَرَاْتُ كِتَابَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فِي الصَّدَقَةِ۔ قَالَ فَوَجَدْتُ فِيْهِ:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ كِتَابُ الصَّدَقَةِ: فِي اَرْبَعٍ وَّعِشْرِيْنَ مِنَ الْاِبِلِ فَدُوْنَهَا الْغَنَمُ فِي كُلِّ خَمْسٍ شَاةٌ وَ فِيْمَا فَوْقَ ذٰلِكَ اِلٰى خَمْسٍ وَّ ثَلَاثِيْنَ اِبْنَةُ مَخَاضٍ، فَاِنْ لَّمْ تَكُنِ اِبْنَةُ

مَخَاضٍ فَابْنُ لَبُونٍ ذَكَرٌ، وَ فِيمَا فَوْقَ ذٰلِكَ إِلٰى خَمْسٍ وَّ اَرْبَعِيْنَ بِنْتُ لَبُونٍ، وَ فِيمَا فَوْقَ ذٰلِكَ إِلٰى سِتِّيْنَ حِقَّةٌ طَرُوْقَةُ الْفَحْلِ، وَ فِيمَا فَوْقَ ذٰلِكَ إِلٰى خَمْسٍ وَّ سَبْعِيْنَ جَذَعَةٌ، وَ فِيمَا فَوْقَ ذٰلِكَ إِلٰى تِسْعِيْنَ اِبْنَتَا لَبُوْنٍ، وَ فِيمَا فَوْقَ ذٰلِكَ إِلٰى عِشْرِيْنَ وَ مِائَةٍ حِقَّتَانِ طَرُوْقَتَا الْفَحْلِ فَمَا زَادَ عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الْاِبِلِ فَفِي كُلِّ اَرْبَعِيْنَ بِنْتُ لَبُوْنٍ، وَ فِي كُلِّ خَمْسِيْنَ حِقَّةٌ وَ فِي سَائِمَةِ الْغَنَمِ اِذَا بَلَغَتْ اَرْبَعِيْنَ إِلٰى عِشْرِيْنَ وَ مِائَةِ شَاةٌ وَ فِيمَا فَوْقَ ذٰلِكَ إِلٰى مِائَتَيْنِ شَاتَانِ وَ فِيمَا فَوْقَ ذٰلِكَ إِلٰى ثَلَاثِمِائَةٍ ثَلَاثُ شِيَاهٍ فَمَا زَادَ عَلٰى ذٰلِكَ فَفِي كُلِّ مِائَةٍ شَاةٌ، وَلَا يُخْرَجُ فِي الصَّدَقَةِ تَيْسٌ وَلَا هَرِمَةٌ، وَلَا ذَاتُ عَوَارٍ اِلَّا مَاشَاءَ الْمُصَدِّقُ، وَلَا يُجْمَعُ بَيْنَ مُفْتَرِقٍ وَلَا يُفَرَّقُ بَيْنَ مُجْتَمِعٍ خَشْيَةَ الصَّدَقَةِ وَمَا كَانَ مِنْ خَلِيْطَيْنِ فَاِنَّهُمَا يَتَرَاجَعَانِ بَيْنَهُمَا بِالسَّوِيَّةِ وَ فِي الرِّقَةِ اِذَا بَلَغَتْ خَمْسَ اَوَاقٍ رُبْعُ الْعُشْرِ۔

﴿امام مالکؒ کہتے ہیں کہ میں نے صدقہ کے بارے میں حضرت عمر بن خطابؓ کا خط پڑھا تو وہ یوں تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ کتاب الصدقہ۔ چوبیس یا اس سے کم اونٹوں پر ہر پانچ اونٹ کے لیے ایک بکری اور اس کے اوپر ۳۵ اونٹوں تک اونٹنی کا وہ مادہ بچہ جو دوسرے سال میں ہو یا کچھ زیادہ۔ اور اگر ایسا بچہ نہ ہو تو وہ بچہ جو تیسرے سال میں ہو اور نر ہو۔ اور اس سے اوپر ۴۵ تک تین سال کا مادہ بچہ۔ اور اس سے اوپر ساٹھ تک جوان اونٹنی جو حاملہ ہونے کے قابل ہو اور اس سے اوپر ۷۵ تک جوان اونٹ اور اس سے اوپر ۹۰ تک تین سال کے دو مادہ بچے۔ اور اس سے اوپر ۱۲۰ تک دو جوان اونٹنیاں حاملہ ہونے کے قابل۔ اور اس کے اوپر جو اونٹ زیادہ ہوں تو ہر چالیس پر ایک تین سال کا مادہ بچہ اور ہر پچاس پر ایک جوان اونٹنی۔ اور بکریوں میں جب ان کی تعداد چالیس تک پہنچ جائے تو ۱۲۰ تک ایک بکری اور اس سے اوپر ۲۰۰ تک دو بکریاں اور اس سے اوپر ۳۰۰ تک تین بکریاں اور اس سے اوپر ہر ایک سو پر

ایک بکری۔ اور صدقے میں ساٹھ بکرا، بوڑھی اور عیب دار بکری یا اونٹنی نہیں لی جائے گی مگر یہ کہ تحصیل دار چاہے اور زکوٰۃ کے ڈر سے نہ الگ الگ گلوں کو یکجا کیا جائے گا اور نہ مجتمع گلوں کو الگ الگ کیا جائے گا اور جو خلطین کے درمیان ہو گی تو وہ آپس میں برابر تقسیم کر لیں گے اور چاندی جب پانچ اوقیہ ہو تو اس پر چالیسواں حصہ زکوٰۃ ہو گی۔﴾

وضاحت:

"ابنۃ مخاض" اونٹ کا وہ بچہ جو دوسرے سال میں ہو لیکن ابھی تیسرے میں داخل نہ ہوا ہو۔

"ابن لبون" اونٹ کا وہ نر بچہ جو تیسرے سال میں ہو۔

"حقۃ" جوان اونٹنی

"طروقۃ الفحل" وہ اونٹنی جو حاملہ ہونے کی صلاحیت کو پہنچ جائے۔

"جذعۃ" جوان اونٹ

"تیس" ساٹھ جو تاسل کے لیے پالا جاتا ہے۔

"ھرمۃ" بوڑھی اونٹنی یا بکری

"ذات عوار" عیب دار یعنی جس کی ایک آنکھ یا کان یا سینگ یا ٹانگ خراب ہو وغیرہ۔

"خلیطین" جب دو یا زیادہ مالکوں کا مال ممیز ہو لیکن گھاٹ، غلہ، ساٹھ، ڈیرہ اور چرواہا ایک ہی ہو تو وہ خلیط کے حکم میں ہیں۔ مال ممیز نہ ہو تو شریک ہوں گے۔

"رقۃ" چاندی کو کہتے ہیں۔

یہ روایت اگرچہ موقوف کے درجے میں ہے لیکن نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کی رو سے کہ علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین (میری سنت اور خلفائے راشدین کے طریقے کو لازم پکڑنا) اس کو سنت کا درجہ حاصل ہے۔ کیونکہ یہ حضرت عمر بن خطابؓ کے خط کے مندرجات ہیں اور اس لحاظ سے یہ ہدایات اسلامی نظام کا جزو ہیں۔

اونٹوں کا نصاب پانچ اونٹ ہے جس کی زکوۃ ایک بکری ہے۔ جوں جوں اونٹوں کی تعداد میں اضافہ ہو گا زکوۃ کے جانور کی نوعیت بدلتی جائے گی جو روایت میں بالکل واضح ہے۔ اونٹوں یا بکریوں کے شمار میں ان کا بڑا یا چھوٹا ہونا خارج از بحث ہے۔

مالکیہ کے نزدیک اگر زکوۃ دینے والے کے پاس مطلوبہ قسم کی اونٹنی گلے میں موجود نہ ہو تو اس کو خرید کر دینی پڑے گی۔ دوسرے فقہاء کا بھی یہی مسلک ہے۔ میرے نزدیک یہ درست نہیں۔ مطلوبہ قسم کی اونٹنی کی نایابی کی صورت میں اس کی بازاری قیمت زکوۃ میں ادا کی جا سکتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذؓ کو جو ہدایت فرمائی تھی کہ غلے میں سے غلہ اور جانوروں میں سے جانور لو تو وہ در حقیقت لوگوں کی سہولت کے پیش نظر فرمائی تھی کیونکہ صحرا کی زندگی میں نقد ادائیگی مشکل تھی۔ اب اگر سہولت نقد ادائیگی میں ہے تو واجبی دام زکوۃ میں لیں گے اور زکوۃ دینے والوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ غلے اور مواشی کی بجائے ان کی نقد قیمت زکوۃ میں ادا کر دیں۔ قیمت کا تعین تحصیلدار کرے گا۔ اگر زیادتی کرے گا تو اوپر شکایت کی جا سکتی ہے۔

الا ماشاء المصدق کا تعلق صرف "ذات عوار" سے ہے۔ تیس اور هرمة سے نہیں۔ عیب اگر معمولی قسم کا ہو اور جانور کی قیمت پر کچھ زیادہ اثر انداز نہ ہوتا ہو تو ایسا جانور صدقہ میں لے لیا جائے گا۔ یہ تحصیلدار کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ساٹھ کو اس لئے نہیں لیا جائے گا کہ گلے کی نشوونما کا انحصار اس کے اوپر ہے۔

میرے نزدیک تحصیلدار چھانٹ کر اچھے جانور نہیں لے سکتا۔ جس نسل یا قسم کے جانور زیادہ تعداد میں ہوں گے ان ہی میں سے لے گا۔

اگر زکوۃ دینے والے کے کئی گلے الگ الگ ہوں تو وہ زکوۃ کی ادائیگی کے لیے ایک جگہ شمار نہ ہوں گے اور نہ ہی ایک جگہ کے اکٹھے گلوں کو زکوۃ کے لیے الگ کیا جائے گا۔

امام مالک کے فتوے :

امام مالک کا فتوی یہ ہے کہ اگر ایک شخص کے پاس دو الگ الگ چراہوں کی نگرانی میں بکریاں ہوں یا الگ الگ چراہوں کی نگرانی میں الگ مقامات یا شہروں میں ہوں تو مالک کے سامنے جمع کی جائیں گی اور وہ ان کی زکوۃ دے گا۔ میرے نزدیک اگر ایک تحصیل دار کے حلقے میں ایسا ہو تو جمع کی جا سکتی ہیں لیکن اگر تحصیلدار الگ ہوں تو ایسا کرنا

باعث زحمت ہے۔ اس لیے ان کو الگ الگ رکھنا چاہیے۔

خلیط ہونے کی صورت میں ہر مالک پر زکوۃ اس وقت عائد ہو گی جب اس کے گلے کی تعداد بقدر نصاب ہو گی۔ اگر کسی ایک خلیط کے گلے کی تعداد نصاب سے کم ہو گی تو اس پر زکوۃ نہیں ہو گی لیکن اگر گلے میں کئی شخص شریک ہوں تو جانوروں کی کل تعداد پر زکوۃ لی جائے گی جس کو شریک آپس میں شراکت کے تناسب سے تقسیم کر لیں گے۔

احناف کا مسلک بھی یہی ہے لیکن اہل حدیث اور شوافع کہتے ہیں کہ کل گلے کی تعداد پر زکوۃ عائد ہو گی، چاہے خلیط ہوں یا شریک۔ میرے نزدیک احناف اور مالکیہ کا مسلک صحیح ہے۔ جب مال معین ہو تو اس کی تعداد کے لحاظ سے نصاب کا تعین ہو گا۔ جب مال معین نہ ہو تو شراکت کے اصول کے تحت زکوۃ عائد ہو گی۔ شوافع کا مسلک کہ ہر شکل میں کل مال کے حساب سے زکوۃ لی جائے گی درست نہیں۔

امام مالک کا فتوی یہ ہے کہ اگر بھیڑیں بکریوں سے زیادہ ہوں اور صاحب مال پر ایک بکری سے زیادہ زکوۃ واجب نہ ہوتی ہو تو تحصیلدار ان بھیڑوں میں سے ایک بھیڑ لے لے گا۔ اور اگر بکریاں بھیڑوں سے تعداد میں زیادہ ہوں تو وہ ایک بکری لے گا اور اگر بھیڑ بکریاں تعداد میں برابر ہوں تو یہ تحصیلدار کی صوابدید پر ہو گا کہ بکری لے یا بھیڑ۔ یہی معاملہ اونٹوں کی مختلف اقسام جمع ہونے کی صورت میں ہو گا۔ میرے نزدیک یہ فتوی نہایت معقول ہے اور ہر نوع کے جانوروں کی زکوۃ میں اسی کو مد نظر رکھنا چاہیے۔

حضرت عمرؓ کا فرمان انہی جانوروں کے بارے میں ہے جو اس زمانے میں عربوں کے ہاں پالے جاتے تھے۔ اب صورت حال میں یہ فرق واقع ہو گیا ہے کہ ان کے علاوہ کئی انواع کے جانوروں کے فارم اور اصطبل قائم ہو چکے ہیں۔ ان جانوروں کا کاروبار نہایت منافع بخش ہے۔ میرے نزدیک ایک اسلامی حکومت ان تمام جانوروں پر جو تجارت کے لیے پالے جاتے ہیں زکوۃ عائد کرے گی۔

مَا جَاءَ فِي صَدَقَةِ الْبَقَرِ

گایوں کی زکوۃ کے بارے میں

حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ حُمَيْدِ بْنِ قَيْسٍ الْمَكِّيِّ عَنْ طَاوُسٍ الْيَمَانِيِّ أَنَّ مُعَاذَ بْنَ

جَبَلٍ الْاَنْصَارِیَّ اَخَذَ مِنْ ثَلَاثِیْنَ بَقَرَةً تَبِیْعًا وَمِنْ اَرْبَعِیْنَ بَقَرَةً مُسِنَّةً وَاُتِیَ بِهَا دُوْنَ ذٰلِكَ فَاَبٰی اَنْ یَّاْخُذَ مِنْهُ شَیْئًا - وَ قَالَ لَمْ اَسْمَعْ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِیْهِ شَیْئًا حَتّٰی اَلْقَاهُ فَاَسْئَلَهٗ فَتُوُفِّیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَبْلَ اَنْ یَقْدَمَ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ-

﴿طاؤس الیمانی روایت کرتے ہیں کہ معاذ بن جبل انصاریؓ نے تیس گائے بیل میں سے ایک بچہ لیا جس نے دودھ پینا ابھی چھوڑا تھا-اور چالیس گائے بیل میں ایک دو سالہ بچھڑی بطور زکوٰۃ وصول کی- اس تعداد سے کم گائے بیل لائے گئے تو انہوں نے کچھ لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں نے رسول اللہ سے اس بارے میں کچھ نہیں سنا-اس لیے میں اس وقت تک کچھ نہیں لوں گا جب تک کہ میں رسول اللہ ﷺ سے نہ ملوں اور ان سے پوچھ نہ لوں- معاذ بن جبلؓ کے رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے حضورؐ کا انتقال ہو گیا-﴾

وضاحت :

"تبیع" اس بچھ کو کہتے ہیں جس نے دودھ پینا چھوڑ دیا ہو-

"مسنۃ" اس دو سالہ بچھڑی کو کہتے ہیں جو بلوغ میں داخل ہو رہی ہو-

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ گائے بیل کا نصاب تیس گائے بیل ہے اور بھیڑ بکری کا چالیس ہے- آج کل گائے بیل کی ترقی یافتہ نسلیں ہالینڈ اور آسٹریلیا سے درآمد کی جاتی ہیں- سانہیوال کی بھینسیں اور بعض علاقوں کی گائے بیل خاص شہرت رکھتے ہیں-ان کی زکوٰۃ لیتے وقت تحصیلدار خیال رکھے گا کہ جس نسل کی تعداد زیادہ ہو گی اسی میں سے زکوٰۃ لے گا، جیسا کہ اوپر کی روایت میں بیان ہو چکا ہے-

امام مالکؒ کے فتوے :

امام مالک کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے پاس بھیڑیں بھی ہوں اور بکریاں بھی تو دونوں کو جمع کر کے زکوٰۃ لی جائے گی کیونکہ وہ سب غنم کے حکم میں ہیں- میرے نزدیک یہ درست ہے-

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے گلے میں اضافہ کرے، خواہ خرید کر یا جانوروں کی افزائش سے یا میراث ملنے سے، تو ان پر سال گزرنے سے پہلے زکوٰۃ نہ ہو گی- لیکن اگر وہ شخص پہلے ہی صاحب نصاب ہے تو وہ اضافہ شدہ جانوروں کی زکوٰۃ پہلے جانوروں کے ساتھ دے گا اگرچہ اس کے یہ جانور زکوٰۃ دینے کے ایک ہی روز پہلے پیدا ہوئے یا خریدے گئے ہوں-

امام مالکؒ کے نزدیک اونٹ جو ربط چلاتے ہوں اور بیل جن پر پانی کی مشکیں لاد کر لائی جاتی ہوں اور جو کھیتی کے کام میں آتے ہوں اگر وہ نصاب کی تعداد میں ہوں تو ان پر زکوٰۃ لی جائے گی- مثلاً اگر ایک اونٹ ربط چلاتا ہے اور دوسرے پالے ہوئے ہیں اگر یہ مل کر پانچ ہو جائیں تو زکوٰۃ لی جائے گی-ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے اونٹ کے ساتھ سائمہ کا ذکر نہیں کیا- صرف بکری کے ساتھ کیا ہے- میرے نزدیک زیادہ قرین صواب یہ ہے کہ بکری اور دوسرے جانوروں کو قیاس کیا جائے- تیز زکوٰۃ میں ایک اصول یہ مدنظر رکھا گیا ہے کہ استعمال کی جتنی چیزیں ہیں وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں- پہننے کے کپڑوں اور استعمال کے زیوروں پر زکوٰۃ نہیں- مزید ان زکوٰۃ ان چیزوں پر ہے جن میں نشوونما ہوتی ہو- وہ اونٹ یا بیل جو ربط چلاتا ہو یا بار برداری کے کام آتا ہو وہ نشوونما کے مقصد کے لیے بیکار ہو جاتا ہے اور اس کی مدد سے جس چیز کی نشوونما ہو رہی ہے اس میں سے زکوٰۃ الگ لی جا رہی ہے- اگر اونٹ ربط چلاتا ہے تو فصل میں اس کی محنت جذب ہو رہی ہے اور فصل میں سے زکوٰۃ لی جا رہی ہے-اس لیے جو جانور استعمال کے ہیں وہ زکوٰۃ کے اموال میں نہیں آتے- مالکیہ استعمال کے زیورات کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کرتے ہیں تو استعمال کے جانور بھی اسی اصول کے تحت زکوٰۃ کے اموال سے الگ ہونے چاہئیں-

مَا جَاءَ فِیْمَا یَعْتَدُّبِهٖ مِنَ السِّخْلِ فِی الصَّدَقَةِ

زکوٰۃ میں میمنوں کو شمار کرنے کے بارے میں روایت

حَدَّثَنِیْ یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ ثَوْرِ بْنِ زَیْدِ الدِّیْلِیِّ عَنِ ابْنِ لِعَبْدِاللّٰهِ بْنِ سُفْیَانَ الثَّقَفِیِّ عَنْ جَدِّهٖ سُفْیَانَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ بَعَثَهٗ مُصَدِّقًا فَكَانَ یَعُدُّ عَلَی النَّاسِ بِالسِّخْلِ، فَقَالُوْا اَتَعُدُّ عَلَیْنَا بِالسِّخْلِ وَلَا تَاْخُذُ مِنْهُ شَیْئًا ، فَلَمَّا قَدِمَ عَلٰی عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ ذَكَرَ لَهٗ

ذٰلِكَ، فَقَالَ عُمَرُ نَعَمْ تَعُدُّ عَلَيْهِمْ بِالسَّخْلَةِ يَحْمِلُهَا الرَّاعِيْ ، وَلَا تَأْخُذُهَا ، وَلَا تَأْخُذُ الْاَكُوْلَةَ، وَلَا الرُّبّٰى، وَلَا الْمَاخِضَ وَلَا فَحْلَ الْغَنَمِ، وَتَأْخُذُ الْجَذَعَةَ وَالثَّنِيَّةَ- وَذٰلِكَ عَدْلٌ بَيْنَ غِذَاءِ الْغَنَمِ وَ خِيَارِهٖ-

﴿سفیان بن عبداللہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ان کو تحصیلدار بنا کر بھیجا-وہ زکوۃ کے لیے بکریوں کے بچوں کو بھی شمار کرتے تھے-لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ بکریوں کے بچوں کو شمار کر لیتے ہیں لیکن زکوۃ کے طور پر ان کو قبول نہیں کرتے-جب سفیان حضرت عمرؓ کے پاس آئے تو ان سے اس بات کا ذکر کیا-اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہاں تم بکری کے بچوں کو شمار کیا کرو بشمول ان کے جن کو چرواہا اپنے کندھے پر اٹھائے ہو (یعنی جو ابھی بکری کے ساتھ چل بھی نہ سکتا ہو) لیکن ان کو زکوۃ میں نہ لو-اور نہ ہی اس بکری کو لو جو گوشت کھانے کے لیے تیار کی جا رہی ہو، نہ اس کو جو بچے کی پرورش کرتی ہو، نہ وہ جو گابھن ہو اور نہ ہی سانڈ زکوۃ میں لیا جائے گا-البتہ ایک سالہ اور دو سالہ بچے لیے جائیں گے اور یہی انصاف کا تقاضا ہے عام بکریوں اور اعلیٰ بکریوں کے درمیان﴾

وضاحت :

"السخلة" بکری کے چھوٹے بچے کو کہتے ہیں-

"الاکولۃ" اس بکری کو کہتے ہیں جس کا گوشت کھانے کے لیے اس کو موٹا کیا جا رہا ہو-

"الربّی" وہ بکری جو بچہ جن چکی ہو اور اب اس کی پرورش کر رہی ہو-

"الماخض" وہ گابھن بکری جو بچہ جننے والی ہو-

"الفحل الغنم" وہ سانڈ جو افزائش نسل کی غرض سے پالا جا رہا ہو-

اس روایت کا مفہوم واضح ہے-اس کی رو سے اصول یہ ہے کہ بچے نصاب پورا کرنے کے لیے تو شمار کیے جائیں گے لیکن ان کو زکوۃ میں وصول نہیں کیا جائے گا-اسی طرح سے وہ بکریاں جو کسی خاص مقصد کے لیے پالی جا رہی

ہوں زکوۃ میں وصول نہیں کی جائیں گی-غذاء الغنم سے عام بکریاں مراد ہیں اور خیارہ سے خاص اعلیٰ قسم کی بکریاں-انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے دونوں کے ایک سالہ اور دو سالہ بچے لیے جائیں گے-

اَلنَّهْيُ عَنِ التَّضْيِيْقِ عَلَى النَّاسِ فِي الصَّدَقَةِ

وصولی زکوۃ میں لوگوں کو تنگ کرنے کی ممانعت

☐ حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيٰى بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يَحْيٰى بْنِ حَبَّانَ عَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّهَا قَالَتْ: مُرَّ عَلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ بِغَنَمٍ مِنَ الصَّدَقَةِ فَرَاٰى فِيْهَا شَاةً حَافِلًا ذَاتَ ضَرْعٍ عَظِيْمٍ ، فَقَالَ عُمَرُ مَا هٰذِهِ الشَّاةُ؟ فَقَالُوْا شَاةٌ مِنَ الصَّدَقَةِ فَقَالَ عُمَرُ مَا اَعْطٰى هٰذِهِ اَهْلُهَا وَهُمْ طَائِعُوْنَ لَا تَفْتِنُوا النَّاسَ لَا تَاْخُذْ وَاحِدَاتِ الْمُسْلِمِيْنَ، نَكِّبُوا عَنِ الطَّعَامِ-

﴿حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ حضرت عمرؓ کے سامنے صدقہ کی بکریوں کا گزر ہوا تو انہوں نے ایک بکری دیکھی جو بڑے تھن والی دودھ سے لبریز تھی-اس پر حضرت عمرؓ نے کہا یہ بکری کیسی ہے؟ لوگوں نے کہا یہ بھی صدقہ کی بکری ہے-حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس کے مالکوں نے خوشی سے تو نہیں دی ہو گی-لوگوں کو فتنہ میں نہ ڈالو اور مسلمانوں کے عزیز مال نہ لو-لوگوں کی غذائی ضروریات لینے سے اجتناب کرو-﴾

وضاحت :

حضرت عمرؓ کا مطلب یہ تھا کہ غذائی ضروریات مثلاً دودھ وغیرہ کے لیے جو بکریاں پالی جاتی ہیں، زکوۃ کی وصولی میں ان کو ہاتھ نہ لگاؤ-عمدہ اور منتخب مال زکوۃ میں نہیں لیا جائے گا-کوئی مالک اپنی خوشی سے دیدے تو الگ بات ہے-

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ محمد بن مسلمہ انصاریؓ جب تحصیلدار کی حیثیت سے زکوۃ وصول کرنے جاتے تو صاحب

مال سے کہتے کہ اپنے مال کی زکوٰۃ نکالو۔ جو کچھ وہ پیش کرتا تو جس مقدار میں وہ سمجھتے کہ زکوٰۃ کا حق ادا ہو گیا تو اس کو قبول کر لیتے۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں پسندیدہ طریقہ یہی ہے کہ مسلمانوں پر زکوٰۃ کے بارے میں تشدد نہیں کرنا چاہیے اور جو مال وہ خوشی سے ادا کریں اس کو قبول کر لینا چاہیے، بشرطیکہ زکوٰۃ کا حق اس سے ادا ہو جاتا ہو۔

آخِذُ الصَّدَقَةِ وَمَا يَجُوْزُ لَهٗ اَخْذُهَا

صدقہ لینے والے کے لیے کیا لینا جائز ہے

□ حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ اِلَّا لِخَمْسَةٍ لِغَازٍ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ، اَوْ لِعَامِلٍ عَلَيْهَا اَوْ لِغَارِمٍ اَوْ لِرَجُلٍ اشْتَرَاهَا بِمَالِهٖ اَوْ لِرَجُلٍ لَهٗ جَارٌ مِسْكِيْنٌ فَتُصُدِّقَ عَلَى الْمِسْكِيْنِ فَاَهْدَى الْمِسْكِيْنُ لِلْغَنِيِّ۔

﴿عطاء بن یسار کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پانچ قسم کے آدمیوں کے سوا کسی غنی کے لیے صدقہ قبول کرنا جائز نہیں۔ پہلا وہ جو اللہ کی راہ میں جہاد کر رہا ہو، دوسرا تحصیل دار، تیسرا مقروض، چوتھا وہ جس نے اپنے مال کے عوض صدقہ کے جانور خرید لیے، پانچواں وہ شخص جس کا پڑوسی مسکین ہو اور مسکین کو جو کچھ صدقہ میں ملا ہو تو اس میں سے وہ غنی کو ہدیۃً دے دے۔﴾

وضاحت :

اس روایت میں دو صورتیں بیان ہوئی ہیں جن میں کوئی غنی آدمی بھی صدقہ کا مال حاصل کر سکتا ہے۔ اول اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے پر صدقہ کی رقم خرچ کی جا سکتی ہے۔ مثلاً صدقہ کی رقم سے کسی مجاہد کو گھوڑا، اسلحہ وغیرہ لے کر دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اب زمانہ سٹینڈنگ آرمی رکھنے کا ہے اس لیے یہ انفرادی مصرف ختم ہو چکا ہے۔ دوسرے تحصیل زکوٰۃ پر مقرر عملہ کی تنخواہ اموال صدقہ میں سے دی جا سکتی ہے، بشرطیکہ تحصیل زکوٰۃ کا کام حکومت کرتی ہو۔ تیسرے کسی مقروض کو قرض سے نجات دلانے کے لیے صدقہ کی رقم دے سکتے ہیں۔ چوتھے کوئی مال دار آدمی صدقے کے جانور خرید کر اپنے لیے پال سکتا ہے۔ پانچویں کسی شخص کے پڑوسی مسکین کو صدقے کے جانور ملیں اور

وہ اپنے پڑوسی مالدار کو یہ جانور ہدیہ میں دے دے تو اس کا ہدیہ قبول کرنا غنی کے لیے جائز ہو گا۔

آخر الذکر صورت کے جواز کا حکم حضرت بریرہؓ کی روایت سے بھی نکلتا ہے۔ وہ حضرت عائشہؓ کی لونڈی تھیں۔ ان کو صدقہ کا گوشت ملا تو انہوں نے حضرت عائشہؓ کے پاس ہدیۃً بھیج دیا۔ رسول اللہ ﷺ اس کو کھانے لگے۔ حضرت عائشہؓ نے آپ کو روکا کہ گوشت تو بریرہ کو صدقے میں ملا ہو گا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ لہا صدقۃ ولنا ھدیۃ (یہ اس کے لیے صدقہ ہے لیکن ہمارے لیے ہدیہ ہے)۔

یہ روایت کہ کسی سید کے لیے صدقہ لینا جائز نہیں تحقیق طلب ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مصلحت کی بنا پر نبی ﷺ نے اس کو ناجائز قرار دیا ہو کیونکہ اس کی ایک علت موجود تھی۔ یہود میں غربا و مساکین کے بجائے حضرت موسیٰ کا خاندان یعنی لاوی ہی تمام صدقات کا مرجع بن گیا تھا۔ ہو سکتا ہے اس صورت کو دوبارہ پیدا ہونے سے روکنے کے لیے آنحضرت ﷺ نے اپنی اولاد کے لیے صدقہ کو ممنوع قرار دے دیا ہو۔ یہ گویا سد ذریعہ کی مصلحت پیش نظر تھی۔ میرے نزدیک صدقہ کو ھی من اوساخ الناس (یہ لوگوں کا میل کچیل ہے) کی علت پر ممنوع قرار دینا درست نہیں معلوم ہوتا۔ اگر سید غریب ہوں تو ان کی مدد کی کیا صورت ہو گی؟ وہ کس بنا پر صدقات سے محروم رکھے جائیں گے؟

شوافع صدقات کو قرآن مجید کے بیان کردہ آٹھوں مصارف پر برابر خرچ کرنے کے قائل ہیں۔ ان کا یہ مسلک عربیت کے بھی خلاف ہے اور اس سوال کا جواب بھی نہیں دیتا کہ اگر کوئی مصرف معدوم ہو گیا ہو تو اس صورت میں کیا کیا جائے گا۔ جیسے کہ موجودہ زمانے میں غلامی کا نظام ختم ہو چکا ہے تو زکوٰۃ کا آٹھواں حصہ جو غلاموں کی آزادی کی مد کا ہے اس کو کہاں خرچ کیا جائے گا۔ میرے نزدیک جمع شدہ مال زکوٰۃ کو قرآن مجید کے بیان کردہ ہر مصرف پر بھی خرچ کیا جا سکتا ہے اور ایک مصرف کو دوسرے مصرف پر ترجیح بھی دی جا سکتی ہے۔ نیز جو مصرف معدوم ہو چکے ان پر اصرار کی کوئی وجہ نہیں۔ مالکیہ یہ کہتے ہیں کہ امیر کو اختیار ہے کہ وہ جس مد میں جتنا خرچ کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ موقف درست ہے۔ حکومت اگر مناسب خیال کرے تو فقرا اور مساکین پر صدقات کا کل کا کل کئی سال تک خرچ کر سکتی ہے جب کہ دوسری اصناف پر کچھ بھی خرچ نہ کرے۔ احناف اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ زکوٰۃ کو صرف ایک ہی مصرف پر بھی خرچ کیا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ بھی ٹھیک ہے۔

مَاجَاءَ فِي أَخْذِ الصَّدَقَاتِ وَ التَّشْدِيْدِ فِيْهَا

صدقے کی وصولی اور اس میں سختی کے بارے میں روایات

❐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ اَبَابَكْرٍ الصِّدِّيْقَ قَالَ لَوْ مَنَعُوْنِيْ عِقَالًا لَجَاهَدْتُهُمْ عَلَيْهِ۔

﴿امام مالک کو یہ بات پہنچی کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ لوگ اگر ایک رسی جانور بھی مجھ سے روکیں گے تو میں اس پر ان سے جہاد کروں گا۔﴾

وضاحت :

"عقال کے معنی اس رسی کے ہیں جس سے اونٹ باندھا جاتا ہے۔ اس لیے عام طور پر سیدنا ابوبکرؓ کے قول کے یہ معنی بیان کیے جاتے ہیں کہ اگر لوگ اونٹ باندھنے کی وہ رسی بھی جو وہ زکوٰۃ میں دیا کرتے تھے روکیں گے تو میں اس پر ان سے جہاد کروں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض الفاظ مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اور ان کا یہ استعمال نہایت معروف ہو جاتا ہے۔ یہی حال لفظ 'عقال' کا ہے۔ مجازی معنی میں اس کا اطلاق اس جنس پر ہوتا ہے جو اموال میں سے بطور زکوٰۃ وصول کر لی جاتی ہے اور اس کے بجائے نقد مال نہیں لیا جاتا۔ "المبرد" نے الکامل باب فی الخطاب فی اقوال عمر بن الخطابؓ میں لکھا ہے کہ مصدق اگر زکوٰۃ میں نقدی وصول نہ کرے بلکہ اسی مال میں سے جو اس کے سامنے پیش کیا جائے جنس وصول کرے تو کہا جاتا ہے کہ "اخذ عقالا"۔ اس نے کسی شاعر کا ایک شعر نظیر میں پیش کیا ہے۔

اتانا ابو الخطاب يضرب طبله

فردّ ولم ياخذ عقالا ولا نقدا

(ابو الخطاب جب ہمارے پاس ڈھول پیٹتا ہوا آیا تو اس کو لوٹا دیا گیا حالانکہ اس نے نہ کوئی جنس وصول کی تھی نہ نقدی)

میرے نزدیک یہ تحقیق صحیح ہے اور عقال سے مراد وہ جانور ہے جو صدقہ میں قبول کیا جائے۔ خواہ وہ اونٹ ہو یا گائے، بھیڑ ہو یا بکری۔ ہماری زبان میں بھی بعض الفاظ کا مجازی معنی میں استعمال معروف ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس ارشاد کا مفہوم سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کا یہ قول کس موقع کا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے خلافت پر متمکن ہونے کے بعد جب بعض قبائل نے اسلامی ریاست کو زکوٰۃ ادا کرنے سے

انکار کر دیا تو آپ نے ان کو بزور شمشیر مطیع کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے یہ رائے دی کہ مانعین زکوٰۃ اس قسم کے لوگ نہیں جن کے ساتھ ہمیں جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے نظم آیات سے استدلال کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کو قائل کیا کہ میں نماز اور زکوٰۃ میں تفریق نہیں کرنے دوں گا۔ جس طرح ایک منکر نماز اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اسی طرح زکوٰۃ کا منکر بھی اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اسی موقع پر آپ نے فرمایا کہ اگر ایک رسی جانور بھی کسی کے ذمہ ہو گا تو میں اس سے لڑ کر رہوں گا۔

ہمارے یہاں نظام زکوٰۃ کے نفاذ کے بعد حکومت نے بعض فرقوں کی اس بات کو معلوم نہیں کیسے گوارا کر لیا ہے کہ ہم اپنے مسلک فقہی کی رو سے حکومت کو زکوٰۃ دینا ضروری نہیں سمجھتے۔ شریعت کی رو سے ایسا کرنا درست نہیں۔ اس بارے میں صحیح موقف یہ ہے کہ یا تو یہ لوگ اسلامی ریاست کے حقوق بے کم و کاست ادا کریں ورنہ اقلیت کی حیثیت سے اپنے حقوق محفوظ کرا لیں۔ اقلیت کے حقوق میں بھی صرف پرسنل لا کی چیزیں ہوتی ہیں جس کے تحت ایک فریق کے شخصی اور ذاتی معاملات آتے ہیں۔ سٹیٹ سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ تعزیرات، حدود، شہادت وغیرہ ایسے معاملات ہیں جن میں اقلیت کو یہ حق نہیں ہوتا کہ وہ حکومت پر اپنی مرضی ٹھونسے۔ ان میں اکثریت کا مذہب چلتا ہے۔ جہاں تک اقلیت کا تعلق ہے یہ دوسرے درجے کے شہری ہوتے ہیں۔ اول درجے کے نہیں ہو سکتے۔ اگر کسی فرقہ کے لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تو وہ یہ کہنے کا حق نہیں رکھتے کہ ہم اپنی فقہ کے مطابق حکومت کو زکوٰۃ دینے کے پابند نہیں ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کا عزم تو یہ تھا کہ اگر لوگوں نے ایک جانور بھی روکا تو میں ان کے خلاف جہاد کروں گا۔ نفاذ دین میں یہی عزم رکھنا ہر حکومت کے فرائض میں سے ہے۔

اس بارے میں امام مالک کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے فرائض میں سے کسی فریضہ کی ادائیگی کو روکے اور مسلمان اس کا مطالبہ کرنے پر بھی اس کو حاصل نہ کر سکیں تو اس کے حصول کے لیے جہاد ان پر فرض ہو گا، جب تک کہ وہ اس سے فریضہ کا حساب نہ چکا لیں۔ اسی فتویٰ پر امت کا اجماع ہے۔ اس صورت میں حکومت جہاد کرے گی اور طاقت کے ذریعے اپنا حق وصول کرے گی۔

ہمارے ملک میں حکومت نے زکوٰۃ کے معاملہ میں جو کمزوری دکھائی ہے وہ بہت افسوسناک ہے۔

❐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ اَنَّهُ قَالَ: شَرِبَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لَبَنًا فَاعْجَبَهُ فَسَأَلَ الَّذِيْ سَقَاهُ مِنْ اَيْنَ هٰذَا اللَّبَنُ فَاَخْبَرَهُ اَنَّهُ وَرَدَ عَلٰى مَاءٍ قَدْ سَمَّاهُ فَاِذَا نَعَمٌ

مِنْ نَعَمِ الصَّدَقَةِ وَهُمْ يَسْقُوْنَ فَحَلَبُوْا لِيْ مِنْ اَلْبَانِهَا فَجَعَلْتُهُ فِيْ سِقَائِيْ فَهُوَ هٰذَا- فَاَدْخَلَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يَدَهُ فَاسْتَقَائَهُ-

﴿زید بن اسلمؒ روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دودھ پیا تو ان کو بہت پسند آیا- جس شخص نے دودھ پلایا تھا آپ نے اس سے پوچھا کہ یہ دودھ کہاں سے ملا- اس نے بتایا کہ فلاں چشمے پر مجھے جانا ہوا تو وہاں کچھ صدقے کے مویشی تھے جن کو لوگ پانی پلا رہے تھے- انہوں نے میرے لیے دودھ دوہا تو میں نے اس کو اپنے مشکیزہ میں ڈال لیا- یہ وہی دودھ ہے- حضرت عمرؓ نے اپنا ہاتھ منہ میں ڈال کر قے کرنا چاہی-﴾

وضاحت :

یہ غلبہ حال کی اسی طرح کی ایک مثال ہے جس طرح حضرت سلیمان نے گھوڑوں کے معائنہ کے دوران نماز عصر قضا ہونے پر گھوڑوں پر تلوار چلانی شروع کر دی تھی- اس سے حضرت سلیمان اور حضرت عمرؓ جیسے لوگوں کے مزاج کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شدید التاثر لوگ تھے- اس روایت سے ان کی شدت احتیاط ظاہر ہوتی ہے کہ وہ خلیفہ کی حیثیت سے بیت المال کی امانت کے بارے میں کس قدر محتاط تھے-

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عَامِلًا لِعُمَرَ بْنِ عَبْدِالْعَزِيْزِ كَتَبَ اِلَيْهِ يَذْكُرُ اَنَّ رَجُلًا مَنَعَ زَكٰوةَ مَالِهٖ، فَكَتَبَ اِلَيْهِ عُمَرُ اَنْ دَعْهُ وَلَا تَاْخُذْ مِنْهُ زَكٰوةً مَعَ الْمُسْلِمِيْنَ- قَالَ فَبَلَغَ ذٰلِكَ الرَّجُلَ فَاشْتَدَّ عَلَيْهِ وَ اَدّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ زَكَاةَ مَالِهٖ فَكَتَبَ عَامِلُ عُمَرَ اِلَيْهِ يَذْكُرُ لَهٗ ذٰلِكَ فَكَتَبَ اِلَيْهِ عُمَرُ اَنْ خُذْهَا مِنْهُ-

﴿حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ایک عامل نے ان کو یہ واقعہ لکھا کہ ایک شخص نے اپنے مال کی زکوٰۃ روک دی ہے تو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کو لکھا کہ اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو اور مسلمانوں کے ساتھ اس سے زکوٰۃ وصول نہ کرو- جب اس شخص کو یہ بات پہنچی تو اس پر سخت گراں گزری اور اس نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کر دی- عامل نے خلیفہ کو یہ صورت واقعہ لکھی تو حضرت عمر بن

عبدالعزیز نے عامل کو ہدایت کی کہ اس سے زکوٰۃ وصول کر لو﴾

وضاحت :

میرے نزدیک حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بہترین طرز عمل اختیار کیا- وہ یہ حکم بھی دے سکتے تھے کہ اس ہٹ دھرم شخص سے زبردستی زکوٰۃ وصول کرو لیکن انہوں نے اس کو سبق دینا پسند کیا- انہوں نے کہا کہ اس شخص کو مسلمانوں کے ساتھ شامل نہ کرو- اس حکم کا مطلب یہ تھا کہ جب اس شخص کے کسی حق کا معاملہ آئے گا تو اس سے غیر مسلموں جیسا سلوک کیا جائے گا کیونکہ ایک شخص اگر حکومت کا حق ادا نہیں کرتا تو حکومت اس کی جان، مال، ناموس یا کسی اور چیز کی ذمہ دار نہیں ہوتی، جب تک وہ حکومت کا حق ادا نہ کرے- وہ آدمی جلد ہی سمجھ گیا کہ نقصان کہاں تک جاتی ہے- اس نے زکوٰۃ خود جا کر جمع کرائی- اس طرح حضرت عمر ثانیؒ نے شدید ترین طرز عمل اختیار کیا اور ساتھ ہی تعلیم بھی دے دی تاکہ لوگ سمجھیں کہ ان کی ذمہ داریاں اور حقوق کیا ہیں-

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عامل کا طرز عمل بھی لائق تحسین ہے کہ اس نے جب تک خلیفہ سے اجازت نہیں لے لی اس وقت تک زکوٰۃ قبول نہیں کی-

زَكَاةُ مَا يُخْرَصُ مِنْ ثِمَارِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ

کھجوروں اور انگوروں کے تخمینہ سے زکوٰۃ

☐ حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنِ الثِّقَةِ عِنْدَهٗ عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ وَ عَنْ بُسْرِ بْنِ سَعِيْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: فِيْمَا سَقَتِ السَّمَاءُ وَالْعُيُوْنُ وَالْبَعْلُ الْعُشْرُ، وَ فِيْمَا سُقِيَ بِالنَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ-

﴿امام مالکؒ اس شخص سے روایت کرتے ہیں جو ان کے نزدیک ثقہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو چیزیں بارش سے، قدرتی چشموں سے یا اپنے طور پر نشوونما پائیں تو ان کا دسواں حصہ زکوٰۃ ہے اور جن کو نہر یا کنویں سے پانی دیا جائے تو ان میں بیسواں حصہ زکوٰۃ ہو گی-﴾

وضاحت :

قدرتی طور پر سیراب ہونے والی فصلوں اور مصنوعی آبپاشی سے سیراب ہونے والی فصلوں میں فرق کیا گیا ہے- آبپاشی پر اٹھنے والے مصارف کو مد نظر رکھتے ہوئے نصرو غیرہ سے سیراب ہونے والی فصلوں کی زکوٰۃ کی مقدار بارانی زمینوں کی فصلوں کی زکوٰۃ کا نصف رکھی گئی ہے-

امام مالک کے فتوے :

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ کسی شخص کے پاس مختلف اقسام کی کھجوریں ہوں تو ردی قسم کی کھجوریں اگرچہ نصاب کے لیے شمار ہوں گی لیکن صدقہ میں وہ نہیں لی جائیں گی- اس کی دلیل ان کے نزدیک یہ ہے کہ ریوڑ میں موجود بکری کے چھ نصاب کی تعداد میں تو شمار کیے جاتے ہیں لیکن صدقے میں قبول نہیں کیے جاتے-

میرے نزدیک صدقہ اس مال میں سے لیا جانا چاہیے جس کی مقدار زیادہ ہو- مویشیوں کے بارے میں بالکیہ کا اپنا فتویٰ یہ ہے کہ جس قسم کے مویشیوں کی تعداد زیادہ ہو گی ان میں سے صدقہ لیں گے اور جن کی تعداد کم ہو گی اس میں سے نہیں لیں گے- یہی اصول فصلوں کے بارے میں بھی قرین صواب ہے- میرے نزدیک اقسام کے تناسب سے بھی صدقہ لیا جا سکتا ہے-

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں یہ بات متفق علیہ ہے کہ زکوٰۃ کی وصولی کے لیے کھجوروں اور انگور کے سوا باقی پھلوں کا تخمینہ نہیں لگایا جائے گا- حنفیہ نے تخمینہ کو ختم ہی کر دیا ہے- وہ کہتے ہیں کہ یہ منسوخ ہو چکا ہے-

میرے نزدیک روایات میں کھجور اور انگور کا ذکر اس لیے ہوا ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں یہی دو مشہور پھل تھے- باقی آم، سنترے، سیب وغیرہ عرب میں نہیں تھے- دوسرے خرص یعنی درخت پر پھل کا تخمینہ لگانا عام زندگی میں اس طرح ضروری ہوتا ہے جس طرح اشیاء کا ناپ اور وزن کرنا- پھلوں میں پیداوار کے اندازہ کے لیے سوائے خرص کے اور کوئی صورت ممکن نہیں- زیتون کے بارے میں بالکیہ خرص کے قائل نہیں بلکہ جب پھل اتار کر تیل نکالا جائے اور وہ تیل ۵ وسق سے زائد ہو تو عشر یا نصف عشر لیا جائے گا- میرے نزدیک یہ درست نہیں- زیتون بھی کھجور، آم، سنترے وغیرہ کے حکم میں ہو گا-

پھل کچے اور نیم پختہ حالت میں بھی استعمال ہوتے ہیں اور روزانہ درختوں سے گرتے بھی ہیں- اس لیے جائے روز روز کا حساب کرنے کے سہولت اس میں ہے کہ درخت پر پھل کا تخمینہ کر لیا جائے- البتہ تخمینہ کرنے کے لیے

یہ ضروری ہے کہ پھلوں کی صلاحیت ظاہر ہو گئی ہو اور ان کی بیع جائز ہو- تخمینہ کرنے میں جو اصول معروف ہو گا اس پر عمل ہو گا-

بالکیہ کہتے ہیں کہ پھلدار درختوں کی زکوٰۃ میں پھل وصول کریں گے- یہ درست نہیں- آنحضرتؐ نے مالکوں کی سہولت کے پیش نظر یہ فرمایا تھا کہ وہ پھل میں سے دیں- آج لوگوں کی سہولت اگر اس میں ہے کہ اس کی قیمت دیں تو یہ طریقہ بھی حدیث کے منشا کے مطابق ہو گا-

امام مالکؒ کی رائے یہ ہے کہ جو چیزیں ترحالت میں نہیں کھائی جاتیں بلکہ کٹائی اور صفائی کے بعد دانے نکلنے پر کھائی جاتی ہیں تو ان کا تخمینہ نہیں ہو گا- میرے نزدیک یہ رائے درست ہے-

امام مالکؒ کے نزدیک کھجور کے درخت پر کھجور کا تخمینہ اس وقت کیا جائے گا جب پھل کی صلاحیت ظاہر ہو جائے- لیکن اگر تخمینہ یا کٹائی اور پکنے کے بعد اس پر کوئی آفت آجائے جو تمام پھل کو برباد کر دے تو زکوٰۃ نہیں ہو گی- ہاں اگر ۵ وسق سے زیادہ بچ رہے تو اس پر زکوٰۃ ہو گی- میرے نزدیک یہ اصول درست ہے اور یہی اصول تمام پھلوں میں بھی ملحوظ رہے گا-

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے بہت سے قطعات مختلف مقامات پر واقع ہوں یا مختلف ناموں میں اس کی شراکت ہو اور شراکت کا مال یا قطعات کی ملکیت الگ الگ اس مقدار کو نہیں پہنچتے جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہو لیکن یہ سب کرنے پر نصاب کو پہنچ جاتے ہوں تو جمع کر کے ان پر زکوٰۃ عائد کی جائے گی- میرے نزدیک اس صورت میں یہ دیکھا جائے گا کہ جائداد میں دوسرے ساتھیوں کی نوعیت شریک کی ہے یا خلیط کی- اگر وہ مال میں شریک ہیں تو تمام مال بیچ کر کے زکوٰۃ ادا کی جائے گی لیکن اگر وہ خلیط ہیں تو زکوٰۃ اس وقت عائد ہو گی جب ہر خلیط کا مال بقدر نصاب ہو- عامل نہیں، اور مختلف جگہ کے قطعات یا مال جمع کرنے میں تحصیل کا لحاظ رکھنا ہو گا- ایک تحصیلدار کے علاقے کے قطعات اور اموال جمع کیے جائیں گے لیکن مختلف تحصیلداروں کے علاقے کے نہیں-

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ زیتون میں سے تیل نکالنے کے بعد عشر لیا جائے گا بشرطیکہ تیل ۵ وسق تک ہو- اس سے کم میں عشر نہیں ہو گا- ان کے نزدیک زیتون کھجور کے حکم میں ہے یعنی ایسی پیداوار کہ اگر آسمانی بارش اور قدرتی چشموں یا از خود زمین سے سیراب ہو تو اس میں عشر ہوتا ہے اور جس فصل کو پانی دیا جاتا ہو اس میں نصف عشر- امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک زکوٰۃ زیتون کے تیل سے نہیں بلکہ زیتون کے پھل سے وضع کی جائے گی- قاضی ابو یوسف کے

نزدیک اس فصل میں زکوۃ نہیں ہے۔ یہ تو ایک تیل ہے۔

احناف کے نزدیک ہر زمینی پیداوار میں زکوۃ ہے۔ خواہ پیداوار کی مقدار کثیر ہو یا قلیل۔ یعنی اس میں نصاب کی شرط نہیں۔ مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک مناط حکم یہ ہے کہ اس میں قوت اور ادخار (غذا بننے اور ذخیرہ کرنے کی صلاحیت) پایا جائے۔ میرے نزدیک احناف کا مسلک اس حد تک درست ہے کہ تمام پیداوار میں جو تجارتی مقاصد لیے ہوئے ہو زکوۃ ہوگی بشرطیکہ اس کی مقدار نصاب تک پہنچتی ہو لیکن قلیل مقدار مستثنیٰ ہوگی۔ مالکیہ اور شوافع کا مسلک کہ فصل میں قوت اور ادخار کی خصوصیت پائی جائے، درست نہیں۔ یہ علت فقہاء کی اپنی بنائی ہوئی ہے، یہ کسی نص یا مرفوع حدیث پر مبنی نہیں۔ یہ ضابطہ بندی کی غرض سے متعین کی گئی ہے۔ ضابطہ بندی اگرچہ ناگزیر ہے لیکن ضابطہ ایسا ہونا چاہیے جس میں تمام پیداوار جو تجارتی مقاصد کے لیے ہوئے ہوں وہ سب اس میں آجائیں۔ اس ضابطہ سے تمام پھل، سبزیاں اور ترکاریاں وغیرہ زکوۃ کے دائرے سے نکل جاتی ہیں۔ حالانکہ ان پھلوں اور سبزیوں کی آج بڑے پیمانے پر کاشت اور تجارت ہو رہی ہے۔ احناف نے بھی اس ضابطہ کو نہیں مانا۔

امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ زیتون میں عشر یا نصف عشر زکوۃ خرچ نکالنے سے پہلے وضع کی جائے گی یا بعد میں، تو انہوں نے کہا کہ خرچ کو نہیں دیکھا جائے گا بلکہ مالک پر اعتماد کیا جائے گا۔ امام مالک کا یہ فتویٰ مبہم ہے۔ انہوں نے خرچ کی بات ٹال دی ہے۔ اگر زکوۃ تیل کے حساب سے لیتے ہیں تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ خرچ کاٹنا پڑے گا۔ احناف پھل میں سے زکوۃ لینے کے قائل ہیں۔ اس صورت میں خرچ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک اس بارے میں احناف کا مسلک درست ہے۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم اٰتوا حقہ یوم حصادہ (فصل کا حق ادا کرو اس کے کاٹنے کے دن) سے مراد اس کی زکوۃ ادا کرنے کا حکم ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ کے نزدیک اس سے مراد ان لوگوں کو دینا ہے جو کٹائی کے وقت بھری دو بھری مانگنے کے لیے آجاتے ہیں۔ میرے نزدیک امام مالک کی بات درست ہے لیکن چونکہ حکم عام ہے اس سے مراد سب حقوق ہوں گے۔ پہلا حق تو سرکاری زکوۃ ہے، دوسرے حقوق لوگوں کے ہیں جو انفاق فی سبیل اللہ کے ضمن میں آتے ہیں مروجہ ترقی کے لیے اس طرح کا انفاق نہایت ضروری ہے۔ امام مالک اگر آیت کو صرف زکوۃ سے خاص کر دیتے ہیں تو یہ ٹھیک نہیں۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ جس نے اپنا باغ یا زمین بیچ دی جس میں کھیتی یا پھل ہو لیکن جس کی صلاحیت ابھی ظاہر نہ

ہوئی ہو تو اس کی زکوۃ خریدنے والے کے ذمہ ہوگی کیونکہ بیع کے وقت اس پر زکوۃ واجب ہی نہیں ہوئی تھی۔ اور اگر فصل تیار ہو اور اس کی بیع جائز ہو تو زکوۃ بیچنے والے کے ذمہ ہوگی، الا آنکہ وہ یہ شرط لگا دے کہ اس کی زکوۃ خریدار ادا کرے گا۔ میرے نزدیک یہ فتویٰ درست ہے۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص چار وسق کھجور اجرے، چار وسق منقے بنے، چار وسق گندم کاٹے اور چار وسق دالیں کاٹے تو ان کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر نصاب پورا نہیں کیا جائے گا اور اس پر زکوۃ نہیں ہوگی۔ ہاں اگر کھجور کی مختلف اقسام یا دوسری اصناف کی مختلف قسمیں مل کر بقدر نصاب ہو جائیں تو تمام اقسام کو یک جان کر کے ان پر زکوۃ عائد کی جائے گی۔ یعنی اگر گندم کی اقسام بے شمار ہیں تو ان سب کو جمع کر کے دیکھا جائے گا کہ وہ بقدر نصاب ہیں یا نہیں، اگر وہ بقدر نصاب ہو جائیں تو ان پر زکوۃ ہوگی۔ گندم کے رنگ یا مزا یا نام کا لحاظ نہ ہوگا۔ یہی معاملہ دوسری تمام اجناس مثلاً منقے، دالوں اور دھان میں ہوگا۔ ہر قسم کی دالیں اور دھان ایک جنس مانے جائیں گے۔

شوافع کا مسلک مالکیہ سے مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر رنگ، نام اور مزے میں فرق ہے تو کسی جنس کی اقسام کو جمع نہیں کیا جائے گا بلکہ ہر ایک کا نصاب الگ ہوگا۔

میرے نزدیک مالکیہ کا مسلک درست ہے۔ شوافع کا مسلک درست نہیں۔ مالکیہ کا مسلک حضرت عمرؓ کے خط میں لکھے گئے فتوے پر مبنی ہے۔ جس طرح ہر نوع کی بھیڑ بکریاں یا مختلف قسم کے اونٹ یا گائے بھینس جمع کر کے ان پر زکوۃ لی جاتی ہے اسی طرح مختلف قسم کی گندم اگرچہ اس کے رنگ، مزا اور نام میں فرق ہو زکوۃ کے لیے جمع کی جائے گی۔ علیٰ ھذا القیاس دھان اور دالیں اور دوسری اجناس۔ میرے نزدیک جس طرح بھیڑ بکریوں میں سے جمع کرنے کے بعد زکوۃ اس قسم سے لینی چاہیے جس کی تعداد زیادہ ہو تو اسی اصول پر اجناس میں بھی جس نوع کی مقدار زیادہ ہو اسی نوع میں سے زکوۃ لینی چاہیے۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے دالوں اور گندم میں فرق کیا تھا۔ انہوں نے عیسائی تاجروں سے دالوں میں عشر لیا اور منقے سے نصف عشر۔ ان کی رائے میں دالیں سب ایک قسم ہیں۔

میرے نزدیک عیسائی تاجروں سے زکوۃ لینے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اس عشر یا نصف عشر کی نوعیت ایک محصول یا ٹیکس کی تھی۔ جب عیسائی تاجر اشیاء فروخت کرنے کے لیے مدینہ آنے لگے تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ چونکہ ہماری رعایا کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ جزیہ کا ہے، تجارت کے بارے میں ان پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ لہٰذا انہوں

نے بطور تجارتی محصول یا نکس عشر اور نصف عشر ان پر عائد کر دیا۔ عشر اور نصف عشر کا فرق تجارتی غرض سے رکھا گیا جس چیز کی مدینہ والوں کو زیادہ ضرورت تھی اس پر نصف عشر کے برابر ٹیکس لگایا گیا۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر دو شخصوں کے درمیان کھجور کے باغ مشترک ہوں اور وہ اس سے آٹھ وسق کھجور حاصل کریں تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہوگی اور اگر ان میں سے ایک کے حصے میں پانچ وسق آئیں اور دوسرے کے حصے میں چار وسق یا اس سے کم تو پانچ وسق کے مالک پر زکوٰۃ ہوگی اور دوسرے پر زکوٰۃ نہ ہوگی۔ اور یہی طریقہ تمام شریکوں کے لیے ہوگا۔ چاہے گندم کا ہیں یا انگور یا کھجور یا منقے۔ جب ہر ایک کا حصہ پانچ وسق ہوگا تو زکوٰۃ ہوگی، اگر حصہ پانچ وسق سے کم ہوگا تو زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

احناف کے نزدیک مقدار کا سوال نہیں، مال قلیل ہو یا کثیر وہ اس پر زکوٰۃ مانتے ہیں۔ شوافع کہتے ہیں کہ شریک ایک ساتھ زکوٰۃ دیں۔

میرے نزدیک شریک اور خلیط میں فرق ہے۔ جہاں شریک ہوں تو مال کی زکوٰۃ ایک ہی جگہ کاٹی جائے گی۔ اگر خلیط ہوں تو مالکیہ کے مسلک کے مطابق زکوٰۃ ہوگی۔ شریکوں کے معاملے میں شوافع کی رائے صحیح ہے، خلیطوں کے بارے میں نہیں۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ایسی تمام اصناف از قسم گندم، کھجور، منقے اور غلہ جن کی زکوٰۃ ادا کر دی گئی ہو، اگر طویل مدت تک روک لی گئی ہوں اور کئی سال روکے رکھنے کے بعد مالک ان کو بیچ تو ان کی قیمت پر زکوٰۃ نہیں ہوگی جب تک اس قیمت پر ایک سال نہ گزر جائے۔ بشرطیکہ یہ اقسام تجارت کے لیے نہ روکی گئی ہوں بلکہ ان کی حیثیت گھریلو سامان کی ہو۔ ہاں اگر یہ بطور سامان تجارت ہوں تو مالک پر اس وقت زکوٰۃ ہوگی جب وہ مال فروخت کرے گا اور ایک سال اس روز سے شمار ہوگا جس روز اس شخص نے ان کی زکوٰۃ دی تھی جس سے اس نے مال خریدا تھا۔

میرے نزدیک یہ فتویٰ درست ہے۔ مالکیہ احتکار کی اجازت نہیں دیتے۔ تاجر مال کو روک نہیں سکتا۔ اس کو سال پورا ہونے پر زکوٰۃ دینی ہوگی۔

پھلوں، ترکاریوں اور سبزیوں کی زکوٰۃ کے باب میں بھی کوئی مرفوع حدیث یا اثر صحابہ نہیں، امام مالکؒ کے فتوے ہیں۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ کسی بھی قسم کے پھل مثلاً انار، فرسک، انجیر یا ان جیسے دوسرے پھلوں پر زکوٰۃ نہیں اور نہ

ی ترکاریوں اور سبزیوں پر زکوٰۃ ہے۔ ان کی پیداوار کو اگر فروخت کر دیا جائے تو قیمت میں سے بھی زکوٰۃ ضع نہیں کی جائے گی جب تک اس پر پورا سال نہ گزر جائے اور وہ نصاب سے زائد نہ ہو۔

اس فتوے کی علت یا مناط حکم اجناس میں قوت اور ادخار کا پایا جانا ہے۔ میرے نزدیک یہ علت درست نہیں۔ یہ اللہ اور رسول کی بتائی ہوئی علت نہیں۔ اس کی بنا کسی نص پر نہیں اور نہ ہی کسی حدیث پر ہے۔ اس معاملے میں احناف کا مسلک درست ہے کہ زمین میں جو چیز پیدا ہوگی اس پر زکوٰۃ ہوگی۔ اس میں نصاب کی قید ضروری ہے جو شارع نے لگائی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے گھریلو استعمال کے لیے کوئی جنس پیدا کرتا ہے تو وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوگی لیکن تجارتی مقاصد کے لیے ہر زمینی پیداوار پر زکوٰۃ ہوگی۔

مَا جَاءَ فِي صَدَقَةِ الرَّقِيقِ وَ الْخَيْلِ وَالْعَسَلِ

غلام، گھوڑے اور شہد کی زکوٰۃ کے بارے میں روایات

حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ عَنْ عِرَاكِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَيْسَ عَلَى الْمُسْلِمِ فِي عَبْدِهِ وَلَا فِي فَرَسِهِ صَدَقَةٌ

﴿حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان پر اس کے غلام اور گھوڑے میں زکوٰۃ نہیں﴾

وضاحت:

غلامی کا مسئلہ تو اب ختم ہو چکا اس لیے غلاموں کی زکوٰۃ کا معاملہ صرف علمی حد تک رہ گیا ہے۔ گھوڑے کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے جو حکم دیا ہے وہ ایسے گھوڑوں کے بارے میں ہے جو ضرورت اور استعمال کے لیے رکھے جائیں۔ ان پر زکوٰۃ نہیں ہوگی۔ ہمارے زمانے میں گھوڑے تجارت کے لیے پالے جاتے ہیں اور ان کی خاص نسلوں کی افزائش کے لیے بڑے بڑے فارم وجود میں آگئے ہیں۔ یہ تجارت نہایت منافع بخش ہے۔ ان گھوڑوں کا سرمایہ تجارت کا ہوگا، ان پر زکوٰۃ لگنی چاہیے۔ دوسرے مویشیوں کی طرح صرف ایک مقررہ مقدار زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوگی۔

اس بارے میں احناف کا مسلک یہ ہے کہ گھوڑی پر زکوٰۃ لی جائے گی لیکن گھوڑے پر نہیں۔ میرے نزدیک

مسلک کے نقل کرنے میں کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ تجارت کے لیے پالے گئے گھوڑے اور گھوڑیاں زکوٰۃ کے لیے یکساں متصور ہوں گے۔

□ حدثني عن مالك عن ابن شهاب عن سليمن بن يسار ان اهل الشام قالوا لابي عبيدة ابن الجراح خذ من خيلنا و رقيقنا صدقة فابى ثم كتب الى عمر بن الخطاب فابى عمر، ثم كلموه ايضا فكتب الى عمر فكتب اليه عمر ان احبوا فخذها منهم وارددها عليهم وارزق رقيقهم- قال مالك معنى قوله رحمه الله وارددها عليهم يقول على فقراء هم

﴿سلیمان بن یسار کہتے ہیں کہ اہل شام نے ابو عبیدہ بن جراح سے کہا کہ ان کے گھوڑوں اور غلاموں سے زکوٰۃ لی جائے تو انہوں نے انکار کیا۔ اس بارے میں حضرت عمرؓ کو لکھا تو انہوں نے بھی انکار کیا۔ لوگوں نے دوبارہ اس معاملہ میں بات کی تو ابو عبیدہ نے دوبارہ حضرت عمرؓ کو لکھا۔ اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے لکھا کہ اگر وہ زکوٰۃ دینا پسند کرتے ہیں تو لے لو اور ان ہی کو لوٹا دو اور ان کے غلاموں کو کھلاؤ۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ان ہی کو لوٹانے کا مطلب یہ تھا کہ ان کے فقرا میں تقسیم کر دو۔﴾

وضاحت :

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل شام کے پاس غلام اور گھوڑے وافر مقدار میں بطور مال غنیمت جمع ہو گئے ہوں گے چنانچہ انہوں نے زکوٰۃ دینے پر اصرار کیا تو حضرت عمرؓ نے اجازت دے دی۔ مال کو فقراء میں تقسیم کرنے کا امام مالک کا مختار زکوٰۃ کے اس بنیادی اصول سے ماخوذ ہے کہ تؤخذ من اغنيائهم و ترد الى فقراء هم (مال کو امیروں سے وصول کر کے ان کے غریبوں میں لوٹا دیا جائے)

□ حدثني عن مالك عن عبدالله بن ابي بكر بن عمرو بن حزم انه قال: جاء كتاب من عمر بن عبدالعزيز الى ابي وهو بمنى ان لا ياخذ من العسل ولا من الخيل صدقة

﴿عبداللہ بن ابی بکر بن عمرو بن حزم روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا خط ان کے والد کو منیٰ میں ملا کہ وہ شہد اور گھوڑے میں سے زکوٰۃ نہ لیں﴾

وضاحت :

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی یہ ہدایت بھی عام قسم کے شہد کے چھتوں کے بارے میں ہے جو درختوں یا پہاڑوں میں لگتے ہیں۔ گھوڑے بھی وہی مراد ہیں جو لوگ ضرورت کے لیے یا شان و شوکت کے اظہار کے لیے رکھتے ہیں۔ دوسرے زمانے میں شہد کی پیداوار بھی ایک صنعت بن چکی ہے اور گھوڑوں کی افزائش بھی اقوامی تجارت کا ایک حصہ ہے۔ اب ایک اسلامی ریاست شہد اور گھوڑوں کو مال تجارت کی حیثیت دے گی اور اس پر زکوٰۃ عائد کرے گی۔

جزية اهل الكتب والمجوس

اہل کتاب اور مجوسیوں کا جزیہ

□ حدثني يحيى عن مالك عن ابن شهاب قال: بلغني ان رسول الله ﷺ اخذ الجزية من مجوس البحرين و ان عمر ابن الخطاب اخذها من مجوس فارس و ان عثمان بن عفان من البربر-

﴿ابن شہاب سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ یہ بات مجھے پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بحرین کے مجوس سے جزیہ لیا، حضرت عمر بن خطابؓ نے فارس کے مجوس سے جزیہ لیا اور حضرت عثمان بن عفانؓ نے بربر سے جزیہ لیا﴾

وضاحت :

قرآن میں یہود اور نصاریٰ سے جزیہ لینے کا حکم ہے۔ جب فتوحات کا دائرہ ایران، مصر اور بلاد مغرب تک وسیع ہوا تو دوسرے مذاہب کے لوگ مسلمانوں کے زیر اثر آ گئے۔ اب سوال پیدا ہوا کہ مجوسیوں کے ساتھ معاملہ کس طرح کیا جائے۔ اس معاملہ میں صحابہ کرام کی رائے یہ ہوئی کہ مجوس کے ساتھ اہل کتاب کا سا سلوک کرو۔ یہ سلوک صرف جزیہ کے بارے میں ہے، نکاح یا ذبائح کے معاملات کے لیے نہیں۔ اور مجوس ہی نہیں، تمام غیر مسلموں کے ساتھ یہی سلوک ہو گا اور وہ شبہ اہل کتاب سمجھے جائیں گے۔ صرف مشرکین اہل عرب کا معاملہ مختلف تھا۔ ان کے لیے اسلام قبول کرنا یا تلوار، کیونکہ ان کے اوپر رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ حجت تمام ہو چکی تھی۔ ان کو تمام

دیا جا سکتا تھا اور نہ ان سے جزیہ لیا جا سکتا تھا۔ غیر مسلموں میں مفتوح اور معاہد اہل ذمہ کے درمیان فرق کیا جائے گا۔ مفتوح اہل ذمہ کے بارے میں حکومت کی صوابدید پر معاملہ ہوگا جب کہ معاہد اہل ذمہ کے ساتھ معاملہ ان شرائط کے مطابق ہوگا جو معاہدہ میں طے پا جائیں گی۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ ذَكَرَ الْمَجُوْسَ فَقَالَ: مَا اَدْرِيْ كَيْفَ اَصْنَعُ فِيْ اَمْرِهِمْ، فَقَالَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ اَشْهَدُ لَسَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: سُنُّوْا بِهِمْ سُنَّةَ اَهْلِ الْكِتٰبِ

﴿محمد بن علی روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے مجوس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان کے ساتھ کیا معاملہ کروں تو عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ان کے ساتھ اہل کتاب کا معاملہ کرو﴾

وضاحت:

یہ روایت ترتیب میں مذکور روایت سے پہلے آنی چاہیے تھی۔ اصل میں یہ مسئلہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں پیش آیا۔ انہوں نے لوگوں سے اس کے متعلق پوچھا تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث اس بارے میں پیش کر دی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بڑے پایہ صحابی ہیں۔ ان کی خبر واحد کی بڑی اہمیت ہے اور اسی کے مطابق خلفائے راشدین نے عمل کیا، جیسا کہ اوپر کی روایت میں حضرت عمرؓ کے علاوہ حضرت عثمانؓ کے فیصلے کا حوالہ دیا گیا ہے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ اَسْلَمَ مَوْلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ ضَرَبَ الْجِزْيَةَ عَلٰى اَهْلِ الذَّهَبِ اَرْبَعَةَ دَنَانِيْرَ وَ عَلٰى اَهْلِ الْوَرِقِ اَرْبَعِيْنَ دِرْهَمًا مَعَ ذٰلِكَ اَرْزَاقُ الْمُسْلِمِيْنَ وَضِيَافَةُ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ

﴿حضرت عمر بن خطابؓ کے آزاد کردہ غلام اسلمؒ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ذمیوں کے اوپر سونے پر چار دینار اور چاندی پر چالیس درہم جزیہ مقرر کیا اور مزید یہ کہ مسلمانوں کو کھانا کھلائیں اور

تین روز تک مہمان نوازی کریں۔﴾

وضاحت:

یہ اہل ذمہ کے اوپر جزیہ کی شرح ہے۔ فی دینار کے اوپر چار دینار جزیہ ہوگا اور دو صد درہم کے اوپر چالیس درہم جزیہ یعنی دونوں صورتوں میں پانچواں حصہ اور اس پر مزید یہ کہ مسلمانوں کو کھانا کھلائیں اور تین روز تک مہمانوں کی ضیافت کریں۔ اسلامی حکومت کو حق ہے کہ اہل ذمہ سے ان کی حفاظت کے بدلے میں جزیہ مقرر کرے۔ اسی حق کے تحت حضرت عمرؓ نے یہ شرح مقرر کی۔ اصولی طور پر یہ شرح زکوٰۃ کی شرح سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ زیادہ میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کی مقدار اسلامی حکومت کی صوابدید پر ہے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّهُ قَالَ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اِنَّ فِي الظَّهْرِ نَاقَةً عَمْيَاءَ فَقَالَ عُمَرُ ادْفَعْهَا اِلٰى اَهْلِ بَيْتٍ يَنْتَفِعُوْنَ بِهَا- قَالَ فَقُلْتُ وَ هِيَ عَمْيَاءُ فَقَالَ عُمَرُ يَقْطُرُوْنَهَا بِالْاِبِلِ- قَالَ فَقُلْتُ كَيْفَ تَاْكُلُ مِنَ الْاَرْضِ؟ قَالَ فَقَالَ عُمَرُ اَمِنْ نَعَمِ الْجِزْيَةِ هِيَ اَمْ مِنْ نَعَمِ الصَّدَقَةِ؟ فَقُلْتُ بَلْ مِنْ نَعَمِ الْجِزْيَةِ فَقَالَ عُمَرُ اَرَدْتُمْ وَاللّٰهِ اَكْلَهَا- فَقُلْتُ اِنَّ عَلَيْهَا وَسْمَ الْجِزْيَةِ فَاَمَرَبِهَا عُمَرُ فَنُحِرَتْ وَ كَانَ عِنْدَهُ صِحَافٌ" تِسْعٌ فَلَا تَكُوْنُ فِيْهِ فَاكِهَةٌ وَلَا طُرْفَةٌ" اِلَّا جَعَلَ مِنْهَا فِيْ تِلْكَ الصِّحَافِ فَبَعَثَ بِهَا اِلٰى اَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ وَ يَكُوْنُ الَّذِيْ يَبْعَثُ بِهٖ اِلٰى حَفْصَةَ ابْنَتِهٖ مِنْ آخِرِ ذٰلِكَ فَاِنْ كَانَ فِيْهِ نُقْصَانٌ" كَانَ فِيْ حَظِّ حَفْصَةَ قَالَ فَجَعَلَ فِيْ تِلْكَ الصِّحَافِ مِنْ لَحْمِ تِلْكَ الْجُزُوْرِ فَبَعَثَ بِهٖ اِلٰى اَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ وَ اَمَرَ بِمَا بَقِيَ مِنْ لَحْمِ تِلْكَ الْجُزُوْرِ فَصُنِعَ فَدَعَا عَلَيْهِ الْمُهَاجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارَ- قَالَ مَالِكٌ لَا اَرٰى اَنْ تُؤْخَذَ النَّعَمُ مِنْ اَهْلِ الْجِزْيَةِ اِلَّا فِيْ جِزْيَتِهِمْ-

﴿زید بن اسلم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عمرؓ بن خطاب کو بتایا کہ شتر خانے میں ایک اندھی اونٹنی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس کو کسی گھر والے کے پاس بھیج دو تاکہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ کہتے ہیں کہ اس پر میں نے کہا وہ تو اندھی ہے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ وہ اس

کو اونٹوں کی قطار میں لگالیں گے۔ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ وہ زمین سے کیسے کھائے گی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ آیا وہ جزیہ کے جانوروں میں سے ہے یا صدقے کے جانوروں میں سے۔ میں نے جواب دیا کہ یہ جزیہ کے جانوروں میں سے ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تمہارا ارادہ، اللہ کی قسم، اس کو کھانے کا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ اس کے اوپر تو جزیہ کا نشان ہے۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اس کو ذبح کیا جائے۔ حضرت عمرؓ کے پاس نو طشتریاں تھیں اور ان کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی بھی پھل یا اچھی چیز ہوتی تو وہ ان طشتریوں میں حصے کر کے حضور کی ازواج کو بھیجتے اور جو کچھ بچتے اس کا آخری حصہ حضرت حفصہؓ کا ہوتا۔ تاکہ جو کمی بھی ہو وہ حضرت حفصہ کے حصے میں آئے۔ اسلم کہتے ہیں کہ اس اونٹنی کے گوشت کے حصے بنا کر ازواج مطہرات کو بھیجے گئے اور جو گوشت باقی بچا اس کو پکا کر تیار کرنے کا حکم دیا گیا اور اس پر مہاجرین اور انصار کی دعوت کی گئی۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ میری رائے میں اہل ذمہ سے سوائے جزیہ کے جانور نہیں لیے جا سکتے۔

وضاحت:

اس روایت سے کئی باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ جزیہ میں جانور بھی لیے جا سکتے ہیں سرہاد نقدی کے ادھے ہونے کا سوال تو ہو سکتا ہے کہ دینے والے نے دھوکہ سے دے دی ہو یا اگر پوری اونٹنی جزیہ میں نہ بھیجنی ہو تو اندھی قبول کر لی گئی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وصولی کے بعد اندھی ہو گئی ہو۔ دوسری یہ کہ جزیہ کے جانور بیت المال کا حصہ ہوتے تھے اور حضور کی ازواج مطہرات کی کفالت بیت المال سے ہوتی تھی۔ تیسری یہ کہ حضرت عمرؓ کا طریقہ یہ تھا کہ جو کچھ بھی ازواج مطہرات کو بھجواتے تو سب کے حصے کر کے بھجواتے اور اپنی بیٹی حضرت حفصہؓ کا حصہ آخر میں نکالتے تاکہ جو کمی بھی ہو وہ حضرت حفصہ کے حصے میں آئے تاکہ خلیفہ پر بیٹی کے معاملہ میں طعن نہ ہو۔ چوتھی یہ کہ ازواج مطہرات کو بھجوانے کے بعد جو کچھ بچا وہ پکا کر مہاجرین و انصار کی دعوت کر دی گئی تاکہ وہ ضائع نہ ہو اور کسی کو اس کے استعمال پر اعتراض بھی نہ ہو۔

کتاب البیوع

بیع کا مفہوم

بیع کا لفظ اشتراء اور بیع یعنی خرید اور فروخت دونوں کے لیے آتا ہے۔اس کے معنی کا یہ اشتراک قدیم زمانے کے نظام تجارت کی وجہ سے ہوا ہے۔اس زمانے میں دنیا میں بارٹر سسٹم رائج تھا یعنی تجارت میں اشیاء کا تبادلہ کر لیا جاتا تھا۔موجودہ زمانے میں بھی بعض صورتوں میں بین الاقوامی تجارت بارٹر سسٹم ہی کے تحت ہوتی ہے۔مبادلے میں ایک ہی چیز ثمن بھی ہوتی ہے اور مبیع بھی۔اس لیے میرے نزدیک بیوع کا صحیح ترجمہ معاملات ہے۔معاملات کے بارے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ دو معاملات ایسے ہیں جن پر عائلی تمدن کی بنیاد ہے۔ایک وہ جو میاں بیوی کے درمیان شادی کا معاہدہ ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو اشیاء کی لین دین کا معاملہ ہوتا ہے۔یہ دونوں بنیادی چیزیں ہیں۔یہ نہ ہوں تو معاشرہ وجود میں نہیں آتا اور زندگی نہیں گزر سکتی۔سب سے زیادہ اہم یہی معاملات ہیں۔اسی لیے ان دونوں کے متعلق خصوصیت کے ساتھ شریعت میں بحث آئی ہے تاکہ محکم تمدن وجود میں آسکے۔کتاب البیوع اشیاء کی لین دین کے معاملات پر بحث کرتی ہے۔

مَا جَاءَ فِی بَیْعِ الْعُرْبَانِ

بیعانہ کے معاملہ میں روایت

۱ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنِ الثِّقَةِ عِنْدَهٗ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰی عَنْ بَیْعِ الْعُرْبَانِ۔

﴿امام مالک اس شخص سے روایت کرتے ہیں جو ان کے نزدیک قابل اعتماد ہے کہ عمرو بن شعیب کے والد نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع عربان سے منع فرمایا۔﴾

وضاحت :

بیع عربان یا عربون کے لیے اردو میں ایک جامع لفظ نہیں مل سکا۔امام مالک نے اس کی نوعیت کی تشریح یوں کی ہے کہ ایک شخص کوئی غلام یا لونڈی خریدے یا کرائے پر سواری لے، پھر اس شخص سے جس سے اس نے معاملہ کیا ہے یہ کہے کہ میں تمہیں ایک دینار یا ایک درہم یا اس سے زیادہ یا کم رقم دیتا ہوں اس شرط پر کہ اگر میں نے یہ مال خریدا

یا سواری کی تو میں نے جو رقم تم کو دے دی ہے وہ اس کی قیمت میں شمار ہوگی اور اگر میں نے خریدنے کا ارادہ فسخ کر دیا یا سواری کو کرایہ پر استعمال کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تو جو پیسہ میں نے دیا ہے وہ ضائع ہو گا، میں اس کا مطالبہ نہ کروں گا۔ گویا یہ وہ چیز ہوئی جسے آج رجحان کا نام دیا جاتا ہے۔ لغت کے لحاظ سے بیع عربان کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص ایک چیز کے خریدنے کے متعلق اپنا ارادہ ظاہر کر دیتا ہے اور کچھ رقم پیشگی دے کر اس چیز کو اس وقت تک کے لیے محفوظ کرا لیتا ہے جب تک وہ یہ طے نہ کر لے کہ خریدوں یا نہ خریدوں، تاکہ وہ چیز اس دوران ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ قدیم زمانے میں اس کی بڑی اہمیت تھی۔ مال باہر سے آتا تھا اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتا تھا۔ کسی شخص کے لیے اس کا امکان بہت کم ہوتا تھا کہ وہ کچھ عرصے کے لیے اس کو اپنے لیے محفوظ کرا سکے۔ تو اس کو محفوظ کرانے کا ایک طریقہ یہ نکالا گیا کہ کچھ رقم بطور رجحان دے دی جاتی۔ اسی کو روایت میں بیع عربان کا نام دیا گیا ہے۔

بیع عربان اس روایت کی رو سے ناجائز ہے۔ لیکن جو غذاب نقل ہوئے ہیں ان کی رو سے ایسی بیع کو عبداللہ بن عمرؓ جیسا محتاط آدمی جائز قرار دیتا ہے اور امام احمد بن حنبل بھی اس کو جائز سمجھتے ہیں۔ اس لیے معلوم کرنا پڑے گا کہ صحیح صورت معاملہ کیا ہے۔ فقہا معاملات میں فساد کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ایسے معاملات، جن میں کسی ایک فریق کو ضرر یا غرر یعنی نقصان یا دھوکہ ہو، باطل ہیں۔

میرے خیال میں بیع عربان کے ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ایسی شرط پائی جاتی ہے جس میں کراہت ہے، لہٰذا اس میں ضرر پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بیع کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بیع کو کچھ دنوں کے لیے روکا جائے۔ خریدنے کا معاملہ مشتبہ ہوتا ہے اور روکنے کا معاوضہ وہ رقم ہے جو متوقع خریدار نے پیشگی دے دی۔ میرے نزدیک معاملہ صاف صاف ہونا چاہیے اور خریدار کو یہ کہنا چاہیے کہ اگر تم مال کو روک سکتے ہو تو روکو۔ پابند ہونے کی صورت میں ہو سکتا ہے کہ بائع کو اپنا مال اچھی قیمت پر فروخت کرنے کا موقع ملے لیکن وہ بیع عربان کے باعث اس فائدے سے محروم رہے۔ اسی طرح مال روکنے کا معاوضہ اگرچہ لیتا رہا تو نہیں لیکن اس کا شائبہ تو ہے۔ بائع آخر کس چیز کا معاوضہ لے رہا ہے۔ ظاہر ہے صرف اس چیز کا کہ اس نے مبیع کو روک رکھا ہے۔ لہٰذا اس بیع میں ضرر اور غرر دونوں پائے جاتے ہیں۔ اسی لیے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہو گا۔

یہی صورت جانور کرائے پر لینے میں ہے۔ آپ جانور لے لیتے ہیں پھر اس کو دوڑاتے ہیں یا نہیں۔ اس طرح آپ نے بائع کو پابند کر کے اس کو دوسرے مواقع سے فائدہ اٹھانے سے محروم کر دیا۔ اب آپ کی دی ہوئی ضمانت کی

رقم اس کا کافی بدل ہوتی ہے یا نہیں؟ یہ ایک مشتبہ معاملہ ہے۔ معاملہ کی یہ ساری شکل ضرر و غرر کے پہلوؤں کی حامل ہے۔ اس لیے ایسے معاملہ سے پرہیز ہونا چاہیے۔

اس روایت کی سند میں عن مالك عن الثقة عندہ کے الفاظ بھی قابل غور ہیں۔ امام مالکؒ نے موطا میں جو روایات لی ہیں ان میں کثیر روایات کی سند میں عمن اثق به (اس شخص سے جس پر مجھے اعتماد ہے) یا عن الثقة عندنا (اس شخص سے جو ہمارے نزدیک قابل اعتماد ہے) کے الفاظ آتے ہیں۔ عام حالات میں اگر کوئی محدث سند کے کسی راوی کو چھپائے تو اس کی روایت مجروح قرار دی جاتی ہے لیکن امام مالک چونکہ بڑے عالی مقام محدث ہیں اس لیے ان کی یہ زیادتی برداشت کر لی جاتی ہے کہ وہ اپنے راوی کی شخصیت کا اظہار نہ کریں۔ پہلے تو میں بھی اس چیز کو نظر انداز کرتا رہا لیکن بعض روایات پڑھنے سے میرا اعتماد سخت مجروح ہوا۔

شارحین کی رائے یہ ہے کہ اکثر مواقع پر الثقة عندنا سے امام مالک کی مراد ابن شہاب زہری ہوتے ہیں جن کے بارے میں معلوم ہوتا ہے اسی زمانے میں دو رائیں پائی جاتی تھیں۔ بعض لوگ ان پر اعتماد کرتے تھے لیکن بعض ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ امام مالکؒ چونکہ جرح و تعدیل میں بھی اپنی رائے رکھتے ہیں اس لیے وہ صاف لفظوں سے کہتے ہیں کہ میں ان پر اعتماد کرتا ہوں، دوسرا کوئی نہیں کرتا تو نہ کرے۔ ایک متنازعہ فیہ شخصیت کے حق میں اس طرح کا اصرار امام صاحب کی ذہنی زیادتی ہے۔ زہری کا تشیع اور مرسل روایت کا ان کے ہاں ہونا ان کو اس قابل نہیں چھوڑتا کہ امام صاحب ان کے حق میں دھونس سے کام لیں۔ آپ آگے دیکھیں گے کہ زہری نے نہایت خطرناک روایتیں بیان کی ہیں اور امام صاحب نے ان کو قبول کر لیا ہے۔

مَا جَاءَ فِي الْمَمْلُوكِ

غلام کے بارے میں حکم

٦ حدثني يحيى عن مالك عن نافع عن عبدالله بن عمر ان عمر بن الخطاب قال من باع عبدا و له مال فماله للبائع الا ان يشترطه المبتاع۔

"عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ جس شخص نے اپنا ایسا غلام بیچا جس کا اپنا مال بھی ہے تو وہ مال فروخت کرنے والے کا ہو گا، الا آنکہ خریدنے والا شرط لگا دے کہ وہ مال

میرا ہوگا۔﴾

وضاحت :

اس اثر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غلاموں کے پاس اپنا مال ہوتا تھا اور وہ اس کے مالک بھی ہوتے تھے۔ غلام کی فروخت کی صورت میں وہ مال مشتری کو اسی صورت میں مل سکتا تھا جب وہ اس کے متعلق شرط کر لیتا۔

احناف کہتے ہیں کہ غلام کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا اور اس روایت میں مال کی ضمیر جو غلام کی طرف لوٹتی ہے تو وہ محض اختصاص کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ جس طرح کہہ دیا جائے گھوڑے کی زین، گھوڑے کی لگام۔ حقیقت میں گھوڑے کا تو کچھ بھی نہیں ہوتا صرف اس کی طرف نسبت ہوتی ہے۔ ہر چیز گھوڑے کے مالک کی ہوتی ہے۔ میرے نزدیک احناف کا یہ مسلک درست نہیں اور مال کی ضمیر غلام کی طرف حقیقی ہے۔ محض شاعرانہ نہیں ورنہ غلام کے پہننے کے اگر کپڑے ہو سکتے ہیں، اس کا جوتا ہو سکتا ہے، اس کی کوٹھڑی میں جو سامان ہے وہ اس کا ہو سکتا ہے تو مال کیوں نہیں ہو سکتا۔ مالکیہ کا مذہب جو اس روایت سے ظاہر ہو رہا ہے میرے خیال میں درست ہے اور شوافع کا مذہب بھی یہی ہے۔ انہوں نے بہت سی مثالیں اس موقف کے حق میں دی ہیں جیسے کہ "ان عتق العبد او کاتب تبعه ماله و ان افلس اخذ الغرماء ماله و لم يتبع سيده بشيء من دينه۔" اگر غلام آزاد ہو جائے یا مکاتبت کر لے تو اس کا مال اس کے ساتھ جائے گا اور اگر مفلس ہو جائے تو اس کے قرض خواہ اس کا مال لے لیں گے اور غلام کا آقا اس کے قرضے کا ذمہ دار نہ ہوگا"۔

مَا جَاءَ فِي الْعُهْدَةِ

گارنٹی کے بارے میں روایت

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِيْ بَكْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ اَنَّ اَبَانَ بْنَ عُثْمَانَ وَ هِشَامَ بْنَ اِسْمٰعِيْلَ كَانَا يَذْكُرَانِ فِيْ خُطْبَتِهِمَا عُهْدَةَ الرَّقِيْقِ فِي الْاَيَّامِ الثَّلٰثَةِ مِنْ حِيْنَ يُشْتَرَى الْعَبْدُ اَوِ الْوَلِيْدَةُ وَ عُهْدَةَ السَّنَةِ۔

﴿عبداللہ بن ابی بکر سے روایت ہے کہ ابان بن عثمان اور ہشام بن اسماعیل دونوں اپنے خطبات میں غلام

کی گارنٹی کا ذکر کرتے تھے، تین دن اس دن سے جس دن سے غلام یا لونڈی خریدی جائے اور ایک سال کا بھی ذکر کرتے تھے۔﴾

وضاحت :

جو چیز فروخت کے لیے پیش کی جائے اس کی گارنٹی تو ہونی چاہیے۔ جیسے کسی نے گائے یا بکری بیچی ہے تو خریدار کم از کم دو تین دن ملنے چاہئیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ کتنا دودھ دیتی ہے۔ یا گھوڑا ہے تو معلوم ہو جائے کہ اصیل ہے یا زلیل ہے کہ چلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اس زمانے میں مشینری کے آلات مثلاً ریفریجریٹر، ٹی وی وغیرہ میں گارنٹی کا رواج عام ہو چکا ہے۔ عام استعمال کی اشیاء میں بھی کئی دکاندار اس بات کا موقع دیتے ہیں کہ خریدار ان کی چیز کو رات رکھ کر تسلی کر لے۔

غلاموں کے بارے میں تین دن کی گارنٹی اور ایک سال کی گارنٹی کا ذکر ابان بن عثمان اور ہشام بن اسماعیل اپنے خطبات میں کرتے تھے۔ اصل روایت میں یہ ابہام ہے کہ تین دن کون سے لونڈی یا غلام کے لئے ہوتے تھے اور ایک سال کن کے لیے۔ امام مالک نے آگے اپنی وضاحت سے اس ابہام کو دور کیا ہے کہ اگر لونڈی اور غلام کو تین دن میں کوئی بیماری لگ جائے تو وہ فروخت کرنے والے کے ذمہ ہوگی، یعنی بیع رد کی جا سکتی ہے اور جنون، برص اور جذام کی صورت میں ایک سال کی گارنٹی ہوگی۔ ایسی بیماری اگر ایک سال میں بھی لاحق ہو گئی تو فروخت کنندہ ذمہ دار ہوگا۔

اسی طرح امام مالک کا فتویٰ ہے کہ اگر کسی نے غلام یا لونڈی جو میراث میں سے تھی یا کسی اور طرح سے اس کے پاس آئی تھی تندرستی کی گارنٹی کے ساتھ بیچی تو بائع پر اس کی ذمہ داری نہیں ہوگی۔ ہاں اگر غلام یا لونڈی میں عیب تھا جس کا بائع کو علم تھا تو گارنٹی اس کو فائدہ نہیں دے گی۔ ایسی بیع رد ہوگی۔

احناف کہتے ہیں کہ صرف تین دن کی گارنٹی ہوگی، سال بھر کی نہیں۔ تین دن کے بعد رد کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ اب لونڈی اور غلاموں کا معاملہ ختم ہونے کے بعد ان فتووں کی اب صرف تاریخی حیثیت رہ گئی ہے۔

اَلْعَيْبُ فِي الرَّقِيْقِ

غلام کا عیب دار ہونا

☐ حدثني يحيى عن مالك عن يحيى بن سعيد عن سالم بن عبدالله أن عبدالله بن عمر باع غلاما له بثمانمائة درهم وباعه بالبراءة فقال الذى ابتاعه لعبدالله بن عمر بالغلام داء" لم تسمه لي فاختصما الى عثمان بن عفان فقال الرجل باعني عبدا وبه داء" لم يسمه و قال عبدالله بعته بالبراءة فقضى عثمان بن عفان على عبدالله بن عمر أن يحلف له لقد باعه العبد وما به داء" يعلمه فابى عبدالله أن يحلف و ارتجع العبد فصح عنده فباعه عبدالله بعد ذلك بالف و خمسمائة درهم۔

سالم بن عبداللہ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ نے ایک غلام آٹھ سو درہم میں اس کی تندرستی کی گارنٹی کے ساتھ بیچا، خریدار نے آکر عبداللہ بن عمرؓ سے کہا کہ غلام میں ایک عیب ہے جس کا انہوں نے ذکر نہیں کیا تھا۔ دونوں مقدمہ عثمان بن عفانؓ کے پاس لے گئے۔ خریدنے والے کا بیان یہ تھا کہ عبداللہ بن عمرؓ نے غلام بیماری کی حالت میں بیچا لیکن اس بیماری کا ذکر نہیں کیا۔ عبداللہ بن عمرؓ کا بیان تھا کہ میں نے اس کو تندرستی کی حالت میں بیچا تھا۔ اس پر حضرت عثمان بن عفانؓ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کہا کہ آپ قسم کھایئے کہ آپ نے جس وقت غلام بیچا تھا تو اس وقت اس کو کوئی ایسی بیماری نہیں تھی جس کا آپ کو علم ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے قسم کھانے سے انکار کر دیا اور غلام واپس لے لیا۔ وہ ان کے پاس آکر ٹھیک ہو گیا تو عبداللہ بن عمرؓ نے اس کو پندرہ سو درہم میں بیچ دیا۔

وضاحت :

روایت کا مفہوم واضح ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے بھی اس بات کو ملحوظ رکھا کہ خریدار کو اس بات کا موقع ملنا چاہیے کہ اگر غلام میں کوئی عیب ہے تو آگاہ ہونے پر وہ بیع کو فسخ کرنے کے لیے کہے۔

مَا يُفْعَلُ بِالْوَلِيْدَةِ اِذَا بِيْعَتْ وَالشَّرْطُ فِيْهَا

اس لونڈی کے متعلق حکم جو شرط کے ساتھ بیچی جائے

☐ حدثني يحيى عن مالك عن ابن شهاب عن عبيدالله بن عبدالله بن عتبة بن مسعود اخبره ان عبدالله بن مسعود ابتاع جارية من امرأته زينب الثقفية واشترطت عليه انك ان بعتها فهي لي بالثمن الذي تبيعها به فسأل عبدالله بن مسعود عن ذلك عمر بن الخطاب فقال عمر بن الخطاب لا تقربها وفيها شرط" لاحد

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک لونڈی اپنی بیوی حضرت زینب ثقفیہ سے خریدی تو انہوں نے شرط لگادی کہ اگر آپ اس کو کبھی بیچنے والے ہوں تو اسی قیمت پر جس پر خرید رہے ہیں مجھے بیچ دیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے حضرت عمر بن خطابؓ سے فتویٰ پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ اس سے قربت نہ کرنا کیونکہ اس میں کسی کے لیے شرط ہے۔

وضاحت :

اگر بیع میں یا نکاح میں کوئی شرط ایسی ہو جو مقصد بیع یا مقصد نکاح کے منافی ہو تو اس شرط کے باعث اس میں فساد پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس معاملہ میں کوئی ایسی شرط عائد نہیں کی گئی جو عبداللہ بن مسعودؓ کو لونڈی ہبہ کرنے، آزاد کرنے یا مکاتبت کرنے سے روکتی ہو۔ لونڈی کی مالکہ نے صرف یہ کہا ہے کہ اگر اسے بیچا ہو تو اسی قیمت پر ان کو واپس انہی کے پاس بیچ دیں۔ یہ شرط مقصد بیع کے خلاف نہیں۔ اس لیے یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس میں لونڈی کی حرمت کی وجہ کیا ہے۔ البتہ حضرت عمرؓ کا فتویٰ یہی ہے۔

☐ حدثني عن مالك عن نافع عن عبدالله بن عمر انه كان يقول لا يطا الرجل وليدة الا وليدة ان شاء باعها و ان شاء وهبها و ان شاء امسكها و ان شاء صنع بها ماشاء۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا فتویٰ یہ ہے کہ آدمی لونڈی سے قربت نہیں کر سکتا مگر اس صورت میں جب کہ اس کو اختیار ہو کہ وہ چاہے تو اس کو بیچ دے، چاہے تو ہبہ کر دے، چاہے تو روک رکھے اور اس

سے جو معاملہ کرنا چاہے کر سکے۔

وضاحت :

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ فتویٰ حضرت عمرؓ کے مذکورہ بالا فتویٰ سے مختلف ہے اور میرے نزدیک صحیح ہے۔ مگر حضرت عمرؓ کے فتویٰ کی علت سمجھ میں نہیں آئی۔ واپس بائع کو پھل بیچنے کی شرط کسی طرح مکمل حق ملکیت کو متاثر نہیں کرتی کہ جس سے بیع فاسد ہوتی ہو۔

مَا جَاءَ فِي ثَمَرِ الْمَالِ يُبَاعُ أَصْلُهُ

جو درخت بیچ دیے گئے ہوں ان کے پھل کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ بَاعَ نَخْلًا قَدْ اُبِّرَتْ فَثَمَرُهَا لِلْبَائِعِ اِلَّا اَنْ يَشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ۔

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کھجوروں کا ایسا باغ بیچا جس میں گابھا لگایا جا چکا تھا تو اس کا پھل بیچنے والے کا ہوگا الا یہ کہ خریدنے والا شرط ٹھہرائے۔﴾

وضاحت :

عربوں میں گابھا لگانے کا ایک طریقہ رائج تھا کہ نر کھجور کے اندر سے کچھ ذرے لے کر مادہ کھجوروں کے اوپر چھڑکتے تھے تو پھل زیادہ آتا تھا۔ اسی کے متعلق دوسری روایت میں آتا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تم اگر یہ نہ کرو تو کیا ہوگا۔ لوگوں نے گابھا لگانا چھوڑ دیا تو پھل کم آئے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ "انتم اعلم بامور دنیا کم" (تم اپنے دنیاوی امور کو بہتر طور پر جانتے ہو) معلوم ہوا کہ یہ دینی کا معاملہ نہیں تھا اور نہ دین کا معاملہ تھا بلکہ یہ تجربات کا معاملہ تھا۔ جن چیزوں کا تعلق اس دنیا کے نفع عاجل سے ہے تو ان چیزوں کا تقاضا خود ہمارے اندر اتنا ہے کہ اس کے اصول، اس کی صنعت اور اس کے طریقے سکھانے کی مذہب کو ضرورت نہیں۔ ضرورت صرف یہ جاننے کی ہے کہ دنیا کی چیزوں کو کن اخلاقی حدود و قیود کے اندر رہ کر استعمال کریں۔ مثال کے طور پر مذہب کو ہمیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کپڑے کی تراش خراش کیسی ہو، ٹوپی اور پاجامے کی وضع قطع کیسی ہو۔ لیکن وہ اخلاقی حدود بتاتا

ہے کہ مرد ریشم کے کپڑے نہ پہنے، کپڑے سے تفاخر کا اظہار نہ ہو۔ مرد عورتوں کا اور عورتیں مردوں کا لباس اختیار نہ کریں، وغیرہ۔ البتہ آخرت کے متعلق یہ چیزیں بتانے کی ہیں کہ خدا کو راضی کرنے کا کیا طریقہ ہے، عبادت کس طرح کی جائے، رکوع و سجود کیسے ہونے چاہئیں۔ گویا اصل بات یہ ہے کہ دنیاوی امور کے لیے انسان کے اندر اتنی صلاحیت ہے کہ اس کو کچھ لگام لگانے کی ضرورت ہے، تمیز دینے کی نہیں۔ اس کو اخلاقی اصولوں کا پابند بنانا ضروری ہے۔

احناف کے نزدیک باغ کو گابھا لگایا گیا ہو یا نہ لگایا گیا ہو پھل فروخت کرنے والے کا ہوگا اور باغ کو پانی دینے اور اس کی حفاظت کے جتنے امور ہیں ان کی ذمہ داری مشتری پر نہ ہوگی اور خریدار کو یہ حق بھی ہے کہ وہ فروخت کنندہ سے یہ مطالبہ کر سکتا ہے کہ باغ کا پھل توڑ لو۔ میں اس کے پکنے کا انتظار نہیں کر سکتا۔ لیکن مالکیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ نہیں، خریدار پانی بھی دے گا، دیکھ بھال بھی کرے گا اور بائع کو پھل اس وقت تک روکنے کا حق ہے جب تک کہ اس کے اترنے کا وقت نہ آجائے۔

میرے نزدیک حنفیہ کا فتویٰ مصلحت سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے لیکن روایت کے الفاظ مالکیہ اور شافعیہ کے حق میں جاتے ہیں۔ بیع کے بارے میں یہ اصول معروف ہے کہ اگر بیع میں کوئی ایسی شرط لگا دی جائے جو مالکیت کے منافی ہو تو وہ بیع ناجائز ہے۔ اس اصول کے لحاظ سے حنفیہ کا مسلک درست ہے۔ اس اصول کو مالکیہ اور شافعیہ بھی مانتے ہیں کہ جب تک مکمل تملیک نہ ہو تو بیع نہیں ہوتی۔ باغ کی فروخت کی صورت میں اگر شرائط اس طرح کی ہوں کہ خریدنے والا باغ کو پانی دے، پھل کو پرندوں کے حملوں سے محفوظ رکھے اور اس وقت تک باغ کی دیکھ بھال کا ذمہ دار ہو جب تک پھل اترنے کا وقت نہیں آتا تو یہ بیع کیا ہوئی!

اَلنَّهْيُ عَنْ بَيْعِ الثِّمَارِ حَتّٰى يَبْدُوَ صَلَاحُهَا

صلاحیت ظاہر ہونے سے پہلے پھل فروخت کرنے کی ممانعت

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ بَيْعِ الثِّمَارِ حَتّٰى يَبْدُوَ صَلَاحُهَا نَهَى الْبَائِعَ وَ الْمُشْتَرِيَ۔

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پھل بیچنے سے منع فرمایا جب تک کہ

پھل کی صلاحیت ظاہر نہ ہو جائے- آپؐ نے بائع اور مشتری دونوں کو منع فرمایا۔

☐ حدثنی یحیی عن مالك عن حمید الطویل عن انس بن مالك ان رسول الله ﷺ نهی عن بیع الثمار حتی تزهی فقیل له یا رسول الله وما تزهی فقال حین تحمر و قال رسول الله ﷺ ارأیت اذا منع الله الثمرة فبم یأخذ احدکم مال اخیه-

(رسول اللہ ﷺ نے پھلوں کی بیع سے منع فرمایا ان کے پکنے تک- پوچھا گیا یا رسول اللہ! پکنے سے کیا مطلب ہے- فرمایا کہ جب تک دوسرخ نہ ہو جائے- پھر آپ نے فرمایا کہ بتاؤ، اگر اللہ پھل روک دے تو کس چیز کے بدلے تم اپنے بھائی کا مال لو گے ؟)

☐ حدثنی عن مالك عن ابی الرجال محمد بن عبدالرحمن بن حارثة عن امه عمرة بنت عبدالرحمن ان رسول الله ﷺ نهی عن بیع الثمار حتی تنجو من العاهة قال مالك وبیع الثمار قبل ان یبدو صلاحها من بیع الغرر

(عمرہ بنت عبدالرحمٰن بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے پھلوں کے بیچنے سے منع فرمایا جب تک کہ وہ آفت سے محفوظ نہ ہو جائیں- اور امام مالکؒ کا کہنا ہے کہ وہ بیع جو صلاحیت ظاہر ہونے سے قبل ہوتی ہے وہ بیع غرر (دھوکہ) ہوتی ہے-)

☐ حدثنی عن مالك عن ابی الزناد عن خارجة بن زید بن ثابت عن زید بن ثابت انه کان لا یبیع ثمارة حتی تطلع الثریا-

(زید بن ثابت کے متعلق روایت ہے کہ وہ اپنا باغ نہیں بیچتے تھے جب تک کہ ثریا طلوع نہ ہو-)

وضاحت :

ان تمام روایات میں نبی ﷺ نے باغ کے پھل کا سودا اس وقت تک کرنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ اس کی صلاحیت اور امکانات ظاہر نہ ہو جائیں-

پھل کی صلاحیت ظاہر ہونے کا کیا مطلب ہے، اس بارے میں روایات مختلف ہیں- ایک روایت میں ہے حتی

تزهی (جب تک پک نہ جائے) دوسری روایت میں ہے حتی یحمر (جب تک سرخی نہ پیدا ہو جائے) تیسری جگہ ہے حتی ینجو من العاهة (جب تک آفات سے محفوظ نہ ہو جائے) زید بن ثابت طلوع ثریا کے زمانہ میں باغ بیچتے- یہ گرمیوں کا زمانہ ہوتا ہے- بدو صلاح یعنی صلاحیت ظاہر ہونے کی شرط کب پوری ہوتی ہے، یہ بات واضح نہیں- حقیقت میں پھل محفوظ تو صرف اس وقت ہوتا ہے جب اس کو توڑ کر گھر میں ڈال لیا جائے- لیکن ظاہر ہے یہاں مراد معروف بلاؤں سے محفوظ ہونا ہے- ہر پھل کے نقصان کا ایک خاص زمانہ ہوتا ہے- اگر اس زمانے میں کوئی آفت نہ آئے تو باغ بچ جاتا ہے- پھر بعض روایات میں حتی ینبع کا لفظ بھی آیا ہے یعنی پھل پکنے لگے- ان تمام روایات کا مرکزی نکتہ میں یہ ایک پیچیدہ معاملہ ہو جاتا ہے کہ بدو صلاح کا صحیح مفہوم کیا ہے-

باغ کے معاملہ میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ اس میں صلاحیت کے ظہور کا کوئی وقت بھی ایسا نہیں ہو سکتا جو پورے باغ پر محیط ہو- کچھ پھل پہلے تیار ہو جاتے ہیں اور کچھ کافی مدت کے بعد تیار ہوتے ہیں- تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون سا وقت ہے جب باغ کا پھل بیچا جا سکتا ہے-

موجودہ زمانے میں ایک باغ، دو یا تین سال کے لیے ٹھیکے پر دینے کا رواج ہے- جب بیع ہوتی ہے تو پھل کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا لہذا بدو صلاح کا مرحلہ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا- حدیث کی رو سے یہ بیع جائز نہیں تو پھر اس کا حل کیا ہے ؟

پہلے قبد و صلاح کے معاملہ کو لیجئے- میرے نزدیک بدو صلاح کا مطلب یہ ہے کہ جب باغ کی پیداوار پر پھل کا اطلاق ہو سکے اور پھل اگرچہ اپنے تمام استعمالات کے لئے ابھی موزوں نہ ہو لیکن اتنی صلاحیت ضرور ہو چکی ہو کہ وہ کسی کام میں لایا جا سکے- مثلاً آم میں جب کیریاں یا گٹھلیاں بن جائیں اور وہ اچار وغیرہ کے کام میں لایا جا سکے تو اس وقت اس کو بیچا جائے- سالنے بھی کچے ہی قابل فروخت ہو جاتے ہیں تو اس حالت میں ان پر بدو صلاح کا اطلاق کیا جا سکتا ہے-

پورے باغ میں کسی ایک وقت میں بدو صلاح کا اطلاق نہیں ہو سکتا کیونکہ درخت پر کچھ پھل تو بدو صلاح کی حالت میں جلدی آجاتے ہیں اور آن حالیکہ اسی درخت پر پھول بھی آرہے ہوتے ہیں جن کو پھل بننے میں ایک یا دو

مہینے درکار ہوتے ہیں- احناف کے نزدیک اگر علاقے کے ایک باغ پر بھی بدو صلاح کی اصطلاح صادق آگئی تو دوسرے تمام باغوں پر بھی اس کا اطلاق ہوگا- یہ بھی ضروری نہیں کہ سارے کے سارے باغ پر بدو صلاح صادق آتی ہو- اگر کچھ پھل اس حالت کو پہنچ گئے ہوں تو پورے باغ پر اس کا اطلاق کر دیا جائے گا- اور ایسے باغ کی بیع جائز ہو گی- میرے نزدیک یہ رائے صحیح اور مسئلہ کا حل پیش کرتی ہے-

اب رہا ٹھیکے پر دینے کا مسئلہ جب کہ باغ میں پھل کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا تو اس مسئلے کو اس تناظر میں حل کرنا چاہیے کہ بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی حرمت سدِ ذریعہ کے لیے ہے- حقیقت میں ان کے اندر حرمت کا سبب موجود نہیں ہوتا لیکن چونکہ وہ ذریعہ بنتی ہیں حرام کا اس لیے ان کو روک دیا جاتا ہے- لہٰذا سدِ ذریعہ میں اصل مصلحت کا لحاظ رکھا جاتا ہے- وہ مصلحت اگر ملحوظ ہے تو دوسرا طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے-

میرے نزدیک یہ بیع جائز ہو سکتی ہے لیکن چند شرائط کے ساتھ- چونکہ روایت میں ہے کہ اگر اللہ پھل روک لے تو تم کس بنیاد پر اپنے بھائی کا مال لو گے تو اس خطرے کے تدارک کے لیے کہ ایک سال پھل کم آئے یہ کیا جا سکتا ہے کہ بیع ہو تو ایک سال کے لیے نہیں بلکہ کم از کم تین سال کے لئے ہونی چاہیے تاکہ اگر بالفرض ایک سال پھل نہیں آتا یا کم آتا ہے تو اس کی کمی یا نقصان کی تلافی بقیہ دو سالوں میں ہو جائے- اس لیے کہ یہ واقعہ ہے کہ بعض درخت یا باغ ایک سال اگر پھل کم دیتے ہیں تو اگلے سال بہت اچھا پھل بھی دیتے ہیں- تو اس مسئلہ کا حل صرف یہی ہے کہ دو یا تین سال کے لیے معاملہ کیا جائے- دوسری شرط یہ ہے کہ آفات کے متعلق یہ شرط عائد کر دی جائے کہ اگر نقصان ایک ثلث یا اس سے زیادہ ہو تو مالک اس کا ذمہ دار ہوگا- ماتحیہ کا فتویٰ بھی یہی ہے- اگر نقصان ایک ثلث سے کم ہو تو مالک بری ہوگا- یہی معاملہ اس صورت میں بھی ہوگا جب باغ پانی سے محروم ہو جائے اور پھل اس قدر کم کر دے کہ نقصان ایک تہائی سے زیادہ ہو جائے کیونکہ پانی کا انتظام مالک کے ذمہ ہوتا ہے، ٹھیکے دار کو اس پر اختیار نہیں ہوتا- اس وجہ سے یہ بھی ضروری ہے کہ ٹھیکے کی میعاد کم از کم تین سال ہو تاکہ اس قسم کی وجوہ سے جو نقصان ہو اس کی آئندہ سالوں میں تلافی ہو سکے-

ان شرائط کے تحت بیع میں حرمت کی علت باقی نہیں رہتی اور نہ ہی بیع میں کسی فریق کے لیے غرر یا ضرر کا پہلو پایا جاتا ہے-

مَاجَاءَ فِي بَيْعِ الْعَرِيَّةِ
عریہ کی فروخت کے بارے میں حکم

حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَرْخَصَ لِصَاحِبِ الْعَرِيَّةِ اَنْ يَبِيْعَهَا بِخَرْصِهَا

﴿زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صاحب عریہ کو اجازت دی کہ وہ اس کو تخمینہ کی بنیاد پر بیچ سکتا ہے-﴾

حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ دَاوٗدَ بْنِ الْحُصَيْنِ عَنْ اَبِي سُفْيَانَ مَوْلَى ابْنِ اَبِي اَحْمَدَ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَرْخَصَ فِي بَيْعِ الْعَرَايَا بِخَرْصِهَا فِيمَا دُوْنَ خَمْسَةِ اَوْسُقٍ اَوْ فِي خَمْسَةِ اَوْسُقٍ-

﴿حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے عرایا کو فروخت کرنے کی رخصت دی، تخمینہ کر کے، اگر اس کی مقدار پانچ وسق سے کم یا پانچ وسق ہو﴾

وضاحت:

"عریۃ" کے معنی باغ سے الگ کیا ہوا حصہ ہے- "عرایا" اس کی جمع ہے- عریہ کی شکل یہ ہوتی ہے کہ ایک آدمی کے پاس باغ ہو وہ اس کو بیچ دے لیکن ساتھ ہی یہ بھی چاہے کہ اس کا تازہ پھل بھی اس کو ملتا رہے تو وہ اس کی خاطر کچھ درخت مخصوص کر لے اور باغ والے سے یہ طے کر لے کہ وہ اس کے بدلے میں تخمینہ کر کے خشک پھل دے دے گا-

جب تولنا ممکن ہو نہ ناپنا تو اس وقت تخمینہ کا طریقہ ہی اختیار کیا جاتا ہے- خیبر کی پیداوار کے متعلق روایت میں آتا ہے کہ درخت پر ہی اس کے پھل کا تخمینہ کر لیا جاتا تھا کہ کتنا پھل اترے گا اور اس میں کتنی زکوٰۃ ہو گی- معلوم ہوا کہ ان صورتوں میں بیع تخمینہ سے بھی ہو سکتی ہے اور جائے خود تخمینہ پر شریعت کو کوئی اعتراض نہیں- تیسری خلاصے عریہ کی بیع میں قضیہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں بیع مزابنہ کی صورت ہے جس کی ممانعت ہے کیونکہ حکم یہ ہے کہ التمر بالتمر کیلا (کھجور کے بدلے کھجور ناپ کر فروخت کی جائے) اور عریہ کی صمدت یہ ہے کہ تازہ

پھل جو ابھی درخت پر ہے وہ خشک کھجور کے بدلے میں بیچا جائے تو یہ بیع المجہول بالمجہول ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔اس میں ربا اور قمار کا شائبہ بھی ہے۔

مالکیہ یہ کہتے ہیں کہ یہ بیع فی الحقیقت بیع ہے ہی نہیں بلکہ جس طرح کسی چیز میں سے کچھ منہا کر دیا ہوتا ہے یا کسی چیز کا مالک بنا دیا ہوتا ہے یہ اس نوعیت کی چیز ہے اور یہ بیع کی تعریف میں ہی نہیں آتی۔میرے نزدیک یہ صرف بات بنائی گئی ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ حقیقت میں مصلحت کی بنا پر ضرورت کے نظریہ کے تحت یہ ایک رخصت ہے اس لیے کہ ایک آدمی نے اپنا باغ تو بیچ دیا لیکن تازہ پھل کھانے کو جی چاہتا ہے تو اس کی کیا شکل ہو۔تو اس ضرورت کے تحت یہ عریہ کی شکل اختیار کی جاتی ہے۔لیکن اس میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مصلحت کی بنا پر ایک کام جو ناجائز ہے اس کو جائز کیا جا سکتا ہے۔شاہ ولی اللہ اس کا جواب اپنے رنگ میں یہ دیتے ہیں کہ ایک احکام مصالح عباد ہیں اور ایک احکام شرائع ہیں۔اگر ان میں تصادم ہو تو شریعت مقدم ہو گی۔میرے نزدیک یہ کوئی خاص نکتہ نہیں۔مصالح عباد شریعت ہی کا حصہ ہیں۔جو جائز ہے اس میں بھی مصلحت ہے اور جو حرام ہے اس میں بھی مصلحت ہے۔شریعت سے الگ کوئی مصالح نہیں اور شریعت کے تمام احکام میں مصلحت عباد ملحوظ ہے۔

میرے نزدیک بیع کی یہ شکل بیع مزابنہ میں ایک استثنا کی صورت ہے۔یہ ضرورت کے تحت بھی ہے اور اس شرط کے ساتھ بھی کہ مقدار پانچ وسق سے زیادہ نہ ہو۔مقدار معین کرنے سے غبن کا دروازہ بھی بند ہو جاتا ہے اور ضرورت بھی پوری ہو جاتی ہے۔اس میں کسی نقصان کا اندیشہ بھی نہیں ہوتا۔یہ رخصت صرف عریہ کے لئے ہے، دوسری شکلوں میں تر اور خشک کھجور کی بیع جائز نہیں۔

شاہ ولی اللہ نے اس روایت کی ترتیب بدل دی ہے اور اس کو بیع مزابنہ کے اوپر تمہید کے طور پر رکھ دیا ہے۔اس سے وہ یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ یہ بیع اسی کا حصہ ہے۔میرے نزدیک یہ بات معقول ہے۔

اَلْجَائِحَةُ فِی بَیْعِ الثِّمَارِ وَالزَّرْعِ

پھلوں اور کھیتی کی بیع میں آفت سے نقصان

❐ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِی الرِّجَالِ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ عَنْ اُمِّهٖ عَمْرَةَ بِنْتِ

عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّهٗ سَمِعَهَا تَقُوْلُ ابْتَاعَ رَجُلٌ ثَمَرَ حَائِطٍ فِی زَمَانِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَعَالَجَهٗ وَ قَامَ فِیْهِ حَتّٰی تَبَیَّنَ لَهُ النُّقْصَانُ فَسَاَلَ رَبَّ الْحَائِطِ اَنْ یَضَعَ لَهٗ اَوْ اَنْ یُقِیْلَهٗ فَحَلَفَ اَنْ لَا یَفْعَلَ فَاَتَتْ اُمُّ الْمُشْتَرِی اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَذَكَرَتْ ذٰلِكَ لَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تَاَلّٰی اَنْ لَا یَفْعَلَ خَیْرًا فَسَمِعَ بِذٰلِكَ رَبُّ الْحَائِطِ فَاَتٰی رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هُوَ لَهٗ.

﴿محمد بن عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی والدہ عمرہ بنت عبدالرحمٰن کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں پھلوں کا باغ خریدا۔اس نے اس کی دیکھ بھال کی اور اس میں ٹھہرا رہا یہاں تک کہ اس پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اس باغ میں نقصان ہو گا۔اس نے باغ کے مالک سے درخواست کی کہ وہ قیمت میں کچھ کمی کر دے یا بیع کو فسخ کر دے۔مالک نے قسم کھا کر کہا کہ وہ یہ نہیں کرے گا۔خریدنے والے کی والدہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور یہ قصہ بیان کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ عجیب بات ہے کہ اس نے نیکی نہ کرنے کی قسم کھائی ہے۔باغ والے نے جب یہ سنا تو فوراً رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ حضور میں نے مانا جو یہ کہتا ہے۔﴾

❐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِالْعَزِیْزِ قَضٰی بِوَضْعِ الْجَائِحَةِ قَالَ مَالِكٌ وَ عَلٰی ذٰلِكَ الْاَمْرُ عِنْدَنَا- قَالَ مَالِكٌ وَالْجَائِحَةُ الَّتِی تُوْضَعُ عَنِ الْمُشْتَرِی الثُّلُثُ فَصَاعِدًا وَلَا یَكُوْنُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ جَائِحَةً-

﴿امام مالک سے روایت ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے آفت کا نقصان منہا کرنے کا فیصلہ دیا۔امام مالک کہتے ہیں کہ ہمارا فتویٰ اسی پر ہے۔ان کا کہنا ہے کہ آفت کا نقصان جو مشتری سے منہا کیا جائے گا وہ ایک ثلث، قیمت یا اس سے زیادہ ہے۔نقصان ایک ثلث سے کم ہو تو یہ آفت قرار نہیں پائے گی۔﴾

وضاحت :

پہلی روایت اگرچہ مرفوع ہے لیکن بعض لوگوں نے اس کو مرسل کہا ہے تاہم اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ دوسری روایت میں ایک تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا اثر ہے اور دوسرا امام مالک کا فتویٰ ہے۔

پہلی روایت میں آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے متعلق دو مختلف رائیں ہیں۔ اس کی روشنی میں شوافع اور حنفیہ آفت کے نقصان کو پورا کرنا باغ کے مالک کے لیے مستحب مانتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ یہ فرماتے کہ اس شخص کو فوراً پکڑ کر حاضر کرو، وہ ایسی حرکت کس طرح کر سکتا ہے تب ہی وجوب کا پہلو نکلتا۔ مالکیہ آفت کا نقصان پورا کرنا واجب مانتے ہیں۔ آنحضرتؐ کے ارشاد سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کو نقصان سے چاہے وہ کتنی اہم نیکی اور ایسی چیز ہے جس کے نہ کرنے کی قسم نہیں کھانی چاہیے۔ اس لیے میرے نزدیک مالکیہ کا مذہب زیادہ قوی ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا عمل یہ تھا کہ آفت سے نقصان کی صورت میں قیمت میں کمی کرا دیتے تھے۔ ان کا عمل بھی خلیفہ راشد کی حیثیت سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک (یعنی فقہائے مدینہ کے نزدیک) یہ امر متفق علیہ ہے کہ خریدار سے نقصان کی قیمت منہا کر دی جائے بشرطیکہ نقصان ایک تہائی سے زیادہ ہو۔ ایک تہائی انہوں نے کس بنیاد پر لیا ہے اس کے لیے کوئی دلالۃ النص یا اشارۃ النص نہیں، یہ صرف ذوق سلیم پر مبنی ہے۔ اس بارے میں جب بھی قانون بنایا جائے گا تو کوئی نہ کوئی مقدار تو مقرر کرنی پڑے گی۔ مالکیہ نے وہ ایک تہائی مقرر کی ہے جو میرے نزدیک مناسب ہے۔ یہ بات بھی کہ ایک تہائی سے کم نقصان ہو تو وہ آفت کی تعریف میں نہیں آئے گا، نہایت معقول ہے۔

مَا يَجُوْزُ فِي اسْتِثْنَاءِ الثَّمَرِ

باغ کے پھل مستثنیٰ کرنے کے باب میں

☐ حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ رَبِيْعَةَ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّ الْقَاسِمَ بْنَ مُحَمَّدٍ كَانَ يَبِيْعُ ثَمَرَ حَائِطِهٖ وَ يَسْتَثْنِي مِنْهُ۔

﴿ربیعہ بن عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ قاسم بن محمد اپنے باغ کا پھل بیچتے تھے اور اس میں سے کچھ

درختوں کے پھل مستثنیٰ کر لیتے تھے۔﴾

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِي بَكْرٍ اَنَّ جَدَّهٗ مُحَمَّدَ بْنَ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ بَاعَ ثَمَرَ حَائِطٍ لَهٗ يُقَالُ لَهُ الْاَفْرَقُ بِاَرْبَعَةِ آلَافِ دِرْهَمٍ وَ اسْتَثْنٰى مِنْهُ بِثَمَانِمِائَةِ دِرْهَمٍ تَمْرًا۔

﴿عبداللہ بن ابی بکر اپنے دادا عمرو بن حزم سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے باغ، افرق کے پھل چار ہزار درہم میں فروخت کیے اور اس میں سے آٹھ سو درہم کے پھل مستثنیٰ کر لیے﴾

وضاحت :

ان دونوں روایتوں میں سے کوئی بھی حدیث نہیں۔ یہ روایات صحابہ کرامؓ کے عمل کو بیان کرتی ہیں۔ ان سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ باغ کے مالک کو اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ باغ فروخت کرتے وقت اس کے بعض درخت یا پھل کی کچھ مقدار اپنے استعمال کے لئے علیحدہ کر لے، جیسا کہ اوپر بیع عریہ کے متعلق بیان ہوا۔ ان روایات کے بعد امام مالک کا یہ فتویٰ بیان ہوا ہے کہ یہ امر ہمارے نزدیک مجتمع علیہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنا باغ بیچے تو اس میں سے ایک تہائی مقدار تک اپنے لیے مستثنیٰ کر سکتا ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ یہ کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ فقہائے مدینہ کا اس امر پر اتفاق ہے، اس کو اجماع امت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعض کم علم لوگوں نے اس کو اصطلاحی معنوں میں اجماع امت تصور کر کے اس پر یہ بحث شروع کر دی ہے کہ شوافع اور احناف اس کو نہیں مانتے، حالانکہ یہاں اس بحث کا کوئی موقع نہیں ہے۔

مَا يُكْرَهُ مِنْ بَيْعِ الثَّمَرِ

کھجور کی فروخت کی مکروہ شکل

☐ حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِبْنِ اَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ اَنَّهٗ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلتَّمْرُ بِالتَّمْرِ مِثْلًا بِمِثْلٍ فَقِيْلَ لَهٗ اِنَّ عَامِلَكَ عَلٰى خَيْبَرَ يَاْخُذُ الصَّاعَ بِالصَّاعَيْنِ۔ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اُدْعُوْهُ لِيْ فَدُعِيَ لَهٗ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَتَاْخُذُ الصَّاعَ بِالصَّاعَيْنِ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَا يَبِيْعُوْنَنِي الْجَنِيْبَ بِالْجَمْعِ صَاعًا بِصَاعٍ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِعِ

الْجَمْعَ بِالدَّرَاهِمِ ثُمَّ ابْتَعْ بِالدَّرَاهِمِ جَنِيبًا-

﴿عطاء بن یسار کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کھجور کے بدلے کھجور برابر خریدیں- پوچھا گیا کہ آپ کے عامل جو خیبر پر مقرر ہیں ایک صاع کھجور دو صاع کے بدلے خریدتے ہیں- آپؐ نے فرمایا کہ ان کو میرے پاس بلاؤ- جب وہ بلائے گئے تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ کیا تم ایک صاع کھجور دو صاع کے بدلے خریدتے ہو- اس پر انہوں نے کہا کہ یہ لوگ جنیب کھجور ملے جلے کھجوروں کے بدلے برابر دینے کو تیار نہیں ہوتے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جمع کھجور کو درہموں کے بدلے بیچ دیا کرو اور پھر ان درہموں سے جنیب کھجور خرید لیا کرو-﴾

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِالْحَمِيْدِ بْنِ سُهَيْلِ ابْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عَنْ اَبِي سَعِيْدِ الْخُدْرِي وَ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اسْتَعْمَلَ رَجُلًا عَلٰى خَيْبَرَ فَجَاءَهُ بِتَمْرٍ جَنِيْبٍ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَكُلُّ تَمْرِ خَيْبَرَ هٰكَذَا فَقَالَ لَا وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا لَنَاْخُذُ الصَّاعَ مِنْ هٰذَا بِالصَّاعَيْنِ وَالصَّاعَيْنِ بِالثَّلَاثَةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَفْعَلْ بِعِ الْجَمْعَ بِالدَّرَاهِمِ ثُمَّ ابْتَعْ بِالدَّرَاهِمِ جَنِيْبًا-

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو خیبر پر عامل بنایا- وہ جنیب کھجور لایا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا خیبر کی ساری کھجوریں ایسی ہوتی ہیں- اس نے کہا کہ نہیں، اللہ کی قسم- ہم اس کا ایک صاع دو صاع کے بدلے میں اور اس کے دو صاع تین صاع کے بدلے میں لیتے ہیں- اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو بلکہ جمع کھجور بیچ کر درہم لیا کرو اور پھر ان درہموں سے جنیب کھجور خرید کرو-﴾

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ يَزِيْدَ اَنَّ زَيْدًا اَبَا عَيَّاشٍ اَخْبَرَهُ اَنَّهُ سَاَلَ سَعْدَ ابْنَ اَبِي وَقَّاصٍ عَنِ الْبَيْضَاءِ بِالسُّلْتِ فَقَالَ لَهُ سَعْدٌ اَيَّتُهُمَا اَفْضَلُ قَالَ الْبَيْضَاءُ فَنَهَاهُ عَنْ ذٰلِكَ وَ قَالَ سَعْدٌ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يُسْئَلُ عَنِ اشْتِرَاءِ التَّمْرِ بِالرُّطَبِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ

اَيَنْقُصُ الرُّطَبُ اِذَا يَبِسَ فَقَالُوا نَعَمْ فَنَهٰى عَنْ ذٰلِكَ-

﴿ابو عیاش زید نے خبر دی کہ انہوں نے سعد بن ابی وقاص سے بیضاء کے سلت کے ساتھ تبادلے کے بارے میں پوچھا- سعد نے دریافت کیا کہ ان دونوں میں سے بہتر کون ہے- انہوں نے کہا کہ بیضاء۔ تو سعد نے ان کے تبادلے سے روک دیا اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ سے سنا- آپؐ سے پوچھا گیا کہ کیا خشک کھجور تر کھجور کے بدلے میں خریدا جا سکتا ہے، تو آپ نے دریافت فرمایا کیا تر کھجور خشک ہونے پر کم ہو جاتا ہے- لوگوں نے بتایا کہ ہاں- تو آپؐ نے اس سودے سے روک دیا-﴾

وضاحت:

جنیب- نہایت اعلیٰ قسم کی کھجور-

جمع- عام قسم کی ملی جلی کھجوریں-

رطب- تر اور تازہ کھجوریں-

بیضاء- جو کی ایک قسم جس کا چھلکا چکنا ہوتا ہے-

سلت- یہ بھی جو کی ایک قسم ہے جس کا چھلکا سخت ہوتا ہے- ایک قول یہ بھی ہے کہ گندم کی ایک قسم ہے-

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے کھجور کو کھجور کے عوض فروخت کرنے سے منع فرمایا اور تبادلہ کی یہ صورت تجویز فرمائی کہ کھجور کو فروخت کر کے دام کھرے کیے جائیں اور اس رقم سے دوسری کھجور خرید کی جائے- یہی طریقہ دوسری اجناس کے مبادلہ کی صورت میں بھی استعمال ہوگا- اسی لیے جب حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے جو کی قسموں کے مبادلے کی بابت دریافت کیا گیا تو انہوں نے کھجور پر قیاس کر کے اس کے مبادلہ سے منع فرمایا-

ان روایات میں بظاہر اشکال ہے- اول تو بیع ایک ہی قسم کی جنس کے تبادلے کی ضرورت سمجھ میں نہیں آتی- آخر ایک شخص ایک قسم کی چیز کا بیع اسی قسم کی چیز کے ساتھ تبادلہ کیوں کرے گا- تبادلہ تو اسی صورت میں ہوگا جب دونوں قسمیں مختلف ہوں- دوسرے جب جنس میں اختلاف موجود ہو تو برابر خرید و فروخت ممکن نہیں- اعلیٰ قسم کی کھجور کے عوض اسی مقدار میں ردی کھجور آخر کوئی شخص کیوں قبول کرے گا- مثال کے طور پر بیع کی گندم

بہت اعلیٰ ہوتی ہے اور عام گندم سے اس کا تبادلہ قرین انصاف بھی نہیں اور معاملے کے لحاظ سے ممکن بھی نہیں- یہی حال باسمتی اور اری چاول کا ہے- دونوں اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بہت مختلف ہیں اور منڈی میں ان کی قیمتیں الگ الگ ہوتی ہیں- عملی زندگی میں یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص باسمتی چاول کے عوض اری چاول برابر مقدار میں قبول کرلے-

بعض فقہاء اس کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ اگر کسی کو نفع اٹھانا ہو تو صحیح عقد کے ذریعے سے کرے یعنی باقاعدہ معاملہ کی شکل اختیار کرے- اس صورت میں ربا کا فائدہ حاصل ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں- میرے نزدیک یہ جواب صحیح نہیں- یہ تو حیلہ کی ایک شکل ہوئی جو شیطان کا راستہ ہے- اور اگر مسئلہ کا حل نہ نکالا جائے تو زندگی اتنی تنگ ہو جاتی ہے کہ چلنا محال ہو جاتا ہے- لہٰذا یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ نبیؐ نے جو حکم دیا ہے اس کی حکمت کیا ہے، اس لیے کہ روایت کی تکذیب کی کوئی وجہ نہیں-

میرے نزدیک آپ کی یہ ہدایت سدذریعہ کے اصول کے تحت تھی- اجناس کے تبادلہ میں مقدار کی کمی بیشی ظاہری طور پر ربا کی ایک قسم نظر آتی ہے- شریعت کا یہ اصول ہے کہ جب کسی برائی کا عام رواج ہو اور اس سے بچنا لوگوں کے لیے آسان نہ ہو تو ان تمام چیزوں کو جو اس برائی کا ذریعہ بن سکتی ہیں یا جن میں حرام کا مظنہ پایا جائے روک دیا جاتا ہے تاکہ اس برائی کا سدباب ہو جائے اور اس کی نفرت طبیعتوں پر غالب آجائے- اس کی ایک مثال ان برتنوں کے استعمال کی ممانعت ہے جو زمانہ جاہلیت میں شراب بنانے اور پینے کے کام آتے تھے- جب شراب کی حرمت کا حکم پوری طرح نافذ ہو گیا تو آپ نے دوسرے مقاصد کے لیے ان برتنوں کے استعمال پر سے پابندی اٹھالی-

باقی رہا مسئلہ کا حل تو اس بارے میں دوسری روایات موجود ہیں جو اس صورت میں اجناس کے تبادلے کا جواز مہیا کرتی ہیں جب سودا اجناس کی موجودگی میں ہو رہا ہو، ادھار نہ ہو- آپؐ نے فرمایا لا ربا الا فی النسیۃ (سود ادھار کی صورت کے سوا نہیں ہوتا) ظاہر ہے کہ جب معاملہ آمنے سامنے ہو گا تو اس صورت میں تفاضل کی کوئی بنا کوئی بنیاد موجود ہو گی- ادھار میں تفاضل کی صورت میں ربا کا مظنہ موجود ہوتا ہے- اسی طرح صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب الصرف وبیع الذھب بالورق نقدا میں حضرت عبادہ بن الصامت کی ایک روایت کے الفاظ ہیں اذا اختلفت ھذہ الاصناف فبیعوا کیف شئتم (جب یہ اجناس مختلف ہو جائیں تو جس طرح چاہو ان کا سودا کرو) اس روایت کی رو سے گندم اور چاول کی اعلیٰ و ادنیٰ قسموں میں یا سونے چاندی کے مختلف قیراط ہونے کی صورت میں

ان کی کمی بیشی کے ساتھ سودا جائز ہو گا-

مَاجَاءَ فِی الْمُزَابَنَةِ وَالْمُحَاقَلَةِ
مزابنہ اور محاقلہ کے بارے میں حکم

حدثنی یحیی عن مالك عن نافع عن عبد الله بن عمر أن رسول الله ﷺ نهی عن المزابنة و المزابنة بیع الثمر بالتمر کیلا و بیع الکرم بالزبیب کیلا-

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مزابنہ سے منع فرمایا- مزابنہ یہ ہے کہ کھجور کی بیع تازہ پھل کے ساتھ اور انگور کی بیع منقے کے ساتھ وزن کر کے کی جائے-﴾

حدثنی عن مالك عن داود بن الحصین عن أبی سفیان مولی ابن أبی أحمد عن أبی سعید الخدری أن رسول الله ﷺ نهی عن المزابنة والمحاقلة والمزابنة اشتراء الثمر بالتمر فی رؤوس النخل و المحاقلة کراء الأرض بالحنطة-

﴿ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مزابنہ اور محاقلہ سے منع کیا ہے- مزابنہ تو یہ ہے کہ خشک کھجور کا سودا اس تازہ کھجور کے عوض کیا جائے جو درخت کے اوپر ہے اور محاقلہ یہ ہے کہ زمین کا کرایہ گندم کو ٹھہرا دیا جائے-﴾

حدثنی عن مالك عن ابن شهاب عن سعید بن المسیب أن رسول الله ﷺ نهی عن المزابنة والمحاقلة و المزابنة اشتراء الثمر بالتمر و المحاقلة اشتراء الزرع بالحنطة و استکراء الأرض بالحنطة

قال ابن شهاب فسألت سعید بن المسیب عن استکراء الأرض بالذهب والورق فقال لا بأس بذلك-

﴿سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مزابنہ اور محاقلہ سے منع فرمایا- مزابنہ تو خشک کھجور کے بدلے درخت پر لگی تازہ کھجور خریدنا ہے اور محاقلہ کھیتی کو گندم کے بدلے یا زمین کو گندم کے بدلے کرایہ پر لینا ہے-

لٰکن شہاب کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن المسیب سے زمین سونے یا چاندی کے بدلے میں کرائے پر لینے کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا اس میں کوئی حرج نہیں۔﴾

وضاحت :

ان تینوں روایات میں ایک ہی مضمون ہے۔ یعنی یہ کہ تازہ پھل اور خشک پھل کی بیع ایک دوسرے سے جائز نہیں، اس لیے کہ ایک طرف تو ایک معین شے ہے لیکن دوسری طرف غیر معین اور مجہول شے ہے۔ تازہ پھل جو ابھی درخت پر ہے کی مقدار کا صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ پھر وہ آفات سے محفوظ بھی نہیں ہوتا۔ یہی صورت حال انگور اور منقے کے چارے میں پیش آتی ہے۔ اس میں بھی بیع مجہول شے کی متعین شے کے ساتھ ہے۔ بیع درست ہونے کے لیے شریعت کا ایک اصول یہ ہے کہ دونوں چیزوں ثمن یا مبیع میں سے ایک بھی مجہول نہ ہو۔ دونوں قطعی طور پر معین ہوں تاکہ ضرر یا غرر کا امکان نہ رہے۔ یعنی کوئی پارٹی نقصان نہ اٹھائے۔

اگر چھوہارے کی تمیز خشک اور تر کھجور دونوں کے ساتھ مان لی جائے تب بھی ان دونوں کی بیع جائز نہیں۔ کیونکہ نبی کریمؐ نے خشک اور تر کھجور کے مبادلے سے منع فرمایا ہے۔ جہاں تک بیع عریہ کا تعلق ہے اگرچہ اس میں بھی تازہ کھجور کے بدلے خشک کھجور ہی دی جاتی ہے تاہم اس میں پانچ وسق کی مقدار لوگوں کی ضرورت اور مصلحت کے تحت جائز کر دی گئی ہے۔ ایک شخص جب اپنا باغ بیچ دیتا ہے تو اس کے تازہ پھل کا وہ پھر بھی حاجت مند ہوتا ہے۔ اس کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ باغ کے تازہ پھل خشک پھل کے بدلے (یا ہری فصل جنس کے عوض) حاصل کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس کی مقدار پانچ وسق سے زیادہ نہ ہو۔

زمین کے کرائے کے طور پر گندم دینے کا معاملہ بھی جائز نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں غرر ہے۔ معلوم نہیں اس قطعہ زمین میں گندم کتنی پیدا ہوتی ہے۔ ہوتی بھی ہے کہ نہیں۔ یہ صورت معاملہ اس عام اصول کے خلاف ہے جس کے تحت کسی بھی فریق کو ضرر یا غرر نہیں ہونا چاہیے۔ سعید بن مسیب کے بیان کی رو سے فقہائے مدینہ کی رائے میں زمین کا کرایہ نقدی کی صورت میں ادا کرنا جائز ہے۔ ہمارے ہاں بعض لوگ بڑے دھوم دھام سے یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ زمین کرایہ پر دینا حرام ہے۔ انھوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مکان کا کرایہ لینا بھی ناجائز ہے۔ بہر حال مدینہ کے بڑے فقہا کی رائے یہی ہے کہ زمین کرائے پر لی جا سکتی ہے۔ اس میں جو قباحت ہے تو اس کا حل، جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، یہ ہے کہ زمین ایک سال کے لئے نہیں بلکہ دو تین سال کے لیے دی جائے تاکہ اگر ایک

سال فصل کم آئے تو دوسرے یا تیسرے سالوں میں اس کی تلافی ہو سکے۔ نیز اگر کسی آفت سے کرایہ دار کا نقصان ایسے تہائی قیمت سے زیادہ ہو جائے تو مالک اس کی بھی تلافی کر دے۔

بَيْعُ الذَّهَبِ بِالْفِضَّةِ تِبْرٌ اَوْ عَيْنًا

سونے کی بیع چاندی سے، خواہ ٹکڑوں کی شکل میں ہو یا نقدی کی صورت میں

حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ اَنَّهُ قَالَ اَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ السَّعْدَيْنِ اَنْ يَبِيْعَا اٰنِيَةً مِنَ الْمَغَانِمِ مِنْ ذَهَبٍ اَوْ فِضَّةٍ فَبَاعَا كُلَّ ثَلَاثَةٍ بِاَرْبَعَةٍ عَيْنًا وَكُلَّ اَرْبَعَةٍ بِثَلَاثَةٍ عَيْنًا فَقَالَ لَهُمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَرَبَيْتُمَا فَرُدَّا۔

﴿یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سعدین (یعنی سعد بن ابی وقاصؓ اور سعد بن عبادہؓ) کو حکم دیا کہ غنیموں سے سونے یا چاندی کے جو برتن ملے ہیں ان کو بیچ دو۔ انہوں نے تین کو چار مثقال میں یا چار کو تین مثقال میں بیچ دیا۔ آپ نے فرمایا یہ تو تم نے ربا کا کام کیا ہے۔ چنانچہ دونوں نے سودا لوٹا دیا﴾

حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُوْسَى بْنِ اَبِي تَمِيْمٍ عَنْ اَبِي الْحُبَابِ سَعِيْدِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَلدِّيْنَارُ بِالدِّيْنَارِ وَالدِّرْهَمُ بِالدِّرْهَمِ لَا فَضْلَ بَيْنَهُمَا۔

﴿ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دینار کے بدلے دینار ہے اور درہم کے بدلے درہم۔ دونوں کے درمیان کمی بیشی نہ ہونی چاہیے۔﴾

حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ اَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا تَبِيْعُوا الذَّهَبَ بِالذَّهَبِ اِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ وَلَا تُشِفُّوْا بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ وَلَا تَبِيْعُوا الْوَرِقَ اِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ وَلَا تُشِفُّوْا بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ وَلَا تَبِيْعُوْا مِنْهَا شَيْئًا غَائِبًا بِنَاجِزٍ۔

﴿ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سونے کے بدلے سونا بیچو مگر برابر

برابر اور ایک کو دوسرے پر ذرا برابر بھی زیادہ نہ کرو- اور چاندی کو چاندی کے بدلے نہ بیچو مگر برابر برابر اور ایک کو دوسرے پر ذرا بھی زیادہ نہ کرو اور ان سے کسی غائب کو نقد کے عوض نہ بیچو-﴾

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ حُمَيْدِ بْنِ قَيْسٍ الْمَكِّيِّ عَنْ مُجَاهِدٍ اَنَّهُ قَالَ كُنْتُ مَعَ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ فَجَاءَهُ صَائِغٌ فَقَالَ لَهُ يَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اِنِّي اَصُوْغُ الذَّهَبَ ثُمَّ اَبِيْعُ الشَّيْءَ مِنْ ذٰلِكَ بِاَكْثَرَ مِنْ وَزْنِهِ فَاَسْتَفْضِلُ مِنْ ذٰلِكَ قَدْرَ عَمَلِ يَدِي فَنَهَاهُ عَبْدُ اللّٰهِ عَنْ ذٰلِكَ فَجَعَلَ الصَّائِغُ يَرْدُدُ عَلَيْهِ الْمَسْئَلَةَ وَ عَبْدُ اللّٰهِ يَنْهَاهُ حَتّٰى انْتَهٰى اِلٰى بَابِ الْمَسْجِدِ اَوْ اِلٰى دَابَّةٍ يُرِيْدُ اَنْ يَرْكَبَهَا ثُمَّ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ اَلدِّيْنَارُ بِالدِّيْنَارِ وَ الدِّرْهَمُ بِالدِّرْهَمِ لَا فَضْلَ بَيْنَهُمَا هٰذَا عَهْدُ نَبِيِّنَا اِلَيْنَا وَ عَهْدُنَا اِلَيْكُمْ

﴿مجاہد کہتے ہیں کہ میں عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ تھا کہ ایک سنار آیا- اس نے پوچھا کہ اے ابو عبدالرحمٰن (یہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی کنیت ہے) میں سونے کے زیور بناتا ہوں اور اس میں کوئی چیز سونے کے اصل وزن سے زیادہ پر بیچ دیتا ہوں- اس طرح میں اپنی محنت کے بقدر اس سے چا لیتا ہوں- عبداللہ بن عمر نے اس کو ایسا کرنے سے منع کیا- سنار نے اپنا سوال دہرایا لیکن عبداللہ بن عمرؓ برابر انکار کرتے رہے یہاں تک کہ مسجد کے دروازے تک یا اپنی سواری تک سوار ہونے کے لیے پہنچ گئے- پھر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ دینار کے بدلے دینار اور درہم کے بدلے درہم ہے- ان کے درمیان کوئی تفاضل نہیں- یہ ہمارے نبی کا ہم سے اور ہمارا تم سے عہد ہے-﴾

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ عَنْ جَدِّهِ مَالِكِ بْنِ اَبِي عَامِرٍ اَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ قَالَ قَالَ لِي رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَبِيْعُوا الدِّيْنَارَ بِالدِّيْنَارَيْنِ وَ لَا الدِّرْهَمَ بِالدِّرْهَمَيْنِ-

﴿عثمان بن عفانؓ کہتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک دینار کو دو دینار اور ایک درہم کو دو درہم کے بدلے نہ بیچو-﴾

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ اَنَّ مُعَاوِيَةَ بْنَ اَبِي سُفْيَانَ بَاعَ

سِقَايَةً مِنْ ذَهَبٍ اَوْ وَرِقٍ بِاَكْثَرَ مِنْ وَزْنِهَا فَقَالَ اَبُو الدَّرْدَاءِ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَنْهٰى عَنْ مِثْلِ هٰذَا اِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ فَقَالَ لَهُ مُعَاوِيَةُ مَا اَرٰى بِمِثْلِ هٰذَا بَاْسًا فَقَالَ اَبُو الدَّرْدَاءِ مَنْ يَعْذُرُنِي مِنْ مُعَاوِيَةَ اَنَا اُخْبِرُهُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَ يُخْبِرُنِي عَنْ رَاْيِهِ لَا اُسَاكِنُكَ بِاَرْضٍ اَنْتَ بِهَا ثُمَّ قَدِمَ اَبُو الدَّرْدَاءِ عَلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهُ فَكَتَبَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اِلٰى مُعَاوِيَةَ اَنْ لَا تَبِعْ ذٰلِكَ اِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ وَزْنًا بِوَزْنٍ-

﴿عطاء بن یسار روایت کرتے ہیں کہ معاویہ بن ابو سفیانؓ نے سونے یا چاندی کا ایک پیالہ اس کے اپنے وزن سے زیادہ کے عوض بیچا- ابو الدرداءؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ اس طرح کی بیع سے منع فرماتے تھے مگر برابر برابر پر- امیر معاویہؓ نے کہا کہ میں اس میں کوئی قباحت نہیں دیکھتا- ابو الدرداءؓ نے کہا معاویہؓ سے کون میری جان چھڑائے گا- میں اس شخص کو رسول اللہ ﷺ کی حدیث سناتا ہوں اور یہ مجھے اپنی رائے بتاتا ہے- میں تو تمہارے ساتھ اس زمین پر رہنے کا نہیں جس زمین پر تم رہتے ہو- پھر حضرت ابو الدرداءؓ حضرت عمرؓ بن خطاب کے پاس آئے اور ان سے ذکر کیا تو انہوں نے حضرت معاویہؓ کو لکھ بھیجا کہ ان چیزوں کو برابر برابر ہی ہم وزن بیچو-﴾

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ لَا تَبِيْعُوا الذَّهَبَ بِالذَّهَبِ اِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ وَلَا تُشِفُّوا بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ وَلَا تَبِيْعُوا الْوَرِقَ بِالْوَرِقِ اِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ وَلَا تُشِفُّوا بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ وَلَا تَبِيْعُوا الْوَرِقَ بِالذَّهَبِ اَحَدُهُمَا غَائِبٌ وَالْاٰخَرُ نَاجِزٌ وَ اِنِ اسْتَنْظَرَكَ اِلٰى اَنْ يَلِجَ بَيْتَهُ فَلَا تُنْظِرْهُ اِنِّي اَخَافُ عَلَيْكُمُ الرِّمَاءَ وَالرِّمَاءُ هُوَ الرِّبَا-

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ سونے کو سونے کے عوض نہ بیچو مگر برابر اور ذرا بھی اس سے کم و بیش نہ کرو- اور چاندی کو چاندی کے بدلے نہ بیچو مگر برابر اور ذرا بھی کم و بیش نہ کرو- اور چاندی کو سونے کے بدلے اس صورت میں نہ بیچو کہ ایک چیز تو غائب ہو اور

دوسری موجود ہو- اور اگر تم سے کوئی اتنی سی مہلت مانگے کہ غائب چیز کو گھر میں داخل ہو کر لے آئے گا تو اس کی مہلت بھی نہ دو- مجھے ڈر ہے کہ تم ربا میں نہ پڑ جاؤ-﴾

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ عَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ اَنَّهٗ قَالَ: قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ الدِّيْنَارُ بِالدِّيْنَارِ وَالدِّرْهَمُ بِالدِّرْهَمِ وَالصَّاعُ بِالصَّاعِ وَلَا يُبَاعُ كَالِئٌ بِنَاجِزٍ-

﴿قاسم بن محمد سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ دینار کے بدلے دینار اور درہم کے بدلے درہم اور صاع کے بدلے صاع چکو- ادھار کے بدلے نقد نہ بیچا جائے-﴾

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِي الزِّنَادِ اَنَّهٗ سَمِعَ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ يَقُولُ لَارِبًا اِلَّا فِي ذَهَبٍ اَوْ فِي فِضَّةٍ اَوْ مَا يُكَالُ اَوْ يُوزَنُ بِمَا يُؤْكَلُ اَوْ يُشْرَبُ -

﴿سعید بن مسیب کا فتویٰ ہے کہ سود نہیں مانا جائے گا مگر سونے یا چاندی میں یا جو چیز ناپی جاتی ہو یا وزن کی جاتی ہو یا کھائی جاتی ہو یا پی جاتی ہو-﴾

وضاحت :

مذکورہ روایات میں مرفوع روایات بھی ہیں، تعامل صحابہ کی روایات بھی ہیں اور فتوی بھی- ان میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اگر ایک ہی جنس کی دو چیزیں ایک دوسرے کے بدلے میں فروخت کی جائیں تو دونوں کی مقدار برابر ہونی ضروری ہے- اس میں مقدار مختلف نہ ہونے پائے- لہٰذا اگر سونے کا سونے سے، چاندی کا چاندی سے، ایک دینار کے سکے کا دوسرے دینار کے سکے سے، ایک درہم کا دوسرے درہم سے، اجناس میں سے ایک جنس کا اسی جنس سے تبادلہ کیا جائے تو اس میں تفاضل جائز نہ ہوگا- یعنی ایک سونے کو دوسرے پر اور ایک چاندی کو دوسری چاندی پر فوقیت دے کر مقدار میں کمی بیشی نہ کی جائے گی-

تبادلہ کی جانے والی اشیاء جب ایک ہی جنس سے ہوں تو ان کی مقدار کا برابر ہونا سمجھ میں آتا ہے لیکن ایسے تبادلے کی زندگی میں عام ضرورت سمجھ میں نہیں آتی- اگر کبھی کوئی موقع ایسا پیش آجائے تو ان روایات کی روشنی میں مبادلہ برابر برابر ہی کی بنیاد پر ہوگا-

نبی ﷺ کے زمانے میں سونے یا چاندی کی ایک ہی قسم رہی ہوگی- اس طرح سونے کا سکہ دینار اور چاندی کا

سکہ درہم ہوتا تھا- آپ نے ان کے آپس میں تبادلہ کی صورت میں تفاضل کو منع فرمایا- رہا سونے چاندی کے زیورات کو برابر برابر فروخت کرنے کا معاملہ تو ان کی نوعیت سادہ زیورات کی نہیں رہی ہوگی بلکہ چاندی یا سونے کے ٹکڑوں کی رہی ہوگی جس کے باعث آپ نے برابر برابر بیچنے کا حکم دیا اور زائد پر بیچنے کو ربا کہہ کر بیع کو رد فرمایا-

موجودہ زمانے میں سونے اور چاندی کی کئی اقسام وجود میں آگئی ہیں- مثلاً سونا ۸ قیراط سے لے کر ۲۴ قیراط تک کا ہے- ہر ایک قسم کی کوائنی متعین ہے اور ہر قسم کا بازار کا بھاؤ الگ الگ ہے- یہی حال چاندی کا ہے- اگر ۲۲ یا ۲۴ قیراط سونے کے باہم تبادلہ کی صورت پیش آئے تو ظاہر ہے کہ اس میں تفاضل رہا ہوگا- لیکن اگر مختلف قیراط سونے کا تبادلہ مقصود ہو تو ان کو مختلف اجناس کے طور پر لیا جائے گا تو ان پر اس قاعدہ کا اطلاق ہوگا جس کا اوپر حوالہ آچکا ہے- کہ اذا اختلفت هذه الاصناف فبيعوا كيف شئتم (جب یہ اجناس مختلف ہوں تو جس طرح چاہو بیچو)

زیورات کا بھی یہی حال ہے- ان میں جو کاریگری اور صنعت کی گئی ہے یا اس میں موتی یا ہیرے جڑ کے گئے ہیں تو میرے نزدیک اس سے ان کی جنس بدل جاتی ہے- ان کا عام سونے سے برابر برابر تبادلے کا سوال پیدا نہیں ہوتا- رہا حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا فتویٰ جس میں انہوں نے سنار کو منع کر دیا کہ وہ اپنی محنت کے بقدر زیادہ وزن پر نہیں بیچ سکتا تو آج کل یہ بھی مسئلہ نہیں رہا کیونکہ نوٹوں سے خریداری ہوتی ہے- حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے سنار کو جس بات سے منع کیا وہ شاید یہ تھی کہ وہ گاہک کے دیے ہوئے سونے ہی میں سے اپنی مزدوری وضع کر لیتا تھا- ظاہر ہے کہ یہ شکل گاہک کے لیے ضرر اور غرر کا باعث ہو سکتی تھی اور اس میں ربا کا شبہ بھی تھا- بہر حال حضرت ابن عمرؓ نے اپنے مسلک کے جواز میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی بات نہیں کہی- صرف الدینار بالدینار کی روایت ہی کا حوالہ دیا جس کے تحت صنعت یا کاریگری کی صورت از خود شامل نہیں ہو جاتی-

اسی طرح کا دوسرا واقعہ حضرت امیر معاویہؓ اور ابو الدرداءؓ کا ہے- حضرت امیر معاویہؓ نے اپنا پیالہ اس کے وزن سے زیادہ پر بیچا تو ابو الدرداءؓ کو اس پر اعتراض ہوا اور انہوں نے معاملے کو حضرت عمر بن خطابؓ کے سامنے پیش کر دیا- جنہوں نے امیر معاویہؓ کو لکھ بھیجا کہ وہ ایسا نہ کریں- اس واقعہ میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ پیالے کی نوعیت کیا تھی- سادہ تھا یا جڑاؤ- سادہ برتنوں پر نہایت نفیس کاریگری بھی عموماً کی جاتی ہے- پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ حضرت امیر معاویہؓ نے بیع کو روک لیا یا نہیں- گمان یہی ہے کہ انہوں نے بیع نہیں کیا ہوگا- اس پیالے کے متعلق میرا گمان یہ ہے کہ یہ کافی قیمت کا تھا اور اس میں جڑاؤ چیزیں لگی ہوئی تھیں- میرے اصول کے مطابق دو ایک دوسری جنس تھا

جس کو حضرت معاویہؓ بازار کی قیمت پر بیچ سکتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اصولی حکم بیان کر دیا۔ عین ممکن ہے کہ ان کو پیالے کی قدر و قیمت کی پوری اطلاع نہ ہو۔ یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ حضرت عمرؓ اس واقعہ میں کس طرح شامل ہوئے۔ اس روایت کے متعلق ابن عبدالبر کی تحقیق یہ ہے کہ یہ صرف ایک ہی طریقے سے مروی ہے اس لیے تمام پہلو واضح نہیں ہوتے جو روایت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔ حضرت عمرؓ کے ساتھ اس کا تعلق کچھ خلاف عقل معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا مسئلہ جو ان روایات سے سامنے آتا ہے وہ ایسے سودے کی ممانعت ہے جس میں تبادلہ کی جانے والی ایک شے سامنے موجود نہ ہو یا اس کا ادھار کیا جا رہا ہو۔ حضرت عمرؓ نے یہاں تک فرمایا کہ اگر ایک فریق یہ کہے کہ میں ابھی گھر جا کر دام لے آتا ہوں تب بھی اس کو مہلت نہ دو۔ مجھے ربا کا اندیشہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہدایت احتیاطی تدبیر کے لیے ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ یہ سودا ہے بلکہ اس اندیشہ کا اظہار فرمایا کہ اس ذریعہ سے تم سود میں نہ پڑ جاؤ۔ یہ سب روایات احتیاط کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ ایسے احکام کا مزاج تشدد کا ہوتا ہے تاکہ لوگوں میں ذریعہ پیدا نہ ہو۔

آخری روایت میں سعید بن مسیب کا فتویٰ ہے کہ سود کا اطلاق صرف سونے، چاندی، ناپی جانے والی چیزوں، تولی جانے والی چیزوں، کھائی جانے والی چیزوں اور پی جانے والی چیزوں پر ہوتا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا سود کا تعلق صرف انہی چھ چیزوں سے ہے، بقیہ تمام چیزوں میں آزادانہ لین دین جائز ہے۔ اس صورت میں ضروری ہوتا ہے کہ سب میں قدر مشترک تلاش کی جائے۔ وہ علت معلوم کی جائے جو ان چھ چیزوں میں ربا کی پائی جاتی ہو۔ اہل ظاہر کا مذہب یہ ہے کہ ربا صرف انہی چھ چیزوں میں ہے اوروں میں نہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں ناپا تولا جانا علت ہے اور یہ علت جس چیز میں پائی جائے گی اس میں ربا پایا جائے گا۔ بعض کہتے ہیں کہ ثمنیت علت مشترک ہے۔ میرے نزدیک جامع تعبیر یہ ہے کہ ہر وہ چیز اس میں آئے گی جو مبادلہ کی حیثیت رکھتی ہو یا مبادلے کا کام دے سکتی ہو۔ اس لیے کہ ربا جب بھی پیدا ہوگا مبادلے کی چیز میں ہوگا۔ لہٰذا اس میں یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ مبادلہ کی صورت میں تفاضل نہ ہو، معاملہ نسیہ (ادھار) نہ ہو اور مقدار میں کمی بیشی نہ ہو۔

مَا جَاءَ فِي الصَّرْفِ

نقدی کے مبادلہ کے بارے میں

حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ مَالِكِ بْنِ أَوْسِ بْنِ الْحَدَثَانِ النَّصْرِيِّ أَنَّهُ الْتَمَسَ صَرْفًا بِمِائَةِ دِينَارٍ قَالَ فَدَعَانِي طَلْحَةُ بْنُ عُبَيْدِ اللَّهِ فَتَرَاوَضْنَا حَتَّى اصْطَرَفَ مِنِّي وَ أَخَذَ الذَّهَبَ يُقَلِّبُهَا فِي يَدِهِ ثُمَّ قَالَ حَتَّى يَأْتِيَ خَازِنِي مِنَ الْغَابَةِ وَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يَسْمَعُ فَقَالَ عُمَرُ وَ اللَّهِ لَا تُفَارِقْهُ حَتَّى تَأْخُذَ مِنْهُ ثُمَّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الذَّهَبُ بِالْوَرِقِ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَ هَاءَ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَ هَاءَ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَ هَاءَ وَ الشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ۔

«مالک بن اوس بن حدثان نصری کہتے ہیں کہ ان کو ایک صد دینار کے مبادلے کی ضرورت پیش آئی۔ کہتے ہیں کہ مجھے طلحہ بن عبید اللہ نے بلایا تو ہم نے مبادلہ کا نرخ طے کر لیا یہاں تک کہ انہوں نے مجھ سے صرف طلب کر لیا اور سونا ہاتھ میں لے کر الٹنے پلٹنے لگے۔ پھر کہا کہ میرا خزانچی غابہ سے آتا ہے تو میں دینار دیتا ہوں۔ حضرت عمر بن خطابؓ سن رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ خدا کی قسم، آپ یہاں سے نہیں جب تک کہ ان سے رقم لے نہ لیں۔ پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ سونا چاندی کے بدلے میں سود ہے مگر یہ کہ اس ہاتھ لے اس ہاتھ دے۔ گندم کے بدلے گندم سود ہے مگر یہ کہ اس ہاتھ لے اس ہاتھ دے۔ کھجور کے بدلے کھجور سود ہے مگر یہ کہ اس ہاتھ لے اس ہاتھ دے۔ جو کے بدلے جو سود ہے مگر یہ کہ اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے۔»

وضاحت:

مبادلے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو دست بدست یعنی نقد نقد اور دوسری صورت ایک مقررہ مدت کے اندر ادائیگی کی ہے۔ مبادلے کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب ایک شخص کو ایک جنس کے بدلے میں دوسری جنس

کی ضرورت ہو- جیسے دینار کے بدلے درہم کی یا روپے کے بدلے ڈالر، پونڈ یا دوسری کرنسی کی یا ایک قسم کی گندم دوسری قسم کی گندم کے بدلے- علی ہذا القیاس دوسری اجناس یا چیزیں- ایسے مبادلے میں تفاضل جائز ہے- یعنی آپ ایک اعلیٰ قسم کی کھجور دے کر اس سے زیادہ مقدار میں عام قسم کی کھجور لے سکتے ہیں لیکن صرف اس شرط کے ساتھ کہ مبادلہ دست بدست ہو، ادھار نہ ہو کیونکہ ادھار میں سود کا شائبہ ہو جاتا ہے- اسی لئے ادھار میں تفاضل جائز نہیں- ادھار میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جس چیز کے ساتھ مبادلہ کیا جارہا ہے اس کی نوعیت کیا ہوگی- اس لیے دونوں چیزوں کا موجود ہونا ضروری ہے- حضرت عمرؓ نے اسی وجہ سے تاکید کی کہ معاملہ اسی وقت انجام پذیر ہو جائے تاکہ ربا کا شائبہ نہ رہے-

عام مذہب تو یہی ہے جو اوپر بیان ہوا ہے لیکن احناف اس میں کچھ نرمی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ معاملہ مکمل نہ ہوگا جب تک کہ فریقین ایک دوسرے سے الگ نہ ہو جائیں- خواہ وہ معاملہ کرنے میں کتنا ہی زیادہ وقت لیں، ہو سکتا ہے معاملہ طے کرنے میں تاخیر ضرورت کا تقاضا ہو- مجھے یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے-

معاملہ کی دوسری صورت مقررہ مدت میں ادائیگی کی ہے- مثلاً معاملہ کی شرائط طے ہو جاتی ہیں اور ایک فریق کہتا ہے کہ میں کل رقم بنک سے نکلوا کر دے دوں گا تو اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں- یا یہ صورت ہو کہ خزانچی موجود نہیں اور یہ طے ہو جائے کہ خزانچی کے آجانے پر ادائیگی کر دی جائے گی- تو اس میں کوئی شرعی قباحت معلوم نہیں ہوتی کیونکہ معاملہ کرنے کے وقت ہی یہ طے پایا ہے کہ ادائیگی کل یا پرسوں ہوگی تو اس میں کوئی حرج نہیں- احناف کے مسلک سے بھی اس کا جواز نکلتا ہے- نہ جانے زندگی کے کتنے معاملات اسی طرح طے ہوتے ہیں- اگر آپ پونڈ کے بدلے روپوں کا تبادلہ کرتے ہیں اور آج کے بھاؤ پر معاملہ طے ہو جاتا ہے لیکن ادائیگی کو دو تین روز کے لیے مؤخر کرنا بھی طے پاجاتا ہے تو جائز ہے- اگر مبادلے کا بھاؤ اس دوران تبدیل بھی ہو جائے لیکن ادائیگی طے شدہ بھاؤ پر ہی عمل میں آئے گی-

اس حکم میں دست بدست کی قید احتیاط کے نقطہ نظر سے ہے- دست بدست اور نسیہ میں جو باریک سا فرق ہے اس کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے- حضرت عمرؓ نے جو تاکید کی ہے اس کی نوعیت بھی یہی ہے- یہ ایک صنف کو دوسری صنف سے بدلنے کا معاملہ تھا- اس کا دست بدست ہونا ہی بہتر تھا- غش کے موجود نہ ہونے سے معاملہ نسیہ کی صورت میں طے پانے کا امکان تھا- حضرت عمرؓ نے اس خدشہ کے پیش نظر کہ ہو سکتا ہے کہ مرور زمانہ سے لوگ

[illegible] قید کو نظر انداز کرتے کرتے ربا میں ملوث ہو جائیں یہ حکم سد للذریعہ کی حکمت کے تحت دیا-

اَلْمُرَاطَلَةُ

مسکوک اور غیر مسکوک کا تبادلہ

حدثني يحيى عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَزِيدَ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ قُسَيْطٍ اَللَّيْثِيِّ اَنَّهُ رَاٰى سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ يُرَاطِلُ الذَّهَبَ بِالذَّهَبِ فَيُفْرِغُ ذَهَبَهُ فِي كِفَّةِ الْمِيزَانِ وَ يُفْرِغُ صَاحِبُهُ الَّذِي يُرَاطِلُهُ ذَهَبَهُ فِي كِفَّةِ الْمِيزَانِ الْاُخْرٰى فَاِذَا اعْتَدَلَ لِسَانُ الْمِيزَانِ اَخَذَ وَ اَعْطٰى-

* یزید بن عبداللہ بن قسیط اللیثی روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے سعید بن مسیب کو دیکھا کہ وہ سونے سے سونے کا تبادلہ کر رہے تھے تو وہ اپنا سونا ترازو کے ایک پلڑے میں رکھتے تھے اور ان کے ساتھی جو تبادلہ کر رہے تھے اپنا سونا ترازو کے دوسرے پلڑے میں رکھتے- تو جب میزان برابر ہو جاتی تھی تو وہ لین دین کرتے تھے-*

وضاحت:

یہاں ذہب سے مراد دینار ہے اور دوسرے سونے سے مراد سونے کے ٹکڑے ہیں- اس وقت سونے کی ایک ہی قسم ہوتی تھی- ہمارے ہاں کی طرح مختلف قیراط کی بہت سی قسمیں نہیں تھیں- یہی صورت چاندی کی بھی تھی- دینار کے ساتھ سونے کے ٹکڑے بھی سکے کے طور پر چلتے تھے- اسی لیے سعید بن مسیب ان کا ہم وزن مبادلہ کر رہے تھے- اب سکوں کا الگ نظام وجود میں آگیا ہے اور سونے کی بھی الگ الگ کوالٹی دستیاب ہے- اب اگر سونے کے سکے اور سونے کے ٹکڑے کا نرخ بازار میں الگ الگ ہو تو بازار کا نرخ ہی چلے گا- موجودہ حالات میں سونا ایک الگ جنس ہے اور سونے کا سکہ ایک دوسری جنس ہے اور اجناس مختلف ہونے کی صورت میں نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ بیعوا کیف شئتم (جس طرح چاہو ان کی خرید و فروخت کرو)

آگے اس بارے میں امام مالک کے فتویٰ کا حوالہ ہے- وہ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سونا سونے کے بدلے اور چاندی چاندی کے بدلے بیع کرنے میں کچھ حرج نہیں- اگر دست بدست معاملہ میں ایک آدمی گیارہ دینار دس دینار

کے بدلے میں لے تو یہ بیع درست ہے جبکہ وزن برابر اور جنس ایک ہو۔ اسی طرح درہموں کے مبادلہ میں بھی کوئی حرج نہیں۔

میرے نزدیک یہ فتویٰ درست ہے۔ موجودہ زمانہ کے لحاظ سے میں اس پر یہ اضافہ کرتا ہوں کہ سونا اگر مختلف قیراط کا ہے تو یہ دیکھا جائے گا کہ کس درجے کا سونا ہے۔ یکساں درجے والے سونے سے برابر پر معاملہ ہو سکتا ہے۔ ورنہ پھر کمی بیشی کرنی پڑے گی اور شریعت میں اس کی اجازت ہے۔

اَلْعِیْنَۃُ وَ مَا یُشْبِھُھَا

ادھار پر خرید اور نقد پر فروخت جیسے سودوں کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنِ ابْتَاعَ طَعَامًا فَلَا یَبِعْهُ حَتّٰی یَسْتَوْفِیَهُ۔

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے غلہ خریدا تو وہ اس کو بیچ نہیں سکتا جب تک کہ وہ اس کو اپنے پورے قبضے میں نہ کر لے۔﴾

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ دِیْنَارٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنِ ابْتَاعَ طَعَامًا فَلَا یَبِعْهُ حَتّٰی یَقْبِضَهُ

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے غلہ خریدا تو وہ اس کو فروخت نہ کرے جب تک کہ اس کو اپنے قبضے میں نہ کر لے۔﴾

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ قَالَ كُنَّا فِی زَمَانِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ نَبْتَاعُ الطَّعَامَ فَیَبْعَثُ عَلَیْنَا مَنْ یَّاْمُرُنَا بِانْتِقَالِهٖ مِنَ الْمَكَانِ الَّذِی ابْتَعْنَاهُ فِیْهِ اِلٰی مَكَانٍ سِوَاهُ قَبْلَ اَنْ نَبِیْعَهٗ۔

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں غلہ خریدتے تو آپ کا بھیجا ہوا آدمی ہمارے پاس یہ حکم لاتا کہ غلے کو آگے فروخت کرنے سے پہلے اس جگہ سے جہاں ہم نے اسے

خریدا کسی دوسری جگہ منتقل کر لیں﴾۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ حَكِیْمَ بْنَ حِزَامٍ ابْتَاعَ طَعَامًا اَمَرَ بِهٖ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لِلنَّاسِ فَبَاعَ حَكِیْمٌ الطَّعَامَ قَبْلَ اَنْ یَّسْتَوْفِیَهٗ فَبَلَغَ ذٰلِكَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ فَرَدَّهٗ عَلَیْهِ وَ قَالَ لَا تَبِعْ طَعَامًا ابْتَعْتَهٗ حَتّٰی تَسْتَوْفِیَهٗ۔

﴿حضرت نافعؒ روایت کرتے ہیں کہ حکیم بن حزام نے غلہ خریدا جس کا حضرت عمر بن خطابؓ نے لوگوں کے لیے خریدنے کا حکم دیا تھا۔ پھر حکیم نے اس کو قبضہ حاصل کرنے سے پہلے بیچ دیا۔ جب یہ بات حضرت عمرؓ کو پہنچی تو آپ نے بیع لوٹا دی اور فرمایا کہ جو غلہ آپ نے خریدا ہے اس کو قبضہ کرنے سے پہلے نہ بیچو۔﴾

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ صُكُوْكًا خَرَجَتْ لِلنَّاسِ فِی زَمَانِ مَرْوَانَ ابْنِ الْحَكَمِ مِنْ طَعَامِ الْجَارِ فَتَبَایَعَ النَّاسُ تِلْكَ الصُّكُوْكَ بَیْنَهُمْ قَبْلَ اَنْ یَّسْتَوْفُوْهَا فَدَخَلَ زَیْدُ بْنُ ثَابِتٍ وَ رَجُلٌ مِّنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ ﷺ عَلٰی مَرْوَانَ ابْنِ الْحَكَمِ فَقَالَا اَتَحِلُّ بَیْعَ الرِّبَا یَا مَرْوَانُ فَقَالَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ وَمَا ذٰلِكَ فَقَالَا هٰذِهِ الصُّكُوْكُ تَبَایَعَهَا النَّاسُ ثُمَّ بَاعُوْهَا قَبْلَ اَنْ یَّسْتَوْفُوْهَا فَبَعَثَ مَرْوَانُ ابْنُ الْحَكَمِ الْحَرَسَ یَتْبَعُوْنَهَا یَنْزِعُوْنَهَا مِنْ اَیْدِی النَّاسِ وَ یَرُدُّوْنَهَا اِلٰی اَهْلِهَا۔

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی کہ مروان بن حکم کے دور حکومت میں جار کے علاقے میں گندم کے پرمٹ لوگوں کو دیے گئے تو لوگوں نے ان پرمٹوں کو آپس میں بیچنا شروع کر دیا، پیشتر اس کے کہ غلہ اپنے قبضہ میں لے لیں۔ تو زید بن ثابتؓ اور ایک صحابی مروان کے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ آپ نے ربا کی بیع شروع کر دی ہے مروان صاحب! اس نے کہا کہ اللہ کی پناہ! کیا بات ہوئی۔ تو انہوں نے کہا یہ پرمٹ جو آپ نے دیے ہیں یہ لوگوں کے درمیان بک رہے ہیں، پیشتر اس کے کہ وہ اپنا غلہ وصول کریں۔ اس پر مروان نے اپنے چوبداروں کو ان لوگوں کا تعاقب کرنے کو بھیجا تو انہوں نے لوگوں سے پرمٹ چھین کر اصل مالکوں کو دیے کہ وہ اپنا غلہ وصول کر لیں۔﴾

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ رَجُلًا اَرَادَ اَنْ يَبْتَاعَ طَعَامًا مِنْ رَجُلٍ اِلٰى اَجَلٍ فَذَهَبَ بِهِ الرَّجُلُ الَّذِي يُرِيْدُ اَنْ يَبِيْعَهُ الطَّعَامَ اِلَى السُّوْقِ فَجَعَلَ يُرِيْهِ الصُّبَرَ وَيَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَيِّهَا تُحِبُّ اَنْ اَبْتَاعَ لَكَ فَقَالَ الْمُبْتَاعُ اَتَبِيْعُنِي مَا لَيْسَ عِنْدَكَ فَاَتَيَا عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ فَذَكَرَا ذٰلِكَ لَهٗ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ لِلْمُبْتَاعِ لَا تَبْتَعْ مِنْهُ مَالَيْسَ عِنْدَهٗ وَ قَالَ لِلْبَائِعِ لَا تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ۔

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی کہ ایک شخص نے کچھ گندم دوسرے شخص سے کچھ مدت کے لیے ادھار خریدنے کا ارادہ کیا تو وہ شخص خریدار کو بازار لے گیا اور اس سے کہا کہ یہ ڈھیریاں ہیں، جس میں سے چاہو میں خرید دیتا ہوں۔ خریدار نے کہا کہ آپ میرے پاس وہ چیز بیچ رہے ہیں جو آپ کے پاس نہیں ہے۔ تو دونوں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آئے اور ان سے اس معاملہ کا ذکر کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے خریدار سے کہا کہ آپ اس سے وہ چیز نہ خریدیں جو اس کے پاس نہیں اور بیچنے والے سے کہا کہ وہ چیز نہ بیچو جو تمہارے پاس نہیں۔﴾

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ اَنَّهٗ سَمِعَ جَمِيْلَ بْنَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ الْمُؤَذِّنَ يَقُوْلُ لِسَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ اِنِّي رَجُلٌ اَبْتَاعُ مِنَ الْاَرْزَاقِ الَّتِي تُعْطِي النَّاسَ بِالْجَارِ مَاشَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ اُرِيْدُ اَنْ اَبِيْعَ الطَّعَامَ الْمَضْمُوْنَ عَلَيَّ اِلٰى اَجَلٍ فَقَالَ لَهٗ سَعِيْدٌ اَتُرِيْدُ اَنْ تُوَفِّيَهُمْ مِنْ تِلْكَ الْاَرْزَاقِ الَّتِي ابْتَعْتَ فَقَالَ نَعَمْ فَنَهَاهُ عَنْ ذٰلِكَ۔

﴿سعید بن مسیب سے ایک شخص نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میں اس غلے میں سے جو جار کے علاقوں کے غلوں میں سے لوگوں کو ملتے ہیں جتنا اللہ چاہے خرید لوں۔ پھر جو غلہ میرے ذمہ ضمانت کے طور پر ادھار ہے اس میں سے دے دوں۔ سعید بن مسیب نے کہا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ تم ان کو پورا کر دو اس غلہ سے جو تم نے خریدا ہے تو اس شخص نے کہا ہاں۔ اس پر سعید بن مسیب نے اس کو منع کر دیا۔﴾

ان احادیث کی روایت کے بعد امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات ہمارے نزدیک متفق علیہ ہے کہ جس کسی نے

گندم، جو کی قسم کی کوئی چیز یا جَو یا جوار، دالیں یا وہ چیزیں جن میں زکوٰۃ واجب ہے یا سالن کی قسموں سے کوئی چیز جیسے تیل، گھی، شہد، سرکہ، پنیر، نمک، دودھ یا اس طرح کی ساری چیزیں خریدیں تو وہ ان میں سے کسی کو بھی بیچ نہیں سکتا جب تک کہ وہ ان کو قبضہ میں نہ لے لے اور ان کو پوری طرح سے وصول نہ کرے۔

وضاحت:

طعام سے عام طور پر غلہ مراد ہوتا ہے اور گندم کے لیے بھی اس لفظ کا استعمال عام ہے۔ روایات میں تین تک مرفوع احادیث ہیں۔ ایک روایت میں حضرت عمر بن خطابؓ کا حکم ہے جو مرفوع روایات سے مستنبط ہے۔ وہ روایات صحابہ کے آثار میں سے ہیں اور ایک روایت حضرت سعید بن مسیب جو کہ مدینہ منورہ کے مشہور فقیہ ہیں، کا فتویٰ ہے۔ اس کے بعد اپنے فتویٰ میں امام مالکؒ نے طعاما کے لفظ کی تشریح کی ہے کہ اس میں کھانے پینے کی تمام چیزیں شامل ہیں۔ میرے نزدیک ان کی یہ تشریح درست ہے۔

امام مالکؒ کا یہ فرمانا بھی ٹھیک ہے کہ وہ تمام کھانے پینے کی چیزیں جن پر زکوٰۃ واجب ہو اسی حکم میں ہیں۔ میرے نزدیک زکوٰۃ ان تمام خوردنی اشیاء پر واجب ہے جو تجارتی مقاصد کے لیے کاشت کی جاتی ہیں۔ صرف ان کی ایک مقررہ مقدار زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے۔ احناف کا بھی یہی مسلک ہے۔

ان تمام روایات میں یہ حکم بیان ہوا ہے کہ جب کسی جنس کا سودا ہو جائے تو خریدار کو چاہیے کہ وہ اس کو قبضہ میں لے کر کسی دوسری جگہ منتقل کرلے۔ اگر وہ آگے اس کو فروخت کرنا چاہتا ہے تو منتقلی کے بعد نئے مقام سے فروخت کرے۔

قبضے میں لے کر فروخت کرنے کی یہ پابندی صرف خوردنی اشیاء سے ہی متعلق ہے جو قابل انتقال ہیں۔ دوسری چیزیں مثلاً غیر منقولہ جائیداد یا جن کی نقل و حمل میں زحمت ہو اس حکم کے تحت نہیں آتیں۔ خوردنی اشیاء کے متعلق اس حکم کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ نزاع کا خطرہ نہ رہے۔ خریدار کی ملکیت تامہ جب تک نہ ہو اس بات کا اندیشہ باقی رہتا ہے کہ انتقال کے وقت جنس کا کوئی نقص واضح ہو جائے اور نزاع کی صورت پیدا ہو جائے۔ اس لیے کامل قبضے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

حدیث میں خرید کردہ مال کو قبضہ میں لینے کا جو حکم ہے، مال کو دوسری جگہ منتقل کرنا اس کی کامل شکل ضرور ہے لیکن واحد یہی شکل نہیں۔ قبضہ کے معنی یہ ہیں کہ شے بالکل آپ کے تصرف میں آجائے۔ آپ اس کے دام لوٹا

کرنے کے بعد اس کی ملکیت اس طرح حاصل کر چکے ہوں کہ اب اگر دوسری جگہ اس کو فروخت کرنا چاہیں تو اس میں آپ کے اختیار پر کوئی قدغن نہ ہو۔ اس صورت میں نزاع کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ جہاں تک جگہ کا معاملہ ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ خریدار کے پاس غلہ رکھنے کے لیے جگہ ہی نہ ہو اور وہ اس بات پر مجبور ہو کہ وہ اسی جگہ سے اس کو فروخت کر دے جہاں سے اس نے غلہ خریدا۔ اس طرح کی صورت میں سودا کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔

پرمٹوں کے اجراء کی روایت میں قبضے سے پہلے فروخت کرنے کی ممانعت کی ایک اور حکمت سامنے آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے جار کے کسی علاقے میں غذائی اجناس کی کمی کا مسئلہ حل کرنے کے لیے لوگوں میں پرمٹ تقسیم کیے جن کو پیش کر کے وہ سرکاری گودام سے غلہ حاصل کر سکتے تھے۔ لوگوں نے ان پرمٹوں کی تجارت شروع کر دی اور غلہ وصول کر کے اس کو فروخت کرنے کی جائے پرمٹ فروخت ہونا شروع ہو گئے۔ اس طرح کے سودوں کے باعث مصنوعی طور پر اشیائے ضرورت کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بعض صحابہ نے حکومت کی توجہ پرمٹوں کے کاروبار کی طرف مبذول کرائی تو حکومت نے اس کو روکنے کے اقدامات کیے۔

اس سے اگلی روایت سے دلالی کی ممانعت مستنبط ہوتی ہے۔ چونکہ روایت زیر بحث میں دلال کو گندم کی فروخت سے روکا گیا اس لیے اس روایت کی رو سے غلے اور اس قسم کی غذائی ضروریات کی چیزوں پر دلالی کی ممانعت صاف ظاہر ہے۔ اس کی حکمت یہی معلوم ہوتی ہے کہ اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں اعتدال رہے۔ اشیائے خوردونوش کے علاوہ دوسری اشیاء کی دلالی پر پابندی اس روایت سے مستنبط نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں آج مقامی یا بین الاقوامی تجارت میں جو دلالی رائج ہے وہ ایک ناگزیر ضرورت بن چکی ہے۔ اس میں قیمتوں کا تعین بین الاقوامی منڈیوں کے بھاؤ کے مطابق ہوتا ہے اور اس میں دلال کا رول نہ صرف اہم ہے بلکہ بہت سے نزاعات سے بچنے کا باعث بھی ہے۔ میرے نزدیک اس روایت کا ایسی دلالی پر اطلاق نہیں ہوتا۔

ان روایات کو پڑھ کر ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ صدر اول کے لوگوں نے ان چیزوں پر اتنی سختی سے عمل کیوں کیا۔ میرے خیال میں اگر وہ لوگ ایسا نہ کرتے تو آج یہ تعلیمات ہوا ہو گئی ہوتیں۔ سودا اگر کسی چیز میں رتی برابر بھی ذھیل دے دیتے تو آج یہ ذھیل بڑھتے بڑھتے نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتی تو انہوں نے اصل سے آپ کو آگاہ کر دیا۔ اب یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ حالات میں جو تغیر ہوا ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے اور اس کوشش کے

ساتھ کہ کوئی حرام حلال نہ ہونے پائے اور کوئی حلال حرام نہ ہونے پائے اس سختی کو کم کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے زمانے کے لحاظ سے کام کیا اور بالکل ٹھیک کیا۔ اب حالات کے تغیر اور صنعت و حرفت کی ترقی نے جدید مسائل کو جنم دیا ہے۔ ان کے معروضی مطالعہ اور شریعت کے احکام کی روشنی میں آراء قائم کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے۔

مَا يُكْرَهُ مِنْ بَيْعِ الطَّعَامِ اِلٰى اَجَلٍ

غلے کو ادھار بیچنے کی کراہت کی ایک شکل

٦ حدثني يحيى عن مالك عن ابي الزناد انه سمع سعيد بن المسيب و سليمان بن يسار ينهيان ان يبيع الرجل حنطة بذهب الى اجل ثم يشتري بالذهب تمرا قبل ان يقبض الذهب۔

ابو الزناد سے روایت ہے کہ انہوں نے سنا کہ سعید بن مسیب اور سلیمان بن یسار دونوں اس بات سے منع کرتے تھے کہ کوئی شخص سونے کے عوض گندم ادھار بیچے اور پھر اس رقم سے کھجور خریدے پیشتر اس کے کہ اس نے سونے پر قبضہ کیا ہو۔

وضاحت:

مطلب یہ ہے کہ آپ نے کچھ دینار کی گندم فروخت کی اور ابھی قیمت وصول نہیں کی۔ قرض واجب الادا ہے۔ پھر جب ادائیگی کا مقررہ وقت آئے تو آپ یہ کہہ دیں کہ مجھے اس رقم کے عوض کھجور دے دی جائے۔

سعید بن المسیب اور سلیمان بن یسار دونوں حضرات فقہاء مدینہ میں سے ہیں۔ یہ دونوں معاملہ کی اس شکل سے منع کرتے تھے۔ ان کا انحصار اس روایت پر معلوم ہوتا ہے کہ قبضہ کرنے سے پہلے کسی چیز کا سودا کرنا منع ہے۔ میرے نزدیک اس شکل میں کمزوری کا پہلو یہ ہے کہ چونکہ رقم ابھی تک قرض ہے تو جب تک آپ بعینہ وہ رقم وصول نہ کر لیں حرمت کا موقع باقی رہے گا۔ ہو سکتا ہے اس میں آپ تفاضل کی کوئی صورت پیدا کر لیں۔ لہٰذا اس صورت میں معاملہ کی ممانعت احتیاط کے پہلو سے اور موقع حرمت سے بچنے کے لیے ہے۔

اس مضمون کی ایک روایت ابوبکر بن محمد بن حزم سے بھی مروی ہے۔

اَلسَّلَفَةُ فِي الطَّعَامِ

غلے کی خرید میں پیشگی رقم کی ادائیگی

❐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّهُ قَالَ لَا بَاْسَ بِاَنْ يُسْلِفَ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِي الطَّعَامِ الْمَوْصُوفِ بِسِعْرٍ مَعْلُومٍ اِلٰى اَجَلٍ مُسَمًّى مَالَمْ يَكُنْ فِي زَرْعٍ لَمْ يَبْدُ صَلَاحُهُ اَوْ تَمْرٍ لَمْ يَبْدُ صَلَاحُهُ۔

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ اس بات میں کچھ حرج نہیں کہ کوئی شخص کسی شخص کو غلہ خریدنے کے لیے پیشگی رقم دے کہ جس کی تاریخ معین کر دی گئی ہو اور قیمت بھی متعین کر دی گئی ہو بشرطیکہ اس کا تعلق کسی ایسی کھیتی یا ایسے کھجور سے نہ ہو جس کی صلاحیت ابھی ظاہر نہیں ہوئی﴾

وضاحت :

یہ دراصل بیع سلم ہے جس میں اوصاف کے تعین کے ساتھ آپ ایک چیز پیشگی رقم دے کر خریدتے ہیں۔ اس طرح کی صورت معاملہ میں کوئی حرج نہیں۔ فی زمانہ تمام بیرونی تجارت اسی اصول پر ہو رہی ہے۔ کروڑوں اربوں روپے کے معاہدے ہوتے ہیں جن میں خریدے جانے والے مال کے اوصاف متعین کر دیے جاتے ہیں اور تمام دوسری شرائط لکھ دی جاتی ہیں جن کے پورا نہ ہونے کی صورت میں بیع فسخ کی جا سکتی ہے۔ بیع سلم کی اس صورت میں احناف یہ قید لگاتے ہیں کہ خیار بھی ہونا چاہیے یعنی مال وقت پر نہ ملے یا صفات کے مطابق نہ ملے تو خریدار کو اختیار ہونا چاہیے کہ بیع کو فسخ کر دے۔ میرے نزدیک یہ قید ضروری ہے، خیار ہونا چاہیے۔

غلے کی صلاحیت کے ظاہر ہونے یا نہ ہونے کا تعلق صرف اس صورت حال سے ہے جب کسی خاص کھیت یا باغ کی فصل کا معاملہ درپیش ہو لیکن بیع سلم کی عام صورت جس میں مال کے اوصاف کا تعین کر دیا گیا ہو اس ذیل میں نہیں آتی۔ یہ بیع مجہول نہیں بلکہ اگر مال تخلوق نہ بھی ہو تو بھی اس میں کچھ حرج نہیں کیونکہ اس میں مال موصوف ہے اور بائع مقررہ وقت پر اس کو مہیا کرنے کا پابند ہے۔ مثال کے طور پر ایک کارخانہ دار ایسا مال فراہم کرنے کا ذمہ

لے سکتا ہے جو خاص صفات کا حامل ہو۔ سودا کرتے وقت یہ مال غیر تخلوق ہو گا لیکن چونکہ اوصاف متعین ہیں اس لیے یہ معاملہ درست ہو گا۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ معاہدہ میں خریدار کو یہ اختیار دیا گیا ہو کہ مال اوصاف کے مطابق نہ ہونے کی صورت میں قبول نہیں کیا جائے گا اور بیع فسخ کر دی جائے گی۔ معاہدہ میں اگر خیار نہ ہو تو اعتراض وارد ہوتا ہے۔ اس لیے حنفیہ خیار کی جو شرط لگاتے ہیں اس کو میں ضروری سمجھتا ہوں۔ اس ضمن میں امام مالک کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر ایک شخص متعین مدت کے اختتام پر متعین غلہ حاصل کرنے کے لیے پیشگی ادائیگی کر دیتا ہے لیکن اس مدت کے پورا ہونے پر وہ بائع کے پاس وہ چیز نہیں پاتا جس کا لینا طے ہوا تھا تو اس پیشگی ادا کردہ رقم سے وہ کوئی دوسری چیز نہیں خرید سکتا جب تک کہ وہ رقم واپس اپنے قبضہ میں نہ لے لے۔ میرے نزدیک اس میں بھی احتیاط کا پہلو مدنظر ہے کہ رقم چونکہ پیشگی دی ہوئی تھی اس لیے اس کے بدلے کوئی دوسری جنس لینے میں تفاضل نہ ہو جائے۔

بَيْعُ الطَّعَامِ بِالطَّعَامِ لَا فَضْلَ بَيْنَهُمَا

تفاضل کے بغیر غلے کے بدلے غلے کی فروخت

❐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ سُلَيْمَانَ بْنَ يَسَارٍ قَالَ فِي عَلَفِ حِمَارِ سَعْدِ بْنِ اَبِي وَقَّاصٍ فَقَالَ لِغُلَامِهِ خُذْ مِنْ حِنْطَةِ اَهْلِكَ فَابْتَعْ بِهَا شَعِيرًا وَلَا تَاْخُذْ اِلَّا مِثْلَهُ۔

﴿سلیمان بن یسار کہتے ہیں کہ سعد بن ابی وقاصؓ کے گدھے کے دانے ختم ہو گئے۔ انہوں نے اپنے غلام سے کہا کہ گھر سے گندم لو اور اس کے عوض جا کر جو خرید و لیکن لینا برابر برابر۔﴾

وضاحت :

حضرت سعدؓ کی اس ہدایت کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اجناس کی خرید و فروخت کے بارے میں میری رائے جو میں اوپر بیان کر چکا ہوں، یہ ہے کہ جن چیزوں کی جنس مختلف مانی گئی ہے ان کی مقداریں مبادلہ میں مختلف ہو سکتی ہیں۔ جو اور گندم کو ایک جنس نہیں مانا جا سکتا اس لیے اس میں تفاضل میں کوئی قباحت نہیں۔

یہ روایت امام صاحب کی بلاغیات میں سے ہے۔ دوسری روایت جو انہیں نافع کے ذریعہ سے ملی ہے اس میں سلیمان بن یسار کی واقعہ عبدالرحمٰن بن الاسود سے منسوب کرتے ہیں۔

اَلْحُكْرَةُ وَالتَّرَبُّصُ

ذخیرہ اندوزی اور انتظار

اجناس کی ذخیرہ اندوزی اس انتظار میں کہ جب قیمت بڑھے گی تو ان کو فروخت کریں گے، حضرت عمرؓ نے اس کو ناجائز قرار دیا ہے۔

☐ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ لَاحُكْرَةَ فِی سُوْقِنَا لَا یَعْمِدُ رِجَالٌ بِاَیْدِیْهِمْ فُضُوْلٌ مِنْ اَذْهَابٍ اِلٰی وَرِقٍ مِنْ وَرِقِ اللّٰهِ نَزَلَ بِسَاحَتِنَا فَیَحْتَكِرُوْنَهٗ عَلَیْنَا وَلٰكِنْ اَیُّمَا جَالِبٍ جَلَبَ عَلٰی عَمُوْدِ كَبِدِهٖ فِی الشِّتَاءِ وَالصَّیْفِ فَذٰلِكَ ضَیْفُ عُمَرَ فَلْیَبِعْ كَیْفَ شَاءَ اللّٰهُ وَلْیُمْسِكْ كَیْفَ شَاءَ اللّٰهُ۔

﴿امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عمرؓ بن خطاب نے فرمایا کہ ہمارے بازاروں میں ذخیرہ اندوزی جائز نہیں۔ کوئی شخص جس کے پاس فاضل رقم موجود ہو یہ ارادہ نہ کرے کہ اللہ کے بھیجے ہوئے رزقوں میں سے جو رزق ہماری سرزمین میں اترے اس کو ہم سے روک کر ذخیرہ کر لے۔ ہاں یہ ہے کہ جو کوئی مال لانے والا اپنی محنت کر کے گرمیوں اور سردیوں میں مال لائے تو وہ عمرؓ کا مہمان ہے اور اپنا مال چاہے بیچے اور چاہے روک رکھے، جیسے اللہ تعالیٰ چاہے۔﴾

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ یُوْنُسَ بْنِ یُوْسُفَ عَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیَّبِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ مَرَّ بِحَاطِبِ بْنِ اَبِیْ بَلْتَعَةَ وَهُوَ یَبِیْعُ زَبِیْبًا لَهٗ بِالسُّوْقِ فَقَالَ لَهٗ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اِمَّا اَنْ تَزِیْدَ فِی السِّعْرِ وَاِمَّا اَنْ تَرْفَعَ مِنْ سُوْقِنَا۔

﴿سعید بن مسیبؒ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ حاطبؓ ابن ابی بلتعہ پر گزرے تو وہ بازار میں منقے بیچ رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا کہ آپ یا تو بھاؤ کو بڑھائیں ورنہ ہمارے بازار سے اٹھا دیے جائیں گے۔﴾

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ كَانَ یَنْهٰی عَنِ الْحُكْرَةِ۔

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عثمانؓ ذخیرہ اندوزی سے منع فرماتے تھے﴾

وضاحت:

پہلی روایت میں حضرت عمرؓ کا یہ حکم بیان ہوا ہے کہ ہمارے ہاں ذخیرہ اندوزی نہ کی جائے۔ ان کی یہ بات قابل فہم ہے کیونکہ سرمایہ جب تک بازی نہ کھیلے وہ سودی سرمایہ ہے۔ وہ بزدل سرمایہ ہے جو دوسروں کی چراگاہ میں چرنا موٹا ہونا چاہتا ہے۔ جو سرمایہ بازی کھیل کر بازار کا مقابلہ کرتا ہے اس کا منافع طیب ہے۔ ذخیرہ اندوزی کر کے سرمایہ دار عوام کے استعمال کی اشیاء کی قیمتیں بڑھاتے ہیں تاکہ ان کی جیبوں سے پیسہ کھینچ کر اپنے سرمائے کو اور بڑھائیں۔ اسلام میں ایسا کرنا ناجائز ہے۔ البتہ اسلام اس بات کا حق دیتا ہے کہ تو بازار کی قیمت کو موافق نہ پا کر اپنا مال فروخت کے لیے پیش نہ کرے۔ یہ ذخیرہ اندوزی نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کے قول کے دوسرے حصہ کا یہی مخاطب ہے۔ دوسری روایت حاطب ابن ابی بلتعہ کے متعلق ہے کہ وہ بازار میں منقے بیچ رہے تھے۔ ممکن ہے کہ فالتو ہو گیا ہو اور وہ چاہتے ہوں کہ جلدی بک جائے اور اس مقصد کے لیے بازار کے بھاؤ سے کم پر بیچ رہے ہوں۔ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یا تو بھاؤ بڑھاؤ ورنہ اٹھ جاؤ۔ یعنی میں تم کو سستا نہیں بیچنے دوں گا۔ حضرت عمرؓ کا فلسفہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص بازار کا بھاؤ گرانے کی مصنوعی شکل پیدا کرے تو یہ بھی صحیح نہیں۔ مارکیٹ ریٹ کا احترام بہر حال ہونا چاہیے۔ مارکیٹ کے نظام میں توازن قائم رکھنا ضروری ہے۔ حضرت عمرؓ آسانی سے غلطی کرنے والے نہیں تھے۔ حاطب بازار میں مستقل بیٹھنے والے نہیں تھے۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے کہا کہ اگر بیٹھنا ہے تو اس کو بیچنے کی جو روایت ہے اس کا احترام کرو۔

اسلام کی رو سے حکومت کا فرض ہے کہ وہ مارکیٹ کے نظام کو کنٹرول کرے اور اتفاقی طور پر اگر کوئی تاجر دکاندار بنے ہوں تو مارکیٹ ریٹ کا لحاظ کریں اور مصنوعی طور پر قیمت میں کمی بیشی کر کے دوسرے دکانداروں کے لیے مشکلات نہ پیدا کریں۔ تیسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ بھی حضرت عمرؓ کی طرح ذخیرہ اندوزی کو ناجائز قرار دیتے اور اس سے منع فرماتے تھے۔

ذخیرہ اندوزی یا احتکار صرف غذائی اشیاء میں ناجائز سمجھا جاتا ہے جو زندگی کی ناگزیر ضروریات میں سے ہیں۔ شوافع کے نزدیک احتکار یہ ہے کہ غلہ یا غذائیت کی دوسری اشیاء جو انسانوں اور جانوروں کی زندگی قائم رکھنے

کے لیے ناگزیر ہیں، خرید کر ذخیرہ کرلی جائیں، صرف اس مقصد کے لیے کہ بھاؤ بڑھایا جائے یا جب بھاؤ بڑھ جائے گا تو فروخت کر دیں گے، اپنی ضرورت کے لیے خرید کر رکھ لینا احتکار نہیں اور نہ ہی غذائی اشیاء کے علاوہ دوسری اشیاء پر احتکار کا اطلاق ہوتا ہے۔ احناف کے نزدیک بھی انسانوں اور مویشیوں کی غذائیت کی اشیاء کے علاوہ احتکار نہیں اور نہ ہی ایسی ذخیرہ اندوزی گناہ ہے جس سے کسی شہر کے لوگوں کو کوئی ضرر نہ پہنچے۔

مَا يَجُوْزُ مِنْ بَيْعِ الْحَيَوَانِ بَعْضِهِ بِبَعْضٍ وَالسَّلَفِ فِيهِ

ایک جانور کی دوسرے جانور کے بدلے میں خرید و فروخت اور اس میں ادھار کرنے کا جواز

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ صَالِحِ بْنِ كَيْسَانَ عَنْ حَسَنِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيِّ بْنِ اَبِي طَالِبٍ اَنَّ عَلِيَّ بْنَ اَبِي طَالِبٍ بَاعَ جَمَلًا لَهُ يُدْعَى عُصَيْفِيْرًا بِعِشْرِيْنَ بَعِيْرًا اِلَى اَجَلٍ۔

﴿حسن بن محمد بن علی سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنا اونٹ جس کو عصیفیر کہتے تھے بیس اونٹوں کے بدلے میں ادھار بیچا۔﴾

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ اشْتَرَى رَاحِلَةً بِاَرْبَعَةِ اَبْعِرَةٍ مَضْمُوْنَةٍ عَلَيْهِ يُوَفِّيْهَا صَاحِبُهَا بِالرَّبَذَةِ۔

﴿امام مالکؒ نافع سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے باربرداری کا ایک اونٹ چار اونٹوں کے عوض خریدا اس ضمانت پر کہ اونٹ کا مالک ربذہ کے مقام پر قبضہ دے گا۔﴾

وضاحت:

یہ دونوں روایتیں مرفوع احادیث نہیں بلکہ صحابہؓ کے اثر ہیں۔ حضرت علیؓ کے متعلق ہے کہ انہوں نے اپنا اونٹ جس کو عصیفیر کے نام سے پکارا جاتا تھا، بیس اونٹوں کے عوض فروخت کیا اور وہ بھی ادھار۔ اس میں اگرچہ بظاہر ایک ہی جنس یعنی اونٹ کا معاملہ ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کا اونٹ کسی خاص اور اعلیٰ نسل کا تھا جو بیس اونٹوں کے عوض فروخت ہوا۔ پھر اس میں یہ بھی تھا کہ یہ بیس اونٹ ہاتھوں ہاتھ نہیں بلکہ ایک معینہ مدت کے

بعد دیے گئے۔ اس میں وہی فلسفہ ہے کہ جب جنس مختلف ہو تو جس طرح چاہے بیچو۔ تمام جانور ایک ہی قسم کے نہیں ہوتے بلکہ کوئی دو جانور بھی ایک دوسرے کے بالکل کلو نہیں ہوتے اس لیے ان کی خرید و فروخت میں تفاضل اور نسیہ (ادھار) جائز ہے۔

دوسری روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق ہے کہ انہوں نے ایک سواری کا اونٹ چار اونٹوں کے عوض خریدا اس ضمانت پر کہ اس کا مالک یہ اونٹ ربذہ کے مقام پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے حوالے کرے گا۔ یعنی اس میں بھی ایک معینہ مدت کے لیے ادھار تھا اور ایک کے بدلے چار اونٹ کا مبادلہ تھا۔ اگرچہ دونوں قسم کے جانور اونٹ ہی تھے لیکن ان کی جنس مختلف تھی جس کی وجہ سے تفاضل اور نسیہ درست تھا۔ اگر ایک اونٹ کے بدلے ایک اونٹ اور کچھ نقد یا ادھار رقم بھی ثمن کے طور پر ہو تو وہ بھی جائز ہوگی۔ شوافع کا مسلک بھی یہی ہے اور میرے نزدیک یہ ٹھیک ہے، بشرطیکہ مدت معین ہو اور جانوروں کے اوصاف واضح ہوں۔ احناف کے ہاں یہ جائز نہیں۔

مَا لَا يَجُوْزُ مِنْ بَيْعِ الْحَيَوَانِ

کن جانوروں کی بیع کا جواز نہیں ہے

☐ حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ بَيْعِ حَبَلِ الْحَبَلَةِ وَ كَانَ بَيْعًا يَتَبَايَعُهُ اَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ كَانَ الرَّجُلُ يَبْتَاعُ الْجَزُوْرَ اِلٰى اَنْ تُنْتَجَ النَّاقَةُ ثُمَّ تُنْتَجَ الَّتِي فِي بَطْنِهَا۔

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس جانور کی بیع سے منع فرمایا جو ابھی پیٹ میں ہے۔ بیع کا یہ طریقہ اہل جاہلیت میں رائج تھا کہ ایک آدمی اونٹنیوں کو خرید لیا کرتا یہاں تک کہ جو اونٹنی ابھی جننے والی ہوتی وہ بھی اور اس کا بچہ بھی جو کچھ جنتا۔﴾

وضاحت:

اہل جاہلیت کے ہاں نسل کی بڑی اہمیت تھی۔ اچھی نسل کا جانور حاصل کرنے کے لیے وہ یہ کرتے کہ کسی خاص نسل کی اونٹنی اگر گابھن ہونے کے بعد مادہ بچہ جننے کی بجائے نر بچہ جنتی تو اس کے متوقع بچے کا بھی

سودا کر لیتے تاکہ اس کی نسل بھی حاصل کر لیں۔ رسول اللہ ﷺ نے جاہلیت کی اس بیع سے منع فرمایا۔ اس کی علت بالکل واضح ہے کہ یہاں سارا معاملہ مجہول ہے۔ نہ معلوم گابھن اونٹنی کیا جنتی ہے، سالم یا ناقص، نر یا مادہ، پھر وہ نر یا مادہ بلوغت کو پہنچتے بھی ہیں یا نہیں اور اگر پہنچ جاتے ہیں تو کیا بنتے ہیں۔ غرضیکہ سارا معاملہ مجہول بھی ہے اور معدوم بھی۔ اس بیع میں مدت بھی معین نہیں کہ کب یہ سارا عمل مکمل ہوگا اور ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ ایسی بیع میں ایک فریق یا دونوں کو ضرر بھی ہے اور غرر بھی۔

امام مالکؒ کے نزدیک ایسی بیع میں کچھ حرج نہیں اگر جانور کی صفات متعین کر دی جائیں اور خریدنے والے کو اس بات کا خیار ہو کہ اگر جانور موصوف نہ حاصل ہو تو بیع کو رد کر دے۔ میرے نزدیک اس صورت میں بھی ایسی بیع درست نہیں کیونکہ مدت معین نہیں ہو سکتی۔

بَيْعُ الْحَيَوَانِ بِاللَّحْمِ

جانور کو گوشت کے بدلے فروخت کرنا

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الْحَيَوَانِ بِاللَّحْمِ۔

﴿سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جانور کو گوشت کے بدلے بیچنے سے منع فرمایا۔﴾

وضاحت:

یہ روایت اگرچہ مرسل ہے لیکن ایسی بیع کے منع فرمانے کی علت واضح ہے کہ اس میں ضرر کا اندیشہ ہے۔ احناف کے نزدیک ایسی بیع فاسد اور مکروہ ہے اور اس کی مثال بیع مزابنہ اور محاقلہ جیسی ہے۔ میرے نزدیک ایسی بیع اس لیے درست نہیں کہ جانور کے گوشت کا صحیح صحیح اندازہ کرنا ممکن نہیں۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس بات پر فقہائے مدینہ کا اتفاق ہے کہ اونٹ یا گائے بکری یا ان جیسے جنگلی جانوروں کے گوشت کا اگر تبادلہ کیا جائے گا تو مقدار اور وزن برابر رکھنا ہوگا، اس لیے کہ سب ایک ہی جنس ہیں۔

امام مالکؒ اور فقہائے مدینہ کا یہ فتویٰ میرے نزدیک صحیح نہیں۔ اگر آپ ہرن کا شکار کریں تو اس کے گوشت کو بکری کے بہتر سے بہتر گوشت پر ترجیح ہوگی۔ نیل گائے کے گوشت کو گائے یا بھینس کے بہترین سے

بہترین گوشت پر ترجیح ہوگی۔ اسی طرح مچھلی کا گوشت اونٹ کے گوشت یا گائے بکری کے گوشت کے مقابلہ میں قابل ترجیح ہو سکتا ہے۔ گوشت کی ان اقسام کی قدر و قیمت اور جنس بھی مختلف ہو جاتی ہے اس لیے یکساں مقدار پر ان کا تبادلہ ممکن نہیں۔

مَاجَاءَ فِي ثَمَنِ الْكَلْبِ

کتے کی قیمت کے بارے میں روایت

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ أَبِي بَكْرِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ الْحَارِثِ بْنِ هِشَامٍ عَنْ أَبِي مَسْعُودٍ الْأَنْصَارِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ وَمَهْرِ الْبَغِيِّ وَحُلْوَانِ الْكَاهِنِ۔

﴿ابو مسعود انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کتے کی قیمت، زانیہ کی اجرت اور کاہن کے حلوہ سے منع فرمایا۔﴾

وضاحت:

اس روایت میں نبی اکرم ﷺ نے جن تین چیزوں سے منع فرمایا ہے ان میں پہلی چیز کتے کی قیمت لینا ہے۔ یعنی کوئی شخص کتے پکڑ پکڑ کر بیچنے کا دھندا شروع کر دے تو یہ کوئی پسندیدہ فعل نہیں۔ کتا ہمیشہ سے فصل اور کھیتی کی نگرانی کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے نہ اس کو سدھانے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ کوئی خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اگر کسی کو کتے کی ضرورت ہو تو اس سے کتے کی قیمت وصول کرنا ایک سخت گناہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کی حکمت یہی معلوم ہوتی ہے۔

باقی رہا سدھائے ہوئے کتوں کا مسئلہ تو ایسے کتوں کا معاملہ الگ ہے۔ زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام دونوں میں شکاری کتے خاص شکار کے مقصد کے لئے سدھائے جاتے تھے۔ اس کا قرآن مجید میں بھی ذکر ہے۔ مَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ تُعَلِّمُونَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللَّهُ۔ (مائدہ ۵: ۴) "اور شکاری جانوروں میں سے جن کو تم نے سکھایا ہے اس علم میں سے کچھ سکھا کر جو خدا نے تم کو سکھایا"۔ مکلب کا لفظ ٹریننگ دینے کے معنی کے لیے خاص ہو گیا۔ کتوں کی ٹریننگ شکیات کا پتہ لگانے کے لیے بھی کی جاتی ہے۔ ایسے کتے ہوائی اڈوں اور بندرگاہوں پر اس

مقصد کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔اسی طرح سدھائے ہوئے کتے فوج اور پولیس میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ان کتوں کی ٹریننگ پر نہ صرف محنت کرنی پڑتی ہے بلکہ خاصا خرچ کرنا پڑتا ہے۔میرے نزدیک ایسے سدھائے ہوئے کتوں کی قیمت لینے میں کوئی حرج نہیں اور وہ اس حدیث کے مفہوم میں شامل نہیں ہیں۔

مالکیہ کا فتویٰ یہ ہے کہ کتے کی قیمت نہیں لینی چاہیے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔اس معاملہ میں وہ شکاری یا غیر شکاری کتے کا فرق نہیں کرتے۔شوافع بھی مالکیہ کے ہم خیال ہیں لیکن ان کے نزدیک قیمت نہ لینے کی علت کتے کی نجاست ہے۔امام ابو حنیفہؒ اور صاحبین کے نزدیک کتے کی بیع جائز ہے۔ان کی دلیل یہ ہے کہ کتا ایک کار آمد جانور ہے جو نگہبانی اور شکار کے لیے مفید ہے۔وہ اس بارے میں ایک حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں جس میں شکاری کتے کی بیع کو عام کتے سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔یہ حدیث نسائی میں ہے اگرچہ بالاتفاق ضعیف ہے۔احناف یہ بھی کہتے ہیں کہ سدھائے ہوئے کتے کو اگر کوئی قتل کر دے تو اس پر جرمانہ عائد کیا جا سکتا ہے۔میری بھی یہی رائے ہے اور میرے نزدیک حنفیہ کا مسلک زیادہ معقول ہے۔

روایت میں دوسری چیز جس کی نبی اکرم ﷺ نے ممانعت فرمائی وہ زانیہ کی اجرت ہے۔زنا جب ایک کبیرہ گناہ ہے تو اس کو کمائی کا ذریعہ بنانا بدرجہ اولیٰ حرام ہے۔

تیسری چیز جس کی نبی اکرم ﷺ نے ممانعت فرمائی ہے وہ کاہن کا حلوہ ہے جو اس کو کہانت کی اجرت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔یہ بھی بالاتفاق حرام ہے۔قرآن مجید کی رو سے شیاطین جھوٹوں اور گناہ گاروں پر القا کرتے ہیں۔اس روایت کا اطلاق منجم اور کاہن دونوں پر ہوتا ہے کیونکہ دونوں کا عمل باطل اور کل کا کل جھوٹ ہوتا ہے۔ان کی پیشگوئیوں میں اگر کبھی بھار تقدیر الٰہی سے کوئی بات سچی ثابت ہو جاتی ہے تو کاہن یا منجم کے علم کو اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا۔

اَلسَّلَفُ وَ بَيْعُ الْعُرُوْضِ بَعْضِهَا بِبَعْضٍ
پیشگی ادائیگی کے ساتھ سامان کی بیع

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ بَيْعٍ وَ سَلَفٍ۔

﴿امام مالکؒ سے روایت ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسی بیع سے منع فرمایا جس

میں سلف یعنی پیشگی ادائیگی ہو۔﴾

وضاحت:

امام مالکؒ اس کی تفصیل یوں کرتے ہیں کہ ایک آدمی دوسرے سے کہے کہ میں فلاں چیز لے لوں گا اس شرط پر کہ آپ فلاں چیز مجھے اس قیمت پر دے دیں۔اس صورت حال میں بیع اور سلف دونوں شامل ہو جاتے ہیں۔پیشگی ادائیگی کی صورت یہ ہے کہ آپ نے معاملہ طے کر دیا کہ فلاں چیز لوں گا اس شرط پر کہ تم فلاں چیز مجھے دے دو۔اگر سلف کی شرط اڑا دی جائے تو بیع جائز ہو جائے گی۔

میرے نزدیک بیع میں کوئی شرط بیع کے منشا کے خلاف داخل کرنا جائز نہیں۔نیز زیر بحث معاملہ میں مذکورہ شرط کے باعث یہ بیع جائز نہیں ہے۔اس میں ضرر و غرر کے علاوہ قمار کا شائبہ بھی پایا جاتا ہے۔

اَلسَّلَفُ فِي الْعُرُوْضِ
سامان کے ضمن میں پیشگی

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ عَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ اَنَّهٗ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَبَّاسٍ وَ رَجُلٌ يَسْاَلُهٗ عَنْ رَجُلٍ سَلَفَ فِي ثِيَابٍ فَاَرَادَ بَيْعَهَا قَبْلَ اَنْ يَقْبِضَهَا فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ تِلْكَ الْوَرِقُ بِالْوَرِقِ وَ كَرِهَ ذٰلِكَ۔

﴿قاسم بن محمد کہتے ہیں کہ میں نے سنا کہ ایک آدمی عبداللہ بن عباسؓ سے دوسرے شخص کے بارے میں فتویٰ پوچھ رہا تھا جس نے پیشگی رقم دے کچھ چادروں کی خریداری کے لیے دے دی پھر ان چادروں کو قبضہ میں لینے سے پہلے بیچنا چاہا۔ابن عباس نے کہا یہ تو چاندی کے بدلے چاندی کا سا معاملہ ہے اور اس کو مکروہ گردانا۔﴾

وضاحت:

اس معاملہ میں ایک غلطی یہ تھی کہ قبضے سے پہلے فروخت جائز نہیں۔کیونکہ قبضے کے بغیر ملکیت تام نہیں ہوتی۔جن چیزوں کے بارے میں نزاع پیدا ہونے کا سوال نہیں ہوتا ان چیزوں کی بیع ہو جائے گی۔احناف

صرف غلے میں بیع سے پہلے قبضہ کی شرط مانتے ہیں، دوسری چیزوں کی بیع سے پہلے قبضہ ضروری نہیں سمجھتے۔ کیونکہ ان کے نزدیک نبی اکرم ﷺ نے طعام کے بارے میں پیشگی قبضہ کا حکم دیا ہے۔

امام مالک کا فتویٰ یہ ہے کہ کسی نے غلام یا جانور یا سامان کی خرید کے لیے اگر پیشگی رقم دے دی جب کہ خریدی جانے والی چیز کے اوصاف معین اور مدت مقرر کر دی گئی ہو تو اس مدت کے پورا ہونے پر اگر مشتری اس چیز کو اسی شخص کے پاس جس سے اس نے اس کو خریدا تھا اس قیمت سے زیادہ پر فروخت کر دے جو اس نے پیشگی ادا کی ہے تو اس میں ربا کا شائبہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ رقم بائع کے پاس کچھ عرصہ رہی ہے اور اس نے اس رقم سے فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن اگر کسی دوسرے کے پاس بیچے تو کچھ حرج نہیں۔ میرے نزدیک امام مالک کی یہ بات ٹھیک ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ سامان اس شخص کے ہاتھ نہ بیچے جس سے خریدا ہے بلکہ کسی اور کے ہاتھ بیچ دے تاکہ ربا کا شائبہ نہ رہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں یہ بات متفق علیہ ہے کہ سونے اور چاندی کے سوا جو چیزیں وزن کی جاتی ہیں جیسے تانبا، شبہ، رانگ، سکہ، لوہا، سبزی، انجیر، روئی اور ان جیسی دوسری چیزیں تو ان کے بارے میں کچھ حرج نہیں کہ ایک صنف کی ایک چیز کے بدلے میں دوسری صنف کی چیزیں دو لی جائیں۔ مثلاً لوہے کے ایک رطل کے بدلے دو رطل لوہا اور پیتل کے ایک رطل کے بدلے میں دو رطل پیتل۔ یہ امام مالک کا فتویٰ ہے۔ یہ اس اصول پر مبنی ہے کہ اگر جنس مختلف ہو تو تفاضل جائز ہے البتہ امام مالک وزن کی شرط جو لگاتے ہیں اس کی علت میری سمجھ میں نہیں آئی۔

اَلنَّهْيُ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ

ایک بیع کے اندر دو بیع کی ممانعت

- حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ۔

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بیع کے اندر دو بیع کرنے سے منع فرمایا۔﴾

- حَدَّثَنِي مَالِكٌ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِرَجُلٍ اَبِيْعُ لِي هٰذَا الْبَعِيْرَ بِنَقْدٍ حَتّٰى اَبْتَاعَهٗ مِنْكَ اِلٰى اَجَلٍ فَسَاَلَ عَنْ ذٰلِكَ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ فَكَرِهَهٗ وَ نَهٰى عَنْهُ۔

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی کہ ایک آدمی نے دوسرے سے کہا یہ اونٹ آپ میرے لیے نقد خرید لو اور

میں آپ سے ایک مدت کے بعد خرید لوں گا۔ پھر عبداللہ بن عمرؓ سے فتویٰ پوچھا تو انہوں نے اس سودے کو مکروہ جانا اور اس سے روکا۔﴾

- حَدَّثَنِي مَالِكٌ" اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ الْقَاسِمَ بْنَ مُحَمَّدٍ سُئِلَ عَنْ رَجُلٍ اشْتَرٰى سِلْعَةً بِعَشَرَةِ دَنَانِيْرَ نَقْدًا اَوْ بِخَمْسَةَ عَشَرَ دِيْنَارًا اِلٰى اَجَلٍ فَكَرِهَ ذٰلِكَ وَ نَهٰى عَنْهُ۔

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی کہ قاسم بن محمد سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس نے ایک چیز بیک وقت دس دینار نقد یا پندرہ دینار ادھار پر خریدی تو انہوں نے اس کو ناجائز جانا اور اس سے منع کیا۔﴾

وضاحت:

ترمذی نے ایک بیع میں دو بیعوں کی روایت کو وصل کیا ہے اور نسائی نے اسے ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ قاسم بن محمد والی روایت میں ایک ہی بیع میں دو بیعوں کی مثال موجود ہے۔ اس میں ادھار کی صورت میں پانچ دینار کی زیادتی اصل میں دس دینار پر ربا کی ایک شکل ہے۔ اسی علت کی وجہ سے رسول اکرم ﷺ نے ایسی بیع سے منع فرمایا ہے۔ اونٹ کے سودے والی روایت میں بیع کے مکروہ یا ناجائز ہونے کی علت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس میں اصل مشتری تو وہ ہے جو نقد خرید رہا ہے۔ اس کے سودے میں ناجائز ہونے کی کوئی علت نہیں۔ رہ گیا دوسرا آدمی جو بعد میں خریدے گا تو وہ اس وقت بیع نہیں کر رہا بلکہ صرف بیع کا وعدہ کر رہا ہے۔ اس وعدہ کے ناجائز ہونے کی علت مجھ پر واضح نہیں۔

بَيْعُ الْغَرَرِ

دھوکا بازی کی بیع

- حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِيْ حَازِمِ بْنِ دِيْنَارٍ عَنْ سَعِيْدِ ابْنِ الْمُسَيَّبِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ بَيْعِ الْغَرَرِ۔

﴿سعید بن مسیبؒ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دھوکے بازی کی بیع سے منع فرمایا﴾

وضاحت :

اسلام میں بیع کا یہ مسلم اصول ہے کہ اس میں کسی ایک فریق کو بھی دھوکا نہیں ہونا چاہیے۔ جس بیع میں ایک فریق کو نقصان یا اس سے دھوکہ ہو رہا ہو تو وہ بیع حرام ہے۔ بیع غرر کی تعریف امام مالک نے یہ کی ہے کہ وہ بیع جس کا ظاہر مشتری کو دھوکہ دینے والا اور اس کا باطن مجہول ہو۔ مشتری دھوکہ تو کھا جائے لیکن وہ دھوکا اتنا پر پیچ ہو کہ اس کا پتہ نہ پا سکے۔ اس کی مثال انہوں نے یہ دی کہ ایک آدمی کا اونٹ گم ہو گیا اور اس کی قیمت پچاس دینار ہے۔ تلاش کرنے والا یہ کہے کہ یہ لو پچاس دینار، اگر مل گیا تو اسی قیمت پر اونٹ میرا ہو گا۔ اب اگر دیا جائے تو بائع کے پچاس دینار گئے اور اگر نہ ملا تو خریدنے والے کے پچاس دینار گئے۔ اس میں حرمت کا اصل پہلو یہ ہے کہ یہ شرط باطل ہے کیونکہ اس میں ایک نہ ایک فریق کو ضرر اور غرر لازمی ہے۔ فرض کریں اونٹ مل بھی جاتا ہے تو نہ معلوم کس حالت میں ملتا ہے۔ زخمی ہو چکا ہے یا مار ہے۔ تلاش و پھرنے کے دوران اس کو کسی قسم کا بھی ضرر پہنچ سکتا ہے۔ اگر ملتا ہی نہیں تب خریدنے والے کو نقصان لازم ہے۔ پس وہ تمام شکلیں جن میں ایک فریق کے لیے کسی قسم کا خطرہ ہو ناجائز ہیں۔ یہی حال جوئے اور ریس وغیرہ کا ہے۔ جیتنے والے گھوڑے کا مالک سب رقم سمیٹ لیتا اور باقی سب لٹ جاتے ہیں۔ اسی سبب سے جوئے اور ریس کو حرام ٹھہرایا گیا ہے۔

بیع غرر کی دوسری مثال امام مالک نے یہ بیان کی ہے کہ جو بچہ ابھی مادہ کے پیٹ میں ہے اس کی بیع بھی غرر کی ایک قسم ہے۔ معلوم نہیں نر پیدا ہوتا ہے یا مادہ، سالم پیدا ہوتا ہے یا ناقص، کچھ روز زندہ رہتا بھی ہے یا نہیں۔ غرض کچھ بھی متعین طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ میرے نزدیک ایسی صورت میں علی الوصف اگر معاملہ کیا جائے تو درست ہو سکتا ہے۔ سب کچھ تحریر کر لیا جائے کہ اگر مذکورہ صفات کے مطابق بچہ پیدا ہو تو ٹھیک ورنہ بیع فسخ کر دی جائے گی یعنی مشتری کو خیار کا حق رہے گا۔ یہ بات امام مالک کے بیع علی الوصف کے اصول کے مطابق ہے۔

اَلْمُلَامَسَةُ وَ الْمُنَابَذَةُ

ہاتھ لگا کر اور چیز پھینک کر سودا کرنا

"ملامسہ" کے معنی ہاتھ لگانے اور منابذہ کے معنی پھینک دینے کے ہیں۔ یہ ناجائز بیع کی قسمیں ہیں۔ ملامسہ بیع میں جس چیز پر آپ ہاتھ رکھ دیں گے وہ ثمن بن جائے گی اور جس چیز کا مطالبہ کریں گے وہ مبیع بن جائے

گی۔ منابذہ میں ایک شخص دوسرے کی طرف کپڑا پھینک دیتا ہے اور دوسرا شخص اس کی طرف کوئی چیز تو وہ بھی ثمن اور مبیع بن جاتی ہیں۔ یہ جوئے کی ایک شکل ہے، اس لیے ناجائز ہے۔

حدثنی یحیٰی عن مالك عن محمد بن یحیی بن حبان و عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ نهی عن الملامسة والمنابذة۔

﴿ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ملامسہ و منابذہ سے منع فرمایا۔﴾

وضاحت :

امام مالکؒ نے اس کی وضاحت یوں کی ہے کہ ملامسہ یہ ہے کہ ایک آدمی کپڑے کو ہاتھ لگائے۔ اس کو کھولے نہیں یعنی اس کی حقیقت معلوم کیے بغیر اس کو خریدے یا رات کو خریدے جب کہ اس کو معلوم نہ ہو کہ اس میں کیا ہے۔ منابذہ یہ ہے کہ آدمی اپنی چیز دوسرے شخص کے آگے پھینک دے اور دوسرا اپنی چیز اس کے بدلے میں پھینکے اور دونوں کو ایک دوسرے کی چیز کی اصلیت یا اس کی قیمت کا کچھ اندازہ نہ ہو۔ یہ دونوں صورتیں صریح جوا ہیں اس لیے نبی ﷺ نے ان سے منع فرمایا ہے۔

اس زمانے میں سودے کی ایک اور صورت بھی تھی کہ فہرست کے مطابق مال کی بیع ہوتی۔ مال کو کھول کر نہیں دیکھا جاتا تھا۔ بس پیٹیوں میں مال بند ہوتا اور پیٹیاں گن کر پوری کر لی جاتیں۔ امام مالک کے نزدیک یہ منابذہ میں نہیں آتا۔ آج کل تجارت کا انداز یہی ہے۔ اس میں اگر خریدار کو خیار حاصل ہو کہ اگر مال فہرست کے مطابق نہ ہے تو بیع کو رد کر دے تو پھر اس سودے میں کچھ حرج نہیں اور یہ صورت ملامسہ یا منابذہ کے حکم میں نہیں آتی۔

بَیْعُ الْمُرَابَحَةِ

منافع پر بیچنا

امام مالکؒ بیع المرابحہ یعنی منافع پر بیچنے کے بارے میں اپنا فتویٰ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں یہ بات متفق علیہ ہے کہ اگر کسی شخص نے ایک شہر میں کپڑا خریدا پھر وہ اس کو لے کر دوسرے شہر میں آیا اور وہ کپڑا نفع پر بیچنا ہے تو وہ اس کی قیمت میں دلالوں کی اجرت، کپڑا تہ کرنے اور لادنے کا خرچہ اور ٹھہرنے کی جگہ کا کرایہ وغیرہ شامل نہیں کر سکتا۔ صرف باربرداری کا خرچہ شامل کر سکتا ہے۔ میرے خیال میں یہ فتویٰ اس زمانے میں نہیں چل

سکتا۔ ہر چیز کا خرچہ جو اس سے متعلق ہو گا وہ شمار کرنا پڑے گا۔ آج کل ٹیلی فون کا خرچہ، دفتر کے اخراجات اور ہوٹل کا کرایہ وغیرہ سب خرچ شامل کرنے کے بعد منافع کا تعین ہو سکے گا۔ میری رائے میں اس زمانے میں تجارت کے جو اصول ہیں اور جن پر معاملات قائم ہیں وہ بالکل فطری ہیں۔

اَلْبَیْعُ عَلَی الْبَرْنَامِجِ

فہرست کے مطابق بیع

فہرست کے مطابق بیع کے باب میں بھی کوئی حدیث یا اثر نہیں۔ صرف امام مالک کا فتویٰ ہے۔ آج کل بین الاقوامی تجارت اسی طریقہ پر ہو رہی ہے۔ ایجنٹوں کے ذریعے سے مال آتا ہے اور بغیر دیکھے دکھائے صرف اعتماد پر فروخت ہوتا ہے۔ یہ بیع علی الوصف کے زمرے میں آتی ہے۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ایک شخص دوسرے شخص سے کہتا ہے کہ وہ کپڑا جو آپ نے فلاں شخص سے خریدا ہے مجھے اس کے متعلق معلوم ہے۔ اگر میں تمہارے حصہ میں اتنا نفع دے دوں تو کیا تم مجھے شریک بنا لو گے۔ اگر وہ مان جائے تو یہ شخص بھی اس کا شریک بن جائے گا۔ اگر بعد میں وہ دیکھے کہ مال تو فہرست کے مطابق نہیں یا گراں ہے تو امام مالکؒ کے نزدیک وہ اس کو لازمی لینا ہو گا اور اس کو خیار نہیں رہے گا۔ کیونکہ اس نے معلومات ہوتے ہوئے سودا کیا تھا۔

بَیْعُ الْخِیَارِ

بیع جس میں مال واپس کرنے کا اختیار ہو

❐ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَلْمُتَبَایِعَانِ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا بِالْخِیَارِ عَلٰی صَاحِبِهٖ مَالَمْ یَتَفَرَّقَا اِلَّا بَیْعَ الْخِیَارِ۔

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خرید و فروخت کا معاملہ کرنے والے اپنی خرید و فروخت کے بارے میں اس وقت تک اختیار رکھتے ہیں جب تک وہ الگ نہیں ہوتے۔ مگر بیع خیار کا معاملہ اس سے الگ ہے۔﴾

وضاحت :

بیع کا عام اور معروف طریقہ یہ ہے کہ آپ دکان پر گئے، کوئی شے خریدی، پیسے دیئے اور چلے گئے۔ بائع سے الگ ہونے سے پہلے آپ چیز کی دیکھ بھال اور مول بھاؤ کر لیتے ہیں اور آپ کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ شے لے لیں یا نہ خریدیں۔

بیع خیار میں مشتری خیار کی شرط لگا دیتا ہے تو اس کی پابندی ضروری ہوتی ہے۔ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کے متعلق فوری فیصلہ ممکن نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک آدمی بکری خریدتا ہے۔ وہ بائع سے کہتا ہے کہ دیکھوں گا کہ کتنا دودھ دیتی ہے۔ اسی وقت فوری فیصلہ اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایک آدمی ایک گھوڑا خریدتا ہے، اسے دیکھتا ہے کہ وہ اڑیل ہے یا شائستہ ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ریڈیو اور ٹی وی کا معاملہ بھی ایسا ہے کہ مشتری کہہ سکتا ہے کہ چند دن اس کی کارکردگی دیکھ کر فیصلہ کروں گا۔ تو ایسی چیزوں کی بیع کا معاملہ الگ ہے۔ اس میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کتنے دن کا خیار ہو گا۔ یہ عرصہ غیر متعین نہیں ہو سکتا۔ احناف اور شوافع کے نزدیک تین دن تک فیصلہ ہو جانا چاہیے۔ مالکیہ کہتے ہیں کہ اس کی کوئی حد معروف مقرر نہیں۔ احناف اور شوافع جو تین دن کی قید لگاتے ہیں تو یہ مدت بہت سی چیزوں کے لیے کافی ہے لیکن سب چیزوں کے لیے کافی نہیں۔ مثلاً آپ نے مکان لینا ہے اور اس کے پڑوس اور اس کے ماحول کو معلوم کرنا ہے تو اس کے لیے تین دن کی مدت قرین انصاف نہیں معلوم ہوتی۔ دوسری طرف مالکیہ کا مسلک بھی درست نہیں معلوم ہوتا۔ خیار کی مدت کو غیر معین عرصہ کے لیے معلق نہیں رکھا جا سکتا۔ میرے نزدیک چیزوں کے لحاظ سے خیار کی اتنی مدت متعین ہو گی جس پر بائع اور مشتری دونوں رضامند ہو جائیں۔

اس زمانہ میں باہر کے ملکوں سے جو بیع ہوتی ہے وہ سب بیع سلم ہوتی ہے۔ اس میں رقم دے دی جاتی ہے اور مبیع (فہرست) کے مطابق مال لیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی خیار ہوتا ہے کہ اگر مال معینہ اوصاف کے مطابق نہ ہو تو آپ بیع فسخ کر سکتے ہیں۔ میرے نزدیک بیع کے اس طریقہ میں کوئی خرابی نہیں۔

بعض ممالک میں خیار کا ایک شریفانہ طریقہ بھی ہے کہ آپ چیز لے جائیں اور اسے استعمال کریں۔ استعمال کے بعد اگر دیکھیں کہ ناقص ہے یا آپ کو پسند نہیں تو واپس کر دیں۔ بائع بڑی شرافت سے واپس لے لیتا ہے۔ اس بیع میں نہ عالم بظرفا کی حد ہے نہ خیار کی مدت کی۔ کاروبار کی ترقی کے لیے یہ حربہ اختیار کیا جاتا ہے۔

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ كَانَ يُحَدِّثُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَيُّمَا بَيِّعَيْنِ تَبَايَعَا فَالْقَوْلُ مَا قَالَ الْبَائِعُ اَوْ يَتَرَادَّانِ۔

﴿عبداللہ بن مسعود بیان کرتے تھے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ دو فریق جب کوئی معاملہ کر چکیں تو اختلاف کی صورت میں بائع کا قول معتبر ہوگا یا پھر دونوں بیع منسوخ کر دیں﴾

وضاحت :

یہ روایت بہت مبہم ہے۔ اس میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بیع ہو چکنے کے بعد اختلاف کی صورت میں خالی بائع کا قول کیوں معتبر ہوگا، مشتری کا موقف بھی تو درست ہو سکتا ہے۔ آگے امام مالک نے اپنا ایک فتویٰ نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس روایت کے مضمون سے مطمئن نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر بیع کے بعد بائع اور مشتری میں جھگڑا پیدا ہو جائے تو بائع سے کہا جائے گا کہ وہ قسم کھائے یا مشتری کی بات مان لے۔ اگر وہ قسم کھا جائے تو مشتری سے کہا جائے گا کہ وہ یا تو بائع کا قول تسلیم کر لے یا اپنے قول پر قسم کھائے۔ اس طرح امام صاحب بائع اور مشتری دونوں کو موقع دیتے ہیں۔ احناف اس بارے میں یہ کہتے ہیں کہ اگر مال تلف ہو گیا ہو تب صرف مشتری کے قول کا لحاظ ہوگا۔

مَاجَاءَ فِي الرِّبَا فِي الدَّيْنِ

قرضے میں ربا کے بارے میں

❐ حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابِي الزِّنَادِ عَنْ بُسْرِ بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ عُبَيْدٍ اَبِي صَالِحٍ مَوْلَى السَّفَّاحِ اَنَّهٗ قَالَ بِعْتُ بَزًّا لِي مِنْ اَهْلِ دَارِ نَخْلَةَ اِلٰى اَجَلٍ ثُمَّ اَرَدْتُ الْخُرُوْجَ اِلَى الْكُوْفَةِ فَعَرَضُوْا عَلَيَّ اَنْ اَضَعَ عَنْهُمْ بَعْضَ الثَّمَنِ وَ يَنْقُدُوْنِيْ فَسَاَلْتُ عَنْ ذٰلِكَ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ فَقَالَ لَا آمُرُكَ اَنْ تَاْكُلَ هٰذَا وَلَا تُوْكِلَهٗ۔

﴿سفاح کے آزاد کردہ غلام عبید ابی صالح بیان کرتے ہیں کہ میں نے دار نخلہ والوں کے پاس اودھار پر کپڑے بیچے۔ پھر میرا ارادہ ہوا کہ کوفہ چلا جاؤں تو ان لوگوں نے یہ پیشکش کی کہ میں قیمت کم کر دوں

اور نقد وصولی کر لوں۔ میں نے زید بن ثابتؓ سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نہ تو تمہیں اس کے کھانے کی اجازت دیتا ہوں نہ کھلانے کی۔﴾

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عُثْمَانَ بْنِ حَفْصِ بْنِ خَلْدَةَ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ سُئِلَ عَنِ الرَّجُلِ يَكُوْنُ لَهُ الدَّيْنُ عَلَى الرَّجُلِ اِلٰى اَجَلٍ فَيَضَعُ عَنْهُ صَاحِبُ الْحَقِّ وَيُعَجِّلُهُ الْاٰخَرُ فَكَرِهَ ذٰلِكَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ وَنَهٰى عَنْهُ۔

﴿سالم بن عبداللہؒ روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرؓ سے پوچھا گیا کہ ایک آدمی کا دوسرے پر ایک مدت مقررہ تک کے لیے قرض ہے۔ رقم میں حق والا کچھ کمی کر دیتا ہے اور دوسرا مدت سے پہلے واپس کر دیتا ہے تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس کو مکروہ جانا اور اس سے منع فرمایا۔﴾

وضاحت :

یہ دونوں روایتیں ضع و تعجل کے اصول سے متعلق ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ قرض کی فوراً ادائیگی کے بدلے قرض کی رقم میں کمی کر دی جائے۔ یہ اصول جاہلیت میں عام تھا۔ قرض کی مدت جب ختم ہو جاتی تو قرض خواہ کہتا کہ ادا کرو گے یا سود دو گے۔ اگر وہ رقم دے دیتا تو ٹھیک ورنہ وہ قرض کی رقم میں اضافہ کر دیتا اور مدت بڑھا دیتا۔ قریش تاجر قوم تھی۔ یہ لوگ یہودی مہاجنوں سے بڑی بڑی رقمیں سود پر اودھار لیتے تھے۔ جب مدت پوری ہو جاتی تو یہود کہتے کہ ادا کرو ورنہ رقم اور مدت میں اضافہ کر دیا جائے گا۔ اس زمانہ کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ صورتی شکل جاہلیت کے زمانے میں تھی اب بالکل بدل گئی ہے اور اس کے حق میں بڑی دلپذیر تقریر کرتے ہیں۔ لیکن جب تجزیہ کیا جائے تو کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ صرف شکل ذرا بدلی ہوئی ہوتی ہے۔

کلیہ یہ ہے کہ تاجر اور سود خور کے منافع میں اصولی فرق ہے۔ تاجر جو منافع لیتا ہے اس کے لیے اس کا سرمایہ بازی کھیلتا ہے، بازار کے اتار چڑھاؤ کا مقابلہ کرتا ہے، معاشرے کی خدمت کرتا ہے، تب جا کر منافع حاصل کرتا ہے۔ بخلاف اس کے سود خور کا سرمایہ ایک ایسا سانڈ ہے جو دوسرے کی چراگاہ میں چر کر موٹا ہوتا ہے اور خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔ "ضع و تعجل" کا اصول اسلام کے تحت نہیں آتا۔ اس لیے زید بن ثابت اور عبداللہ بن عمرؓ نے اس کو مکروہ جانا۔

نبی ﷺ نے جب بنو نضیر کو جلاوطن کیا تو انہوں نے کہا کہ ہمارے قرضے لوگوں کے ذمے ہیں اور ان کی مدت ابھی پوری نہیں ہوئی۔ تو آپ نے فرمایا "ضع و تعجل" مطلب یہ کہ رقم کم کرو اور فوراً وصول کر لو۔ اس واقعہ کی روشنی میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے لیے اس طرح کرنا جائز تھا تو اب یہ ناجائز کیوں ہو گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بنو نضیر کی جلاوطنی کا معاملہ حرمت ربوا سے پہلے کا ہے کیونکہ حرمت ربوا کا حکم حجۃ الوداع کے موقع پر گیا جس کے بعد آپ نے فرمایا ربوا الجاهلية موضوع تحت قدمي هاتين (جاہلیت کے زمانے کا سود میرے ان دو قدموں کے نیچے ہے)

بنو نضیر کے معاملے کی ایک دوسری توجیہ بھی ہو سکتی ہے کہ آنحضرتؐ نے اس کو ایک سیاسی مسئلے کے طور پر حل فرمایا۔ اور اس میں کوئی خلاف شرع بات معلوم نہیں ہوتی۔ ایک قوم کو جلاوطن کیا جا رہا ہے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ ان کی رقم ہڑپ نہ کی جائے تو اس معاملے کا بہترین حل یہی تھا کہ وہ رقم کم لے لیں اور رفقہ معاملہ طے ہو جائے۔ اس صورت حال میں اور نسیئہ پر تفاضل میں بنیادی فرق ہے۔ بنو نضیر کا معاملہ ایک سیاسی مسئلے کے طور پر حل کیا گیا۔ جب کہ نسیئہ کاروبار اخلاقی بنیاد پر حرام ہے۔

جَامِعُ الدَّيْنِ وَ الْحَوَالِ

قرض اور حوالہ کے بارے میں جامع باب

☐ حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ وَ اِذَا اُتْبِعَ اَحَدُكُمْ عَلٰى مَلِيٍّ فَلْيَتْبَعْ۔

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ صاحب مال کا مال مول کرنا ظلم ہے اور اگر تم میں سے کوئی کچھ مدت کے لیے ٹالا جائے تو اس کو چاہیے کہ وہ قبول کرے۔﴾

وضاحت:

اس روایت میں پہلا جملہ "مطل الغنی ظلم" (مالدار کا قرض ادا کرنے میں ٹال مول کرنا ظلم ہے) تو بالکل صاف ہے۔ لیکن روایت کا دوسرا حصہ بڑا زائغ ہے۔ اکثر شارحین نے "ملی" کو غنی کے معنی میں لیا ہے۔ یہ لفظ اس معنی میں بھی آتا ہے لیکن اعلیٰ لغت میں اس کے معروف معنی ملیا کے ہیں جس معنی میں وہ قرآن مجید میں ہے کہ

آپ نے حضرت ابراہیم سے کہا تھا واهجرني ملیا۔ یہاں ملیا کا لفظ ساعت، مدت، وقت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ واهجرني ملیا کے معنی 'یہاں سے دور ہو جاؤ اور میرے پاس کبھی نہ آئیو' کے بھی ہو سکتے ہیں اور 'یہاں سے رخصت کے لیے چلے جاؤ' کے بھی ہو سکتے ہیں۔ اتبع کے معنی کسی کو کسی رخ پر ٹالنے کے آتے ہیں۔ اس طرح قرآن مجید کے مطابق معنی لینے سے حدیث کا مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ اگر کسی کو کچھ مدت کے لیے ٹالا جائے تو اس کو چاہیے کہ وہ قبول کرے۔ اس طرح دونوں فقرے بہت پر حکمت معلوم ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کسی غنی کا مال ٹالتے ہوئے ٹال مٹول کرنا غیر شاکستہ حرکت ہے۔ ایسا کرنے والا لئیم آدمی ہے۔ لیکن تم بھی ذرا آدمی ہو۔ اگر تم کو کچھ وقت کے لیے ٹالا جاتا ہے تو ٹل بھی جاؤ۔ اگر ملی کو غنی کے معنی میں لیا جائے، جیسا کہ اکثر شارحین نے لیا ہے، تو مطلب یہ ہو گا کہ جب تم میں سے کسی کو مال دار شخص کے حوالے کیا جائے تو چاہیے کہ وہ قبول کرے۔ غور کیجئے کیا یہ بات معقول بات ہے۔ آخر اپنی بلا دوسرے کے سر کیوں ڈالی جائے اور قرض خواہ کو اس تجویز کو ماننے پر کیوں مجبور کیا جائے۔ شارحین اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ واجب نہیں، محض ایک مشورہ ہے۔ تو اس مشورے کی ضرورت قرضے کی ادائیگی میں کیسی! یہ بالکل مہمل بات معلوم ہوتی ہے۔ اتنے عظیم فقرہ "مطل الغنی ظلم" کے بعد کوئی ایسی بات ہونی چاہیے۔ میرے خیال میں ملی کے معنی غنی لینے کے بجائے اگر مدت لیا جائے تو بات نہایت پر حکمت ان جاتی ہے۔ واللہ اعلم عند اللہ۔

مَاجَاءَ فِي اِفْلَاسِ الْغَرِيْمِ

خریدار کے دیوالیہ ہو جانے کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ اَبِي بَكْرِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ الْحَارِثِ بْنِ هِشَامٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَيُّمَا رَجُلٍ بَاعَ مَتَاعًا فَاَفْلَسَ الَّذِي ابْتَاعَهُ مِنْهُ وَلَمْ يَقْبِضِ الَّذِي بَاعَهُ مِنْ ثَمَنِهِ شَيْئًا فَوَجَدَهُ بِعَيْنِهِ فَهُوَ اَحَقُّ بِهِ وَ اِنْ مَاتَ الَّذِي ابْتَاعَهُ فَصَاحِبُ الْمَتَاعِ فِيْهِ اُسْوَةُ الْغُرَمَاءِ۔

﴿ابوبکر بن عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک شخص کوئی چیز بیچ اور

خریدنے والا دیوالیہ ہو جائے لیکن بائع نے ابھی قیمت میں سے کچھ نہ لیا ہو اور اس کا مال بعینہ خریدار کے پاس مل جائے تو وہ بیچنے والا اس مال کا سب سے زیادہ حق دار ہوگا۔ اور اگر خریدار مر گیا ہو تو بیچنے والا بھی دوسرے دعویداروں کے ساتھ برابر کا شریک ہوگا۔﴾

□ حَدَّثَنِي "مَالِك" عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ اَبِي بَكْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ عَنْ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ عَنْ اَبِي بَكْرِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ هِشَامٍ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَيُّمَا رَجُلٍ اَفْلَسَ فَاَدْرَكَ الرَّجُلُ مَالَهُ بِعَيْنِهِ فَهُوَ اَحَقُّ بِهِ مِنْ غَيْرِهِ۔

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص دیوالیہ ہو جائے اور اس کے پاس مال بیچنے والا اپنا مال پا جائے تو وہ دوسروں کے مقابلے میں اپنے مال کا زیادہ حق دار ہوگا۔﴾

وضاحت:

ان دونوں روایات کا مفہوم ایک ہی ہے۔ پہلی روایت کے مطابق دیوالیہ شخص کی موت کی صورت میں بائع کا حق دوسرے دعویداروں کے ساتھ ہی ہوگا۔ اس کو اپنا مال واپس لینے کا حق نہیں ہوگا اگرچہ وہ مال بعینہ دیوالیہ شخص کے اموال میں موجود ہو۔ احناف کے نزدیک دونوں صورتوں یعنی دیوالیہ ہونے کی صورت میں بھی اور موت کی صورت میں بھی بائع دوسرے دعویداروں میں شریک ہوگا۔ وہ بائع کا حق دوسروں سے فائق نہیں مانتے لیکن بعض دوسری روایت کی بناء پر بائع کا حق دوسرے دعویداروں کے مقابل میں اولیٰ مانتے ہیں۔ میرے نزدیک احناف کا مسلک زیادہ معقول ہے۔

مَا يَجُوزُ مِنَ السَّلَفِ

پیشگی دینے کی جائز شکلیں

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ اَبِي رَافِعٍ مَوْلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ اَنَّهُ قَالَ اسْتَسْلَفَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ بَكْرًا فَجَاءَتْهُ اِبِلٌ مِنَ الصَّدَقَةِ قَالَ اَبُو

رافع فَاَمَرَنِي رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ اَقْضِيَ الرَّجُلَ بَكْرَهُ فَقُلْتُ لَمْ اَجِدْ فِي الْاِبِلِ اِلَّا جَمَلًا خِيَارًا رَبَاعِيًا فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اَعْطِهِ اِيَّاهُ فَاِنَّ خِيَارَ النَّاسِ اَحْسَنُهُمْ قَضَاءً۔

﴿رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام ابو رافع بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک جوان اونٹ قرض لیا۔ پھر آپ کے پاس صدقے کے اونٹ آگئے۔ ابو رافع کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں اس شخص (قرض خواہ) کو ایک جوان اونٹ دے دوں۔ میں نے عرض کیا کہ اونٹوں میں کوئی جوان اونٹ نہیں، سب چھ سات سالہ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہی دے دو کیونکہ بہترین آدمی وہ ہوتے ہیں جو قرض کو بہترین طریقے سے ادا کریں۔﴾

وضاحت:

اس روایت میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے لیکن بعض لوگوں نے اس پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ آنحضرتؐ صدقے کے مال کے متولی تھے، تو کیا متولی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ چھ اونٹ کے بدلے میں کسی قرض خواہ کو نوجوان اونٹ دے دے۔ میرے نزدیک یہ سوال اس لیے نہیں پیدا ہوتا کہ خیر، عدل اور نیکی کے اصولوں کا لحاظ رکھنا بھی بیت المال کے متولی کا فرض ہے۔ بیت المال کا متولی کوئی منشی یا کلرک نہیں ہوتا بلکہ ایک صاحب اختیار شخص ہوتا ہے۔ میرے خیال میں متولی کو یہ حق حاصل ہے کہ جو بات حق کے اعلیٰ معیار کے مطابق ہے وہ کرے۔ یہ کام یتیم کا متولی بھی کر سکتا ہے اور یہ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔ قرآن مجید معاملات میں احسن طریقہ اختیار کرنے کا جو حکم دیتا ہے یہ بات اس میں داخل ہے۔

نبی ﷺ تو فضائل اعمال سکھانے پر مامور تھے۔ اس خیر کی تعلیم دینے میں آپ کیوں کمزوری دکھاتے جب کہ اتفاق سے اس تعلیم کا ایک مناسب موقع سامنے آگیا تھا۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ حُمَيْدِ بْنِ قَيْسٍ الْمَكِّيِّ عَنْ مُجَاهِدٍ اَنَّهُ قَالَ اسْتَسْلَفَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ مِنْ رَجُلٍ دَرَاهِمَ ثُمَّ قَضَاهُ دَرَاهِمَ خَيْرًا مِنْهَا فَقَالَ الرَّجُلُ يَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ هٰذِهِ خَيْرٌ مِنْ دَرَاهِمِي الَّتِي اَسْلَفْتُكَ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ قَدْ عَلِمْتُ وَلٰكِنَّ نَفْسِي بِذٰلِكَ

طیبۃً۔

﴿مجاہد سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ نے ایک شخص سے کچھ درہم قرض لیے پھر اس کو ان سے اچھے درہم واپس کیے۔اس شخص نے کہا کہ اے ابو عبدالرحمٰن! یہ ان درہموں سے جو میں نے آپ کو دیئے تھے بہتر ہیں۔تو عبداللہ بن عمرؓ نے کہا مجھے معلوم ہے لیکن میرا دل اس پر راضی ہے۔﴾

وضاحت :

اس زمانے میں درہم و دینار مسکوک بھی ہوتے تھے اور غیر مسکوک بھی۔بعض میں اچھی چاندی یا سونا ہوتا تھا اور دوسروں میں کچھ کم ہوتا تھا۔اس طرح درہم کی حقیقی مالیت کم و بیش ہو جاتی تھی۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جب بہتر مالیت کے درہم واپس کیے تو لینے والے نے درہموں کا فرق محسوس کیا اور حضرت عبداللہ کے سامنے اس کا اظہار کیا۔انہوں نے وضاحت کی کہ میں جانتے ہوئے یہ دے رہا ہوں۔اگر قرض واپس کرنے والا اصل سے بہتر چیز اپنی رضا سے دے اور وہ کسی شرط یا وعدے اور رواج پر مبنی نہ ہو تو اس میں کچھ حرج نہیں۔اس میں ربا کا شائبہ پیدا نہیں ہوتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے نزدیک قرض کی واپسی کا یہ معاملہ اس روایت کے تحت نہیں آتا جس میں حضور ﷺ نے فرمایا الورق بالورق والذھب بالذھب ربا الا مثلا بمثل یدا بید یعنی یہ کہ سونا یا چاندی کے تبادلے میں اگر اوصاف اور تفاضل ہو تو سود کا شائبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ایک بات ضرور ہے کہ کوئی شخص اسی سے حیلہ شرعی کا راستہ کھول سکتا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان راستوں کو بند کرنا ممکن نہیں۔

مَالَا یَجُوزُ مِنَ السَّلَفِ

پیشگی دینے کی ناجائز شکلیں

☐ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ عُمَرَ ابْنَ الْخَطَّابِ قَالَ فِی رَجُلٍ اَسْلَفَ رَجُلًا طَعَامًا عَلٰی اَنْ یُعْطِیَهٗ اِیَّاهُ فِی بَلَدٍ آخَرَ فَكَرِهَ ذٰلِكَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَ قَالَ فَاَیْنَ الْحَمْلُ یَعْنِی حَمْلَانَهٗ۔

﴿امام مالک کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ایک ایسے شخص کے معاملے کو، جس نے دوسروں کو پیشگی گندم اس شرط پر دی تھی کہ وہ اس کو کسی دوسرے شہر میں ادا کرے گا، ناپسند فرمایا اور کہا کہ اس کی باربرداری کا کیا ہوگا۔﴾

وضاحت :

حضرت عمرؓ کا یہ فرمانا بالکل ٹھیک تھا۔اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ ادا کرنے والے کا رقبہ اس شہر میں رہا ہو جہاں گندم واپس کی جانی تھی اور اس کو باربرداری کا خرچ نہ اٹھانا پڑتا ہو لیکن یہ شکل ہمیشہ تو نہیں ہو سکتی۔جس شخص کا وہاں قریب زمین وغیرہ نہ ہو تو اس کو لازماً باربرداری کا خرچ اٹھانا پڑے گا۔اس وجہ سے اس معاملے میں سود داخل ہو جائے گا۔

☐ حَدَّثَنِی مَالِكٌ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ رَجُلًا اَتٰی عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ فَقَالَ یَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اِنِّی اَسْلَفْتُ رَجُلًا سَلَفًا وَ اشْتَرَطْتُ عَلَیْهِ اَفْضَلَ مِمَّا اَسْلَفْتُهٗ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ فَذٰلِكَ الرِّبَا قَالَ فَكَیْفَ تَاْمُرُنِی یَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ اَسْلَفُ عَلٰی ثَلَاثَةِ وُجُوهٍ سَلَفٌ تُسْلِفُهٗ تُرِیْدُ بِهٖ وَجْهَ اللّٰهِ فَلَكَ وَجْهُ اللّٰهِ وَسَلَفٌ تُسْلِفُهٗ تُرِیْدُ بِهٖ وَجْهَ صَاحِبِكَ فَلَكَ وَجْهُ صَاحِبِكَ وَسَلَفٌ تُسْلِفُهٗ لِتَاْخُذَ خَیْرًا بِطَیِّبٍ فَذٰلِكَ الرِّبَا قَالَ فَكَیْفَ تَاْمُرُنِی یَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ قَالَ اَرٰی اَنْ تَشُقَّ الصَّحِیْفَةَ فَاِنْ اَعْطَاكَ مِثْلَ الَّذِی اَسْلَفْتَهٗ قَبِلْتَهٗ وَ اِنْ اَعْطَاكَ دُوْنَ الَّذِی اَسْلَفْتَهٗ فَاَخَذْتَهٗ اُجِرْتَ وَ اِنْ اَعْطَاكَ اَفْضَلَ مِمَّا اَسْلَفْتَهٗ طَیِّبَةً بِهٖ نَفْسُهٗ فَذٰلِكَ شُكْرٌ شَكَرَهٗ لَكَ وَ لَكَ اَجْرُ مَا اَنْظَرْتَهٗ۔

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی کہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اے ابو عبدالرحمٰن! (یہ عبداللہ بن عمر کی کنیت ہے) میں نے ایک شخص کو قرض دیا ہے اور یہ شرط ٹھہرائی ہے کہ تم مجھ کو اس سے افضل واپس کرو گے۔اس پر عبداللہ بن عمرؓ نے کہا یہی تو ربا ہوتا ہے۔اس نے کہا پھر آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں۔عبداللہ بن عمرؓ نے کہا پیشگی دینے کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ایک

یہ کہ آپ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے دیں تو آپ کو اللہ کی رضا مل جائے گی-دوسری یہ کہ آپ اپنے ساتھی کی خوشنودی چاہتے ہیں تو وہ آپ کو حاصل ہو جائے گی- تیسری یہ کہ آپ طیب مال کے بدلے خبیث مال حاصل کریں تو یہ ربا کی شکل ہے-اس شخص نے کہا کہ آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں- عبداللہ بن عمرؓ نے کہا میرا مشورہ یہ ہے کہ کاغذ جو لکھا گیا ہے اس کو پھاڑ دو-اگر وہ شخص ویسا ہی مال واپس دے جیسا آپ نے دیا تھا تو قبول کر لیجئے اور اگر اس مال سے کمتر دے اور آپ قبول کر لیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا-اور اگر اس نے اپنی خوشی سے بہتر مال دیا تو یہ اس کی طرف سے آپ کے لیے شکریہ کا اظہار ہوگا-اور آپ کو اس مہلت کا اجر ملے گا جو آپ نے اس کو دی-﴾

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ اَنَّهُ سَمِعَ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ يَقُوْلُ مَنْ اَسْلَفَ سَلَفًا فَلَا يَشْتَرِطْ اِلَّا قَضَاءَهُ-

﴿نافعؒ نے عبداللہ بن عمرؓ کو فرماتے سنا کہ جو کوئی کسی کو پیشگی دے تو ادائیگی کی شرط کے سوا اور کوئی شرط نہ لگائے-﴾

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ كَانَ يَقُوْلُ مَنْ اَسْلَفَ سَلَفًا فَلَا يَشْتَرِطْ اَفْضَلَ مِنْهُ وَ اِنْ كَانَتْ قَبْضَةً مِنْ عَلَفٍ فَهُوَ رِبًا-

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی کہ عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے تھے کہ جس کسی نے کچھ پیشگی دیا تو وہ اس سے افضل کی واپسی کی شرط نہ لگائے، اگرچہ ایک مٹھی چارے کی ہو، کیونکہ وہ سود ہو جائے گا-﴾

وضاحت :

یہ تینوں روایتیں اس بارے میں ہیں کہ اگر کسی کو آپ کوئی چیز کچھ مدت کے لیے ادھار دیں تو سوائے اس کی بروقت ادائیگی کے اس پر اور کوئی ایسی شرط عائد نہ کریں جس سے ربا یا ربا کا شائبہ بھی پیدا ہوتا ہو- پہلی دو روایتوں میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اور تیسری روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے جو فقہ حنفی کے ستون اعظم ہیں-ان روایات سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ قرض لینے کی صورت میں خواہ تفاضل ہو (یعنی

ے گئے اور واپس لیے گئے مال کی مقدار میں فرق ہو) یا جو مال دیا گیا اس سے بہتر کا مطالبہ ہو یا کوئی اور طرح کا فائدہ مقدر یا مشروط ہو تو وہ ربا ہو جائے گا- حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی رائے میں کسی کو کچھ دینے میں ایثار کا جذبہ کارفرما ہونا چاہیے جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی مطلوب ہو یا کم از کم اپنے مسلمان بھائی کی مدد مقصود ہو- لیکن اگر اس کام کے پیچھے کوئی اور دنیوی غرض یا مقصد کارفرما ہو تو، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا، اس صورت میں طیب مال سے بدلے خبیث مال (یعنی سود) حاصل ہوگا اور اللہ کے ہاں اجر کے بدلے میں عذاب ملے گا-

مَا يُنْهَى عَنْهُ مِنَ الْمُسَاوَمَةِ وَالْمُبَايَعَةِ

مول بھاؤ کرنے کے معاملے میں جن چیزوں سے روکا گیا ہے

□ حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَيْعِ بَعْضٍ-

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کی بیع کے اوپر بیع نہ کرے-﴾

وضاحت :

مطلب یہ ہے کہ اگر ایک سودا ہو گیا ہے تو آپ یہ نہیں کر سکتے کہ اس بیع کو ختم کرنے کے لیے خریدار سے یہ کہیں کہ میں سستا دیتا ہوں یا فروخت کنندہ سے کہیں کہ اس بیع کو ختم کرو، میں تم کو زیادہ دام دیتا ہوں- بازار میں جو مقابلہ ہوتا ہے وہ اس کے تحت نہیں آتا- مقابلہ آپ کر سکتے ہیں- لیکن بیع مکمل ہونے کے بعد بیع کی اجازت نہیں یعنی یہ کہ معاملہ طے ہو چکا تب آپ آگے اور اس بیع کو خراب کرنے کی کوشش کی-

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ اَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا تَلَقَّوُا الرُّكْبَانَ لِلْبَيْعِ وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَلَا تَنَاجَشُوْا وَلَا يَبِعْ حَاضِرٌ لِبَادٍ وَلَا تُصَرُّوا الْاِبِلَ وَالْغَنَمَ فَمَنِ ابْتَاعَهَا بَعْدَ ذٰلِكَ فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ بَعْدَ اَنْ يَحْلُبَهَا اِنْ رَضِيَهَا اَمْسَكَهَا وَاِنْ سَخِطَهَا رَدَّهَا وَصَاعًا مِنْ تَمْرٍ-

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ باہر سے مال لانے والوں کا مال خریدنے کے لیے آگے بڑھ کر استقبال کرنے کی کوشش نہ کرو۔ اور ایک دوسرے کی بیع پر بیع نہ کرو۔ اور قیمت بڑھانے کے لیے مصنوعی بیع نہ کرو۔ اور شہر کا مقیم دیہاتی کا تاجر نہ بنے۔ اور اونٹ یا بکری کے تھن میں دودھ جمع نہ کرو اور جس کسی نے ایسی شکل میں جانور خریدا تو دودھ دوہنے کے بعد اس کو اختیار ہے کہ اگر راضی ہو تو ٹھیک ورنہ بیع کو رد کر دے اور ایک صاع کھجور ادا کرے۔﴾

وضاحت :

تلقی الرکبان کا مطلب یہ ہے کہ جس راستے سے منڈی میں مال آتا ہے آپ اس راستے پر شہر سے باہر نکل کر بیٹھ جاتے ہیں اور مال لے کر آنے والے قافلوں کو چائے سگریٹ پلا کر اس سے مول بھاؤ کر لیتے ہیں۔ آپ ان کو یہ موقع نہیں دیتے کہ وہ مارکیٹ میں پہنچ کر اپنے مال کی قیمت کا صحیح اندازہ کر سکیں۔ ایسا کرنا پبلک کے مفاد کے ساتھ خیانت ہے۔ اس میں منڈی میں کاروبار کرنے والوں کا بھی نقصان ہے اور دیہات سے مال لانے والوں کو مال کا صحیح معاوضہ نہ ملنے کا اندیشہ ہے۔

ایک بیع کے اوپر دوسری بیع کرنے کی صورت پچھلی روایت میں زیر بحث آچکی ہے۔

قیمت بڑھانے کے لیے مصنوعی بیع کو نجش کہتے ہیں۔ مثال اس کی یہ ہے کہ ایک مال پانچ روپے کا ہے۔ آپ اس کو سات روپے میں خریدنے کا معاملہ کر لیتے ہیں حالانکہ آپ کی نیت خریدنے کی نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ قیمت بڑھا دیں اور آپ کی زیادہ بولی دیکھ کر حقیقی خریدار زیادہ قیمت پر معاملہ کر لے۔ یہ معاملہ نجش کہلاتا ہے اور اگر اس کو پیشہ بنا لیا جائے، کچھ لوگ یہی کام شروع کر دیں تو یہ تناجش ہوگا۔ آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا کیونکہ یہ مصنوعی طور پر منڈی کی قیمتیں بڑھانے کی ایک کوشش اور پبلک کے لیے ضرر کا باعث ہے۔

شہر کے مقامی آدمی کو دیہاتی کا دلال بننے سے حضورؐ نے روکا اور فرمایا کہ دیہاتی کو مال بازار میں لانے دیں۔ کھلے بازار میں جو بھاؤ چل رہا ہے اس پر وہ مال فروخت کرے۔ اس ہدایت کی وجہ یہ ہے کہ مقیم شہری دیہاتیوں کو بے وقوف بنا کر ان کو نقصان پہنچاتے اور مارکیٹ کے بھاؤ کو خراب کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں آڑھتی یہی کام کرتے ہیں اور

غریب کسانوں کو نقصان بھی پہنچاتے ہیں۔ اس لیے اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

جانوروں کی بیع میں فریب دہی کی ایک شکل یہ ہے کہ ایک یا دو دن دودھ نہیں نکالتے تو جانور کے تھن بھرے ہو جاتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ گائے یا بکری بہت دودھ دینے والی ہے۔ یہ مصنوعی طور پر دودھ زیادہ دکھانا ہوتا ہے۔ ایسی بیع میں مشتری کو اختیار ہوگا کہ دو تین دن دودھ دوہنے کے بعد فیصلہ کرے کہ آیا وہ بیع کو قائم رکھتا ہے یا رد کرتا ہے۔ عام قسم کی بیع میں خیار نہیں ہوتا۔ آپ نے اپنی پسند سے دوکان سے ایک چیز خریدی اور گھر چلے گئے۔ اب اگر اس میں نقص ہے تو دوکاندار کی صوابدید پر ہے، چاہے تو واپس کر لے، چاہے انکار کر دے۔ لیکن دودھ دینے والے یا دوسرے جانوروں کے معاملے میں مشتری کو خیار کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اس کو بیع کے وقت یہ ظاہر کر دینا چاہیے کہ وہ جانور کی عادات دیکھ کر یا اس کا دودھ نکال کر دو یا تین دن میں بیع کا فیصلہ کرے گا۔ احناف کے ہاں خیار کی مدت تین دن ہے جبکہ مالکیہ کے ہاں ہر چیز کی الگ الگ مدت ہے۔ میرے نزدیک مالکیہ کی بات زیادہ قوی ہے۔ ہر چیز کی نوعیت کے لحاظ سے یہ مدت مقرر کی جا سکتی ہے۔

قَالَ مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنِ النَّجْشِ قَالَ مَالِكٌ وَالنَّجْشُ اَنْ تُعْطِيَهُ بِسِلْعَتِهٖ اَكْثَرَ مِنْ ثَمَنِهَا وَ لَيْسَ فِيْ نَفْسِكَ اشْتِرَاؤُهَا فَيُقْتَدٰى بِكَ غَيْرُكَ۔

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نجش سے منع فرمایا۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ نجش یہ ہے کہ تم سامان کی اصل قیمت سے زیادہ قیمت لگاؤ جبکہ تمہارا ارادہ مال خریدنے کا نہیں، تم صرف یہ چاہتے ہو کہ دوسرا آدمی آپ کے پیچھے لگ کر قیمت زیادہ لگائے۔﴾

یہ وہی نجش ہے جس کی وضاحت پچھلی روایت میں ہو چکی ہے۔

جَامِعُ الْبُيُوْعِ

معاملات پر جامع باب

حَدَّثَنِيْ يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ دِيْنَارٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَجُلًا ذَكَرَ

لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنَّهٗ يُخْدَعُ فِى الْبُيُوْعِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا بَايَعْتَ فَقُلْ لَا خِلَابَةَ قَالَ فَكَانَ الرَّجُلُ اِذَا بَايَعَ يَقُوْلُ لَا خِلَابَةَ-

﴿عبداللہ بن دینار سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا کہ میں سودے میں دھوکا کھا جاتا ہوں- آپؐ نے فرمایا کہ جب خریدو تو "لاخلابہ" کہہ دیا کرو- چنانچہ وہ شخص جب خریدتا تو "لاخلابہ" کہہ دیتا-﴾

وضاحت :

"لاخلابہ" کے معنی ہیں کہ دھوکا نہیں ہوگا- یہ کہنے سے یہ شرط عاید کرنا مقصود ہے کہ اگر دھوکا ہو تو میں اس سودے سے بری ہوں- یہ بھی خیار ہی کی ایک شکل ہے- لاخلابہ کے ساتھ مدت کی شرط بھی لگا سکتے ہیں- احناف کے ہاں تین دن کی مدت کی شرط لگائی جا سکتی ہے لیکن یہ مدت کسی نص پر مبنی نہیں- آپ اس سے زیادہ مدت کی شرط بھی لگا سکتے ہیں-

کتاب القراض

کتاب المساقاۃ

کتاب کراء الارض

کتاب الشفعہ

کتاب القراض

"قراض" ایک اصطلاح ہے۔اہل کوفہ اسی کو مضاربت کہتے ہیں۔ تجارت کے لیے کچھ رقم دوسرے کو دے کر منافع میں شریک ہونا قراض یا مضاربت کہلاتا ہے۔ یہ وہی کام ہے جو نبی ﷺ نے بعثت سے پہلے کیا۔ آپ حضرت خدیجہؓ کے مال سے جو تجارت کرتے تھے وہ قراض ہی کا معاملہ ہوتا تھا۔ قراض کی اصطلاح جاہلیت کے زمانے سے رائج ہے اور اسلام نے اس کو قائم رکھا۔

مَاجَاءَ فِی الْقِرَاضِ

قراض کے بارے میں روایات

حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ أَبِيهِ أَنَّهُ قَالَ خَرَجَ عَبْدُاللّٰهِ وَ عُبَيْدُ اللّٰهِ ابْنَا عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فِی جَيْشٍ إِلَى الْعِرَاقِ فَلَمَّا قَفَلَا مَرَّا عَلَى أَبِی مُوسَى الْأَشْعَرِیِّ وَهُوَ أَمِيرُ الْبَصْرَةِ فَرَحَّبَ بِهِمَا وَسَهَّلَ ثُمَّ قَالَ لَوْ أَقْدِرُ لَكُمَا عَلَى أَمْرٍ أَنْفَعُكُمَا بِهِ لَفَعَلْتُ ثُمَّ قَالَ بَلَى هَاهُنَا مَالٌ مِنْ مَالِ اللّٰهِ أُرِيدُ أَنْ أَبْعَثَ بِهِ إِلَى أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ فَأُسْلِفُكُمَاهُ فَتَبْتَاعَانِ بِهِ مَتَاعًا مِنْ مَتَاعِ الْعِرَاقِ ثُمَّ تَبِيعَانِهِ بِالْمَدِينَةِ فَتُؤَدِّيَانِ رَأْسَ الْمَالِ إِلَى أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ وَيَكُونُ الرِّبْحُ لَكُمَا فَقَالَا وَدِدْنَا ذٰلِكَ فَفَعَلَ وَ كَتَبَ إِلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ أَنْ يَأْخُذَ مِنْهُمَا الْمَالَ فَلَمَّا قَدِمَا بَاعَا فَأَرْبَحَا فَلَمَّا دَفَعَا ذٰلِكَ إِلَى عُمَرَ قَالَ أَكُلَّ الْجَيْشِ أَسْلَفَهُ مِثْلَ مَا أَسْلَفَكُمَا قَالَا لَا فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ ابْنَا أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ فَأَسْلَفَكُمَا أَدِّيَا الْمَالَ وَرِبْحَهُ فَأَمَّا عَبْدُاللّٰهِ فَسَكَتَ وَأَمَّا عُبَيْدُ اللّٰهِ فَقَالَ مَا يَنْبَغِی لَكَ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ هٰذَا لَوْ نَقَصَ هٰذَا الْمَالُ أَوْ هَلَكَ لَضَمِنَّاهُ فَقَالَ عُمَرُ أَدِّيَاهُ فَسَكَتَ عَبْدُ اللّٰهِ وَ رَاجَعَهُ عُبَيْدُ اللّٰهِ فَقَالَ رَجُلٌ مِنْ جُلَسَاءِ عُمَرَ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ لَوْ جَعَلْتَهُ قِرَاضًا فَقَالَ عُمَرُ جَعَلْتُهُ قِرَاضًا فَأَخَذَ عُمَرُ رَأْسَ الْمَالِ وَ نِصْفَ رِبْحِهِ وَ أَخَذَ عَبْدُ اللّٰهِ وَعُبَيْدُ اللّٰهِ ابْنَا عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ نِصْفَ رِبْحِ الْمَالِ۔

(۱) زید بن اسلم روایت کرتے ہیں کہ ان کے باپ نے بتایا کہ حضرت عمرؓ کے صاحبزادے عبداللہ اور عبیداللہ ایک لشکر کے ساتھ عراق گئے۔ جب لوٹنے لگے تو وہ حضرت ابو موسیٰ اشعری سے ملنے گئے

جو بصرہ کے امیر تھے۔انہوں نے اچھی طرح سے ان کا خیر مقدم کیا۔پھر کہا کہ اگر میں کچھ کر سکتا تو آپ لوگوں کو نفع پہنچانے کی کوشش کرتا۔پھر کہا کہ یہاں پر بیت المال کا کچھ مال ہے جس کو میں امیر المومنین کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں۔میں یہ کرتا ہوں کہ آپ لوگوں کو یہ مال سلف کے طور پر پیشگی دے دیتا ہوں۔آپ اس سے عراق کی کچھ چیزیں خرید لیں اور مدینہ جا کر بیچ دیں۔راس المال امیر المومنین کو پہنچا دینا اور نفع آپ دونوں کا ہوگا۔دونوں حضرات نے کہا کہ ہم بھی کچھ اسی طرح کا کام چاہتے تھے۔چنانچہ ابو موسیٰ نے ایسا ہی کیا اور امیر المومنین کو لکھ دیا کہ وہ مال ان سے وصول کر لیں۔جب یہ دونوں مدینہ آئے تو انہوں نے مال فروخت کر کے نفع اٹھایا لیکن جب مال حضرت عمرؓ کو دیا تو انہوں نے پوچھا کہ کیا ابو موسیٰ نے لشکر کے ہر آدمی کو اس طرح مال پیشگی دیا تھا جس طرح تم کو دیا۔انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ امیر المومنین کے صاحبزادے ہونے کے ناطے انہوں نے تمہیں مال دیا۔لہٰذا آپ لوگ مال بھی ادا کرو اور منافع بھی۔اس پر عبداللہ تو خاموش رہے مگر عبیداللہ نے کہا، امیر المومنین آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔اگر مال کم ہو جاتا یا تباہ ہو جاتا تو ہم ذمہ دار بھی تو تھے۔حضرت عمرؓ نے کہا کہ نہیں، ادا کرو۔عبداللہ پھر خاموش رہے لیکن عبیداللہ نے وہی بات دہرائی۔اس پر مجلس کے لوگوں میں سے ایک نے کہا کہ امیر المومنین آپ اس کو قراض قرار دے دیں تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ چلو میں قراض قرار دے دیتا ہوں۔چنانچہ حضرت عمرؓ نے اصل مال اور آدھا منافع لے لیا اور نصف منافع دونوں بھائیوں نے وصول کیا۔﴾

وضاحت :

یہ واقعہ حضرت عمرؓ کے مزاج کے عین مطابق ہے۔اس میں انہوں نے جو گرفت کی ہے وہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کی اس عنایت پر کی ہے جو انہوں نے خاص حضرت عمرؓ کے صاحبزادوں پر کی۔یہ چیز تہمت کا موقع پیدا کرنے والی تھی۔امیر المومنین کے صاحبزادے ہونے کی وجہ سے اقربا پروری کا الزام آتا تھا۔

فقہ کی رو سے اس معاملہ میں کوئی خرابی نہیں۔ابو موسیٰ اشعری کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ مال خلافت امیر المومنین تک پہنچ جائے کیونکہ یہ امیر المومنین کے گھر کے لوگ تھے اور مال پہنچانے کے ضامن تھے۔انہوں نے ان کے ذریعے مال بھیجنے کو زیادہ قابل اعتماد پایا ہوگا۔ان کی یہ خواہش بھی تھی کہ اس طرح ان لوگوں کو نفع بھی حاصل ہو جائے۔یہ طریقہ خلاف شریعت نہ تھا۔البتہ یہ طرز عمل ہر قسم کے شک اور تہمت سے بالا نہ تھا۔اس

واقعہ سے امیر المومنین کی پوزیشن پر حرف رکھا جا سکتا تھا۔لہٰذا حضرت عمرؓ نے اصرار کیا کہ میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔

اس واقعہ کو موجودہ زمانے پر منطبق کرنا صحیح نہیں۔آج کل تو مال بھیجنا کوئی مسئلہ نہیں لیکن اس زمانے میں یہ ایک مسئلہ تھا۔ڈاک اور بنک کا انتظام جیسا آج ہے اس زمانے میں نہ تھا۔مال بحفاظت منزل مقصود تک پہنچانا آسان کام نہ تھا۔امیر المومنین کے صاحبزادوں کی ضمانت پر مال کی ترسیل کو حضرت ابو موسیٰ نے غنیمت سمجھا۔اس تناظر میں ان کا طرز عمل بھی درست تھا۔اس پر حضرت عمرؓ کو جو اعتراض تھا وہ صرف یہ تھا کہ اس طرح امیر المومنین کے صاحبزادوں کو دوسرے لوگوں پر غیر ضروری ترجیح مل رہی تھی۔جب اہل مجلس میں سے کسی صاحب نے معاملے کو قراض قرار دینے کی راہ نکال دی تو حضرت عمرؓ کی پریشانی ختم ہو گئی۔

اس واقعہ اور حضرت عمرؓ کے فیصلہ سے یہ معلوم ہوا کہ امانت کا مال تجارت میں لگایا جا سکتا ہے۔یتیموں کا مال بھی تو امانت ہوتا ہے۔اس کو تجارت میں لگانا جائز ہی نہیں بلکہ احسن ہے۔یتامی کے مال کے متعلق آنحضرت ﷺ کی ہدایت ہے کہ اس سے تجارت کرو تاکہ زکوٰۃ اس کو ختم نہ کر دے۔اس لحاظ سے بھی ابو موسیٰ اشعری کا فعل قابل قبول تھا۔ان کے اوپر مال کے پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی اور اس کی ضمانت انہوں نے دونوں اصحاب سے لی تھی۔

اس روایت سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے قراض کی شرعی حیثیت کو درست قرار دیا اور اسی کے مطابق فیصلہ کیا۔لہٰذا یہ طریقہ جاہلیت کی طرح اسلام میں بھی ہے اور اس پر کوئی شرعی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ الْعَلَاءِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ اَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ اَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ اَعْطَاهُ مَالًا قِرَاضًا يَعْمَلُ فِيهِ عَلَى اَنَّ الرِّبْحَ بَيْنَهُمَا۔

﴿علاء بن عبدالرحمٰن اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفانؓ نے ان کو مال مضاربت پر دیا کہ وہ اس سے تجارت کریں اور منافع دونوں میں برابر تقسیم ہوگا۔﴾

وضاحت :

اس روایت میں دو صحابہ کرام کا اثر ہے۔قراض کے ضمن میں کوئی نص قطعی قرآن میں ہے نہ حدیث میں۔معاملہ کی یہ صورت میرے نزدیک اسی بنیاد پر درست ہے جس پر ولی یا وصی یتامی کو اجازت ہے کہ وہ یتامی کے مال سے تجارت کر کے ان کو نفع پہنچا سکتے ہیں۔اس پر اجماع بھی ہے اور کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔

کتاب المساقاۃ

مساقات سے مراد پھل پر زراعت ہے۔ یعنی ایک مالک زمین کسی شخص کے ساتھ یہ معاملہ کر لیتا ہے کہ زمین پر محنت وہ کرے گا اور پیداوار ایک متعین نسبت سے مالک اور مزارع میں تقسیم ہو گی۔

مَاجَاءَ فِی الْمُسَاقَاۃِ

پھل پر زراعت کے بارے میں روایات

❐ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیَّبِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لِیَهُوْدِ خَیْبَرَ یَوْمَ الْفَتْحِ اُقِرُّكُمْ فِیْهَا مَا اَقَرَّكُمُ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ عَلٰی اَنَّ الثَّمَرَ بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمْ قَالَ فَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَبْعَثُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ رَوَاحَةَ فَیَخْرُصُ بَیْنَهٗ وَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ یَقُوْلُ اِنْ شِئْتُمْ فَلَكُمْ وَ اِنْ شِئْتُمْ فَلِیَ فَكَانُوْا یَاْخُذُوْنَهٗ۔

﴿سعید بن المسیب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب خیبر کو فتح کیا تو یہود خیبر سے کہا کہ میں تم کو یہاں ٹھہرنے کی اس وقت تک مہلت دوں گا جب تک اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو ٹھہرانا چاہے۔ شرط یہ ہو گی کہ پھل ہمارے اور تمہارے درمیان مساوی تقسیم ہو گا۔ رسول اللہؐ عبداللہ بن رواحہؓ کو بھیجا کرتے اور وہ آپ کے اور یہود کے درمیان تخمینہ سے پھل تقسیم کرتے۔ وہ یہود سے کہتے کہ چاہو تو تم لے لو اور چاہو تو میرے لیے چھوڑ دو۔ تو یہود اس کو لے لیتے تھے۔﴾

❐ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سُلَیْمَانَ بْنِ یَسَارٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ یَبْعَثُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ رَوَاحَةَ اِلٰی خَیْبَرَ فَیَخْرُصُ بَیْنَهٗ وَ بَیْنَ یَهُوْدِ خَیْبَرَ قَالَ فَجَمَعُوْا لَهٗ حُلِیًّا مِنْ حُلِیِّ نِسَائِهِمْ فَقَالُوْا لَهٗ هٰذَا لَكَ وَ خَفِّفْ عَنَّا وَتَجَاوَزْ فِی الْقَسْمِ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ رَوَاحَةَ یَا مَعْشَرَ الْیَهُوْدِ وَاللّٰهِ اِنَّكُمْ لَمِنْ اَبْغَضِ خَلْقِ اللّٰهِ اِلَیَّ وَمَا ذَاكَ بِحَامِلِی عَلٰی اَنْ اَحِیْفَ عَلَیْكُمْ فَاَمَّا مَا عَرَضْتُمْ مِنَ الرِّشْوَةِ فَاِنَّهَا سُحْتٌ وَ اِنَّا لَا نَاْكُلُهَا فَقَالُوْا بِهٰذَا قَامَتِ

السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ۔

﴿ابن شہاب سلیمان بن یسار سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عبداللہ بن رواحہؓ کو خیبر بھیجا کرتے تھے۔ وہ آپ کے اور یہود کے درمیان پھل کا تخمینہ کرتے۔ یہود نے اپنی عورتوں کے زیورات جمع کیے اور ان کے پاس لے آئے کہ یہ قبول کر لو اور ہمارے ساتھ رعایت کرو اور تقسیم میں سختی نہ کرو۔ اس پر عبداللہ بن رواحہ نے کہا کہ اے یہود، اللہ کی قسم، تم میرے نزدیک اللہ کی مبغوض ترین مخلوق ہو، تاہم یہ بات بھی مجھے اس پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ میں تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی کروں۔ اپنی یہ رشوت جو تم نے پیش کی تو یہ مال حرام ہے۔ ہم یہ نہیں کھاتے۔ اس پر یہود پکار اٹھے کہ اسی عدل پر آسمان اور زمین قائم ہیں۔﴾

وضاحت:

یہ دونوں روایات ابن شہاب سے ہیں۔ پہلی روایت مرسل ہے۔ ان روایات میں ایک مشکل ان کا یہ بیان ہے کہ آنحضرتؐ عبداللہ بن رواحہ کو ہر سال خیبر بھیجا کرتے تھے جب کہ دوسری روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عبداللہ بن رواحہ صرف ایک ہی مرتبہ خیبر گئے۔

پہلی روایت میں یہود کے ساتھ نبی ﷺ کی جس گفتگو کا حوالہ ہے یہ واقعہ فتح خیبر کے موقع پر پیش آیا۔ اس جنگ میں یہود کو شکست ہوئی تو نبی ﷺ نے ان کو خیبر سے نکلنے کا حکم نہیں دیا۔ معلوم ہوتا ہے آپ کو اس معاملہ میں وحی کے ذریعے کسی واضح حکم کا انتظار تھا۔ لہٰذا آپ نے ان سے یہ کہا کہ جب تک اللہ تعالیٰ اس سرزمین پر تمہیں رہنے دے اس وقت تک ہمارے اور تمہارے درمیان زمین کی پیداوار برابر تقسیم ہوا کرے گی۔ گویا آپ نے ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو مفتوح اہل ذمہ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس میں کسی ناانصافی کا کوئی شائبہ نہ تھا۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقریباً چالیس ہزار وسق کھجور کی تقسیم کا معاملہ تھا۔ اس میں مشکل یہ پیش آتی تھی کہ جب تک کھجور کی یہ مقدار پک کر تیار نہ ہو جائے اور اتر نہ جائے تو اس کی گہرائی کیسے کی جائے۔ اگر یہود پر اعتماد کیا جاتا تو وہ اس کو ویسے ہی ٹھکانے لگا لیتے۔ لہٰذا اس کی شکل یہ اختیار کی گئی کہ درختوں پر ہی پھل کا تخمینہ کر لیا جاتا اور اس مقدار کو برابر تقسیم کر لیا جاتا۔

روایت کی رو سے عبداللہ بن رواحہؓ درختوں پر پھل کی مقدار کا تخمینہ کرتے اور یہود کو پیشکش کرتے تھے

کہ اگر چاہو تو تم لے لو اور اگر چاہو تو میں لے لیتا ہوں - مطلب یہ ہے کہ تم لے لو اور مسلمانوں کے حصے کے ضامن ہو اور اگر میں لے لوں تو تمہارے حصہ کا ضامن بنتا ہوں - تو یہود لے لیا کرتے اور مسلمانوں کے حصے کے ضامن ہوتے تھے - یہود نے عبداللہ بن رواحہؓ سے تخمینہ میں رعایت حاصل کرنے کے لیے اپنی عورتوں کے زیورات کی شکل میں رشوت دینی چاہی تو انہوں نے اس کو مسترد کر دیا اور کہا کہ یہ مال حرام ہے جسے مسلمان نہیں کھاتے - لیکن اطمینان رکھو کہ اگرچہ تم ایک مبغوض قوم ہو پھر بھی میں تم سے کوئی ناانصافی نہیں کروں گا - اس پر انہوں نے کہا وہی عدل کی وجہ سے آسمان اور زمین قائم ہیں -

تخمینہ کے باب میں فقہاء کا اختلاف ہے - احناف اور شوافع اس کو نہیں مانتے لیکن مالکیہ مانتے ہیں - احناف اس کو مزابنہ پر قیاس کرتے ہیں - سو اس کو بیع میں داخل کرتے ہیں اور پھر بیع المجہول بالمجہول کے اصول پر اس کو رد کرتے ہیں - لیکن میرے نزدیک اس میں کوئی چیز بھی خلاف عقل نہیں اور یہ ایک ناگزیر عمل ہے - تخمینہ صرف خاص خاص حالات میں ہی اختیار کیا جاتا ہے، جہاں اس کے سوا اور کوئی شکل ممکن ہی نہ ہو - اگر کوئی چیز ناپی یا تولی نہ جا سکتی تو تخمینہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا - آنحضرتؐ نے تخمینہ کا استعمال زکوۃ کے مال میں کیا ہے تو زکوۃ کے مال سے مقدس مال اور کون سا ہو گا -

اہل ظاہر نے تخمینہ کو صرف کھجور اور انگور تک محدود کر دیا ہے - اہل ظاہر کی اسی طرح کی باتیں ہیں جن کو کوئی عاقل نہیں مان سکتا - بہت سی بھس (توڑی) آپ بیچنا چاہتے ہیں تو ترازو لے کر تو نہیں بیٹھیں گے یا ایک بہت بڑی عمارت منہدم ہو رہی ہے، آپ اس کا ملبہ خریدنا چاہتے ہیں، وہ نہ تو تولا جا سکتا ہے نہ گنا جا سکتا ہے - اس کو کھجور یا انگور پر کس طرح قیاس کر سکتے ہیں - بس یہی ایک تخمینہ کرنے کا طریقہ ہے جو مسئلے کا حل ہے - یہ عقلی بھی ہے اور فطری بھی - اس کے سوا کوئی دوسری شکل مسئلے کا حل نہیں ہو سکتی - خیبر کے معاملے کو بیع پر محمول کرنا درست نہیں کیونکہ کوئی چیز خریدی یا فروخت نہیں کی جا رہی تھی بلکہ فصل کی بٹائی کا معاملہ طے کیا جا رہا تھا اور نہ ہی اس میں کوئی چیز مجہول ہے - درختوں پر پھل ہے یا کھیت کی فصل ہے جو ابھی پک کر تیار نہیں ہے کہ اس کو تقسیم کر لیا جائے - تخمینہ ہی اس کا واحد قابل عمل حل تھا جس میں فریقین کو برابر کا حق دیا گیا کہ چاہیں لے لیں چاہیں دے دیں -

یہ بات بھی درست نہیں کہ آنحضرتؐ نے یہ معاملہ غیر مسلموں کے ساتھ کیا اس لیے یہ مسلمانوں کے لیے نظیر نہیں ہو سکتا - معاملہ کسی کے ساتھ بھی ہو آپ نے مال کے متولی کی حیثیت سے کیا اور اس سے اس حکم کے ہر معاملہ میں رہنمائی حاصل ہوتی ہے -

کتاب کراء الارض

مَاجَاءَ فِی کِرَاءِ الْاَرْضِ

زرعی زمین کرایہ پر دینا

حَدَّثَنَا یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ رَبِیْعَةَ بْنِ اَبِیْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ حَنْظَلَةَ بْنِ قَیْسٍ الزُّرَقِیِّ عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِیْجٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰی عَنْ كِرَاءِ الْمَزَارِعِ قَالَ حَنْظَلَةُ فَسَاَلْتُ رَافِعَ بْنَ خَدِیْجٍ بِالذَّهَبِ وَالْوَرِقِ فَقَالَ اَمَّا بِالذَّهَبِ وَالْوَرِقِ فَلَا بَاْسَ بِهٖ -

﴿حنظلہ بن قیس الزرقی رافع بن خدیجؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کھیتوں کا کرایہ لینے سے روکا ہے - حنظلہ کہتے ہیں کہ میں نے رافع بن خدیجؓ سے پوچھا کہ سونے چاندی کے بدلے میں ہو تب بھی؟ انہوں نے کہا کہ سونے چاندی کے بدلے میں ہو تب کوئی حرج نہیں -﴾

وضاحت :

راوی خود نبی ﷺ کے حکم کا جو مطلب سمجھے ہیں وہ یہ ہے کہ روپے کے بدلے میں زمین کرایہ پر لینے میں کوئی حرج نہیں - لیکن ہمارے بعض دانشوروں نے اس حکم کو عام مان کر پہلے زمین کا کرایہ ناجائز قرار دیا پھر اسی کے ضمن میں مکانوں کا کرایہ بھی ناجائز قرار دے دیا - حالانکہ زمین کا کوئی ایک ہی مصرف تو نہیں ہے کہ اس پر کاشت ہوتی ہے - زمین کے بے شمار مصرف ہیں - کارخانے اور سکول قائم کرنے، دوکان فٹک کرنے کی جگہ بنانے، بھیڑوں کے ریوڑ پالنے اور مرغی خانہ یا دوسرے جانوروں کے فارم بنانے کے لیے زمین درکار ہوتی ہے جو خریدی نہیں جاتی بلکہ کچھ عرصہ کے لیے کرایہ پر حاصل کی جاتی ہے، تو ان مقاصد کے لیے زمین کرایہ پر لینے میں کوئی قباحت نہیں -

کرایہ کی جو شکل قابل اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ زرعی زمین ایک مقررہ مقدار فصل کے بدلے کرایہ پر دی جائے - مثلاً مالک زمین یہ طے کر لیتا ہے کہ میں بیج اور میں سے پچاس من غلہ ہر فصل پر لیا کروں گا - معاملہ کی یہ شکل صحیح نہیں - اس کی وجہ یہ ہے کہ ہو سکتا ہے متوقع مقدار میں غلہ پیدا ہی نہ ہو لیکن مالک زمین اپنا مقررہ حصہ لے لے گا - یہ صورت ضرر اور غرر کی ہے - اس مشکل کا حل میں پہلے بتا چکا ہوں کہ زمین کم از کم دو یا تین سال کے

لیے دی جائے اور ایک تہائی سے زیادہ نقصان کی صورت میں مالک بھی نقصان برداشت کرے۔ تب اس معاملہ میں بھی کوئی قباحت نہیں رہ جاتی۔

احناف پیداوار کے بدلے زمین کرایہ پر دینے کے مخالف ہیں۔ مخالفت کی وجہ یہ ہے کہ کرایہ زمین کی پیداوار میں سے لینے کی صورت میں پیداوار کا جھگڑا پیش آسکتا ہے۔ میں نے اس کا جو حل بتایا ہے اس سے احناف کی علت مخالفت باقی نہیں رہتی۔ امام مالک کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ پیداواری جنس کی مقررہ مقدار کے عوض زمین کرائے پر دینا جائز نہیں۔ البتہ نقد پر معاملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ مکان اور زمین نقد کرائے پر لیے اور دیے جاسکتے ہیں۔

کتاب الشفعۃ

مَا تَقَعُ فِيهِ الشُّفْعَةُ

وہ چیزیں جن میں شفعہ ہو سکتا ہے

شفعہ کے لغوی معنی ایک چیز کے ساتھ دوسری چیز کو ملا لینا ہے۔ اس کے اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ اگر آپ کے کھاتے میں کوئی دوسرا شریک ہو اور آپ اس میں سے بغیر اپنے شریک سے مشورہ کیے فروخت کر دیں تو شریک کے مصالح کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس سے ایک دوسرے کے ساتھ اختلاف کا موقع پیدا ہو گا۔ عقل کا بھی تقاضا ہے اور شریعت نے بھی اس کی اجازت دی ہے کہ شریک کو حق ہے کہ وہ شفعہ کرے۔ اگر آپ نے کوئی چیز بیچی ہے تو اس میں شریک کا حق مقدم ہو گا۔ البتہ اس میں بہت سی شرطیں اور قیدیں ہیں جن کو جاننے کی ضرورت ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ شفعہ ہر چیز کے اندر نہیں بلکہ شفعہ مکان یا زمین پر ہی ہو سکتا ہے اور کسی چیز میں نہیں۔ جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ آدمی اگر کپڑے بھی بیچے تو شفعہ ہو سکتا ہے تو یہ غیر عقلی اور فضول بات ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ ملکیت واضح نہ ہو بلکہ ملک مشاع ہو یعنی دو فریق کھاتے میں حصہ دار تو ہیں لیکن ملکیت ابھی غیر معین ہے۔ اس کے حدود متعین نہیں ہوئے ہیں۔ اس صورت میں اگر ایک فریق بیچے تو دوسرا شفعہ کر سکتا ہے لیکن جب حدود متعین ہو جائیں اور ملکیت واضح ہو تو پھر حق شفعہ باقی نہیں رہتا۔

تیسری شرط یہ ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز نہ ہو جس کے تقسیم ہونے سے اس کا فائدہ ختم ہو جاتا ہو۔ جیسے ایک کنواں اگر تقسیم ہو جائے تو پھر کنواں ہی نہیں رہے گا۔ اسی طرح کی کوئی اور چیز جس کی تقسیم اس کی منفعت کو

ختم کر دے، اس میں شفعہ نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص کوئی ایسی چیز بیچے جو مخلوط ہے تو اگرچہ وہ اپنا حصہ ہی بیچے گا لیکن دوسرا آدمی یہ چاہے گا کہ بقیہ حصہ بھی اس کو مل جائے تاکہ کوئی اجنبی آدمی شریک نہ ہو جائے۔ لہٰذا بیع کرنے والے کو چاہیے کہ دوسرے فریق کو اطلاع کر دے تاکہ جو کچھ کارروائی اس کو کرنی ہے کر لے۔ اگر اس کو اطلاع نہ کی جائے تو وہ یہ حق رکھتا ہے کہ وہ عدالتی چارہ جوئی کر کے اپنے شفعہ کا حق محفوظ کر لے۔ لیکن یہ اختیار بہت طویل مدت تک نہیں ہو سکتا کیونکہ اس سے بیع کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ ایک چیز بیع ہوتی ہے تو مشتری کو قبضہ کرنا ہوتا ہے۔ اس کو غیر محدود مدت تک قبضہ سے نہیں روکا جا سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ شفعہ جلد از جلد کیا جائے۔ اگر زیادہ دیر کر دی جائے تو پھر شفعہ کا حق ساقط ہو جائے گا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حق شفعہ استعمال کرنے میں کتنی دیر کی جا سکتی ہے۔ اس معاملے میں فقہا مدت متعین نہیں کرتے۔ میرے نزدیک اس میں بیع خیار والا معاملہ ہونا چاہیے۔ یعنی اگر دوسرے شریک کو اطلاع کر دی گئی تو آپ نے حق ادا کر دیا۔ اس کو شفعہ کا حق صرف اس صورت میں رہے گا جب اس کو اطلاع نہیں کی جاتی۔ میرے نزدیک خیار کی مدت معاملے کی نوعیت کے لحاظ سے مقرر ہونی چاہیے۔ البتہ یہ مدت غیر محدود نہیں ہو سکتی۔ زیادہ سے زیادہ دو چار ماہ کا وقت دے دیا جائے گا۔

☐ حَدَّثَنَا يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَعِيْدِ ابْنِ الْمُسَيَّبِ وَ عَنْ اَبِي سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَضٰى بِالشُّفْعَةِ فِيمَا لَمْ يُقْسَمْ بَيْنَ الشُّرَكَاءِ فَاِذَا وَقَعَتِ الْحُدُوْدُ بَيْنَهُمْ فَلَا شُفْعَةَ فِيهِ۔

امام مالک نے ابن شہاب سعید بن مسیب اور ابی سلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شفعہ کا فیصلہ اس جائیداد کے بارے میں کیا جس کی تقسیم شریکوں کے درمیان نہیں ہوئی تھی۔ اگر تقسیم ہو کر حدود متعین ہو چکے ہوں تو شفعہ نہیں ہے۔

وضاحت:

اس روایت سے یہ ظاہر ہے کہ صرف شریک ملکیت ہی شفعہ کر سکتا ہے، شریک کھاتہ نہیں۔ اگر حدود متعین ہو گئے ہوں تو شفعہ کا حق ختم ہو جاتا ہے۔ عام لوگ بھی شفعہ نہیں کر سکتے۔ احناف کے نزدیک پڑوسی شفعہ کر سکتا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ پڑوسی کے حقوق بہت ہیں۔ روایات میں یہاں تک آیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ

جبریل میرے پاس آئے اور پڑوسی کے بارے میں اس قدر نصیحت کرنے لگے کہ میں ڈر گیا کہ کہیں اس کو شریک جائیداد نہ بنادیں۔ پڑوسی کے حقوق بلاشبہ بہت زیادہ ہیں لیکن یہ اسی طرح ہیں جس طرح دوسرے مسلمان بھائیوں کے بہت سے حقوق ہیں۔ پڑوسی کا کوئی قانونی حق ثابت نہیں۔ لہٰذا احناف کا مسلک میری سمجھ میں نہیں آتا۔

مَالَا تَقَعُ فِيهِ الشُّفْعَةُ

وہ چیزیں جن میں شفعہ نہیں ہو سکتا

□ — قَالَ يَحْيٰى قَالَ مَالِكٌ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عُمَارَةَ عَنْ اَبِي بَكْرِ بْنِ حَزْمٍ اَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ قَالَ اِذَا وَقَعَتِ الْحُدُوْدُ فِي الْاَرْضِ فَلَا شُفْعَةَ فِيْهَا وَلَا شُفْعَةَ فِي بِئْرٍ وَلَا فِي فَحْلِ النَّخْلِ قَالَ مَالِكٌ وَ عَلٰى هٰذَا الْاَمْرُ عِنْدَنَا۔

﴿ابوبکر بن حزم کہتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفانؓ کا فتویٰ یہ ہے کہ جب زمین کی حدود معین ہو جائیں تو اس میں شفعہ کا حق نہیں رہتا۔ اور کنویں اور نر کھجور میں بھی شفعہ نہیں۔ مالک کہتے ہیں کہ ہمارا فتویٰ اسی پر ہے۔﴾

وضاحت :

فحل کھجور کے اس نر درخت کو کہتے ہیں جس کے پھول چھڑک کر دوسری کھجوروں کی تاثیر کرتے ہیں۔ اس سے کھجوریں خوب پھل دیتی ہیں۔ ایسے درخت باغ میں دو تین ہی ہوتے ہیں۔

کنوئیں اور کھجور میں شفعہ نہ ہونے کی علت یہ ہے کہ تقسیم سے ان کی منفعت ختم ہو جاتی ہے۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ راستے کے بارے میں بھی شفعہ نہیں ہو سکتا۔ راستہ بھی مشترک ہی رہے گا۔ تقسیم سے جس چیز کا مفاد ختم ہو جاتا ہو اس میں شفعہ نہیں۔

اس روایت میں خلیفہ راشد کا اثر ہے اور عام طور پر خلفائے راشدین ایسے فتوے اہل علم کے مشورے سے دیتے تھے۔ قاضی ابو یوسفؒ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو بھی اسی زمرے میں شامل کیا ہے اور یہ ٹھیک کیا ہے۔ اس دور خیر کے یہ فتوے اجماع کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کتاب الاقضیہ

اَلتَّرْغِيْبُ فِي الْقَضَاءِ بِالْحَقِّ

حق کے مطابق فیصلہ کرنے کی ترغیب

حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ ابْنِ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ زَيْنَبَ بِنْتِ أَبِي سَلَمَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ وَ إِنَّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ إِلَيَّ فَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ يَكُوْنَ أَلْحَنَ بِحُجَّتِهِ مِنْ بَعْضٍ فَأَقْضِيَ لَهُ عَلٰى نَحْوِ مَا أَسْمَعُ مِنْهُ فَمَنْ قَضَيْتُ لَهُ بِشَيْءٍ مِنْ حَقِّ أَخِيْهِ فَلَا يَأْخُذَنَّ مِنْهُ شَيْئًا فَإِنَّمَا أَقْطَعُ لَهُ قِطْعَةً مِنَ النَّارِ۔

ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے فرمایا کہ آنحضرت کا ارشاد ہے کہ میں ایک انسان ہوں اور تم میرے پاس اپنے مقدمے لاتے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی اپنے بیان کے زور پر اپنی وکالت میں بڑھا ہوا ہو اور میں اس کے دلائل سن کر اس کے حق میں فیصلہ دے دوں۔ تو جس کے لیے میں نے اس کے بھائی کے حق میں سے کسی چیز کا فیصلہ دے دیا تو وہ اس میں سے نہ لے اس لیے کہ میں نے اس کے لیے آگ کے ٹکڑے کا فیصلہ کیا ہے۔

وضاحت :

یہ روایت حق کے مطابق فیصلے کی ترغیب تو دیتی ہی ہے لیکن اس سے ایک اہم نکتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کی معصومیت کا دائرہ اس کے اجتہاد کی حد تک ہے۔ اجتہادی امور میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی نگرانی ہوتی ہے۔ اگر اصلاح کی ضرورت ہو تو وہ کر دی جاتی ہے۔ یہی پیغمبر کی معصومیت کا تقاضا ہے۔ لیکن مقدمے کا فیصلہ اس سے الگ ہے۔ پیغمبر اس بات کا پابند ہوتا ہے کہ وہ شہادت اور مقدمے کی روداد کی روشنی میں فیصلہ کرے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ پیغمبر کے سامنے مقدمہ کی روداد ایسے طریقے سے پیش کی جائے اور غلط موقف کے حق میں دلائل کچھ ایسی قوت سے پیش کیے جائیں کہ ان کی بنا پر وہ حق کے خلاف فیصلہ کر دے، اس لیے کہ مقدمے کی روداد اس کی متقاضی ہے۔

پیغمبر کسی معاملے کا فیصلہ علم غیب کی بنا پر نہیں کر سکتا۔ اگر وہ مقدمات کا فیصلہ علم غیب کی بنا پر کرنے کا پابند ہوتا تو ہماری عدالتیں کس اصول پر فیصلے کرتیں، وہ تو غیب نہیں جانتیں۔ ایک قاضی جو دلائل کی روشنی میں

اور رواج کے مطابق فیصلہ کرتا ہے وہ پیغمبر کی شہادت میں فیصلہ کرتا ہے۔ اگر اس کا فیصلہ حق کے مطابق نہ بھی ہو تب بھی وہ عنداللہ ماجور ہوگا۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اس روایت سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ اگر پیغمبر بشریت کے تقاضے سے کسی وکیل کے دلائل سے متاثر ہو کر کوئی ایسا فیصلہ کر دیتا ہے جو حق کے مطابق نہیں ہے تو وہ فیصلہ تو نافذ ہو جائے گا لیکن اس سے کوئی ناحق حق نہیں بن جائے گا۔ جو شخص بے ایمانی سے، پیغمبر کو چکمہ دے کر اور اپنی وکالت کے زور پر ناحق دنیا کی کچھ متاع لے لے تو وہ یاد رکھے کہ یہ متاع اس کے لیے جہنم کی آگ کا ایک ٹکڑا ہوگی جس کا سامنا اسے آخرت میں کرنا ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس ایک آدمی قاضی سے اگر کوئی ناحق فیصلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ اس کی سزا آخرت میں بھگتے گا۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ سَعِيْدِبْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اخْتَصَمَ إِلَيْهِ مُسْلِمٌ وَ يَهُوْدِيٌّ فَرَأَى عُمَرُ أَنَّ الْحَقَّ لِلْيَهُوْدِيِّ فَقَضَى لَهُ فَقَالَ لَهُ الْيَهُوْدِيُّ وَاللّٰهِ لَقَدْ قَضَيْتَ بِالْحَقِّ فَضَرَبَهُ عُمَرُبْنُ الْخَطَّابِ بِالدِّرَّةِ ثُمَّ قَالَ وَمَا يُدْرِيكَ فَقَالَ لَهُ الْيَهُوْدِيُّ إِنَّا نَجِدُ أَنَّهُ لَيْسَ قَاضٍ يَقْضِي بِالْحَقِّ إِلَّا كَانَ عَنْ يَمِينِهِ مَلَكٌ وَعَنْ شِمَالِهِ مَلَكٌ يُسَدِّدَانِهِ وَ يُوَفِّقَانِهِ لِلْحَقِّ مَا دَامَ مَعَ الْحَقِّ فَإِذَا تَرَكَ الْحَقَّ عَرَجَا وَتَرَكَاهُ۔

﴿سعید بن مسیب روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ کے پاس ایک مسلمان اور ایک یہودی مقدمہ لائے۔ حضرت عمرؓ کو یہ بات نظر آئی کہ حق یہودی کے ساتھ ہے۔ آپ نے یہودی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ یہودی نے کہا اللہ کی قسم، آپ نے حق کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس کو ایک درہ لگایا۔ پھر کہا تمھیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی۔ یہودی نے کہا، ہمارے ہاں روایت ملتی ہے کہ جو قاضی حق کے مطابق فیصلہ کرتا ہے ایک فرشتہ اس کے داہنے اور ایک فرشتہ اس کے بائیں ہوتا ہے۔ یہ فرشتے اس کو درست رکھتے اور حق کی توفیق دیتے رہتے ہیں جب تک وہ حق پر ہوتا ہے۔ اور جب وہ حق کو چھوڑ دیتا ہے تو وہ چل دیتے اور اس کو چھوڑ دیتے ہیں۔﴾

وضاحت:

حضرت عمرؓ کے سامنے یہودی نے جو بات کی یہ اسی طرح کی بات ہے جیسی خیبر کے یہودیوں نے کھجوروں کی تقسیم کے بارے میں فیصلہ پر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو کہی تھی کہ اسی انصاف کی وجہ سے آسمان اور زمین قائم ہیں۔ اس یہودی نے بھی حضرت عمرؓ کے فیصلے کی داد دی۔ اس پر انھوں نے پوچھ لیا کہ اچھا تمھیں کیسے پتہ چلا کہ میں حق پر ہوں۔ شاید اس لیے کہہ رہے ہو کہ فیصلہ تمھارے حق میں ہو گیا۔ لیکن یہودی اپنی بات پر اڑا رہا کہ ہمارے ہاں یہ روایت بیان ہوئی ہے کہ جو قاضی حق فیصلہ کرتا ہے تو اس کے داہنے اور بائیں دو فرشتے اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے میرے حق میں فیصلہ کیا ہے ورنہ ہماری بات پر کسی کو کیسے اعتبار آسکتا ہے۔

یہودی کے تحسین کے کلمات سے لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ چونکہ اس نے حضرت عمرؓ کے منہ پر ان کی تعریف کر دی تھی اس لیے انھوں نے اس پر درہ اٹھا لیا۔ میرے نزدیک یہ خیال درست نہیں۔ یہ بات کہ خدا کی قسم، آپ نے حق کے مطابق فیصلہ کیا ایسی نہیں تھی کہ اس پر درہ مارا جائے۔ اگرچہ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ کسی کی تعریف اس کے منہ پر کرنا اچھی بات نہیں، بہت ہی بے ہودہ بات ہے اور اس کی حوصلہ شکنی بھی کرنی چاہیے۔ لیکن یہ موقع سزا دینے کا نہیں تھا۔ یہودی نے اپنی بات کے حق میں اپنے ہاں کی کسی روایت کا حوالہ دے کر کہا تھا کہ میں یہ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ توفیق بخشی۔ یہ ایسی بات نہیں تھی جس پر حضرت عمرؓ سے سزا دیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں درہ تو رہتا ہی تھا لیکن وہ ہمیشہ اس کو سزا دینے ہی کے لیے استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ کبھی وہ محض ڈرانے دھمکانے کے لیے کسی شخص پر اٹھا لیتے رہے ہوں گے اور کبھی پیار سے بھی ایسا کرتے رہے ہوں گے۔ یہاں پیار ہی سے اٹھانے کا موقع نظر آتا ہے۔ حضرت عمرؓ جیسے معقول، مہذب اور شائستہ آدمی سے یہ بات بالکل بعید ہے کہ وہ حق یا ناحق ہر موقع پر لوگوں کی ٹھکائی کر دیتے رہے ہوں۔ یقیناً لوگوں نے موقع و محل سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔

مَاجَاءَ فِي الشَّهَادَاتِ

گواہوں کے بارے میں روایات

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ أَبِي بَكْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو ابْنِ حَزْمٍ

عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ عُثْمَانَ عَنْ اَبِي عَمْرَةَ الْاَنْصَارِيِّ عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدِ الْجُهَنِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِ الشُّهَدَاءِ الَّذِي يَاْتِي بِشَهَادَتِهٖ قَبْلَ اَنْ يَسْاَلَهَا اَوْ يُخْبِرُ بِشَهَادَتِهٖ قَبْلَ اَنْ يَسْاَلَهَا-

﴿زید بن خالد جہنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں بتاؤں کہ سب سے بہتر گواہ کون ہے-وہ جو اپنی گواہی پیش کرے قبل اس کے کہ اس سے سوال کیا جائے یا (شاید یوں فرمایا کہ) وہ اپنی گواہی کی خبر دے قبل اس کے کہ اس سے پوچھا جائے-﴾

وضاحت :

اس امت کا فریضہ منصبی شہداء اللہ فی الارض کا ہے جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۴۳ میں ہے "لتکونوا شھداء علی الناس"- یہ حق کی گواہی دینے والی امت ہے-اس فریضہ منصبی کا تقاضا یہ ہے کہ امت کے افراد کا اجتماعی مزاج یہ ہو کہ آدمی کسی مظلوم کی حق تلفی ہوتے دیکھ کر خود بول پڑے کہ میں جانتا ہوں کہ اس بیچارے کا حق ہے اور اس کو اس کے حق سے محروم کیا جا رہا ہے-اس سے بحث نہ ہو کہ عدالت اس کو طلب کرتی ہے یا نہیں-وہ ہزاروں کے سامنے بھی اپنی گواہی پیش کرنے کے لیے تیار رہے-آج ہمارا مزاج یہ ہو گیا ہے کہ گواہی بکتی ہے- پیشہ ور گواہ عدالتوں میں موجود ہوتے ہیں- آپ کا کوئی مقدمہ ہو وہ گواہی دینے کے لیے حاضر رہتے ہیں- یہ بدمعاشی ہے-ایسے لوگ اس امت کے فرض منصبی کی مخالفت کرنے والے ہیں-

❐ حَدَّثَنِيْ مَالِكٌ" عَنْ رَبِيْعَةَ بْنِ اَبِي عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّهٗ قَالَ قَدِمَ عَلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ الْعِرَاقِ فَقَالَ لَقَدْ جِئْتُكَ لِاَمْرٍ مَالَهٗ رَاْسٌ وَلَا ذَنَبٌ فَقَالَ عُمَرُ مَا هُوَ قَالَ شَهَادَاتُ الزُّوْرِ ظَهَرَتْ بِاَرْضِنَا فَقَالَ عُمَرُ اَوَ قَدْ كَانَ ذٰلِكَ قَالَ نَعَمْ فَقَالَ عُمَرُ وَاللّٰهِ لَا يُؤْسَرُ رَجُلٌ فِي الْاِسْلَامِ بِغَيْرِ الْعُدُوْلِ-

﴿ربیعہ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس ایک شخص اہل عراق میں سے آیا-اس نے کہا کہ میں ایک ایسے معاملے کی خبر لایا ہوں کہ جس کا نہ کوئی سر ہے نہ پیر- حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ وہ کیا ہے-

اس نے کہا کہ ہمارے ملک میں جھوٹی شہادتیں بہت پھیل رہی ہیں- حضرت عمرؓ نے فرمایا اچھا یہ ہونے لگا-اس نے کہا جی ہاں- حضرت عمرؓ نے فرمایا کوئی بات نہیں، میں اللہ کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اسلام میں کوئی شخص عدول گواہوں کی گواہی کے بغیر قید نہیں کیا جائے گا-﴾

وضاحت :

روایت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ عراق سے آنے والے شخص کی آمد کا کوئی خاص پس منظر تھا- معلوم ہوتا ہے اس کے خلاف کوئی سازش تھی اور بعض لوگ اس کو گرفتار کروانا چاہتے تھے-وہ گھبرا کر اپنی پیشگی حفاظت کے لیے حضرت عمرؓ کے پاس آ گیا-اس نے آ کر امیر المومنین سے کہا کہ ہمارے علاقے میں لوگ بے سروپا باتیں منسوب کر کے جھوٹی گواہی دے دیتے ہیں-اس طرح عراق میں جھوٹی گواہی کا فتنہ پھیل رہا ہے- حضرت عمرؓ کو ڈر ہے کہ اس کے خلاف کوئی گواہی کا مسئلہ ہے اور اس کو گرفتاری کا اندیشہ ہے تو انہوں نے تسلی دی کہ فکر نہ کرو- اسلام میں عادل گواہوں کی گواہی کے بغیر کسی کو پکڑا نہیں جائے گا- یعنی میری طرف سے اطمینان رکھو کہ میرے قاضی تمہارے خلاف عادل گواہوں کی گواہی کے بغیر کوئی اقدام نہیں کر سکتے-

اس روایت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سیفٹی ایکٹ کی نوعیت کے قوانین جن میں بغیر کسی شہادت کے لوگوں کو دھر لیا جاتا ہے اسلام کے خلاف اور باطل ہیں- اہل سیاست کا یہ مطالبہ جائز ہے کہ ایسے قوانین نہیں ہونے چاہئیں-ان کا غلط استعمال ہوتا ہے-اسلام کا اصول یہ ہے کہ جب تک حکومت باقاعدہ مقدمہ چلا کے کسی کو گرفتار کر کے جیل میں نہیں ٹھونس سکتی-

❐ حَدَّثَنِيْ مَالِكٌ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ لَا تَجُوْزُ شَهَادَةُ خَصْمٍ وَلَا ظَنِيْنٍ-

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مخالف کی شہادت اور جس شخص کے متعلق بدگمانی کے وجوہ پائے جائیں اس کی گواہی جائز نہیں-﴾

وضاحت :

یہ حضرت عمرؓ کا فتویٰ ہے-جس طریقے سے آپ کے حلیف یا رشتہ دار کی گواہی آپ کے حق میں مشتبہ ہے اسی طرح سے اگر آپ یہ ثابت کر دیں کہ آپ کے اور گواہ کے درمیان جھگڑا ہے تو پھر اس کی شہادت نہیں لی

جائے گی- اسی طرح اگر کسی کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ پیشہ ور گواہ ہے، جھوٹی گواہی دیتا پھرتا ہے یا کسی مقدمے میں ماخوذ ہے یا کسی غیر قانونی کاروبار میں ملوث ہے تو اس کی گواہی ناقابل قبول ہوگی، اس لیے کہ وہ عدول نہیں، اور اسلام میں غیر عدول کی گواہی معتبر نہیں-

ہمارے فقہاء نے ایک اصول یہ بنا رکھا ہے کہ صحابہ کے بعد کوئی شخص عدول نہیں اور جس شخص کا عدول ہونا معلوم نہ ہو اس کی گواہی نہیں لی جائے گی- میرے خیال میں یہ اصول صحیح نہیں- اصول یہ ہونا چاہیے کہ آپ اگر کسی شخص کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں کر سکتے، کوئی وجہ تہمت نہیں لا سکتے تو وہ عدول مانا جائے گا، خواہ وہ عالم ہو یا جاہل، اور وہ کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتا ہو، معاملات میں وہ عدول سمجھا جائے گا الا یہ کہ آپ اس کے خلاف کوئی الزام ثابت کر دیں-

اَلْقَضَاءُ فِي شَهَادَةِ الْمَحْدُوْدِ

جس پر حد جاری ہو چکی ہو اس کی گواہی کے بارے میں فیصلہ

❐ قَالَ يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ وَغَيْرِهٖ اَنَّهُمْ سُئِلُوْا عَنْ رَجُلٍ جُلِدَ الْحَدَّ اَتَجُوْزُ شَهَادَتُهٗ فَقَالُوْا نَعَمْ اِذَا ظَهَرَتْ مِنْهُ التَّوْبَةُ وَحَدَّثَنِيْ مَالِكٌ اَنَّهٗ سَمِعَ ابْنَ شِهَابٍ يُسْاَلُ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ مِثْلَ مَا قَالَ سُلَيْمَانُ بْنُ يَسَارٍ قَالَ مَالِكٌ وَذٰلِكَ الْاَمْرُ عِنْدَنَا وَذٰلِكَ لِقَوْلِ اللّٰهِ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ قَالَ مَالِكٌ فَالْاَمْرُ الَّذِيْ لَا اخْتِلَافَ فِيْهِ عِنْدَنَا اَنَّ الَّذِيْ يُجْلَدُ الْحَدَّ ثُمَّ تَابَ وَ اَصْلَحَ تَجُوْزُ شَهَادَتُهٗ وَهُوَ اَحَبُّ مَا سَمِعْتُ اِلَيَّ فِيْ ذٰلِكَ-

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی کہ سلیمان بن یسار اور دوسرے لوگوں سے اس شخص کی گواہی کے جواز کے بارے میں پوچھا گیا جس پر حد جاری ہو چکی ہو تو انہوں نے کہا کہ اس آدمی کی شہادت جائز ہے بشرطیکہ

اس کی توبہ ظاہر ہو چکی ہو- امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ابن شہاب سے اس بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے بھی وہی بات کہی جو سلیمان بن یسار نے کہی تھی- امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں بھی فتویٰ یہی ہے- دلیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا قول ہے "اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر الزام لگائیں پھر اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ نہ پیش کریں تو ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو- یہی لوگ اصل فاسق ہیں- البتہ جو لوگ اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لیں گے تو اللہ مغفرت فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے"- امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ جو شخص حد جاری ہونے کے بعد توبہ اور اصلاح کر لے تو اس کی شہادت جائز ہے اور اس بارے میں یہی سب سے زیادہ پسندیدہ بات ہے جو میں نے سنی ہے-﴾

وضاحت :

جس شخص پر کوئی شرعی حد جاری ہو چکی ہو اس کی گواہی قبول کرنے یا رد کرنے کے بارے میں یہ فقہائے مدینہ اور امام مالکؒ کے فتوے ہیں- احناف کا مسلک الگ ہے- احناف کے نزدیک ایسے شخص کی شہادت کبھی قبول نہ ہوگی- جس آیت کو امام مالکؒ نے دلیل میں پیش کیا ہے اسی کو احناف بھی پیش کرتے ہیں- تاویل میں ان کو اختلاف ہے- امام مالکؒ اور ان کے مسلک کے دوسرے لوگ اس آیت کی تاویل یوں کرتے ہیں کہ الا الذین کا استثناء بات کی طرف ہے کہ تہمت لگانے والا اگر توبہ اور اصلاح کر لے تو اس کی شہادت قبول ہونی چاہیے- امام ابو حنیفہؒ یہ فرماتے ہیں کہ استثناء اولئک ھم الفاسقون سے ہے- مراد یہ ہے کہ جو شخص توبہ اور اصلاح کر لے گا وہ فسق سے نکل جائے گا نہ کہ ساقط الشہادۃ ہونے سے- اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ اس طرح آیت میں ابدا کا لفظ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے- اس لیے کہ تاب کو کسی لفظ کے ساتھ معلق نہیں کر سکتے- اگر ایسا کریں گے تو ابدا کا لفظ اس کے منافی ہوگا- لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ توبہ کر کے اصلاح کر لیں گے وہ فاسقوں کے زمرے میں سے نکل جائیں گے لیکن ان کی شہادت قبول نہ ہوگی- میرے نزدیک احناف کا مسلک قوی ہے- میں نے تفسیر مدنی قرآن میں یہی مسلک اختیار کیا ہے- قانون یہ ہے کہ ایک شخص کسی پاکدامن عورت پر اگر زنا جیسے سنگین جرم کا الزام لگاتا ہے اور عدالت میں شہادت نہیں پیش کر سکتا تو اس کی سزا کے طور پر وہ ہمیشہ کے لیے ساقط الشہادت ہو جائے گا- رہا توبہ کا

معاملہ تو یہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے، وہ قبول کرے یا نہ کرے۔ وہ دونوں کا حال جانتا ہے۔ یہ بات قرآن مجید کی زبان اور نظام کے لحاظ سے زیادہ قوی ہے۔

اَلْقَضَاءُ بِالْيَمِيْنِ مَعَ الشَّاهِدِ

گواہ کے ساتھ قسم کو ملا کر فیصلہ

❐ قَالَ يَحْيٰى قَالَ مَالِكٌ عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَضٰى بِالْيَمِيْنِ مَعَ الشَّاهِدِ وَ عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِي الزِّنَادِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِالْعَزِيْزِ كَتَبَ اِلٰى عَبْدِالْحَمِيْدِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ ابْنِ زَيْدِ بْنِ الْخَطَّابِ وَهُوَ عَامِلٌ عَلَى الْكُوْفَةِ اَنِ اقْضِ بِالْيَمِيْنِ مَعَ الشَّاهِدِ وَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ اَبَا سَلَمَةَ بْنَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ وَ سُلَيْمَانَ بْنَ يَسَارٍ سُئِلَا هَلْ يُقْضٰى بِالْيَمِيْنِ مَعَ الشَّاهِدِ فَقَالَا نَعَمْ قَالَ مَالِكٌ مَضَتِ السُّنَّةُ فِي الْقَضَاءِ بِالْيَمِيْنِ مَعَ الشَّاهِدِ الْوَاحِدِ يَحْلِفُ صَاحِبُ الْحَقِّ مَعَ شَاهِدِهٖ وَ يَسْتَحِقُّ حَقَّهٗ فَاِنْ نَكَلَ وَ اَبٰى اَنْ يَحْلِفَ اُحْلِفَ الْمَطْلُوْبُ فَاِنْ حَلَفَ سَقَطَ عَنْهُ ذٰلِكَ الْحَقُّ فَاِنْ اَبٰى اَنْ يَحْلِفَ ثَبَتَ عَلَيْهِ الْحَقُّ لِصَاحِبِهٖ۔

﴿جعفر بن محمد اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مقدمے کا فیصلہ ایک گواہ اور قسم کے ساتھ بھی کیا۔ امام مالک ابی الزناد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے عبدالحمید بن عبدالرحمٰن کو، جو کوفہ کے عامل تھے، یہ لکھا کہ مقدمے کا فیصلہ ایک گواہ اور قسم کے ساتھ کر دیا کرو۔ امام مالک کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن اور سلیمان بن یسار سے پوچھا گیا کہ کیا ایک گواہ اور قسم کے ساتھ مقدمے کا فیصلہ ہو سکتا ہے تو ان دونوں حضرات نے کہا کہ ہاں۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مقدمات کے فیصلے کے بارے میں یہ طریقہ طے ہے کہ مدعی اپنے ایک گواہ کے ساتھ قسم کھائے گا اور وہ اپنے حق کا مستحق بن جائے گا۔ اور اگر وہ انکار کرے اور قسم

نہ کھائے تو مدعا علیہ سے قسم لی جائے گی۔ اگر وہ قسم کھالے تو اس سے وہ حق ساقط ہو جائے گا۔ اگر قسم کھانے سے انکار کرے تو اس کے اوپر مدعی کا حق ثابت ہو جائے گا۔﴾

وضاحت:

یہ روایت ایک بالکل نیا اصول عدل بیان کر رہی ہے۔ اس کی رو سے کسی مقدمہ میں کوئی دعویٰ لے کر آپ عدالت میں جاتے ہیں، آپ کے ہمراہ ایک گواہ ہے، عدالت دوسرا گواہ مانگتی ہے لیکن وہ آپ پیش نہیں کرتے۔ اس روایت کی رو سے عدالت آپ کو یہ موقع دے گی کہ آپ قسم کھائیں اور یہ قسم دوسرے گواہ کے قائم مقام ہو جائے گی۔ یہ نیا اصول عدل قرآن مجید میں متعارف نہیں کرایا گیا ہے۔

احناف اس کے مخالف ہیں۔ ان کی دلیلوں میں سے یہ بات مجھے پسند آئی کہ یہ بات قرآن مجید کے خلاف ہے۔ قرآن مجید میں شہادت کے لیے دو مرد گواہ مقرر کیے گئے ہیں۔ اگر دو مرد میسر نہ ہوں تو ایک مرد کے ساتھ دو عورتیں ایک مرد کی قائم مقام ہوں گی۔ مالکیہ وغیرہ سب روایت کے مضمون پر متفق ہیں اور انھوں نے یہ بات نبی ﷺ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کی طرف منسوب کی ہے۔

احناف کی دلیل کا ایک بہت بودا نکتہ یہ ہے کہ قسم کو قرآن نے بھی اور حدیث نے بھی جو تسلیم کیا ہے وہ مدعا علیہ کی طرف سے کیا ہے نہ کہ مدعی کی طرف سے۔ حدیث میں آیا ہے البینة علی المدعی والیمین علی من انکر۔ جس کی مراد یہ ہے کہ مدعی اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لیے شہادت پیش کرے گا اور مدعا علیہ کے پاس اگر کوئی گواہ یا کوئی دلیل نہیں تو وہ قسم کھائے گا۔ گویا یہ کمزور کو ایک ہتھیار دیا گیا ہے جس کو وہ بصورت مجبوری استعمال کر سکتا ہے۔ روایت زیر بحث یہ ہتھیار مدعی کو پکڑا دیتی ہے۔ میرے نزدیک احناف کا یہ نکتہ بہت مضبوط ہے۔ قسم صرف مدعا علیہ کا ہتھیار ہے، مدعی کا نہیں۔ مدعی کے لیے بینہ ضروری ہے اور بینہ کے معنی ہیں شہادت، یعنی دلیل جو وہ پیش کرے گا۔ عدالت اس کی روشنی میں اس کے دعویٰ کو جانچ کر فیصلہ کرے گی۔

مالکیہ اور ان کے ہم خیال لوگوں کی ایک اور کمزوری بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ اصول صرف مالی معاملات میں کارگر ہوگا اور دوسرے جتنے بھی معاملات ہیں مثلاً حدود، نکاح، طلاق، عتاق، سرقہ، فریہ وغیرہ، ان میں لاگو نہیں ہوگا۔ اس کے لاگو نہ ہونے کا سبب بیان نہ کرنا ان کے موقف کو کمزور کرتا ہے۔ یہ سب معاملات بے حد خطرناک ہیں۔ اگر یہ ہتھیار آپ ان معاملات میں مدعی کو پکڑا دیں تو زنا، حد اور قتل وغیرہ میں غضب ہی ہو جائے گا۔

میں احناف کے موقف کو مضبوط پاتا ہوں اور اس روایت کے تصور عدل کو صحیح نہیں سمجھتا۔

اَلْقَضَاءُ فِي الدَّعْوٰى

دعویٰ میں فیصلہ کا اصول

☐ قَالَ يَحْيٰى قَالَ مَالِكٌ عَنْ حُمَيْدِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ الْمُؤَذِّنِ اَنَّهٗ كَانَ يَحْضُرُ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيْزِ وَهُوَ يَقْضِي بَيْنَ النَّاسِ فَاِذَا جَاءَهُ الرَّجُلُ يَدَّعِي عَلَى الرَّجُلِ حَقًّا نَظَرَ فَاِنْ كَانَتْ بَيْنَهُمَا مُخَالَطَةٌ اَوْ مُلَابَسَةٌ اَحْلَفَ الَّذِيْ ادُّعِيَ عَلَيْهِ وَ اِنْ لَمْ يَكُنْ شَيْءٌ مِنْ ذٰلِكَ لَمْ يُحَلِّفْهُ

﴿حمید بن عبدالرحمٰن المؤذن کہتے ہیں کہ وہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس اس وقت موجود رہے جب وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے۔ اگر ان کے پاس کوئی ایسا شخص آتا جو کسی دوسرے شخص کے خلاف حق کا دعویدار ہوتا تو وہ غور کرتے۔ اگر دیکھتے کہ ان دونوں کے درمیان معاملہ تجارت یا کاروبار وغیرہ کا ہے تو وہ مدعا علیہ سے قسم لیتے اور اگر ایسی کوئی بات نہ ہوتی تو پھر قسم نہ لیتے۔﴾

وضاحت :

قسم کے متعلق یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ کوئی اصولی چیز نہیں ہے۔ یہ صرف اسی صورت میں ہے جب گواہ یا دوسری شہادت اور قرائن موجود نہ ہوں۔ قسامہ کا قانون بھی یہی ہے کہ اگر ایک ملاقے میں قتل ہو گیا ہے اور کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ قاتل کون ہے، کوئی قرینہ بھی نہیں ہے، مقتول کے اولیاء کچھ پتہ نہیں دے رہے ہیں، قاتل کا کوئی نشان نہیں ہے تو ایسی شکل میں اسلام میں بھی اور قدیم مذاہب میں بھی یہ طریقہ رہا ہے کہ لوگوں سے قسم لیتے تھے۔ اسی کو قسامہ کہتے ہیں۔ اس کے لیے قدیم زمانے سے مختلف طریقے رائج رہے ہیں۔ مثلاً قربانی کے جانور ذبح کر کے اس کے گوشت پر یا معبدوں کے پاس کھڑا کر کے قسم لیتے رہے ہیں۔

یہ بات واضح رہے کہ قسم کھانے پر کسی شریف آدمی کو مجبور کرنا اس کی بڑی بے وقعتی ہے۔ اول تو یہی مطالبہ بڑی سنگین چیز ہے کہ قسم کھایئے کہ آپ سچ کہیں گے۔ یہ غیرت مند انسان کی غیرت کے خلاف بات ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ایک دفعہ قسم کھانے کو کہا گیا تو انہوں نے ایک فروخت شدہ غلام واپس لے لیا لیکن قسم کھانا گوارا نہ کیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا معمول یہ نہیں تھا کہ مقدمہ آیا اور جھٹ سے مدعا علیہ سے قسم کھانے کا مطالبہ کر دیا بلکہ غور فرماتے۔ اگر ان دونوں کے درمیان کوئی تجارت یا لین دین کا معاملہ رہا ہوتا تب قسم لیتے۔ اگر ایسا کوئی معاملہ نہ رہا ہوتا تو قسم کا سوال ہی نہ تھا۔

اَلْقَضَاءُ فِي شَهَادَةِ الصِّبْيَانِ

بچوں کی شہادت کے متعلق فیصلہ

☐ قَالَ يَحْيٰى قَالَ مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ الزُّبَيْرِ كَانَ يَقْضِي بِشَهَادَةِ الصِّبْيَانِ فِيمَا بَيْنَهُمْ مِنَ الْجِرَاحِ۔

﴿ہشامؒ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن زبیرؓ بچوں کی آپس کی مار پیٹ کا فیصلہ ان کی شہادت پر کرتے تھے۔﴾

وضاحت :

اگر بچوں کی لڑائی کا معاملہ بن جائے تو ظاہر ہے اس میں بچوں کی شہادت قبول کرنی پڑے گی، ورنہ قانون شہادت کی رو سے بچوں کی شہادت قابل قبول نہیں۔ یہ شہادت انہی کے آپس کے جھگڑے کو نمٹانے کے لیے قبول ہو گی نہ کہ بڑوں کے خلاف۔ امام مالک یہ شرط بھی لگاتے ہیں کہ جس جگہ بچوں کے درمیان جھگڑا ہوا وہاں سے ان کے نمٹنے سے پہلے پہلے ان کی گواہی معتبر ہو گی تاکہ بڑے اس کو سکھا پڑھا کر ان کا بیان تبدیل نہ کر چکے ہوں۔ لہٰذا اگر وہ جھگڑے کے مقام سے الگ ہو جائیں تو ان کی شہادت معتبر نہیں ہو گی۔ ہاں اگر موقع پر انہوں نے عادل لوگوں کو اپنی شہادت پر گواہ بنا لیا ہو تو بڑوں کی گواہی ضمناً قابل قبول ہو گی۔ یہ بجائے خود حجت نہ ہو گی بلکہ اس کے حق میں قرائن ہونے چاہئیں۔

مَاجَاءَ فِي الْحِنْثِ عَلٰى مِنْبَرِ النَّبِيِّ ﷺ

منبر رسولؐ پر جھوٹی قسم کھانے کے متعلق روایات

☐ قَالَ يَحْيٰى حَدَّثَنَا مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ اَبِي وَقَّاصٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ بُسْطَامٍ

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ حَلَفَ عَلٰی مِنْبَرِیْ اٰثِمًا تَبَوَّاَ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔

﴿جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص میرے اس منبر پر جھوٹی قسم کھائے گا تو وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنائے۔﴾

وضاحت :

اس روایت کی وضاحت اگلے باب میں آرہی ہے۔

☐ وَ حَدَّثَنِیْ مَالِكٌ عَنِ الْعَلَاءِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ مَعْبَدِ بْنِ كَعْبِ السَّلَمِیِّ عَنْ اَخِیْهِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ الْاَنْصَارِیِّ عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنِ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِئٍ مُسْلِمٍ بِیَمِیْنِهٖ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ وَ اَوْجَبَ لَهُ النَّارَ قَالُوْا وَ اِنْ كَانَ شَیْئًا یَسِیْرًا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَ اِنْ كَانَ قَضِیْبًا مِنْ اَرَاكٍ وَ اِنْ كَانَ قَضِیْبًا مِنْ اَرَاكٍ وَ اِنْ كَانَ قَضِیْبًا مِنْ اَرَاكٍ قَالَهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ۔

﴿ابوامامہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کسی مسلم کا اپنی قسم کے ذریعے سے حق مارا تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت کو حرام اور دوزخ کو واجب کر دے گا۔ لوگوں نے کہا حضور، اگر حقیر چیز ہو تب بھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جی اگر پیلو کی مسواک بھی ہو تب بھی۔ اگر پیلو کی مسواک بھی ہو تب بھی۔ اگر پیلو کی مسواک بھی ہو تب بھی۔ یہ بات آپ نے تین مرتبہ فرمائی۔﴾

وضاحت :

اس روایت کے متعلق ہمارے علماء حضرات نے یہ اعتراف کیا ہے۔ سو اس سوال کی طرف نکل گئے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ معمولی سی مسواک کے باعث اللہ تعالیٰ بندے کے اوپر دوزخ واجب کر دے اور جنت سے اس کو محروم کر دے۔ انہوں نے اس معارضے کا جواب دینے کی کوشش میں بحث کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

میرے نزدیک یہ بات بالکل صحیح ہے۔ اس میں اصلی مسئلہ یہ نہیں ہے کہ حدیث میں چھوٹی سی چیز

سے عذاب کی اطلاع دی گئی ہے بلکہ سارا زور قسم پر ہے، جو بعض حالات میں جب شاہد اور قرائن اور دوسرے دلائل موجود نہ ہوں، عدل کا واحد ذریعہ ہوتی ہے۔ اللہ کی قسم کو کسی مسلمان کا حق مارنے کا ذریعہ بنانا بہت بڑا گناہ ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مچھر مارنے کے لیے توپ داغ دے۔ جب قسم اتنی بڑی اہمیت کی چیز ہو کہ معاملات میں فیصلہ کا واحد ذریعہ قرار پائے تو اس کو معمولی چیزوں کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ ایک چھوٹی سی چیز، خواہ وہ مسواک ہی ہو، کو ہڑپ کرنے کے لیے اگر کسی مسلمان نے خدا کی قسم کو ذریعہ بنایا تو اس سے بڑھ کر اس کی محرومی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اتنے بڑے گناہ کی سزا جنت سے محرومی اور دوزخ کا واجب ہونا ہی صحیح ہے۔

جَامِعُ مَا جَاءَ فِی الْیَمِیْنِ عَلَی الْمِنْبَرِ

منبر پر قسم کے بارے میں جامع باب

☐ قَالَ یَحْیٰی قَالَ مَالِكٌ عَنْ دَاوُدَ ابْنِ الْحُصَیْنِ اَنَّهٗ سَمِعَ اَبَا غَطَفَانَ بْنَ طَرِیْفٍ الْمُرِّیَ یَقُوْلُ اخْتَصَمَ زَیْدُ بْنُ ثَابِتٍ الْاَنْصَارِیُّ وَ ابْنُ مُطِیْعٍ فِیْ دَارٍ كَانَتْ بَیْنَهُمَا اِلٰی مَرْوَانَ بْنِ الْحَكَمِ وَهُوَ اَمِیْرٌ عَلَی الْمَدِیْنَةِ فَقَضٰی مَرْوَانُ عَلٰی زَیْدِ بْنِ ثَابِتٍ بِالْیَمِیْنِ عَلَی الْمِنْبَرِ فَقَالَ زَیْدُ بْنُ ثَابِتٍ اَحْلِفُ لَهٗ مَكَانِیْ قَالَ فَقَالَ مَرْوَانُ لَا وَاللّٰهِ اِلَّا عِنْدَ مَقَاطِعِ الْحُقُوْقِ قَالَ فَجَعَلَ زَیْدُ بْنُ ثَابِتٍ یَحْلِفُ اَنَّ حَقَّهٗ لَحَقٌّ وَ یَاْبٰی اَنْ یَحْلِفَ عَلَی الْمِنْبَرِ قَالَ فَجَعَلَ مَرْوَانُ بْنُ الْحَكَمِ یَعْجَبُ مِنْ ذٰلِكَ قَالَ مَالِكٌ لَا اَرٰی اَنْ یُحْلَفَ اَحَدٌ عَلَی الْمِنْبَرِ عَلٰی اَقَلَّ مِنْ رُبْعِ دِیْنَارٍ وَذٰلِكَ ثَلَاثَةُ دَرَاهِمَ۔

﴿داؤد بن حصین سے روایت ہے کہ انہوں نے غطفان بن طریف المری سے سنا۔ وہ کہتے تھے کہ زید بن ثابت انصاریؓ اور ابن مطیع کے درمیان ایک مکان کے بارے میں، جس میں دونوں حصہ دار تھے، جھگڑا ہو گیا اور وہ مقدمہ مروان بن الحکم، جو مدینے کا امیر تھا، کے پاس لے گئے۔ مروان بن الحکم نے فیصلہ کیا کہ زید بن ثابت منبر پر قسم کھائیں۔ زید بن ثابت نے کہا کہ میں اپنی جگہ پر ہی قسم کھا لیتا ہوں۔ مروان بن حکم نے کہا نہیں۔ اللہ کی قسم آپ کو اس جگہ پر قسم کھانی پڑے گی جو حقوق کے فیصلوں کا

مقام ہے- زید بن ثابت قسم کھانے لگے کہ حق میرا ہے اور میں قسم کھا رہا ہوں لیکن منبر پر قسم کھانے سے انکار کیا- مروان کو اس پر بڑا تعجب ہوا- امام مالکؒ کہتے ہیں کہ میرا یہ خیال ہے کہ منبر پر ربع دینار سے کم قیمت کی چیز کے بارے میں قسم نہیں لی جا سکتی- اور یہ تین درہم ہوتے ہیں-﴾

وضاحت :

حلف اٹھوانے کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے اور یہ عدالت کے پاس ان صورتوں میں فیصلہ کا ایک ذریعہ ہے جب گواہ اور ثبوت موجود نہ ہوں- منبر پر قسم لینا قسم کو مغلظ کرنے کے لیے تھا اور مروان نے اسی لیے حضرت زید بن ثابتؓ سے اس کا تقاضا کیا اور دو بار اس کا انکار کرتے رہے- اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو قسم کھانا ہی بڑا امر خطر ہے- پھر قسم جب منبر نبوی پر کھائی جائے تو یہ چوکھٹہ ہو جائے گی- اس لیے اس روایت میں جو پیچھے گزری نبی ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص منبر پر جھوٹی قسم کھائے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے- قسم کو مغلظ کرنے کا قرآن مجید میں کوئی ذکر نہیں-

امام مالک کہتے ہیں کہ ربع دینار یا تین درہم سے کم قیمت کی چیز کے بارے میں منبر پر قسم نہیں لی جا سکتی- بعض فقہاء نے قیمت اس سے بڑھا دی ہے- احناف کہتے ہیں کہ عدالت کو یہ حق ہی نہیں کہ قسم اٹھوانے کے لیے کسی کو منبر پر لے جائے- شریعت میں صرف قسم ہے، اس کا مغلظ کرنے کا حکم نہیں- یہ بعد کی بدعت ہے- ایمان جتنا کم ہوتا گیا قسم کو اتنا ہی زیادہ مغلظ کرنا شروع کر دیا گیا- صدر اول میں جب دینی غیرت اور ایمان تھا لوگ سادہ قسم بھی اٹھانے کو تیار نہیں ہوتے تھے- عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق یہ روایت گزر چکی ہے کہ انہوں نے فروخت کیا ہوا غلام واپس لے لیا مگر قسم کھانے پر آمادہ نہ ہوئے-

قسم کھانا بہر حال اچھی بات نہیں ہے- اس ایک مجبوری ہے اور جائز ہے لیکن اس کو وہ آنکھ کر نا بدعت ہے- لہذا قرآن اٹھوا کر قسم لینا اور مسجد میں جا کر قسم لینا سب جہالت ہے- میرے نزدیک احناف کی یہ بات بہت معقول ہے کہ تغلیظ یمین جائز نہیں-

مَالَا يَجُوْزُ مِنْ غَلَقِ الرَّهْنِ

رہن کے ضبط کا جواز نہ ہونے کے بارے میں

☐ قَالَ يَحْيٰى حَدَّثَنَا مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ

ﷺ قَالَ لَا يَغْلَقُ الرَّهْنُ قَالَ مَالِكٌ وَ تَفْسِيْرُ ذٰلِكَ فِيْمَا نُرٰى وَاللّٰهُ اَعْلَمُ اَنْ يَرْهَنَ الرَّجُلُ الرَّهْنَ عِنْدَ الرَّجُلِ بِالشَّيْءِ وَ فِي الرَّهْنِ فَضْلٌ عَمَّا رُهِنَ فِيْهِ فَيَقُوْلُ الرَّاهِنُ لِلْمُرْتَهِنِ اِنْ جِئْتُكَ بِحَقِّكَ اِلٰى اَجَلٍ يُسَمِّيْهِ لَهُ وَاِلَّا فَالرَّهْنُ لَكَ بِمَا رَهَنْتَ فِيْهِ. قَالَ فَهٰذَا لَا يَصْلُحُ وَلَا يَحِلُّ وَ هٰذَا الَّذِيْ نُهِيَ عَنْهُ وَ اِنْ جَاءَ صَاحِبُهُ بِالَّذِيْ رَهَنَ بِهِ بَعْدَ الْاَجَلِ فَهُوَ لَهُ وَ اُرٰى هٰذَا الشَّرْطَ مُنْفَسِخًا-

﴿سعید بن مسیب راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رہن ضبط نہیں کیا جائے گا-

امام مالک کہتے ہیں کہ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک آدمی کسی کے پاس کوئی چیز رہن رکھے اور رہن اس رقم سے زیادہ کا ہو جو رہن کے بدلے میں دی گئی ہے، پھر راہن اس شخص سے جس کے پاس رہن رکھ رہا ہے یہ کہے کہ اگر میں مقررہ مدت تک تمہارا حق ادا کروں تو یہ چیز میری ہے ورنہ یہ رہن آپ کا ہو گا- امام مالک کہتے ہیں کہ یہ معاملہ جائز نہیں اور حلال نہیں- اس سے منع کیا گیا ہے- اگر قرض لینے والا قرض کی رقم جس کے بدلے میں رہن رکھا گیا ہے مدت گزرنے کے بعد بھی واپس کرے تو رہن واپس لینا اسی کا حق ہے- میرے نزدیک مذکورہ شرط فسخ متصور ہو گی-﴾

وضاحت :

زمانہ جاہلیت میں یہ بات تھی کہ مدت مقررہ کے بعد اگر راہن رقم ادا کرتا تو مرتہن کو حق ہوتا تھا کہ چاہے رہن شدہ چیز ضبط کرے یا زیادہ رقم کا مطالبہ کرے اور یہی سود تھا- یہ بات اسلام نے ختم کر دی- پس نہ ہی رہن ضبط ہو سکتا ہے اور نہ ہی مدت مقررہ کی شرط لگانا درست ہے-

رہن رکھنا صرف مجبوری کی صورت میں جائز ہے- اگر قرض دینے والا رہن رکھتا ہے تو وہ شرافت کے خلاف کام کرتا ہے- رہن کو ہڑپ کرنے کے لیے کوئی تدبیر نہیں کرنی چاہیے- ورنہ یہ رویہ بالکل یہودیت ہے- قرآن مجید میں ہے کہ رہن کی صورت وہاں اختیار کی جائے جہاں قرض لکھنے کے لیے کاتب میسر نہ ہو- جہاں قرض کی تحریر کا موقع ہو وہاں رہن مقبوضہ کی اجازت نہیں- یہ تو صرف سفر کی مجبوریوں کی بنا پر جائز ہے- جیسے ہی مجبوریاں

ختم ہو جائیں رہن شدہ چیز لوٹا دی جائے۔ رہن ایک عارضی چیز ہے۔ اس سے کسی کو فائدہ اٹھانے کا حق نہیں۔

اَلْقَضَاءُ فِي الْمُسْتَكْرَهَةِ مِنَ النِّسَاءِ

اس عورت کے بارے میں فیصلہ جس کے ساتھ بالجبر برائی کی گئی ہو

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ أَنَّ عَبْدَ الْمَلِكِ بْنَ مَرْوَانَ قَضَى فِي امْرَأَةٍ أُصِيبَتْ مُسْتَكْرَهَةً بِصَدَاقِهَا عَلَى مَنْ فَعَلَ ذَلِكَ بِهَا قَالَ يَحْيَى سَمِعْتُ مَالِكًا يَقُولُ الْأَمْرُ عِنْدَنَا فِي الرَّجُلِ يَغْتَصِبُ الْمَرْأَةَ بِكْرًا كَانَتْ أَوْ ثَيِّبًا أَنَّهَا إِنْ كَانَتْ حُرَّةً فَعَلَيْهِ صَدَاقُ مِثْلِهَا وَ إِنْ كَانَتْ أَمَةً فَعَلَيْهِ مَا نَقَصَ مِنْ ثَمَنِهَا وَالْعُقُوبَةُ فِي ذَلِكَ عَلَى الْمُغْتَصِبِ رَكَّا عُقُوبَةً عَلَى الْمُغْتَصِبَةِ فِي ذَلِكَ كُلِّهِ وَ إِنْ كَانَ الْمُغْتَصِبُ عَبْدًا فَذَلِكَ عَلَى سَيِّدِهِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ أَنْ يُسَلِّمَهُ۔

﴿ابن شہاب سے روایت ہے کہ عبدالملک بن مروان نے ایک عورت کے بارے میں، جس کو مجبور کر کے اس کے ساتھ برائی کی گئی تھی، یہ فیصلہ کیا کہ جو شخص ملوث ہے وہ اس کا مہر ادا کرے۔ امام مالک کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک ہر اس شخص کے لیے جو ناجائز طور پر کسی عورت سے زیادتی کرے، خواہ وہ کنواری ہو یا شادی شدہ، فتویٰ یہ ہے کہ اگر عورت آزاد ہے تو زیادتی کرنے والے پر اس کا مہر مثل ہوگا اور اگر لونڈی ہے تو جتنی اس کی قیمت اس حادثے کی وجہ سے کم ہوئی اتنی قیمت دلوائی جائے گی۔ زیادتی کرنے کی سزا شرارت کرنے والے کو دی جائے گی، عورت کو نہیں۔ اور اگر زیادتی کرنے والا غلام ہو تو اس کی ذمہ داری اس کے مالک پر ہوگی الا یہ کہ وہ غلام کو حوالے کر دے۔﴾

وضاحت :

لونڈی اور غلاموں کا مسئلہ تو آج کل ختم ہو چکا لہٰذا اس حوالہ سے روایت پر بحث کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہاں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حقوق العباد کے سلسلے کی سزائیں کیا ایک وقت دی جا سکتی ہیں یا نہیں۔ یعنی ایک

سزا تو زیادتی کرنے والے کے زنا کے جرم کی ہوگی اور دوسری یہ کہ عورت کے نقصان کی تلافی کے لیے اس کو مال دینا ہوگا۔ یہ دونوں ایک ساتھ جاری ہو سکتی ہیں یا نہیں؟ موجودہ قانون میں سزائیں جمع کی جاتی ہیں۔ مثلاً اتنا جرمانہ اور اتنی قید یا کوڑے۔ اگر جرمانہ ادا نہ کرے تو مزید قید۔ لیکن بعض صورتوں میں یہ بھی ہے کہ دونوں سزائیں ایک ساتھ جاری نہیں ہوں گی۔ میرے نزدیک دونوں سزائیں بیک وقت دی جا سکتی ہیں۔

اَلْقَضَاءُ فِيمَنِ ارْتَدَّ عَنِ الْإِسْلَامِ

اسلام سے مرتد کے متعلق فیصلہ

☐ حَدَّثَنَا يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ غَيَّرَ دِينَهُ فَاضْرِبُوا عُنُقَهُ وَ مَعْنَى قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ فِيمَا نُرَى وَاللّٰهُ أَعْلَمُ مَنْ غَيَّرَ دِينَهُ فَاضْرِبُوا عُنُقَهُ أَنَّهُ مَنْ خَرَجَ مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَى غَيْرِهِ مِثْلُ الزَّنَادِقَةِ وَ أَشْبَاهِهِمْ فَإِنَّ أُولَئِكَ إِذَا ظُهِرَ عَلَيْهِمْ قُتِلُوا وَلَمْ يُسْتَتَابُوا لِأَنَّهُ لَا تُعْرَفُ تَوْبَتُهُمْ وَ أَنَّهُمْ كَانُوا يُسِرُّونَ الْكُفْرَ وَ يُعْلِنُونَ الْإِسْلَامَ فَلَا أَرَى أَنْ يُسْتَتَابَ هَؤُلَاءِ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهُمْ قَوْلُهُمْ وَ أَمَّا مَنْ خَرَجَ مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَى غَيْرِهِ وَ أَظْهَرَ ذَلِكَ فَإِنَّهُ يُسْتَتَابُ فَإِنْ تَابَ وَ إِلَّا قُتِلَ لَوْ أَنَّ قَوْمًا كَانُوا عَلَى ذَلِكَ رَأَيْتُ أَنْ يُدْعَوْا إِلَى الْإِسْلَامِ وَ يُسْتَتَابُوا فَإِنْ تَابُوا قُبِلَ ذَلِكَ مِنْهُمْ وَ إِنْ لَمْ يَتُوبُوا قُتِلُوا وَلَمْ يُعْفَ بِذَلِكَ فِيمَا نُرَى وَاللّٰهُ أَعْلَمُ مَنْ خَرَجَ مِنَ الْيَهُودِيَّةِ إِلَى النَّصْرَانِيَّةِ وَلَا مِنَ النَّصْرَانِيَّةِ إِلَى الْيَهُودِيَّةِ وَلَا مَنْ يَعْبُرُ دِينَهُ مِنْ أَهْلِ الْأَدْيَانِ كُلِّهَا إِلَّا الْإِسْلَامَ فَمَنْ خَرَجَ مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَى غَيْرِهِ وَ أَظْهَرَ ذَلِكَ فَذَلِكَ الَّذِي عَنَى بِهِ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ۔

﴿زید بن اسلمؒ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنا دین تبدیل کرے اس کی گردن اڑا دو۔ امام مالک کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کے قول کا مطلب، جہاں تک میرا خیال ہے اور اللہ بہتر جانتا ہے، یہ ہے کہ جو شخص اسلام سے نکل کر کسی غیر دین کو اختیار کرے، جیسے زندیق یا ان کے بھائی بند، تو جب ان پر قابو پایا جائے تو ان کو قتل کر دیا جائے، ان سے توبہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ اس کی

وجہ یہ ہے کہ ان کی توبہ کا کچھ معلوم نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ کفر کو چھپاتے اور اسلام کا اعلان کرتے رہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ان لوگوں سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے نہ ان کے قول کو قبول کیا جائے۔ رہے وہ لوگ جو اسلام سے نکل کر کسی دوسرے دین کی طرف چلے جاتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں تو ان سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا۔ اگر توبہ کر لیں تو فبہا ورنہ قتل کر دیے جائیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی قوم اس طرح کی ہو گی تو میری رائے میں اس کو اسلام کی طرف بلایا جائے گا اور توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا۔ اگر توبہ کر لیں تو وہ قبول کر لی جائے گی اور اگر توبہ نہ کریں تو قتل کر دیے جائیں گے۔ اس سے وہ لوگ مراد نہیں جو اپنا دین کسی اور دین سے بدل لیں، مثلاً یہودیت سے نصرانیت یا نصرانیت سے یہودیت۔ دوسرے ادیان کو بدلنے والے بھی مراد نہیں۔ مراد صرف وہ لوگ ہیں جو اسلام سے نکل کر کسی دوسرے دین میں چلے جائیں اور یہ تبدیلی ظاہر ہو۔ واللہ اعلم۔

وضاحت :

امام مالکؒ نے یہاں مرتد سے وہ لوگ مراد نہیں لیے جو سیدھے سادے طریقے سے کسی کے چکر میں پھنس کر کفر میں مبتلا ہوئے ہوں اور اسلام سے ہٹ گئے ہوں جیسے زنادقہ، ملاحدہ اور شریر لوگ مراد لیے ہیں جو اسلام میں سرنگ لگاتے ہیں، اسلام کا انکار تو نہیں کرتے لیکن ایسے فلسفے چھانٹتے ہیں جو اسلام کی شدید ترین نفی کر دیتے ہیں۔ امام صاحب کا فتویٰ یہ ہے کہ ان پر قابو پانے کے بعد ان کو قتل کر دیا جائے گا اور ان سے توبہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا کیونکہ ایسے لوگوں کی توبہ کا کوئی اعتبار نہیں۔

ارتداد کی ایک شکل بنی اسماعیل کے ارتداد کی تھی۔ مشرکین عرب یا دوسرے الفاظ میں بنی اسماعیل کے متعلق شریعت کا جو مسلمہ قانون قرآن مجید میں بیان ہوا ہے یہ ہے کہ اتمام حجت کے بعد ان کے لیے دو ہی راستے تھے۔ ایمان لائیں یا پھر تلوار ان کا فیصلہ کرے۔ وہ ذمی یا غلام نہیں بنائے جا سکتے تھے۔ کیونکہ ان پر اللہ کی طرف سے براہ راست حجت تمام کر دی گئی تھی۔ وہ اگر اسلام لا کر پھر کفر کی طرف آتے تو ان کی سزا بھی قتل تھی۔ ان کے ارتداد کی صورت میں ان سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا جس کے لیے تین دن یا اس سے زیادہ کی مہلت بھی دی جا سکتی ہے۔ مہلت کی مدت امیر کی صوابدید پر ہے۔ مہلت کی مدت گزر جانے کے بعد اسلام کی طرف نہ آنے کی

صورت میں ان کے قتل کا حکم تھا۔ زنادقہ و ملاحدہ اگر انفرادی یا اجتماعی صورت میں امن و امان کا مسئلہ پیدا کریں تو ان کے خلاف فوجی کارروائی ہو سکتی ہے، جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں اہل ردہ کے ساتھ ہوا۔ حضرت علیؓ نے خوارج کے معاملے میں بھی یہ کہا تھا کہ میں ان سے تعرض اس وقت تک نہ کروں گا جب تک یہ لوگ کوئی فساد نہ برپا کریں۔ اگر یہ بغاوت یا ہنگامہ کریں گے تو ان کے خلاف جنگ کروں گا۔ یہی پالیسی ہر اسلامی ریاست اپنائے گی۔

اس دور میں حالات بالکل تبدیل ہو گئے ہیں۔ اب آپ کی یونیورسٹیوں میں مارکس، فرائڈ اور برگسان کے مرید پیدا ہو رہے ہیں۔ اخبار اٹھا کر دیکھ لیجیے کہ اب آپ کی تہذیب، تمدن، کلچر، ثقافت پر ملاحدہ اور فلسفی اوتار اور اوتار نیاں مار رہی ہیں۔ اور آپ کے جو فرمانروا ہیں وہ ان کی جوتیاں سیدھی کرتے ہیں۔ بڑے بڑے لوگ جو مذہب کی منادی کرنے والے تھے اب وہ ان ملاحدہ کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور ہاتھ جوڑ کر کہتے ہیں کہ نجات دہندہ یہی ہیں۔ وہ دن گئے جب یہ نشہ تھا کہ ہم اسلام قائم کریں گے۔ یہ زمانہ بڑے لٹنا کا ہے۔ ایک صحیح اسلامی مملکت کے لیے تو ضروری ہے کہ وہ زنادقہ و مرتدین کو قتل کرے لیکن آج یہ مسئلہ بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ آپ ایسے لوگوں کی گردن اڑا سکیں۔ ایسا کرنے سے پہلے ان کا ہاتھ آپ کی گردن پر ہو گا۔

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَبْدٍ الْقَارِيِّ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّهٗ قَالَ قَدِمَ عَلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَجُلٌ مِنْ قِبَلِ اَبِي مُوسَى الْاَشْعَرِيِّ فَسَاَلَهٗ عَنِ النَّاسِ فَاَخْبَرَهٗ ثُمَّ قَالَ لَهٗ عُمَرُ هَلْ كَانَ فِيْكُمْ مِنْ مُغَرِّبَةِ خَبَرٍ فَقَالَ نَعَمْ رَجُلٌ كَفَرَ بَعْدَ اِسْلَامِهٖ قَالَ فَمَا فَعَلْتُمْ بِهٖ قَالَ قَرَّبْنَاهُ فَضَرَبْنَا عُنُقَهٗ فَقَالَ عُمَرُ اَفَلَا حَبَسْتُمُوْهُ ثَلَاثًا وَ اَطْعَمْتُمُوْهُ كُلَّ يَوْمٍ رَغِيْفًا وَاسْتَتَبْتُمُوْهُ لَعَلَّهٗ يَتُوْبُ وَ يُرَاجِعُ اَمْرَ اللّٰهِ ثُمَّ قَالَ عُمَرُ اَللّٰهُمَّ اِنِّي لَمْ اَحْضُرْ وَلَمْ اَاْمُرْ وَلَمْ اَرْضَ اِذْ بَلَغَنِي۔

﴿ عبدالقاری اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص حضرت ابو موسیٰ اشعری کے پاس سے حضرت عمر بن خطابؓ کے پاس آیا۔ انہوں نے لوگوں کا حال پوچھا تو اس نے بتایا۔ پھر حضرت عمرؓ نے پوچھا کوئی اہم خبر بھی ہے۔ اس نے کہا ہاں ایک شخص نے اسلام لانے کے بعد کفر کیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا تو آپ لوگوں نے اس کے ساتھ کیا کیا۔ اس شخص نے کہا کہ ہم نے اس کو پکڑا اور گردن مار

دی- حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ لوگوں نے اس کو تین دن کے لیے گرفتار کر لیا ہوتا- اس کو ہر روز ایک چپاتی کھانے کو دیتے اور اس سے توبہ کا مطالبہ کرتے- شاید وہ توبہ کرتا اور اللہ کے امر کی طرف لوٹتا- پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا اے اللہ! نہ میں موقع پر موجود تھا نہ میں نے حکم دیا اور نہ میں اس وقت اس پر راضی ہوا جب مجھے اطلاع ملی-﴾

وضاحت :

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ کا مطالبہ ضروری ہے اور اس کے لیے کم از کم تین دن کی مہلت ہونی چاہیے- امیر کی صوابدید پر زیادہ دن کی مہلت بھی دی جا سکتی ہے- امام مالک نے پچھلی روایت میں توبہ کی گنجائش بھی نہیں رکھی اور اس کی وجہ بیان کر دی ہے- دراصل ارتداد کی نوعیتیں مختلف ہیں اور ہر ایک شخص کا معاملہ مختلف ہوتا ہے- امیر معاملے کی نوعیت اور اشخاص کے خاص حالات کو ملحوظ رکھ کر فیصلہ کرے گا-

اَلْقَضَاءُ فِی مَنْ وَجَدَ مَعَ امْرَاَتِهٖ رَجُلًا

اس شخص کے بارے میں جو اپنی بیوی کو دوسرے آدمی کے ساتھ دیکھ لے

☐ حَدَّثَنَا یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ سُهَیْلِ بْنِ اَبِیْ صَالِحِ السَّمَّانِ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ سَعْدَ بْنَ عُبَادَةَ قَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَرَاَیْتَ اِنْ وَجَدْتُ مَعَ امْرَاَتِیْ رَجُلًا اُمْهِلُهٗ حَتّٰی اٰتِیَ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نَعَمْ

﴿ابو صالح السمان حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ سعد بن عبادہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ حضور، اگر میں اپنی بیوی کے ساتھ کسی اور مرد کو دیکھ لوں تو کیا میں اس سے اس وقت تک تعرض نہیں کر سکتا جب تک کہ میں چار گواہ نہ لاؤں- آپ نے فرمایا جی ہاں-﴾

☐ حَدَّثَنِیْ مَالِكٌ عَنْ یَحْیٰی بْنِ سَعِیْدٍ عَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیَّبِ اَنَّ رَجُلًا مِنْ اَهْلِ الشَّامِ یُقَالُ لَهٗ ابْنُ خَیْبَرِیٍّ وَجَدَ مَعَ امْرَاَتِهٖ رَجُلًا فَقَتَلَهٗ اَوْ قَتَلَهُمَا مَعًا فَاشْكَلَ عَلٰی مُعَاوِیَةَ بْنِ اَبِیْ

سُفْیَانَ الْقَضَاءُ فِیْهِ فَكَتَبَ اِلٰی اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ یَسْاَلُ لَهٗ عَلِیَّ بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ عَنْ ذٰلِكَ فَسَاَلَ اَبُوْ مُوْسٰی عَنْ ذٰلِكَ عَلِیَّ بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ فَقَالَ لَهٗ عَلِیٌّ اِنْ هٰذَا الشَّیْءَ مَا هُوَ بِاَرْضٍ عَرَضْتَ عَلَیْكَ لِتُخْبِرَنِّیْ فَقَالَ لَهٗ اَبُوْمُوْسٰی كَتَبَ اِلَیَّ مُعَاوِیَةُ بْنُ اَبِیْ سُفْیَانَ اَنْ اَسْاَلَكَ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ عَلِیٌّ اَنَا اَبُوْ حَسَنٍ اِنْ لَّمْ یَاْتِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَلْیَمْضِ بِرُمَّتِهٖ-

﴿سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ اہل شام میں سے ایک شخص نے، جس کا نام ابن خیبری تھا، اپنی بیوی کے ساتھ ایک دوسرے آدمی کو پایا تو اس نے مرد کو یا ان دونوں کو قتل کر دیا- حضرت معاویہؓ کے لیے اس مقدمہ کا فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تو انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو لکھا کہ وہ اس بارے میں ان کے لیے حضرت علیؓ ابن ابی طالب سے پوچھیں- انہوں نے حضرت علیؓ سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ ہمارے علاقے کا واقعہ نہیں اور میں تاکید سے مطالبہ کرتا ہوں کہ مجھے بتائیں کہ یہ کہاں کا واقعہ ہے- اس پر حضرت ابو موسیٰ اشعری نے بتایا کہ حضرت معاویہؓ نے مجھے لکھا ہے کہ میں اس کے متعلق آپ سے پوچھوں- حضرت علیؓ نے کہا کہ میرا لقب ابو حسن ہے- جب تک وہ چار گواہ نہ لائے، قاتل کو مقتول کے ورثا کے سپرد کر دیا جائے-﴾

وضاحت :

"فلیمض برمته" کے شاہ ولی اللہ نے دو معنی بیان کیے ہیں- ایک یہ کہ "قاتل کی رسی مقتول کے ورثا کو پکڑا دی جائے، وہ قاتل کے ساتھ جو چاہیں کریں"- دوسرے یہ کہ "مقتول کی دیت دی جائے" دونوں میں زیادہ فرق نہیں ہے- دیت میں بھی یہ امکان ہوتا ہے کہ ورثا دیت قبول نہ کریں اور قاتل کو قصاص میں قتل کر دیں-

یہ معاملہ بڑا نازک ہے- اگر شوہر کو یہ اجازت دے دی جائے کہ وہ حالت غیر میں دیکھتے ہی عورت یا مرد کو گردن زدنی قرار دے تو بڑے فساد ہو سکتے ہیں- میرے نزدیک یہ قانون کا معاملہ ہے جسے عدالت میں ثابت کرنا ہوگا- اگر مقدمہ ثابت ہو جائے تو قاتل کے ساتھ یہ رعایت کی جا سکتی ہے کہ اس سے دیت لے لی جائے اور قصاص میں اس کو قتل نہ کیا جائے- شاہ ولی اللہ صاحب یہ مطلب لیتے ہیں کہ مقتول کے ورثا کو دیت کے لوٹ دے دیے جائیں

لیکن مجھے اس تعبیر پر اطمینان نہیں۔

رہا یہ مسئلہ کہ چار گواہ ایسے ہوں جو یہ گواہی دیں کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے عورت اور مرد کو قابل اعتراض حالت میں دیکھا ہے تو یہ تعلیق بالمحال ہے۔ کسی بھی ملک اور معاشرہ میں یہ بات ممکن نہیں کہ اس طرح کے چار کیا ایک یا دو گواہ بھی مل جائیں۔ گواہ کے متعلق اب تک یہ بات میری تحقیق میں نہیں آئی کہ وہ زنا کے متعلق کس طرح کی گواہی دیں۔ میرے نزدیک قرینہ خود بھی گواہ ہے۔ پھر ڈاکٹر کی رپورٹ اور پولیس کا قابل اعتراض حالت میں پکڑنا یہ سب مل کر چار گواہوں سکتے ہیں۔ سورہ یوسف میں قرینہ کے گواہ ہونے کی مثال موجود ہے۔ وَ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (یوسف : ۲۷) اگر اس کی قمیض پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو یہ عورت جھوٹی ہے اور یوسف سچا ہے۔ قرینہ ایک ایسا گواہ ہوتا ہے جو جھوٹ نہیں بولتا جبکہ گواہ جھوٹ بول سکتا ہے۔ شہادت کے سچ ہونے کے لیے فطری شرائط یہ ہیں کہ گواہ صادق اور امین ہو، اس پر حد نہ جاری ہوئی ہو، وہ اچھے کردار کا ہو اور واقعہ کا عینی شاہد ہو۔ ایک ہی واقعہ کے شاہد مختلف پہلو سے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً کوئی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ میں نے اس شخص کو فلاں کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا۔ کوئی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ہم نے اس کمرے کو کھولا تو ہم نے ان کو قابل اعتراض حالت میں پایا۔ کوئی اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اس آدمی کی اس عورت کے ہاں آمد و رفت رہی ہے۔ یہ سب قرائن مل کر مقدمہ تیار ہوتا ہے۔ قرائن کی شہادت جدید قانون میں بھی تسلیم کی گئی ہے۔

بعض روایتوں میں اربعہ شہداء کے ساتھ المرودة فی المکحلہ کے الفاظ آئے ہیں جن کا تقاضا یہ ہے کہ مرد اور عورت کو عین زنا کار حالت میں دیکھا گیا ہو۔ آیا یہ الفاظ آنحضرت ﷺ کے ہیں یا بعد کے، یہ بات تحقیق طلب ہے۔ موطا حدیث کی قدیم ترین کتاب ہے۔ اس میں صرف اربعہ شہداء کے الفاظ ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی قید نہیں لگائی گئی۔ ایک تو اربعہ شہداء کی قید ہی تعلیق بالمحال ہے، اوپر سے المرودة فی المکحلہ کی مزید شرط جرم کو بالکل ہی ناقابل گرفت بنا سکتی ہے۔

رہی یہ بات کہ اگر اس طریقہ سے جرم کے چار گواہ نہ ملیں تو کیا صورت ہوگی۔ میرے نزدیک ایسی شکل میں شوہر کے سامنے لعان کا اختیار موجود ہے۔ وہ اس اختیار کو استعمال کر کے اپنی بے وفا بیوی سے جان چھڑا سکتا ہے۔ لعان کی صورت اسی طرح کے معاملات کے لیے شریعت نے تجویز کی ہے اور یہ بات بالکل قطعی ہے کہ لعان

کے بعد میاں بیوی میں جدائی کرا دی جائے گی۔

اَلْقَضَاءُ فِی الْمَنْبُوْذِ

پھینکے ہوئے بچے کے متعلق فیصلہ

"منبوذ" پھینکے ہوئے بچے کو کہتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی عورت فتنے میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس میں بچے کی ذمہ داریاں اٹھانے کا حوصلہ ہوتا اور نہ ہی بدنامی کا مقابلہ کرنے کا، تو وہ بچے کو کسی جگہ پھینک دیتی ہے۔ بعض اوقات والدین اپنی جائز اولاد کو بھی غربت، فلاکت یا دماغی کمزوری کی وجہ سے پھینک دیتے ہیں۔ ایسے بچے کے بارے میں فیصلہ کیا ہوگا، یہ اس باب میں بیان ہوا ہے۔

قَالَ يَحْيٰى قَالَ مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سِنَانٍ اَبِیْ جَمِيْلَةَ رَجُلٌ مِنْ بَنِیْ سُلَيْمٍ اَنَّهٗ وَجَدَ مَنْبُوْذًا فِیْ زَمَانِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ فَجِئْتُ بِهٖ اِلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَالَ مَا حَمَلَكَ عَلٰى اَخْذِ هٰذِهِ النَّسَمَةِ فَقَالَ وَجَدْتُّهَا ضَائِعَةً فَاَخَذْتُّهَا فَقَالَ لَهٗ عَرِيْفُهٗ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِنَّهٗ رَجُلٌ صَالِحٌ فَقَالَ لَهٗ عُمَرُ اَكَذٰلِكَ قَالَ نَعَمْ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اِذْهَبْ فَهُوَ حُرٌّ وَلَكَ وَلَاؤُهٗ وَ عَلَيْنَا نَفَقَتُهٗ قَالَ يَحْيٰى سَمِعْتُ مَالِكًا يَقُوْلُ الْاَمْرُ عِنْدَنَا فِی الْمَنْبُوْذِ اَنَّهٗ حُرٌّ وَ اَنَّ وَلَاءَهٗ لِلْمُسْلِمِيْنَ هُمْ يَرِثُوْنَهٗ وَ يَعْقِلُوْنَ عَنْهُ۔

ابن شہاب سنان ابی جمیلہ قبیلہ بنی سلیم کے آدمی سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک گرا پڑا بچہ پایا۔ اس کا بیان ہے کہ میں اس کو لے کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے پوچھا کہ اس جان کو کیوں اٹھائے پھر رہے ہو۔ اس شخص نے جواب دیا کہ میں نے گمان کیا کہ یہ جان ضائع ہو جائے گی تو اٹھا لیا۔ حضرت عمرؓ کے سیکرٹری نے کہا کہ امیر المومنین، یہ آدمی نیک ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا واقعی ایسا ہے؟ اس نے کہا جی ہاں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا جاؤ یہ آزاد ہے۔ اس کا ولاء تم کو حاصل ہوگا۔ اور اس کا خرچ ہم دیں گے۔

یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک کو یہ کہتے سنا کہ پھینکے ہوئے بچے کے بارے میں ہمارا فتویٰ

یہ ہے کہ وہ آزاد ہے۔اس کا ولاء مسلمانوں کے لیے ہے۔وہی اس کے وارث ہوں گے اور وہی اس کی دیت بھی دیں گے۔﴾

وضاحت :

"ولاء" عرب کے معاشرتی اور سماجی نظام کا بڑا اہم حصہ تھا۔ عرب کی زندگی قبائلی تھی۔اس میں کوئی شخص کسی قبیلہ کے ساتھ تعلق کے بغیر نہیں کھپ سکتا تھا۔اگر باہر کے کچھ لوگوں کو قبیلہ کے ساتھ وابستہ کرنا ہوتا تو اس کی صورت ولاء کی تھی۔جن لوگوں کا نسب معلوم نہ ہوتا یا جو غلام آزاد ہوتے وہ ولاء کے رشتہ سے قبیلہ کا فرد بن جاتے۔وہ جب مرتے تو ان کے مال کا وارث وہی قبیلہ بنتا۔اگر ان سے کوئی جرم سرزد ہوتا تو جو ان یا دیت بھی قبیلہ کے ذمہ ہوتی۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھینکے ہوئے بچے کا مسئلہ بھی اسی قاعدے سے حل کیا کہ اس کی پرورش کی ذمہ داری اٹھانے والے کو اس کا ولاء دے دیا لیکن خرچہ دیت المال سے ادا کرنے کا حکم دیا۔

مالکیہ یہ کہتے ہیں کہ جدوں کا "ولاء" مسلمانوں کو من حیث القوم حاصل ہوگا۔وہی اس کے وارث بھی ہوں گے اور دیت بھی دیں گے۔میرے خیال میں امیر المومنین نے ٹھیک کیا کہ خرچہ دیت المال پر ڈالا جو سب مسلمانوں کا مشترکہ ہے اور ولاء کا فیصلہ بھی انہوں نے امیر کی حیثیت سے ایک صالح قوی کے حق میں دے دیا جس کو بچے کی پرورش کی ذمہ داری سونپ دی تھی، تاکہ وہ پوری توجہ اور شفقت سے اس کو خاندان کا ایک فرد سمجھ کر اس کی پرورش کرے۔

مالکیہ کے ہاں ایک چیز ہے قیاس مرسل۔اس کا کوئی ضابطہ نہیں ہے۔جن معاملات میں شریعت نے کوئی واضح ہدایت نہیں دی اور ان کا حل مسلمانوں کی مصلحت پر چھوڑ دیا ہے تو جس مصلحت کی طرف مسلمانوں کا ذہن جائے گا وہی شریعت ہے۔احناف اس کو استحسان کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کا عمل اسی کے تحت آتا ہے۔یہ عمل حکمت اور مصلحت ملت کے نقطہ نظر سے بھی بہت اچھا تھا۔

اَلْقَضَاءُ بِالْحَاقِ الْوَلَدِ بِاَبِيْهِ

بیٹے کو باپ کی طرف منسوب کرنے کے بارے میں فیصلہ

☐ قَالَ يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ

ﷺ اَنَّهَا قَالَتْ كَانَ عُتْبَةُ بْنُ اَبِي وَقَّاصٍ عَهِدَ اِلٰى اَخِيْهِ سَعْدِ بْنِ اَبِي وَقَّاصٍ اَنَّ ابْنَ وَلِيْدَةِ زَمْعَةَ مِنِّي فَاقْبِضْهُ اِلَيْكَ قَالَتْ فَلَمَّا كَانَ عَامُ الْفَتْحِ اَخَذَهُ سَعْدٌ وَقَالَ ابْنُ اَخِي قَدْ كَانَ عَهِدَ اِلَيَّ فِيْهِ فَقَامَ اِلَيْهِ عَبْدُ بْنُ زَمْعَةَ فَقَالَ اَخِي وَ ابْنُ وَلِيْدَةِ اَبِي وُلِدَ عَلٰى فِرَاشِهِ فَتَسَاوَقَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ سَعْدٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ابْنُ اَخِي قَدْ كَانَ عَهِدَ اِلَيَّ فِيْهِ وَقَالَ عَبْدُ بْنُ زَمْعَةَ اَخِي وَ ابْنُ وَلِيْدَةِ اَبِي وُلِدَ عَلٰى فِرَاشِهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ هُوَ لَكَ يَا عَبْدُ بْنَ زَمْعَةَ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَ لِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ ثُمَّ قَالَ لِسَوْدَةَ بِنْتِ زَمْعَةَ احْتَجِبِي مِنْهُ لِمَا رَاٰى مِنْ شَبَهِهِ بِعُتْبَةَ بْنِ اَبِي وَقَّاصٍ قَالَتْ فَمَا رَآهَا حَتّٰى لَقِيَ اللّٰهَ۔

﴿حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ عتبہؓ بن ابی وقاص نے اپنے بھائی سعدؓ بن ابی وقاص کو یہ ذمہ داری سونپی کہ زمعہ کی لونڈی کا بیٹا مجھ سے ہے، تم اس کو اپنے قبضہ میں کر لینا۔حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب مکہ فتح ہوا تو سعدؓ نے اس بچے کو لے لیا اور کہا کہ یہ میرے بھائی کا بیٹا ہے۔اس نے اس کے بارے میں مجھے ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔عبد بن زمعہؓ اٹھے اور کہا کہ یہ میرا بھائی ہے۔میرے باپ کی لونڈی کا بیٹا ہے اور اس کے بستر پر پیدا ہوا ہے۔دونوں مقدمہ لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گئے۔سعد بن ابی وقاصؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ یہ میرے بھائی کا بیٹا ہے۔اس نے مجھے اس کی ذمہ داری سونپی ہے۔عبد بن زمعہ نے کہا کہ یہ میرا بھائی ہے، میرے باپ کی لونڈی سے اس کے بستر پر پیدا ہوا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ تمہارا ہے اے عبد بن زمعہ۔پھر آپ نے فرمایا کہ بیٹا اس کی طرف منسوب ہوگا جس کے بستر پر پیدا ہوا اور زانی کے لیے پتھر ہے۔پھر آپ نے اپنی اہلیہ سودہ بنت زمعہ سے فرمایا کہ اس سے پردہ کرنا کیونکہ آپ نے اس لڑکے کے اندر عتبہ بن ابی وقاص کی مشابہت دیکھی۔چنانچہ اس نے مرتے دم تک ان کو (حضرت سودہؓ بنت زمعہ کو) نہیں دیکھا۔﴾

وضاحت :

غلامی کے نظام نے بڑے بڑے قضیے پیدا کر دیے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ آخر تک الجھے ہی رہے،

یہاں تک کہ یہ طے کرنا پڑا کہ نسب، اولاد اور وراثت کی تقسیم کے معاملات جس نہج پر جاہلیت میں طے پا چکے ہیں اب ان کو اولیٹ انہیں جائے گا۔ جو شخص جس کا باپ یا یہ جان چکا سونن چکا۔ اب وہی مانا جائے گا۔ الحمد کا شکر ہے کہ اب یہ ہمارے مسائل نہیں۔ ہمارے لیے یہ صرف تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔

الولد للفراش وللعاهر الحجر کا مطلب یہ ہے کہ جس کے بستر پر بچہ پیدا ہوا ہے، یعنی جس کی منسوبہ زوجہ سے پیدا ہوا ہے وہ اسی کا ہے۔ فیصلہ کن چیز یہی ہے اور زانی کے منہ پر پتھر، نامرادی اور خاک ہے۔ یعنی تعلقات اگر ناجائز رہے ہیں تو اس کے باعث نامرادی ہاتھ آئے گی۔ بچے کی باپ کے ساتھ نسبت کا فیصلہ قیافہ سے نہیں کیا جائے گا۔ روایت کے حوالے سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصول پہلے سے معلوم و مروج تھا لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ حضورؐ نے یہ اصول بیان فرمایا۔

آنحضرتؐ کی زوجہ سودہؓ بنت زمعہ آپؐ کی ابتدائی ازواج میں سے تھیں اور یہ ان کے بھائی کا معاملہ تھا۔ آنحضرتؐ نے اس قضیہ کے بعد ان کو ہدایت کی کہ وہ اس بھائی سے پردہ کریں کیونکہ اس کی شکل و شباہت واقعی عتبہ بن ابی وقاص سے ملتی تھی۔ تاہم آپؐ نے بچے کی نسبت کا فیصلہ مذکور قانون کے مطابق فرمایا۔

❑ وَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَزِيدَ ابْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الْهَادِي عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اِبْرَاهِيمَ بْنِ الْحَارِثِ التَّيْمِي عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِي اُمَيَّةَ اَنَّ امْرَاَةً هَلَكَ عَنْهَا زَوْجُهَافَاعْتَدَّتْ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَ عَشْرًا ثُمَّ تَزَوَّجَتْ حِيْنَ حَلَّتْ فَمَكَثَتْ عِنْدَ زَوْجِهَا اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَ نِصْفَ شَهْرٍ ثُمَّ وَلَدَتْ وَلَدًا تَامًّا فَجَاءَ زَوْجُهَا اِلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهُ فَدَعَا عُمَرُ بِنْسْوَةً مِنْ نِسَاءِ الْجَاهِلِيَّةِ قُدَمَاءَ فَسَاَلَهُنَّ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَتِ امْرَاَةٌ مِنْهُنَّ اَنَا اُخْبِرُكَ عَنْ هٰذِهِ الْمَرْاَةِ هَلَكَ عَنْهَا زَوْجُهَا حِيْنَ حَمَلَتْ فَاُهْرِيْقَتْ عَلَيْهِ الدِّمَاءُ فَخُشَّ وَلَدُهَا فِي بَطْنِهَا فَلَمَّا اَصَابَهَا زَوْجُهَا الَّذِي نَكَحَهَا وَاَصَابَ الْوَلَدَ الْمَاءُ تَحَرَّكَ الْوَلَدُ فِي بَطْنِهَا وَ كَبِرَ فَصَدَّقَهَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَ فَرَّقَ بَيْنَهُمَا وَ قَالَ عُمَرُ اَمَا اِنَّهُ لَمْ يَبْلُغْنِي عَنْكُمَا اِلَّا خَيْرٌ وَ اَلْحَقَ الْوَلَدَ بِالْاَوَّلِ۔

﴿سلیمان بن یسار عبداللہ بن ابی امیہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت کے شوہر کی وفات ہو گئی۔

جب عدت کے چار ماہ دس دن گزر گئے تو اس نے حلت کے بعد دوسرا نکاح کر لیا۔ نئے شوہر کے پاس اس نے جب ساڑھے چار ماہ گزارے تو اس کے ہاں ایک پورا بچہ پیدا ہوا۔ اس کا شوہر حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ ماجرا سنایا۔ حضرت عمرؓ نے جاہلیت کے زمانہ کی بوڑھی عورتوں کو بلوایا اور ان سے پوچھا کہ یہ کیا قصہ ہے؟ تو ایک مائی نے کہا کہ میں بتاتی ہوں کہ اس عورت کا کیا معاملہ ہے۔ یہ حاملہ تھی جب اس کا شوہر وفات پا گیا۔ بچے پر خون پڑتا رہا تو وہ پیٹ میں سوکھ گیا۔ پھر جب دوسرے شوہر سے ملاقات ہوئی تو بچے پر پانی پڑ گیا تو وہ حرکت میں آیا اور بڑا ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے مائی کی تصدیق کی اور عورت اور اس کے خاوند میں تفریق کر دی اور فرمایا کہ آپ دونوں سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ آپ نے بچے کو پہلے خاوند کی اولاد قرار دیا۔﴾

وضاحت:

اس طرح کا مسئلہ حل کرنے کے لیے حضرت عمرؓ موجودہ زمانے کی طرح کا کوئی میڈیکل بورڈ تو نہیں بنا سکتے تھے، یہی کر سکتے تھے کہ مائیوں وغیرہ سے مشورہ کریں کہ وہی ان معاملات کی خبر رکھتی تھیں۔ بچے کی پیدائش کی اقل مدت عام طور پر چھ ماہ مانی جاتی ہے۔ اس سے بھی کم مدت میں بچے کی ولادت کے بارے میں حضرت عمرؓ نے مائیوں کا مشورہ سن کر ان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے رہنمائی دی۔ اس کو راوی حضرات نے یہ سمجھا ہے کہ آپ نے ان کی رائے کی تصدیق کی۔ حالانکہ تصدیق کرنے کا سوال نہیں تھا۔ گفتگو کے نتیجہ میں یہ بات آپ کی سمجھ میں آئی کہ حمل پہلے ہی شخص کا ہے۔ زمانہ عدت میں استبراء رحم کا مقصد حاصل نہ ہوا اور عورت نے دوسرا نکاح کر لیا۔ یہ اسے قائم ہو جانے پر حضرت عمرؓ نے وہ فیصلہ کیا جو مہذب دنیا کا اخلاق ہے۔ آپ نے عورت کو طلاق دلوادی اور بچہ اس کے پہلے شوہر سے منسوب کر دیا۔

❑ وَحَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيٰى بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ اَنَّ عُمَرَ ابْنَ الْخَطَّابِ كَانَ يُلِيْطُ اَوْلَادَ الْجَاهِلِيَّةِ بِمَنِ ادَّعَاهُمْ فِي الْاِسْلَامِ فَاَتٰى رَجُلَانِ كِلَاهُمَا يَدَّعِي وَلَدَ امْرَاَةٍ فَدَعَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ قَائِفًا فَنَظَرَ اِلَيْهِمَا فَقَالَ الْقَائِفُ لَقَدِ اشْتَرَكَا فِيهِ فَضَرَبَهُ عُمَرُ بْنُ

الْخَطَّابِ بِالدِّرَّةِ ثُمَّ دَعَا الْمَرْأَةَ فَقَالَ اَخْبِرِيْنِي خَبَرَكِ فَقَالَتْ كَانَ هٰذَا لِاَحَدِ الرَّجُلَيْنِ يَاْتِينِي وَهِيَ فِي اِبِلٍ لِاَهْلِهَا فَلَا يُفَارِقُهَا حَتّٰى يَظُنَّ وَ تَظُنَّ اَنَّهُ قَدِ اسْتَمَرَّ بِهَا حَبَلٌ ثُمَّ انْصَرَفَ عَنْهَا فَاُهْرِيقَتْ عَلَيْهِ دِمَاءٌ ثُمَّ خَلَفَ عَلَيْهَا هٰذَا تَعْنِي الْآخَرَ فَلَا اَدْرِي مِنْ اَيِّهِمَا هُوَ قَالَ فَكَبَّرَ الْقَائِفُ فَقَالَ عُمَرُ لِلْغُلَامِ وَ الِ اَيِّهِمَا شِئْتَ-

﴿سلیمان بن یسار روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ جاہلیت کی اولاد کو ان سے منسوب کر دیتے جو اسلام میں ان کے مدعی ہوتے تھے-وہ کہتے ہیں کہ دو آدمی آئے وہ دونوں ایک عورت کے بچے کے مدعی تھے- حضرت عمرؓ نے ایک قیافہ شناس کو بلایا-اس نے دونوں کو دیکھا تو قیافہ لگایا کہ اس میں دونوں شخص شریک ہیں- حضرت عمرؓ نے اس پر اپنا درہ اٹھایا- پھر عورت کو بلایا اور کہا کہ ٹھیک ٹھیک بتا کہ واقعہ کیا ہے-اس نے کہا کہ بچہ ان دونوں مردوں میں سے کسی ایک کا ہے-یہ آدمی میرے پاس آتا تھا جب میں اس گھر کے اونٹ چراتی تھی- یہ اس وقت تک میری جان نہیں چھوڑتا تھا جب تک یہ گمان نہ کر لے اور میں بھی گمان نہ کر لوں کہ حمل ہو گیا- پھر وہ چلا گیا اور بچے کے اوپر خون جاری رہا- پھر یہ دوسرا شخص آگیا-اب میں نہیں جانتی کہ ان میں سے بچہ کس کا ہے-اس پر قیافہ شناس نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا- حضرت عمرؓ نے لڑکے سے کہا کہ تم جس کے چاہو بیٹے بن جاؤ-﴾

وضاحت :

زمانہ جاہلیت میں لونڈیوں کی کوئی عزت و ناموس نہ تھی-وہ ایک سے دوسرے شخص کو فروخت ہوتی تھیں اور وہ ان سے جنسی تعلق قائم کر لیتے تھے-جب بچہ پیدا ہوتا تو اس کے نسب کے بارے میں قضیہ پیدا ہو جاتا-

حضرت عمرؓ نے فیصلہ کرنے کے لیے اگرچہ قیافہ شناس کو بلایا لیکن فیصلہ اس کی رائے پر نہیں کیا بلکہ لڑکے کے اوپر چھوڑ دیا کہ بالغ ہو کر جس کے ساتھ چاہے اپنا نسب جوڑ لے-بعض معاملات میں جدید قانون میں بھی بچے کو بلوغت کے بعد خود فیصلہ کرنے کو کہا جاتا ہے-

احناف کا مسلک یہ ہے کہ وہ قیافے کو نہیں مانتے-ان روایات سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عمرؓ

نے قیافے کو کوئی اہمیت دی ہو بلکہ آپ نے حالات کے مطابق فیصلہ کیا-میرے نزدیک بھی قیافہ کوئی چیز نہیں-

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اَوْ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ قَضَى اَحَدُهُمَا فِي امْرَاَةٍ غَرَّتْ رَجُلًا بِنَفْسِهَا وَذَكَرَتْ اَنَّهَا حُرٌّ فَتَزَوَّجَهَا فَوَلَدَتْ لَهُ اَوْلَادًا فَقَضَى اَنْ يَفْدِيَ وَلَدَهُ بِمِثْلِهِمْ قَالَ يَحْيٰى سَمِعْتُ مَالِكًا يَقُولُ وَالْقِيمَةُ اَعْدَلُ فِي هٰذَا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ-

﴿امام مالک کی یہ بات پہنچی کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب یا حضرت عثمانؓ بن عفان دونوں میں سے کسی ایک نے ایک ایسی عورت کے بارے میں، جس نے ایک شخص کو یہ کہہ کر دھوکہ دیا تھا کہ وہ آزاد ہے تو اس شخص نے اس سے نکاح کر لیا اور اس کے اولاد بھی ہوئی، فیصلہ کیا کہ وہ اولاد کا فدیہ دے گا انہی کے مانند-امام مالک کہتے ہیں کہ قیمت زیادہ قرین انصاف ہے-﴾

وضاحت :

یہ روایت میری سمجھ میں نہیں آئی - جب آدمی آزاد ہے تو اولاد بھی آزاد ہو گی- فدیہ یا قیمت کا کیا سوال؟ میرے خیال میں راوی نے معاملہ کو سمجھا نہیں-

اَلْقَضَاءُ فِي اُمَّهَاتِ الْاَوْلَادِ

ماں بننے والی لونڈیوں کے بارے میں فیصلہ

□ قَالَ يَحْيٰى قَالَ مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنْ اَبِيهِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ مَا بَالُ رِجَالٍ يَطَئُونَ وَلَائِدَهُمْ ثُمَّ يَعْزِلُونَهُنَّ لَا تَاْتِينِي وَلِيدَةٌ يَعْتَرِفُ سَيِّدُهَا اَنْ قَدْ اَلَمَّ بِهَا اِلَّا اَلْحَقْتُ بِهِ وَلَدَهَا فَاعْزِلُوا بَعْدَ ذٰلِكَ اَوِ اتْرُكُوا-

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے کہا کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنی لونڈیوں سے تعلقات زن و شو قائم کرتے ہیں، پھر ان کو چھوڑ دیتے ہیں۔ تو کوئی لونڈی اگر ایسی میرے پاس آئے گی جس سے اس کے آقا نے ملاقات کا اعتراف کیا ہو گا تو اس سے جو اولاد ہو گی میں

اس کو اسی آقا کے کھاتے میں ڈال دوں گا-اس کے بعد چاہے چھوڑ دیا جوڑ دو-﴾

وضاحت :

حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ کیا کہ جس مالک نے ملاقات کی ہے چھ اسی کا ہے-چاہے بعد میں لونڈی کو چھوڑ دے چاہے رکھے رہے-اس میں حضرت عمرؓ مالک کو یہ رعایت دے رہے ہیں کہ وہ اگر وطی کا اعتراف کرے تب ایسا کیا جائے گا ورنہ نہیں-اس زمانہ میں غلامی کا یہ مسئلہ سرے سے موجود ہی نہیں رہا اس لیے اس میں زیادہ پڑنے کی ضرورت نہیں-

اَلْقَضَاءُ فِي عِمَارَةِ الْمَوَاتِ

مردہ زمینوں کو آباد کرنے کے بارے میں فیصلہ

❐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ اَحْيَا اَرْضًا مَيْتَةً فَهِيَ لَهُ وَلَيْسَ لِعِرْقٍ ظَالِمٍ حَقٌّ. قَالَ مَالِكٌ وَالْعِرْقُ الظَّالِمُ كُلُّ مَا اُحْتُفِرَ اَوْ اُخِذَ اَوْ غُرِسَ بِغَيْرِ حَقٍّ-

﴿عروہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کسی مردہ زمین کو زندہ کیا وہ اس کی ہے اور اس پر کسی ناجائز تصرف کرنے والے کا حق نہیں-امام مالک کہتے ہیں کہ ناجائز تصرف یہ ہے کہ بغیر کسی حق کے اس میں کنواں کھودا جائے یا قبضہ کیا جائے یا اس میں درخت لگائے-﴾

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ مَنْ اَحْيَا اَرْضًا مَيْتَةً فَهِيَ لَهُ قَالَ مَالِكٌ وَ عَلٰى ذٰلِكَ الْاَمْرُ عِنْدَنَا-

﴿سالم بن عبداللہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ جس نے مردہ زمین کو زندہ کیا وہ اس کی ہے-امام مالک کہتے ہیں کہ ہمارا فتویٰ یہی ہے-﴾

وضاحت :

زمین کے اوپر جب اللہ کے بندے آنے لگے تو کھیتی باڑی کا کام شروع ہوا-آغاز میں تو یہ ہوا کہ بتدریج

کسی نے آباد کر لیا وہ اس کا ہو گیا-اس کے مرنے پر یہ رقبہ اس کی آل اولاد کو منتقل ہوا-جوں جوں دنیا کی آبادی میں اضافہ ہوا، مزید رقبہ زیر کاشت آتا گیا، یہاں تک کہ اب زمین لوگوں کی قانونی ملکیت ہے یا بعض قطعات حکومت کی ملکیت ہیں-کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ دوسرے کی زمین کو اپنے تصرف میں لے آئے یا اس میں کنواں کھودے یا اس پر قبضہ کر لے-البتہ اگر رقبے افتادہ پڑے ہوں اور مالکوں کو ان کے آباد کرنے کی فکر نہ ہو تو حکومت یہ حکم دے سکتی ہے کہ لوگ ان کو معین مدت میں آباد کریں، ورنہ حکومت کو حق ہو گا کہ وہ ان کو اپنے قبضہ میں لے کر ان کو آباد کرنے کا انتظام کرے-

یہ روایات غیر آباد افتادہ زمین کو آباد کرنے کا طریقہ بتاتی ہیں-آج کل حکومت جو زمین دیتی ہے وہ عام طور پر اس شرط کے تحت دیتی ہے کہ دو یا تین سال میں آباد کر لی جائے ورنہ حکومت کو حق ہو گا کہ زمین واپس اپنے قبضے میں لے لے اور کسی دوسرے شخص کو موقع دے کہ وہ مقررہ مدت میں آباد کرے-آنحضرت ﷺ کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی افتادہ مردہ زمین کو آباد کرے گا تو وہ اسی کی ملکیت ہو گی اور کسی دوسرے کو یہ حق نہیں ہو گا کہ وہ اس میں کسی قسم کی مداخلت کرے-اسی پر حضرت عمرؓ کا عمل بیان کیا گیا ہے اور مالکیہ کا فتویٰ بھی یہی ہے-میرے نزدیک یہ بات نہایت معقول ہے کہ افتادہ زمینیں پڑی نہیں رہنی چاہئیں-ان کو آباد کرنا چاہیے، خواہ وہ زمین حکومت کی ملکیت ہو یا کسی دوسرے کی-میرا تجربہ یہ ہے کہ بعض زمینیں اس لیے غیر آباد پڑی ہوئی ہیں کہ ان کی سیرابی کے لیے پانی میسر نہیں-جیسے ہی پانی کا بندوبست ہو جائے گا زمین آباد ہو جائے گی-آج کل زمین نے سرمائے کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور اب افتادہ زمین بہت کم ہے-صرف ایسے علاقوں میں ہے جہاں پانی دستیاب نہیں اور بارش بھی نہیں ہوتی-خاص کر صحرائی علاقے غیر آباد ہیں جہاں زمین آباد کرنا ممکن نہیں-

اَلْقَضَاءُ فِي الْمِيَاهِ

پانی کے بارے میں فیصلے

❐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِي بَكْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ فِي سَيْلِ مَهْزُوْرٍ وَمُذَيْنِبٍ يُمْسَكُ حَتَّى الْكَعْبَيْنِ ثُمَّ يُرْسَلُ الْاَعْلٰى عَلَى الْاَسْفَلِ.

﴿عبداللہ بن ابی بکر کو یہ بات پہنچی کہ رسول اللہ ﷺ نے مہزور اور مذیب کے سیلاب کے پانی کے بارے میں حکم دیا کہ اوپر کی زمینوں والے ٹخنوں تک روک کر باقی کو نیچے والوں کے لیے چھوڑ دیا کریں﴾

وضاحت :

مہزور اور مذیب مدینہ کے نزدیک دو وادیاں تھیں۔ ان کے سیلاب کا پانی لوگوں کے باغات کو سیراب کرتا لیکن جیسا کہ پانی کی قلت کے علاقوں میں ہوتا ہے بارشوں میں لوگ کدال یا پھاوڑے لے کر زمینوں پر پہنچ جاتے اور حریفوں کا پانی کاٹ کر اپنے رقبوں میں زیادہ پانی روکنے کی کوشش کرتے۔ اس طرح بارش کا یہ پانی جھگڑے کا باعث بنتا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کا فیصلہ یوں فرمایا کہ جو لوگ وادی کے اوپر کے حصے میں ہیں وہ ٹخنوں کی بلندی سے زیادہ پانی نہ روکیں اور اس سے زائد پانی کو نیچے والوں کے لیے چھوڑ دیں۔ ٹخنوں تک اونچا پانی زمین کی سیرابی کے لیے کافی ہوتا ہے اور اس سے زیادہ پانی روکنے میں دوسروں کی حق تلفی ہے۔ آج کل بھی نہروں، ربڑوں اور ڈیموں کے پانی کے استعمال کے قاعدے ہیں۔ ایک خاص مقدار تک پانی نہروں میں چھوڑا جاتا ہے اور باقیہ کو ملک کے زیریں حصہ کی آبپاشی کے لیے دریا میں بہنے دیا جاتا ہے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ اَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَايُمْنَعُ فَضْلُ الْمَاءِ لِيُمْنَعَ بِهِ الْكَلَأُ

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ فالتو پانی اپنے چارے اور چراگاہ کی حفاظت کے لیے نہیں روکا جائے گا۔﴾

وضاحت :

ایک تو پبلک کنواں ہوتا ہے جس کا پانی ہر ایک لے سکتا ہے اور اس میں باری نہیں جائی جاتی ہے۔ یہ روایت اس کے متعلق نہیں بلکہ ذاتی کنویں سے متعلق ہے۔ اس میں مالک کا حق مقدم ہوگا۔ اس کے بعد جو فالتو پانی ہوگا اس کو روکنے کا حق مالک کو نہیں ہوگا۔ کنویں کے ارد گرد گھاس اور چارہ مالک کا ہوتا ہے۔ اس کی حفاظت کی خاطر بھی مالک کو فالتو پانی روکنے کا حق نہیں ہوگا۔ ایک چیز جس کو "شفط" کہتے ہیں یعنی ہونٹ تر کرنا یا پیاس بجھانا اس سے آپ نہیں روک سکتے۔ یہ ہونٹ خواہ انسانوں کے ہوں یا مویشیوں کے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ کنویں کے پاس چارے کا

کھیت ہے، اس کو بکریاں یا اونٹ تباہ کر دیں گے۔ پانی دینا واجب ہے۔ کھیت سے روکنا آپ کا حق ہے۔ لیکن آپ اپنے کھیت کو چارے کا بندوبست کریں۔ پانی پینے سے نہیں روک سکتے۔

یہ ضروری ہے کہ ہر کنویں کی حریم ہو یعنی اس کے ساتھ کچھ زمین چھوڑ دی جائے تاکہ جانور وہاں پر بیٹھ سکیں اور پانی پی سکیں۔ اگر کنویں کے ساتھ کسی دوسرے کی زمین ہو تو اس پر بھی کنویں کی حریم بنانے کے لیے قبضہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کی تفصیلات قاضی ابو یوسفؒ کی کتاب الخراج میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ اَبِي الرِّجَالِ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ اُمِّهِ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اَنَّهَا اَخْبَرَتْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا يُمْنَعُ نَفْعُ بِئْرٍ

﴿محمد بن عبدالرحمٰن کی والدہ عمرہ نے ان کو خبر دی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی کنویں کا نفع روکا نہیں جا سکتا۔﴾

وضاحت :

یہ روایت بھی اوپر والی روایت کے ہم معنی ہے۔ پانی ایسی چیز نہیں جس سے روکا جائے۔ یہ "ماعون" میں داخل ہے۔ قرآن مجید میں آخرت سے غافل لوگوں کا کردار بیان کرتے ہوئے ان کی حالت کی صفت بھی بتائی ہے کہ وہ ماعون یعنی استعمال کی معمولی اشیاء کو بھی لوگوں سے روکتے ہیں۔ تو کنویں کا پانی روکنے والے بھی مذکورہ کردار کے حامل ہوئے۔ چشموں کا پانی بھی اس میں شامل ہے۔ البتہ کارپوریشنوں اور میونسپل کمیٹیوں کا پانی اس میں شامل نہیں۔ ان کا پانی بھی قوانین کے تحت ہی استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔

اَلْقَضَاءُ فِي الْمَرْفِقِ

فوائد کے متعلق فیصلہ

"مرفق" وہ سہولت یا فائدہ ہے جس میں مالک کا نقصان نہ ہو رہا ہو۔ اس کا ایک تو اخلاقی پہلو ہے کہ صرف اس بنیاد پر کہ آپ کسی چیز کے قانونی مالک ہیں دوسروں کو فائدہ نہ اٹھانے دیں۔ ایسا کرنے سے بہت سے سماجی نقصانات ہوتے ہیں۔ اس کا دوسرا پہلو شریعت کے نقطہ نظر سے ہے۔ شریعت نے حکومت کو یہ قانونی حق دیا ہے کہ اس طرح کی رکاوٹ یا ممانعت پیدا کرنے والے کو وہ روک سکتی ہے۔

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَمْرِو بْنِ يَحْيَى الْمَازِنِيِّ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ۔

﴿یحییٰ مازنی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی نہ خود ضرر اٹھائے اور نہ کسی کو ضرر پہنچائے۔﴾

وضاحت :

یہ اس طرح کا کلیہ ہے جیسا کہ لاضرر ولا غرر کا کلیہ ہے۔

لاضرر ولا غرر کا مطلب یہ ہے کہ معاملے کی وہ تمام شکلیں صحیح ہیں جن میں دونوں پارٹیوں میں سے کسی ایک کو نہ نقصان پہنچے نہ اس سے دھوکہ ہو۔ لاضرر ولا ضرار کا مفہوم یہ ہے کہ معاملہ میں نہ ہم کو کسی سے نقصان پہنچے اور نہ ہم کسی کے نقصان کا سبب بنیں۔ ہمارے ہاں فریقین کے باہم معاملے میں یہ ایک بنیادی اصول ہے۔ اس کی روشنی میں کوئی ایسا معاملہ جائز نہیں جس میں فریقین میں سے ایک فریق کو نقصان پہنچ رہا ہو اور دوسرا اس نقصان کا ذمہ دار ہو لیکن نقصان میں شریک نہ ہو۔ یہ ان دس اصولوں میں سے ایک ہے جن کو فقہ کی بنیاد بتایا جاتا ہے۔

میرے نزدیک یہ جملہ دعا کا مفہوم بھی دیتا ہے اور معاملات کی بنیاد بھی فراہم کرتا ہے۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَا يَمْنَعْ أَحَدُكُمْ جَارَهُ خَشَبَةً يَغْرِزُهَا فِي جِدَارِهِ ثُمَّ يَقُولُ أَبُو هُرَيْرَةَ مَالِي أَرَاكُمْ عَنْهَا مُعْرِضِينَ وَاللَّهِ لَأَرْمِيَنَّ بِهَا بَيْنَ أَكْتَافِكُمْ

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی بھی اپنے پڑوسی کو اس سے نہ روکے کہ وہ اس کی دیوار میں اپنی کھونٹی ٹھوک لے۔ ابوہریرہؓ نے یہ بھی فرمایا کہ کیا بات ہے کہ میں تمہیں اپنی بات سے اعراض کرتے دیکھتا ہوں۔ خدا کی قسم میں تمہارے آگے یہ چیز پھینکتا ہی رہوں گا۔﴾

وضاحت :

مطلب یہ ہے کہ ایک پڑوسی اگر آپ کی دیوار میں کوئی کھونٹی گاڑنا چاہتا ہے تو اس کو یہ سہولت دینی چاہیے الا آنکہ آپ کو نقصان پہنچ سکتا ہو۔ بغیر کسی معقول سبب کے اسے روکنا نہیں چاہیے۔

حضرت ابوہریرہؓ کے قول پر شارحین نے بلاوجہ تفسیر شروع کر دی ہے کہ کیا اس زمانے میں مسلمانوں کی اخلاقی حالت اتنی گر گئی تھی کہ حضرت ابوہریرہؓ کو یہ کہنا پڑا کہ تم سنو یا نہ سنو، میں تمہارے اوپر یہ مبارک تعلیم پھینکتا ہی رہوں گا۔ حضرت ابوہریرہؓ کے اقوال سے کسی جگہ میرے اوپر یہ اثر نہیں پڑا کہ ان کی زندگی ہی میں مسلمانوں کی عمومی حالت اتنی بگڑ چکی تھی۔ اس زمانے میں آج کل کا سفلہ پن مشکل ہی سے ملتا ہوگا لیکن اکا دکا واقعات پیش آنا کوئی بعید بات نہیں۔ انسان ہمیشہ سے انسان ہی تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ اپنے مزاج کے لحاظ سے ان معاملات میں بڑے حساس تھے۔ انہوں نے سنا ہوگا یا کسی کو دیکھا ہوگا کہ اس طرح کی سخت سے کام لے رہا ہے تو انہوں نے کہہ دیا ہوگا کہ سنو یا نہ سنو، میں تو تمہارے آگے یہ تعلیم پیش کرتا ہی رہوں گا۔

ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ محض اخلاقی نصیحتیں ہیں لیکن میرے نزدیک ان معاملات میں یہ کہنا کہ یہ محض ایک اخلاقی بات ہے، آپ کو اختیار ہے اس پر عمل کریں یا نہ کریں، درست نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وقت آئے جب قانون بنانے والوں کو مداخلت کرنی پڑے تو ایسی مداخلت غلط نہیں ہوگی۔ آگے والی روایت سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَمْرِو ابْنِ يَحْيَى الْمَازِنِيِّ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ الضَّحَّاكَ بْنَ خَلِيفَةَ سَاقَ خَلِيجًا لَهُ مِنَ الْعُرَيْضِ فَأَرَادَ أَنْ يَمُرَّ بِهِ فِي أَرْضِ مُحَمَّدِ بْنِ مَسْلَمَةَ فَأَبَى مُحَمَّدٌ فَقَالَ لَهُ الضَّحَّاكُ لِمَ تَمْنَعُنِي وَهُوَ لَكَ مَنْفَعَةٌ تَشْرَبُ بِهِ أَوَّلًا وَآخِرًا وَلَا يَضُرُّكَ فَأَبَى مُحَمَّدٌ فَكَلَّمَ فِيهِ الضَّحَّاكُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ فَدَعَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ مُحَمَّدَ بْنَ مَسْلَمَةَ فَأَمَرَهُ أَنْ يُخَلِّيَ سَبِيلَهُ فَقَالَ مُحَمَّدٌ لَا فَقَالَ عُمَرُ لِمَ تَمْنَعُ أَخَاكَ مَا يَنْفَعُهُ وَهُوَ لَكَ نَافِعٌ تَسْقِي بِهِ أَوَّلًا وَآخِرًا وَهُوَ لَا يَضُرُّكَ فَقَالَ مُحَمَّدٌ لَا وَاللَّهِ فَقَالَ عُمَرُ وَاللَّهِ لَيَمُرَّنَّ بِهِ وَلَوْ عَلَى بَطْنِكَ فَأَمَرَهُ عُمَرُ أَنْ يَمُرَّ بِهِ فَفَعَلَ الضَّحَّاكُ۔

﴿یحییٰ مازنی سے روایت ہے کہ ضحاک بن خلیفہ نے پانی کی ایک کھال وادی عریض سے نکالی اور چاہا کہ اس کو محمد بن مسلمہ کے رقبے میں سے گزارے تو محمد بن مسلمہ نے انکار کر دیا۔ ضحاک نے کہا کہ آپ کیوں روکتے ہیں جب کہ اس میں آپ کا بھی نفع ہے۔ آپ مجھ سے پہلے اس میں سے پیو گے اور آخر میں

بھی آپ کا حق رہے گا اور آپ کا اس میں کچھ نقصان بھی نہیں ہے- لیکن محمد بن مسلمہ نے انکار ہی کیا- ضحاک نے اس بارے میں حضرت عمر بن خطابؓ سے بات کی- حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہ کو بلایا اور کہا کہ ان کا راستہ چھوڑ دیں- محمد بن مسلمہ نے انکار کیا- حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ اپنے بھائی کو اس چیز سے کیوں روکتے ہو جس میں آپ کا بھی نفع ہے- اور اول اور آخر اس سے فائدہ اٹھائیں گے- نیز اس میں آپ کا کوئی نقصان بھی نہیں ہے- محمد بن مسلمہ نے قسم کھا کر انکار کیا- حضرت عمرؓ نے بھی قسم کھا کر کہا کہ یہ ضرور اپنی کھال نکالیں گے اگرچہ تمہارے پیٹ پر سے نکالنی پڑے- حضرت عمرؓ نے ضحاک کو حکم دیا کہ کھال نکالیں، تو انہوں نے ایسا ہی کیا-﴾

وضاحت :

"عریض" وادی کا نام ہے- "فلیح" سے مراد معروف معنی میں فلیج نہیں ہے لیکن ہے یہ اسی طرح کی چیز بہت چھوٹے پیمانے پر- برساتی ندی نالے ہر جگہ ہوتے ہیں- مدینہ کے گرد و نواح میں جب بارش ہوتی تو بعض جگہوں پر پانی زیادہ جمع ہو جاتا- مدینہ کے لوگ وہاں سے اپنے باغوں کے لیے نالیاں نکال لیتے تھے- اسی طرح کی ایک بڑی نالی یا کھال ضحاک نے بھی بنانی چاہی لیکن پانی کے ذخیرہ اور ان کے رقبے کے درمیان محمد بن مسلمہ کی زمین حائل تھی جنہوں نے ضحاک کو اپنی زمین میں سے کھال نکالنے کی اجازت نہ دی-

محمد بن مسلمہؓ بڑے جلیل القدر صحابی ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ انہوں نے انکار کر دیا جس پر خلیفہ کو مداخلت کرنی پڑی اور انہوں نے محمد بن مسلمہؓ کی خواہش کے علی الرغم ضحاک کو کھال نکالنے کی اجازت دے دی- اس اجازت کی بنیاد یہ تھی کہ محمد بن مسلمہ کا کھال سے سیراب ہونے کا فائدہ ظاہر تھا اور وہ کوئی نقصان ثابت نہیں کر سکے- ان کا انکار صرف اس بنیاد پر تھا کہ رقبہ ان کا ہے- اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ اس طرح کے معاملات میں حکومت یا کارپوریشن مداخلت کر سکتی ہے- بعض فقہا نے اس معاملے میں تشدد کیا ہے- وہ کہتے ہیں کہ کسی کی ملکیت میں بغیر اس کی اجازت کے دخل نہیں دینا چاہیے- یہ مولویانہ فتویٰ ہے اور ٹھیک نہیں- بلاشبہ یہ اصول تو رہے گا کہ مالک کو کوئی ضرر نہ ہو اور اگر ضرر ہو تو نفع اس سے زیادہ ہونا چاہیے- لیکن صرف اس بنیاد پر کہ آپ کا رقبہ ہے، آپ دوسرے آدمی کو ایک فائدہ اٹھانے سے روک نہیں سکتے- حکومت کو حق ہے کہ وہ اس میں مداخلت کرے اور اس

کو آپ کی مرضی کے خلاف اجازت دے دے-

حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَمْرِو بْنِ يَحْيَى الْمَازِنِيِّ عَنْ أَبِيهِ أَنَّهُ قَالَ كَانَ فِي حَائِطِ جَدِّهِ رَبِيعٌ لِعَبْدِ الرَّحْمَنِ ابْنِ عَوْفٍ فَأَرَادَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ عَوْفٍ أَنْ يُحَوِّلَهُ إِلَى نَاحِيَةٍ مِنَ الْحَائِطِ هِيَ أَقْرَبُ إِلَى أَرْضِهِ فَمَنَعَهُ صَاحِبُ الْحَائِطِ فَكَلَّمَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ عَوْفٍ عُمَرَ ابْنَ الْخَطَّابِ فِي ذَلِكَ فَقَضَى لِعَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ بِتَحْوِيلِهِ-

﴿یحییٰ مازنی کہتے ہیں کہ ان کے دادا کے باغ میں عبدالرحمن بن عوفؓ کے لیے ایک چھوٹی نالی تھی- عبدالرحمن بن عوف نے چاہا کہ اس کا رخ باغ کے اس گوشے کی طرف پھیر دیں جو ان کی زمین سے قریب تر ہو- باغ کے مالک نے انہیں اس سے روک دیا- حضرت عبدالرحمن بن عوف نے حضرت عمرؓ سے بات کی تو انہوں نے نالی کا رخ پھیرنے کے معاملہ میں حضرت عبدالرحمن بن عوف کے حق میں فیصلہ دے دیا-﴾

وضاحت :

انسان ہمیشہ انسان رہتا اور جذباتی کیفیات کی زد میں رہتا ہے- یہ بھی ہے کہ انسان کو ملکیت کا کچھ غلط تصور ہو جاتا ہے اور وہ اخلاقی حدود کو پہچاننے سے قاصر رہ جاتا ہے-

بات اس روایت میں بھی وہی ہے جو پچھلی روایت میں ہے کہ جب ایک شخص کو دوسرے کو کوئی سہولت مہیا کرنے سے نقصان نہ ہوتا ہو تو اسے اپنے پڑوسی کو فائدہ پہنچانا چاہیے- اسے اپنی ملکیت کے باعث رکاوٹ پیدا کرنے کا کوئی حق نہیں- یہ سب قوانین زمینداری اور کارپوریشن سے متعلق ہیں-

اَلْقَضَاءُ فِي قَسْمِ الْاَمْوَالِ

مالوں کی تقسیم کے بارے میں فیصلہ

حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ ثَوْرِ بْنِ زَيْدٍ الدِّيلِيِّ أَنَّهُ قَالَ بَلَغَنِي أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ أَيُّمَا دَارٍ أَوْ أَرْضٍ قُسِمَتْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَهِيَ عَلَى قَسْمِ الْجَاهِلِيَّةِ وَ أَيُّمَا دَارٍ أَوْ أَرْضٍ

اَدْرَكَهَا الْاِسْلَامُ وَلَمْ تُقْسَمْ فَهِيَ عَلٰى قَسْمِ الْاِسْلَامِ.

﴿ثور بن زید دیلی کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی گھر یا رقبہ جاہلیت میں تقسیم ہو چکا ہو وہ جاہلیت کی تقسیم ہی پر رہے گا اور جس گھر یا رقبہ کی تقسیم کا مرحلہ اسلام کے آنے تک پیش نہیں آیا وہ اسلام کے اصولوں پر تقسیم ہوگا۔﴾

وضاحت :

مطلب یہ ہے کہ غیر منقولہ جائداد کی تقسیم کے بارے میں جو فیصلے اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں کر دیے گئے اسلام میں ان کو نہیں بدلا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس باب کو دوبارہ کھولنے میں بڑے جھگڑے اور بکھیڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا جاہلیت میں جو ہو چکا وہ مانا جائے گا۔ اس میں کوئی ردوبدل نہیں ہوگا۔ مکان یا رقبہ اسی کا ہے جس کو مل چکا۔ اس کا حق تسلیم کر لیا جائے گا۔ صرف ان معاملات میں اصلاح ہوگی جن کا تعلق دین کے اصولی مسائل سے ہے۔

ہمارے ہاں کے بعض دانشمند معاملات کی ان باریکیوں کو نہیں سمجھتے۔ انہوں نے عشری اور خراجی زمینوں کے بارے میں کہیں پڑھ لیا ہے تو آج وہ پاکستان کی زمینوں کے بارے میں وہی حکم لگانا چاہتے ہیں جو صدر اول میں مسلمانوں نے مفتوح علاقوں پر لگایا تھا۔ یہ ایک فضول بات ہے۔ کوئی صفت زمین کے ساتھ چپکی نہیں رہتی۔ ہر صفت کا تعلق مالکوں سے ہوتا ہے۔ پورے رقبے کا تعلق ریاست سے ہوتا ہے۔ زمین کا اصل مالک خدا تعالیٰ ہے اور خدا کی خلیفہ حکومت ہوتی ہے۔ زمین کے موجودہ مالکوں کے بارے میں یہ بحث نہیں ہو سکتی کہ فلاں زمانے میں اس زمین کا مالک یہودی یا نصرانی یا ہندو تھا۔ یہ سب بحثیں ختم ہو چکی ہیں۔ جو تقسیم چلی آ رہی ہے وہ اصولاً آپ کو آج بھی ماننی پڑے گی۔ البتہ مفتوح اہل ذمہ کے بارے میں آپ کو مداخلت کرنے کا حق ہے۔ معاہد اہل ذمہ کے بارے میں نہیں۔ معاہد اہل ذمہ کے ساتھ جو معاہدہ ہوگا اس کے مطابق عمل ہوگا۔ مثلاً پاکستان کے اہل ذمہ معاہد اہل ذمہ ہیں۔ ان سے متعلق جو معاہدہ ہو چکا ہے اس ہی پر فیصلہ ہوگا۔ آپ ان پر کوئی اور چیز لاگو نہیں کر سکتے۔ ان کی املاک اور معاہدہ کا تحفظ کیا جائے گا۔ یہ چیز اسلام میں مسلم ہے۔

مَالَا يَجُوْزُ مِنَ النَّحْلِ

کون سا عطیہ جائز نہیں

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ

عَبْدٍ الْقَارِيِّ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ مَابَالُ رِجَالٍ يَنْحَلُوْنَ اَبْنَاءَ هُمْ نُحْلًا ثُمَّ يُمْسِكُوْنَهَا فَاِنْ مَاتَ ابْنُ اَحَدِهِمْ قَالَ مَالِيْ بِيَدِيْ لَمْ اُعْطِهِ اَحَدًا وَ اِنْ مَاتَ هُوَ قَالَ هُوَ لِابْنِيْ قَدْ كُنْتُ اَعْطَيْتُهُ اِيَّاهُ مَنْ نَحَلَ نِحْلَةً فَلَمْ يَحُزْهَا الَّذِيْ نَحَلَهَا حَتّٰى يَكُوْنَ اِنْ مَاتَ لِوَرَثَتِهِ فَهِيَ بَاطِلٌ۔

﴿عبدالرحمٰن بن عبدالقاری سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ لوگوں کا عجیب حال ہے کہ اپنے بیٹوں کو کچھ عطیہ دیتے ہیں تو اسے اپنے قبضہ میں رکھتے ہیں۔ اگر بیٹا مر گیا تو کہہ دیا کہ میرا مال میرے ہاتھ میں محفوظ ہے، میں نے یہ کسی کو نہیں دیا۔ اور اگر خود کو موت آگئی تو کہا کہ یہ میرے بیٹے کا ہے، میں نے اس کو دے دیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر کسی نے اس طرح کا ہبہ کیا اور جس کو ہبہ کیا گیا اس نے اس پر قبضہ نہیں کیا کہ اگر وہ مر جائے تو اس کے ورثا کا ہو سکے تو اس طرح کا ہبہ باطل ہوگا۔﴾

وضاحت :

یہ ہبہ کرنے والوں کی ایک چالاکی بتائی ہے کہ قبضہ نہیں کراتے تھے تاکہ موہوب لہ کی وفات کی صورت میں ہبہ الغو ہو جائے اور معطی کا ہی رہے۔ موہوب لہ کے وارث اس کے حق دار نہ ہو سکیں۔ اور اگر معطی کی وفات ہو جائے تو یہ موہوب لہ کا حق رہے۔ دوسرے ورثا کو کچھ کہنے کا موقع نہ ملے۔ حضرت عمرؓ نے قانون بنایا کہ قبضہ ضروری ہے ورنہ ہبہ باطل ٹھہرے گا۔

اَلْقَضَاءُ فِي الْهِبَةِ

ہبہ کے بارے میں فیصلہ

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ دَاوُدَ بْنِ الْحُصَيْنِ عَنْ اَبِيْ غَطَفَانَ بْنِ طَرِيْفٍ الْمُرِّيِّ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ مَنْ وَهَبَ هِبَةً لِصِلَةِ رَحِمٍ اَوْ عَلٰى وَجْهِ صَدَقَةٍ فَاِنَّهُ لَا يَرْجِعُ فِيْهَا وَمَنْ وَهَبَ هِبَةً يَرٰى اَنَّهُ اِنَّمَا اَرَادَ بِهَا الثَّوَابَ فَهُوَ عَلٰى هِبَتِهِ يَرْجِعُ فِيْهَا اِذَا لَمْ يُرْضَ مِنْهَا قَالَ يَحْيٰى سَمِعْتُ مَالِكًا يَقُوْلُ الْاَمْرُ الْمُجْتَمَعُ عَلَيْهِ عِنْدَنَا اَنَّ الْهِبَةَ اِذَا تَغَيَّرَتْ عِنْدَ الْمَوْهُوْبِ لَهُ

لِلْوَهَّابِ بِزِيَادَةٍ اَوْ نُقْصَانٍ فَاِنَّ عَلَى الْمَوْهُوْبِ لَهٗ اَنْ يُعْطِيَ صَاحِبَهَا قِيْمَتَهَا يَوْمَ قَبَضَهَا-

﴿ابو غطفان بن طریف بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جس کسی نے کسی کو صلہ رحمی یا صدقہ کے طور پر ہبہ کیا تو اس میں رجوع کرنا جائز نہیں- اور جس کسی نے ہبہ کیا اور اس سے مقصود اچھا رد عمل تھا تو وہ اپنے ہبہ پر اختیار رکھتا ہے- وہ اس سے رجوع کر سکتا ہے جب موھوب لہٗ کے طرز عمل سے راضی نہ ہو- امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں یہ بات متفق علیہ ہے کہ اچھے طرز عمل سے مشروط ہبہ میں اگر موھوب لہٗ کے ہاں کمی بیشی واقع ہو جائے تو موھوب لہٗ پر واجب ہے کہ وہ ہبہ کرنے والے کو اس دن کی رائج قیمت دے جس روز اس نے قبضہ کیا تھا-﴾

وضاحت :

ہبہ اگر اللہ کی رضا کے لیے کیا ہے تو اس کا رجوع کرنا ایسا ہے جیسے تے کر کے خود اس کو چاٹنا- لیکن اگر آپ نے ہبہ اس لیے کیا ہے کہ موھوب لہٗ آپ کے ساتھ اچھا معاملہ رکھے گا، حسن سلوک سے پیش آئے گا تو یہ ہبہ کو خاص حالات سے مخصوص کر دیتا ہے- اس صورت میں چونکہ ہبہ کچھ شرائط کے ساتھ مشروط ہے، اس لیے اگر وہ شرائط پوری نہ ہوں تو ہبہ کو واپس لیا جا سکتا ہے- اس کے متعلق امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ علمائے اہل مدینہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر موھوب لہٗ کے پاس ہبہ میں کچھ تغیر واقع ہو جائے اور اس کی قیمت میں کمی بیشی ہو جائے تو ہبہ کی واپسی کی صورت میں واپسی کے روز اس کی قیمت کی تشخیص ہو گی اور ہبہ کے دن کی قیمت سے کمی بیشی کا حساب ہو گا-

اَلْقَضَاءُ فِي الْعُمْرٰى

عمر میں دی ہوئی چیز کے متعلق فیصلہ

☐ حَدَّثَنِيْ مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ اَبِيْ سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ الْاَنْصَارِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَيُّمَا رَجُلٍ اَعْمَرَ عُمْرٰى لَهٗ وَلِعَقِبِهٖ فَاِنَّهَا لِلَّذِيْ يُعْطَاهَا لَا تَرْجِعُ اِلَى الَّذِيْ اَعْطَاهَا اَبَدًا لِاَنَّهٗ اَعْطٰى عَطَاءً وَقَعَتْ فِيْهِ الْمَوَارِيْثُ-

﴿جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے عین حیات کے لیے کسی شخص اور اس کے اخلاف کے لیے کچھ دیا، تو وہ اس کا ہو جائے گا جس کو دیا گیا ہے- وہ اس شخص کو اب کبھی نہیں لوٹے گا جس نے وہ دیا تھا، کیونکہ اس کے دیے ہوئے میں اب وراثت قائم ہو گئی-﴾

وضاحت :

عمریٰ سے مراد وہ چیز ہے جو کسی کو عین حیات استعمال کے لیے دے دی جائے- عمریٰ کسی شرط کے ساتھ مشروط بھی ہو سکتا ہے- شرط اگر یہ ہے "لك و لعقبك" تمہارے لیے اور تمہارے اخلاف کے لیے، تو دینے والے کا حق اس پر سے ساقط ہو جائے گا اور عمریٰ پانے والے کی وفات کی صورت میں وراثت لاگو ہو جائے گی- لیکن اگر اس طرح کی بات نہیں کہی گئی بلکہ یہ واضح کر دیا گیا کہ تم اس چیز کو اپنی یا میری زندگی تک استعمال میں لا سکتے ہو تو وہ چیز دونوں میں سے کسی ایک کی وفات کے بعد لوٹ آئے گی-

☐ حَدَّثَنِيْ مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ الْقَاسِمِ اَنَّهٗ سَمِعَ مَكْحُوْلًا الدِّمَشْقِيَّ يَسْاَلُ الْقَاسِمَ بْنَ مُحَمَّدٍ عَنِ الْعُمْرٰى وَمَا يَقُوْلُ النَّاسُ فِيْهَا فَقَالَ الْقَاسِمُ بْنُ مُحَمَّدٍ مَا اَدْرَكْتُ النَّاسَ اِلَّا وَهُمْ عَلٰى شُرُوْطِهِمْ فِيْ اَمْوَالِهِمْ وَ فِيْمَا اَعْطَوْا قَالَ يَحْيَى سَمِعْتُ مَالِكًا يَقُوْلُ وَ عَلٰى ذٰلِكَ الْاَمْرُ عِنْدَنَا اَنَّ الْعُمْرٰى تَرْجِعُ اِلَى الَّذِيْ اَعْمَرَهَا اِذَا لَمْ يَقُلْ هِيَ لَكَ وَ لِعَقِبِكَ-

﴿عبدالرحمٰن بن قاسم سے روایت ہے کہ انہوں نے مکحول دمشقی کو قاسم بن محمد سے عمریٰ اور اس کے بارے میں لوگوں کے فتووں کے متعلق سوال کرتے سنا- قاسم بن محمد نے جواب دیا کہ میں نے تو لوگوں کو اپنے عطیوں اور مالوں کے معاملے میں اپنے اپنے شرائط ہی پر پایا- یحییٰ کہتے ہیں کہ امام مالکؒ کا فتویٰ یہ ہے کہ عمریٰ ہمیشہ دینے والے کی طرف لوٹ جائے گا، جب تک اس نے یہ وضاحت نہ کر دی ہو کہ یہ تیرے اور تیرے اخلاف کے لیے ہے-﴾

وضاحت :

مطلب یہ ہے کہ لوگ بالعموم کسی کو کوئی چیز استعمال کے لیے دیتے وقت شرائط عائد کر دیتے ہیں تو فیصلہ

انہی شرائط کے مطابق ہوگا- یہ بات بالکل معقول ہے کیونکہ اس میں جائداد کی منتقلی کا سوال پیدا ہوتا ہے لہذا شرائط کی تصریح ضروری ہے- اگر کسی نے واضح شرائط عائد نہ کی ہوں تو پھر شبہ کا فائدہ عمری دینے والے کو ملنا چاہیے، اگر وہ اس کا مدعی ہے-

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ وَرِثَ مِنْ حَفْصَةَ بِنْتِ عُمَرَ دَارَهَا قَالَ وَ كَانَتْ حَفْصَةُ قَدْ اَسْكَنَتْ بِنْتَ زَيْدِ بْنِ الْخَطَّابِ مَا عَاشَتْ فَلَمَّا تُوُفِّيَتْ بِنْتُ زَيْدٍ قَبَضَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ الْمَسْكَنَ وَرَاٰى اَنَّهُ لَهُ-

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حضرت حفصہ بنت عمرؓ سے وراثت میں ان کا گھر پایا- حضرت حفصہ نے اس گھر میں زید بن خطاب کی لڑکی کو عمر بھر کے لیے ٹھہرا رکھا تھا- جب بنت زید کی وفات ہو گئی تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے مکان پر قبضہ کر لیا- ان کا خیال تھا کہ وہ اس کے حق دار ہیں-﴾

وضاحت :

اس واقعہ میں اوپر والی روایت کی دلیل ہے کہ عمری یا حین حیات بہ میں جب تک لك و لعقبك کی شرط نہ ہو وہ دینے والے یا اس کے ورثا کی طرف لوٹ جاتا ہے-

اَلْقَضَاءُ فِي اللُّقَطَةِ

گرے پڑے مال کے بارے میں فیصلہ

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ اَبِي عَبْدِالرَّحْمٰنِ عَنْ يَزِيدَ مَوْلَى الْمُنْبَعِثِ عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ الْجُهَنِيِّ اَنَّهُ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلٰى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَسَاَلَهُ عَنِ اللُّقَطَةِ فَقَالَ اعْرِفْ عِفَاصَهَا وَ وِكَاءَهَا ثُمَّ عَرِّفْهَا سَنَةً فَاِنْ جَاءَ صَاحِبُهَا وَ اِلَّا فَشَاْنُكَ بِهَا قَالَ فَضَالَّةُ الْغَنَمِ يَا رَسُولَ اللّٰهِ قَالَ هِيَ لَكَ اَوْ لِاَخِيكَ اَوْ لِلذِّئْبِ قَالَ فَضَالَّةُ الْاِبِلِ قَالَ مَالَكَ وَلَهَا مَعَهَا سِقَاؤُهَا وَحِذَاؤُهَا تَرِدُ الْمَاءَ وَتَاْكُلُ الشَّجَرَ حَتّٰى يَلْقَاهَا رَبُّهَا-

﴿زید بن خالد جہنی سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا- اس نے

گرے پڑے مال کا حکم پوچھا- آپ نے فرمایا کہ اس چیز کا برتن اور بند حسن پہچان رکھو اور ایک سال تک اس کو پہچانو- اگر مالک آجائے تو اس کو دے دو ورنہ اس سے جو چاہو کرو- اس نے کہا کہ یا رسول اللہ اگر گری ہو؟ آپ نے فرمایا کہ اس کا فائدہ تم اٹھاؤ گے یا تمہارا بھائی ورنہ بھیڑیا کھا جائے گا- اس نے کہا حضور اگر گم شدہ اونٹ ہو؟ آپ نے فرمایا، اس سے تمہیں کیا مطلب؟ اس کا مشکیزہ اور جوتا اس کے ساتھ ہے- چشمے پر جا کر پانی پی لے گا، جنگل میں جا کر چرے گا، یہاں تک کہ اس کا مالک اسے پالے گا-﴾

وضاحت :

گری پڑی چیز کے بارے میں سائل کے سوال پر آنحضرت ﷺ نے جو جواب دیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر آدمی اس چیز کو اٹھالے تو اس کے مالک کی تلاش میں اسے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھنی چاہیے- ایک سال تک اس کا اعلان کراتے رہنا چاہیے اور اگر مالک نہ ملے تب وہ چیز اس کی ہو جائے گی- چھوٹے جانور کی صورت میں مالک کے ملنے تک اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے- ایسے بڑے جانور جو اپنا دفاع خود کر سکتے ہیں تو ان کو قبضہ میں لے کر تو تو ان کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لینی چاہیے- مشکیزہ اور جوتا تعبیر ہے اس بات کی کہ اونٹ اپنا پیٹ خود بھر سکتا ہے اور اپنے پاؤں سے چل پھر سکتا اور خطرے کی صورت میں بھاگ سکتا ہے-

□ وَحَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ اَيُّوبَ بْنِ مُوسٰى عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ بَدْرٍ الْجُهَنِيِّ اَنَّ اَبَاهُ اَخْبَرَهُ اَنَّهُ نَزَلَ مَنْزِلَ قَوْمٍ بِطَرِيقِ الشَّامِ فَوَجَدَ صُرَّةً فِيهَا ثَمَانُونَ دِينَارًا فَذَكَرَهَا لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ عَرِّفْهَا عَلٰى اَبْوَابِ الْمَسَاجِدِ وَ اذْكُرْهَا لِكُلِّ مَنْ يَاْتِي مِنَ الشَّامِ سَنَةً فَاِذَا مَضَتِ السَّنَةُ فَشَاْنُكَ بِهَا-

﴿عبداللہ بن بدر جہنی کہتے ہیں کہ شام کے راستے میں وہ ایک منزل پر اترے- وہاں ان کو ایک تھیلی ملی جس میں ۸۰ دینار تھے- انہوں نے اس کا ذکر حضرت عمرؓ سے کیا- انہوں نے کہا کہ ایک سال تک مسجدوں کے دروازوں پر اس کا تعارف کراؤ اور ہر اس شخص سے جو شام سے آئے اس کا ذکر کرو- جب ایک سال گزر جائے تو اس کے بعد اس سے جو چاہو کرو-﴾

❐ وَحَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ أَنَّ رَجُلًا وَجَدَ لُقْطَةً فَجَاءَ إِلَى عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ فَقَالَ لَهُ إِنِّي وَجَدْتُ لُقْطَةً فَمَا تَرَى فِيهَا فَقَالَ لَهُ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ عَرِّفْهَا قَالَ قَدْ فَعَلْتُ قَالَ زِدْ قَالَ قَدْ فَعَلْتُ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ لَا آمُرُكَ أَنْ تَأْكُلَهَا وَلَوْ شِئْتَ لَمْ تَأْخُذْهَا۔

﴿نافع کہتے ہیں کہ ایک شخص کو گرا پڑا مال ملا۔ وہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے پڑا ہوا مال پایا ہے تو اس کے بارے میں آپ کیا فتویٰ دیتے ہیں۔ عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ اس کا اعلان کرو۔ اس نے کہا یہ تو میں کر چکا۔ انہوں نے کہا اور کرو۔ اس نے کہا بہتیرا کیا ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ نے کہا میں یہ اجازت تو نہیں دے سکتا کہ تم اس کو ہڑپ کر لو۔ اگر چاہتے تو نہ اٹھاتے۔﴾

وضاحت :

یہ اوپر کی حدیث میں بیان کردہ نبی ﷺ کی ہدایت کی عملی مثالیں بیان ہوئی ہیں۔

اَلْقَضَاءُ فِي الضَّوَالِّ

گمشدہ یا آوارہ جانوروں کے متعلق فیصلہ

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ أَنَّ ثَابِتَ بْنَ الضَّحَّاكِ الْأَنْصَارِيَّ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ وَجَدَ بَعِيرًا بِالْحَرَّةِ فَعَقَلَهُ ثُمَّ ذَكَرَهُ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَأَمَرَهُ عُمَرُ أَنْ يُعَرِّفَهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَقَالَ لَهُ ثَابِتٌ أَنَّهُ قَدْ شَغَلَنِي عَنْ ضَيْعَتِي فَقَالَ لَهُ عُمَرُ أَرْسِلْهُ حَيْثُ وَجَدْتَهُ۔

❐ وَحَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ وَهُوَ مُسْنِدٌ ظَهْرَهُ إِلَى الْكَعْبَةِ مَنْ أَخَذَ ضَالَّةً فَهُوَ ضَالٌّ۔

❐ وَحَدَّثَنِي مَالِكٌ أَنَّهُ سَمِعَ بْنَ شِهَابٍ يَقُولُ كَانَتْ ضَوَالُّ الْإِبِلِ فِي زَمَانِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ إِبِلًا مُؤَبَّلَةً تُنَاتَجُ لَا يَمَسُّهَا أَحَدٌ حَتَّى إِذَا كَانَ زَمَانُ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ أَمَرَ

بِتَعْرِيفِهَا ثُمَّ تُبَاعُ فَإِذَا جَاءَ صَاحِبُهَا أُعْطِيَ ثَمَنَهَا۔

﴿ثابت بن ضحاک انصاریؓ نے خبر دی کہ ان کو حرۃ کے علاقہ میں ایک اونٹ ملا تو انہوں نے اس کو باندھ چھوڑا۔ پھر حضرت عمر بن خطابؓ سے ذکر کیا تو انہوں نے حکم دیا کہ آپ تین مرتبہ اس کا اعلان کریں۔ ثابت نے ان سے کہا کہ اس نے تو میرا اپنا کاروبار درہم برہم کر دیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ پھر اسے جہاں پایا ہے وہیں لے جا کر چھوڑ دو۔

سعید بن مسیب کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے، جب وہ خانہ کعبہ سے اپنی کمر کی ٹیک لگائے ہوئے تھے، فرمایا کہ جس کسی نے گمشدہ جانور کو ہڑپ کر لیا وہ گمراہ آدمی ہے۔

ابن شہاب کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں کھوئے ہوئے اونٹوں کا ایک ریوڑ بن گیا تھا جس سے بچے پیدا ہونے لگ گئے۔ کوئی ان کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ جب حضرت عثمانؓ کا زمانہ آیا تو انہوں نے حکم دیا کہ ان کا اعلان کرایا جائے، پھر ان کو بیچ دیا جائے اور جب ان کے مالک آئیں تو ان کو اونٹوں کی قیمت دے دی جائے۔﴾

وضاحت :

اوپر گری پڑی چیز یا آوارہ جانور کے بارے میں کل چھ روایات نقل ہوئی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے دور سے لے کر حضرت عثمانؓ کے دور تک گمشدہ مال و متاع کے متعلق احکام میں تدریجی ارتقاء ہوا ہے۔ صرف پہلی روایت مرفوع حدیث ہے، باقی سب صحابہ کے آثار ہیں۔ گری پڑی چیز کے متعلق تو یہ ہوا کہ ایک سال تک اعلان کرنے کی شرط کو لوگوں نے مشکل سمجھا اور یہ رجحان پیدا ہو گیا کہ گری پڑی چیز کو نہ ہی اٹھایا جائے۔ اعلان کے کھکھیڑ میں نہ پڑنا ہی بہتر ہے۔ گمشدہ اونٹ کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس کو پکڑنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنا زادِ راہ ساتھ لیے ہوئے ہے۔ حضرت عمرؓ کے پاس جب یہ مسئلہ آیا تو انہوں نے حکم دیا کہ تین مرتبہ مختلف موقعوں پر اس کا اعلان کیا جائے۔ جب پکڑنے والے صاحب نے کہا کہ اس چکر میں ان کا کاروبار خراب کرے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس کو جہاں سے پکڑا تھا وہیں چھوڑ دو۔ اس کے بعد کوئی گمشدہ اونٹ کو ہاتھ نہ لگاتا تھا۔ یہاں تک کہ ان کا ایک ریوڑ بن گیا اور افزائش نسل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ صورت حال

لوگوں کے لیے دردِ سر بن گئی تو حضرت عثمانؓ کے دور میں پھر یہ فیصلہ ہوا کہ لونٹ کا اعلان کرنے کے بعد اس کو فروخت کر دیا جائے اور جب مالک آئے تو اس کو قیمت دے دی جائے۔

اس زمانے میں حکومت نے مویشی خانے یا کانجی ہاؤس بنا رکھے ہیں جہاں آوارہ جانوروں کو رکھا جاتا ہے۔ مالک اگر آتا ہے تو خرچہ کی رقم لوا کر کے مویشی لے جا سکتا ہے۔ یہ اچھا انتظام ہے، اگر طریقہ ایمانداری سے چلایا جائے۔ مجھے حضرت عثمانؓ کا طریقہ درست معلوم ہوتا ہے۔

صَدَقَةُ الْحَيِّ عَنِ الْمَيِّتِ

زندہ کا مردہ کی طرف سے صدقہ

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ سَعِيدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ شُرَحْبِيلَ بْنِ سَعِيدِ بْنِ سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ عَنْ اَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ اَنَّهُ قَالَ خَرَجَ سَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فِي بَعْضِ مَغَازِيهِ فَحَضَرَتْ اُمَّهُ الْوَفَاةُ بِالْمَدِينَةِ فَقِيلَ لَهَا اَوْصِي فَقَالَتْ فِيمَ اَوْصِي اِنَّمَا الْمَالُ مَالُ سَعْدٍ فَتُوُفِّيَتْ قَبْلَ اَنْ يَقْدَمَ سَعْدٌ فَلَمَّا قَدِمَ سَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ ذُكِرَ ذٰلِكَ لَهُ فَقَالَ سَعْدٌ يَا رَسُولَ اللّٰهِ هَلْ يَنْفَعُهَا اَنْ اَتَصَدَّقَ عَنْهَا فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ نَعَمْ فَقَالَ سَعْدٌ حَائِطُ كَذَا وَ كَذَا صَدَقَةٌ عَنْهَا لِحَائِطِ سَمَّاهُ۔

﴿شرحبیل بن سعید روایت کرتے ہیں کہ سعد بن عبادہؓ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کسی غزوہ میں نکلے۔ اس دوران میں مدینہ میں ان کی والدہ کی وفات ہو گئی۔ وفات کے وقت ان سے کہا گیا کہ آپ کچھ وصیت کر دیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں کس چیز میں وصیت کر سکتی ہوں، سارا مال تو سعد کا ہے۔ سعد کی واپسی سے پہلے ان کی وفات ہو گئی۔ جب سعد بن عبادہؓ آئے تو ان سے اس بات کا ذکر کیا گیا۔ سعد نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ، اگر میں ان کی طرف سے کچھ صدقہ کروں تو کیا ان کو نفع ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں۔ سعد نے کہا کہ فلاں فلاں باغ ان کی طرف سے صدقہ ہے۔ باغ کو انہوں نے نامزد کر دیا۔﴾

وضاحت:

سعد بن عبادہؓ مسلمانوں کے ایک بڑے لیڈر ہیں۔ یہ ان کا واقعہ ہے۔ ان کی والدہ کی وفات کے وقت لوگوں نے کہا کہ اگر آپ کچھ وصیت کرنا چاہتی ہیں تو کر دیں۔ انہوں نے کہا کس طرح وصیت کروں۔ مال تو سعد کا ہے۔ یعنی اگر سعد موجود ہوتے تو میں کچھ کہتی، ان کی عدم موجودگی میں کیا وصیت کروں۔ ان کی وفات کے بعد جب سعد آئے تو ان کو والدہ کا یہ جواب بتایا گیا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ اگر میں والدہ کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا ان کو نفع ہو گا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ہاں۔ چنانچہ انہوں نے ایک باغ ماں کی طرف سے صدقہ کر دیا۔

اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر اولاد اپنے والدین کی طرف سے صدقہ کرے تو آخرت میں وہ ان کے کام آئے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاد حقیقت میں اپنے ماں باپ کے عمل میں شریک ہوتی ہے اس لیے کہ وہ ان کی تربیت میں پروان چڑھتی اور انہی کی تربیت سے نیکی اور بدی سیکھتی ہے۔ لہٰذا عام حالات میں بھی اولاد کے نیک اعمال میں سے والدین کو کچھ حصہ ملتا ہے۔ اولاد اگر خاص طور پر والدین کی طرف سے کوئی نیکی کرے تو ان کو اس کا ثواب بدرجہ اولیٰ ملنا چاہیے۔ لیکن والدین کو اولاد کے عمل کے فائدہ کا تعلق صرف انہی معاملات سے ہے جن میں اولاد کی نیکی کر کے والدین کا کوئی حق ادا کرنا ممکن ہے۔ چنانچہ والدین نے اگر نماز نہیں پڑھی تو اولاد نماز پڑھ کر ان کا فرض ادا نہیں کر سکتی۔ حج بدل کے بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ کرائے کا حج بدل کوئی چیز نہیں، لیکن اگر کسی کے ماں باپ کو حج کی خواہش رہی لیکن ان کے پاس اس کے وسائل نہیں تھے، اولاد کے پاس ذرائع ہیں تو ان کی خواہش کی تکمیل میں اولاد حج کرے گی تو والدین کو ثواب ضرور ملے گا۔

رہے روزمرہ کے معاملات جن کے متعلق اندیشہ ہو کہ ان میں والدین سے کوتاہی ہوئی ہے تو میرے نزدیک اگر اولاد ہو سکا تو اپنے نوافل میں والدین کا کچھ حق رکھے تو اس کا ثواب ان کو ملے گا۔ تو جہاں تک اولاد کا تعلق ہے ان کے اعمال کا ثواب والدین کو ملتا ہے، دوسروں کے اعمال کا نہیں۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيهِ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اُمِّي افْتُلِتَتْ نَفْسُهَا وَ اَرَاهَا لَوْ تَكَلَّمَتْ تَصَدَّقَتْ اَفَاَتَصَدَّقُ عَنْهَا فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ نَعَمْ۔

﴿حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ حضور، میری والدہ کا اچانک انتقال ہو گیا۔ میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اگر وہ بات کر سکتیں تو کچھ صدقہ کرتیں۔ اب کیا میں ان کی طرف سے صدقہ کر دوں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، ہاں۔﴾

وضاحت :

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وہی اوپر والی روایت ہے لیکن میرا رجحان اس طرف ہے کہ یہ الگ ہے۔ بات اس میں بھی وہی ہے کہ اگر اولاد والدین کی طرف سے صدقہ کرے گی تو بے شک وہ قبول ہو گا۔ اولاد کا عمل یوں بھی قبول ہوتا ہے۔ اس میں سے والدین کو حصہ ملتا ہے بشرطیکہ اس نیکی میں ان کی تربیت کو دخل رہا ہو۔ مثلاً والدین نے ان کو تعلیم دلائی اور اس تعلیم کے فیض سے وہ کوئی نیکی کرتی ہے۔ عام تربیت کے اندر بھی ماں باپ کا حصہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اولاد کی نیکی حقیقت میں والدین کی کمائی میں شامل ہے۔

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ رَجُلًا مِنَ الْأَنْصَارِ مِنْ بَنِي الْحَارِثِ بْنِ الْخَزْرَجِ تَصَدَّقَ عَلَى أَبَوَيْهِ بِصَدَقَةٍ فَهَلَكَا فَوَرِثَ ابْنَهُمَا الْمَالَ وَهُوَ نَخْلٌ فَسَأَلَ عَنْ ذَلِكَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ قَدْ أُجِرْتَ فِي صَدَقَتِكَ وَخُذْهَا بِمِيرَاثِكَ۔

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی کہ انصار کے قبیلہ بنو حارث بن خزرج کے ایک شخص نے اپنے ماں باپ پر صدقہ کیا۔ پھر دونوں کی وفات ہو گئی تو بیٹے کو وہی مال وراثت میں ملا، اور یہ کھجوروں کا ایک باغ تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا مسئلہ پوچھا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم کو صدقے کا اجر بھی مل گیا اور اب وراثت میں یہ باغ بھی پاؤ۔﴾

وضاحت :

یہ ہے ہم خرما و ہم ثواب۔ یہ وہی بات ہے جیسے حضرت عائشہؓ کی لونڈی بریرہ کو کچھ گوشت صدقہ میں ملا، انہوں نے پکانے کی غرض سے اس کو ہنڈیا میں چولہے پر رکھا ہوا تھا۔ اتنے میں نبی ﷺ تشریف لائے اور حضرت عائشہؓ سے پوچھا، کھانے کو کچھ ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ بریرہ کو صدقے کا گوشت ملا ہے، وہ تو آپ

نہیں کے نہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ ان کے لیے صدقہ ہے، ہمارے لیے ہدیہ ہو گا۔

اَلْاَمْرُ بِالْوَصِيَّةِ

وصیت کے متعلق حکم

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَا حَقُّ امْرِئٍ مُسْلِمٍ لَهُ شَيْءٌ يُوصِي فِيهِ يَبِيتُ لَيْلَتَيْنِ إِلَّا وَوَصِيَّتُهُ عِنْدَهُ مَكْتُوبَةٌ

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کے اوپر یہ ضروری حق ہے کہ اگر اس کے پاس کوئی ایسی چیز ہو جس کے بارے میں وہ کو وصیت کرنی ہو تو دو راتیں بھی نہ گزرنے دے بجز اس کے کہ اس کے پاس اس کی وصیت لکھی ہوئی ہو۔﴾

وضاحت :

اگر کسی چیز میں آپ کو وصیت کرنی ہے تو اس کے متعلق بہت جلد کر دینا چاہیے۔ یہ انتظار نہ کرنا چاہیے کہ ہو جائے گی، ابھی کیا جلدی ہے۔ بہت سے معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ جن سے جھگڑے بن جاتے ہیں اور درمیان میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے تاکید ہے کہ وصیت وقت سے بہت پہلے لکھ کر رکھی جائے۔ معلوم نہیں موت کس وقت آجائے۔ قرآن کا بھی یہی منشوم معلوم ہوتا ہے۔

جَوَازُ وَصِيَّةِ الصَّغِيرِ وَالضَّعِيفِ وَالْمُصَابِ وَالسَّفِيهِ

بچے، کمزور، بیمار اور نادان کی وصیت کے جواز کے بارے میں

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ أَبِي بَكْرِ بْنِ حَزْمٍ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ عَمْرَو بْنَ سُلَيْمٍ الزُّرَقِيَّ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ قِيلَ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ إِنَّ هَاهُنَا غُلَامًا يَفَاعًا لَمْ يَحْتَلِمْ مِنْ غَسَّانَ وَوَارِثُهُ بِالشَّامِ وَهُوَ ذُو مَالٍ وَلَيْسَ لَهُ هَاهُنَا إِلَّا ابْنَةُ عَمٍّ لَهُ قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَلْيُوصِ لَهَا قَالَ فَأَوْصَى لَهَا بِمَالٍ يُقَالُ لَهُ بِئْرُ جُشَمٍ قَالَ عَمْرُو بْنُ سُلَيْمٍ فَبِيعَ ذٰلِكَ الْمَالُ بِثَلَاثِينَ أَلْفَ دِرْهَمٍ وَابْنَةُ

عَمِّهِ الَّتِی اَوْصٰی لَهَا هِیَ اُمُّ عَمْرِو بْنِ سُلَیْمِ الزُّرَقِیِّ۔

﴿ابوبکر بن حزم سے روایت ہے کہ عمرو بن سلیم الزرقی نے ان کو خبر دی کہ حضرت عمر بن خطابؓ کو بتایا گیا کہ یہاں ایک کمسن نابالغ لڑکا ہے۔ وہ غسان قبیلے کا اور مال دار ہے لیکن اس کا وارث شام میں ہے۔ یہاں اس کی پچاکی بیٹی کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ وہ اس لڑکی کے لیے وصیت کردے۔ تو اس نے پچاز اد بہن کے لیے کچھ جائداد، جو بیر جشم کے نام سے موسوم ہے، کی وصیت کردی۔ عمرو بن سلیم کہتے ہیں کہ وہ باغ تیس ہزار درہم میں بکا۔ اس لڑکے کی پچاز اد بہن، جس کے حق میں اس نے وصیت کی، عمرو بن سلیم کی والدہ تھیں۔﴾

وضاحت :

جس طرح یہ معاملہ یہاں بیان ہوا ہے یہ اصول کے خلاف ہے۔ احناف اور شوافع اس کو نہیں مانتے لیکن بالکیہ کا یہی مسلک ہے۔ احناف اور شوافع اپنے مسلک کی بنیاد قرآن مجید کا یہ حکم بتاتے ہیں کہ یتیم کا مال اس کے حوالے نہ کرو جب تک اس میں سمجھ بوجھ پیدا نہ ہو جائے۔ جب قرآن مجید بچوں کا حق دینے میں یہ قید لگاتا ہے تو پھر وصیت کے معاملے میں ان کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ احناف اور شوافع کا مسلک زیادہ قوی ہے۔ قرآن مجید سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ باقی رہ گیا حضرت عمرؓ کا فیصلہ تو وہ تمام کوائف کو ملحوظ رکھ کر کیا گیا ہوگا جو ہمارے سامنے نہیں ہیں۔ مثلاً لڑکے کے وارث کون لوگ تھے، وہ مسلمان تھے یا کافر، بیر جشم کے علاوہ جائداد کیا تھی اور اس کا کیا ہوا۔ وغیرہ۔

اَلْوَصِیَّةُ فِی الثُّلُثِ لَا یُتَعَدّٰی

ایک ثلث سے زیادہ میں وصیت نہیں کر سکتے

☐ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدِ بْنِ اَبِی وَقَّاصٍ عَنْ اَبِیْهِ اَنَّهٗ قَالَ جَاءَنِی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَعُوْدُنِی عَامَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ مِنْ وَجَعٍ اشْتَدَّ بِی فَقُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَدْ بَلَغَ بِی مِنَ الْوَجَعِ مَا تَرٰی وَ اَنَا ذُوْمَالٍ وَلَا یَرِثُنِی اِلَّا ابْنَةٌ لِی اَفَاَتَصَدَّقُ بِثُلُثَیْ مَالِی قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا فَقُلْتُ فَالشَّطْرُ قَالَ لَا ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلثُّلُثُ وَالثُّلُثُ كَثِیْرٌ

اِنَّكَ اَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ اَغْنِیَاءَ خَیْرٌ مِنْ اَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً یَتَكَفَّفُوْنَ النَّاسَ وَ اِنَّكَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِی بِهَا وَجْهَ اللّٰهِ اِلَّا اُجِرْتَ حَتّٰی مَا تَجْعَلُ فِی فِی امْرَاَتِكَ قَالَ فَقُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اُخَلَّفُ بَعْدَ اَصْحَابِی فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّكَ لَنْ تُخَلَّفَ فَتَعْمَلَ عَمَلًا صَالِحًا اِلَّا ازْدَدْتَ بِهٖ دَرَجَةً وَ رِفْعَةً وَلَعَلَّكَ اَنْ تُخَلَّفَ حَتّٰی یَنْتَفِعَ بِكَ اَقْوَامٌ وَ یُضَرَّ بِكَ اٰخَرُوْنَ اَللّٰهُمَّ اَمْضِ لِاَصْحَابِی هِجْرَتَهُمْ وَ لَا تَرُدَّهُمْ عَلٰی اَعْقَابِهِمْ لٰكِنِ الْبَائِسُ سَعْدُ بْنُ خَوْلَةَ یَرْثِی لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ مَاتَ بِمَكَّةَ۔

﴿سعد بن ابی وقاص روایت کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے سال رسول اللہ ﷺ میری بیماری کی شدت میں عیادت کو آئے۔ میں نے کہا یارسول اللہ مجھے جو تکلیف ہے وہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ میرے پاس مال بہت ہے اور بیٹی کے سوا اور کوئی میرا وارث نہیں ہے۔ تو کیا میں دو تہائی صدقہ کر دوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ میں نے کہا نصف کر دوں۔ آپؐ نے فرمایا نہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک ثلث صدقہ کر دو اور ایک ثلث بھی بہت ہے۔ یہ بات کہ تم اپنی اولاد کو خوشحالی میں چھوڑو اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو محتاج چھوڑو کہ وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ اگر تم اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرو گے تو تم کو اس کا اجر ملے گا یہاں تک کہ تم اپنی بیوی کو جو لقمہ بھی کھلاؤ گے اس پر بھی تم کو اجر ملے گا۔ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ یارسول اللہ! کیا میں اپنے ساتھیوں کے بعد مزید زندگی پاؤں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تمہیں مہلت نہ ملی تو تم نے جو عمل صالح کیے ہیں اس کے نتیجے میں تمہارے درجات کی بلندی اور عزت میں اضافہ ہوگا۔ اور اس بات کا امکان ہے کہ تم زندگی پاؤ اور تمہارے ذریعے سے قوموں کو فائدہ پہنچے اور دشمنوں کا تمہارے ہاتھوں نقصان ہو۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے دعا فرمائی کہ اے رب، میرے اصحاب کی ہجرت کو کامل کر اور ان کو پیٹھ پیچھے نہ لوٹا۔ بیچارے سعد بن خولہؓ کے ساتھ آپ نے ہمدردی کی کیونکہ وہ مکہ میں ہی وفات پا گئے تھے۔﴾

وضاحت :

آنحضرت ﷺ نے حضرت سعدؓ کو ایک ثلث یعنی ایک تہائی تک مال صدقہ کرنے کی اجازت دی۔

ساتھ یہ بھی فرمایا کہ ایک تہائی بھی بہت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے زیادہ نہیں دینا چاہیے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ ایک ٹمٹ بھی نہ دے۔ جس کے پاس دافر مال ہے اور ورثا زیادہ نہیں تو سب ورثا کو کافی مال وراثت میں مل جائے گا۔ اس صورت میں ایک ٹمٹ تک صدقہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اس سے کم کی تو گنجائش آپ کے اس ارشاد سے ہی نکلتی ہے کہ ورثا کو تنگ حال نہ چھوڑو کہ آپ صدقہ کر دو اور وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ اس کا فلسفہ آپ نے یہ بیان فرمایا کہ اولاد پر اگر اللہ کی رضاجوئی کے لیے خرچ کیا جائے تو وہ بھی نیکی ہے اور اس کا اجر ہے، یہاں تک کہ بیوی پر خرچ بھی اسی زمرے میں آتا ہے، یعنی وہ بھی صدقہ ہے۔ صرف دوسروں کو دینا ہی صدقہ نہیں، بیوی بچوں کا حق سب سے پہلے ہے۔ اولاد کے لیے خوش حالی چاہنا فطرت کا تقاضا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ اولاد پر خرچ کرنا بھی عبادت ہے۔ صرف یہی عبادت نہیں کہ آپ کسی دوسرے کو اٹھا کر دے دیں۔

اس کے بعد حضرت سعدؓ نے نبی ﷺ کے سامنے اس خدشے کا اظہار کیا کہ معلوم نہیں میں اپنے ساتھیوں کے بعد زندہ رہوں گا یا نہیں۔ آنحضرت نے فرمایا اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر زندگی کی مہلت نہ ملے تو نیک اعمال کے نتیجہ میں اجر میں زیادتی اور بلندی اور عزت حاصل ہو گی۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ تم مہلت حیات پاؤ اور تمہارے ذریعے سے قوموں کو فائدہ ہو۔ زندگی ہو تو آدمی بڑے بڑے کام کر جاتا ہے۔ حضرت سعدؓ بہت بڑے آدمی تھے۔ اگر ان کو زندگی کے اور دن مل جاتے تو کوئی کارنامہ کر جاتے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ نبی ﷺ کی توقع کے مطابق حضرت سعدؓ نے دین کی سربلندی کے لیے بے پناہ کام کیا اور ایران کی بادشاہت کا خاتمہ کر کے اس علاقہ کو ہمیشہ کے لیے اسلامی مملکت کا حصہ بنا دیا۔

روایت میں بیان کردہ واقعہ مکہ میں پیش آیا۔ نبی ﷺ نے حضرت سعدؓ کی یہ تشویش دیکھی کہ کہیں ان کا وقت آخر مکہ میں نہ آ جائے۔ مکہ میں مر جانا عام طور پر قباحت تشویش نہیں لیکن حضرت سعدؓ نے مکہ سے مدینہ کو ہجرت کی تھی اور مسلمان ہجرت کو بڑی اونچی چیز سمجھتے تھے، اور جا طور پر ایسا سمجھتے تھے۔ دارالہجرت سے واپسی ان کو ناگوار تھی۔ لہذا اس کے بارے میں آنحضرتؐ نے تسلی کر دی کہ تم زندہ رہو گے۔ اور دعا بھی فرمائی کہ اے اللہ میرے اصحاب کی ہجرت کو کامل کر اور ان کو پیٹھ پیچھے نہ لوٹا۔ یعنی اب کسی کو یہ اتفاق پیش نہ آئے کہ ہجرت کے درجے سے گر کر وہ یہاں آ کر وفات پائے۔ آپ نے سعدؓ بن خولہؓ کے لیے ہمدردی کی کیونکہ ان کی وفات مکہ میں ہو گئی تھی۔

اَمْرُ الحَامِلِ وَالمَرِيْضِ وَالَّذِي يَحْضُرُ القِتَالَ فِي اَمْوَالِهِمْ

حاملہ، مریض اور محاذ جنگ پر سپاہی کے مالی معاملات

امام مالک کے فتوے :

یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک کو فرماتے سنا کہ بہترین بات جو میں نے حاملہ کی وصیت اور اس کے مالی معاملات اور اس کے تصرفات کے بارے میں سنی وہ یہ ہے کہ حاملہ عورت مریض کے حکم میں ہے۔ اگر مرض بڑھنے کا کوئی اندیشے کی بات نہ ہو تو جس طرح مریض اپنے مال میں جو چاہے تصرف کر سکتا ہے اسی طرح سے حاملہ عورت بھی کر سکتی ہے۔ لیکن اگر مرض اندیشہ ناک ہو تو مریض کو ایک تہائی سے زیادہ میں تصرف کی اجازت نہیں۔ کہتے ہیں کہ اسی طرح سے حاملہ عورت کا ابتدائے حمل کا دور تو خوشی اور مسرت کا ہے۔ وہ نہ مرض ہے اور نہ ہی اندیشہ ناک ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے۔ "ہم نے اس کو خوشخبری دی اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی" نیز یہ فرمایا کہ "اس نے بڑا حمل اٹھایا اور اس کے ساتھ وقت گزارا۔ پھر جب وہ حمل ہو گئی تو دونوں میاں بیوی نے اپنے رب سے دعا شروع کی کہ اگر تو نے ہم کو اچھی اولاد بخشی تو ہم تیرے شکر گزار بندے بنیں گے"۔ حاملہ عورت کا ابتدائی حمل کا زمانہ چھ ماہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا کہ "مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں" اور فرمایا کہ "ان کا حمل اور دودھ چھڑانا تیس ماہ ہے" تو جب حاملہ کے چھ ماہ گزر جائیں تو اس کو جائز نہیں کہ صرف ایک ٹمٹ مال کے سوا اپنے مالی فیصلے کر سکے۔ میں نے مالک کو کہتے سنا کہ جو سوار محاذ جنگ پر ہے جب صف بندی ہو جائے تو اس کو بھی ایک ٹمٹ سے زیادہ میں فیصلہ کا اختیار نہیں۔ کیونکہ وہ بھی اس وقت حاملہ اور مریض اندیشہ ناک کے حکم میں ہے اور یہ اس وقت تک کے لیے ہے جب تک وہ جنگ کی حالت میں رہتا ہے۔

یہ سب امام مالک کے فتوے ہیں۔ جب ایک تہائی سے زیادہ میں وصیت کی ممانعت ہے تو کسی کے حاملہ یا مریض یا لڑائی میں ہونے سے کیا فرق پڑے گا۔ امام مالک کے ان نکتوں کے حق میں دلیل کیا ہے؟ وصیت کے بارے میں کوئی مرفوع روایت یا نص نہیں ہے۔ لہذا جب تک آدمی اپنے ہوش و حواس میں ہو وہ اپنے مال میں کامل

تصرف کا حق رکھتا ہے- حمل یا بیماری کی حالت میں اس کے حقوق مالکانہ کس طرح ساقط کیے جا سکتے ہیں- اوپر جو ایک ثلث کے بارے میں روایت گزری ہے اس میں اس طرح کی کوئی بات نہیں- ایک ثلث سے زیادہ میں وصیت کرنے کی ممانعت ہے لیکن یہ حرمت کے حکم میں نہیں بلکہ آپ نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ اپنے ورثا کو فقیر اور مسکین نہ چھوڑو- دوسری حکمت جو اس کی بتائی وہ یہ کہ یہ نہ سمجھو کہ دینی کاموں پر جو خرچ ہوتا ہے وہ دنیاداری ہے بلکہ وہ بھی دینداری ہے اور اس کا اجر ہے- ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو پورا حق ہے کہ وہ اپنے مال میں کامل تصرف کر سکتا ہے- باقی یہ ضرور ہے کہ اگر وصیت کرے تو ایک ثلث سے زیادہ نہ کرے- اپنے ورثا کو کھاتا پیتا چھوڑے یہ بھی عبادت ہے-

اَلْوَصِيَّةُ لِلْوَارِثِ وَالْحِيَازَةِ

وارث کو وصیت کرنے اور قبضہ کے بارے میں

امام مالک کے فتوے :

یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک سے سنا- وہ فرماتے تھے کہ آیت "اگر کوئی شخص کوئی مال چھوڑے تو اپنے والدین اور اقربا کے لیے وصیت کر جائے" منسوخ ہو گئی ہے- کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حقوق و فرائض مقرر فرما دیے- وہ کہتے ہیں کہ امام مالک فرماتے تھے کہ ہمارے ہاں علامت سنت، جس میں کوئی اختلاف نہیں، یہ ہے کہ وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں، بجز اس صورت کے کہ میت کے دوسرے وارث اس کی اجازت دے دیں- اگر بعض ورثا اجازت دے دیں اور دوسرے نہ دیں تو جنھوں نے اجازت دے دی ان کا حق وہ حاصل کر سکتا ہے، دوسرے انکار کرنے والے اپنا حق لے لیں گے-

سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۸۰ سورۂ نساء کی آیت "یوصیکم اللہ فی اولادکم" (اللہ تعالیٰ تم کو تمھاری اولادوں کے بارے میں وصیت کرتا ہے) سے منسوخ ہے- یہاں تک تو معروف بات ہے جس میں امام مالک کا کوئی خاص تخت نہیں ہے-

اس کے بعد امام مالک یہ فرماتے ہیں کہ علمائے مدینہ کا یہ متفق علیہ مسلک ہے کہ وارث کے لیے وصیت جائز نہیں قرار دی جا سکتی جب تک کہ میت کے دوسرے ورثا اس کی اجازت نہ دیں- مصلحت کے تحت تو وارث کے لیے وصیت کی اجازت کی بات اچھی ہے لیکن اس کی کامیابی مشکوک ہے- جب اجازت لینے کا مرحلہ آئے گا تو جھگڑا کھڑا ہو جائے گا- پھر اس بات کی دلیل کیا ہے- جب اللہ تعالیٰ نے وصیت کر دی تو اور کسی کا کیا حق رہ گیا- تو ان حضرات کے فتوے اور اللہ تعالیٰ کی وصیت میں مطابقت کیسے ہو گی- حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وصیت کو مانا ہے لیکن اس میں قبضہ کی شرط لگائی ہے، مشورہ دیا اجازت لینے کی نہیں- ورثا کو وصیت مصلحت کے تحت تو کی جا سکتی ہے کیونکہ بعض ورثا مثلاً پوتے کی وراثت کا جھگڑا ہو سکتا ہے- ایسی وصیت پر اعتراض نہیں- مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ دوسرے ورثا کو راضی کر لیا جائے تاکہ بعد میں اختلاف نہ ہو- گویا وصیت صرف اس وارث کے حق میں کی جائے گی جس کی کمزوری یا کمسنی یا اس کے حقوق و فرائض بجا لانے میں کمی رہ گئی ہو، تعلیم ادھوری رہ گئی ہو، ابھی کمانے کے قابل نہ ہو- جبکہ دوسرے کمانے کے قابل ہو چکے ہوں- وغیرہ- میری دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ نے یہ شرط مشورہ نہیں مانی ہے- انھوں نے یہ نہیں کہا کہ میں نے دوسرے ورثا سے اجازت نہیں لی تھی- ظاہر ہے کہ وارث کا یہی معاملہ ہے جبکہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک وارث جو ابھی پردے میں چھپا تھا، اس کا بھی لحاظ رکھا- یہ اجازت والی بات امام مالک کی ہے- یہ از قسم قیاس مرسل ہے جس کے لیے کوئی ضابطہ نہیں-

جَامِعُ الْقَضَاءِ وَكَرَاهِيَتُهُ

منصب قضا اور اس کے مکروہ ہونے کے بارے میں

حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ أَنَّ أَبَا الدَّرْدَاءِ كَتَبَ إِلَى سَلْمَانَ الْفَارِسِيِّ أَنْ هَلُمَّ إِلَى الْأَرْضِ الْمُقَدَّسَةِ فَكَتَبَ إِلَيْهِ سَلْمَانُ إِنَّ الْأَرْضَ لَا تُقَدِّسُ أَحَدًا وَ إِنَّمَا يُقَدِّسُ الْإِنْسَانَ عَمَلُهُ وَ قَدْ بَلَغَنِي أَنَّكَ جُعِلْتَ طَبِيبًا تُدَاوِي فَإِنْ كُنْتَ تُبْرِئُ فَبِعِمًّا لَكَ وَ إِنْ كُنْتَ مُتَطَبِّبًا فَاحْذَرْ أَنْ تَقْتُلَ إِنْسَانًا فَتَدْخُلَ النَّارَ فَكَانَ أَبُو الدَّرْدَاءِ إِذَا قَضَى بَيْنَ اثْنَيْنِ ثُمَّ أَدْبَرَا

عنهُ نظرَ اليهما و قالَ ارجعا اليَّ اعيدا عليَّ قصتكما منطبب" واللهِ-

﴿یحییٰ بن سعید روایت کرتے ہیں کہ ابو الدرداءؓ نے حضرت سلمان فارسیؓ کو لکھا کہ یہاں اس ارض مقدس میں تشریف لائیے- سلمان نے ان کو لکھا کہ کوئی زمین کسی کو مقدس نہیں کرتی بلکہ انسان کو اس کا عمل پاک کرتا ہے- مجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ آپ لوگوں کے علاج کے لیے طبیب بنا دیے گئے ہیں- اگر آپ کے علاج سے لوگ صحت پائیں تو آپ کے کیا کہنے اور اگر آپ یوں ہی عطائی ہیں تو احتیاط کریں، کہیں کسی انسان کو قتل کر کے آپ جہنم میں داخل نہ ہوں- ابو الدرداء کا حال یہ ہو گیا کہ جب وہ دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ کرتے اور وہ ان کے پاس سے بچتے تو وہ ان پر نظر ڈالتے اور کہتے کہ بھائی پھر آجاؤ اور اپنا قصہ مجھے دہرا دو- میں تو واللہ ایک عطائی بنا دیا ہوں-﴾

وضاحت :

ابو الدرداءؓ فقہاء صحابہ میں سے ہیں اور ان کا مقام دینی اعتبار سے خاصا بلند ہے- سلمان فارسیؓ بھی مشہور صحابی ہیں- ابو الدرداءؓ کسی زمانے میں شام میں قاضی مقرر کر دیے گئے- انہوں نے حضرت سلمان فارسی کو دعوت دی کہ آپ یہاں تشریف لائیں، یہ ارض مقدس ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ زمین کسی کو پاک نہیں کرتی بلکہ انسان کا اپنا عمل اس کو پاک کرتا ہے- یہ محض سخن گسترانہ بات ہے- ان کی دعوت سے اس قسم کا ادعا تو معلوم نہیں ہوتا- شام کا ارض مقدس ہونا معلوم ہے- یہاں پہلے قبلہ اور حرم اور انبیاء کا مقر رہا ہے- لیکن حضرت سلمان نے، معلوم ہوتا ہے اس فقرے کو گوارا نہیں کیا اور کہا کہ آپ کس زعم میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ ارض مقدس میں جا کر مقدس ہو گئے ہیں- کوئی سرزمین کسی کو مقدس نہیں بناتی-

مزید حضرت سلمانؓ نے یہ بھی لکھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگوں کے علاج کے لیے طبیب بنا دیے گئے ہو- اس میں اشارہ ان کے قاضی بنانے کی طرف ہے کہ وہ لوگوں کی دینی ضروریات اور مشکلات کا حل کریں- حضرت سلمانؓ نے لکھا کہ اگر لوگوں کو آپ سے فائدہ ہوا تو کیا کہنے اور اگر یونہی عطائی ہو تو بچ کے رہنا کہ لاعلمی میں کسی کو قتل کر کے جہنم میں داخل نہ ہوں- یہ جملہ بھی غیر ضروری طریقے سے تیز اور سخت ہے- اس لیے

ابو الدرداء کا حال یہ ہوا کہ جب بھی دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ کرتے اور وہ ان سے بچتے تو پھر ان کی طرف دیکھتے اور کہتے کہ بھائی اپنا قصہ ذرا پھر سے سنا- آخر میں عطائی جو ہوا- میرے خیال میں یہ بھی سلمانؓ پر فقرہ چست کرتے کہ جب مجھے انہوں نے عطائی قرار دے چھوڑا ہے تو خدا کے لیے پھر سنا دو تاکہ میں عطائی نہ رہوں اور جہنم میں داخل نہ ہوں-

یہ بزرگوں کی باتیں ہیں مگر دلچسپ ہیں- سلمان فارسیؓ نے جو باتیں لکھیں ان کے لکھنے کا موزوں موقع نہ تھا- بے تکلفی میں یہ بات لکھی جا سکتی ہے- دونوں بزرگوں سے آدمی ہیں- میرے خیال میں یہ سب بے تکلفی میں ہوا-

حدثني مالكٌ عن عمر بن عبد الرحمن بن دلافٍ المزنيّ عن ابيه انّ رجلًا من جهينة كان يسبق الحاجّ فيشتري الرّواحل فيغلي بها ثمّ يسرع السّير فيسبق الحاجّ فافلس فرفع امره الى عمر بن الخطاب فقال اما بعد ايّها النّاس فانّ الأسيفع اسيفع جهينة رضي من دينه و امانته بان يقال سبق الحاجّ ألا و انّه قد دان معرضا فاصبح قد رين به فمن كان له عليه دينٌ فليأتنا بالغداة نقسم ماله بينهم و اياكم والدّين فانّ اوّله همٌّ و آخره حربٌ-

﴿عبدالرحمن بن دلاف روایت کرتے ہیں کہ قبیلہ جہینہ کا ایک شخص آگے بڑھ کر، حاجیوں سے پہلے، مال لانے والے قافلوں سے ملتا، ان سے مال خرید کر اس کی قیمت گراں کرتا اور پھر تیزی سے آگے آ کر حاجیوں کو بے خبری میں مال بیچتا- آخر کار وہ دیوالیہ ہو گیا- اس کا مقدمہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ اے لوگو! یہ اسیفع ہے، جہینہ والا اسیفع- اس نے اپنے دین اور اپنی امانت کے بجائے اس بات کو پسند کیا کہ لوگ کہیں کہ وہ حاجیوں پر سبقت کرتا رہا ہے- آگاہ رہو کہ اپنے اس اعراض کی وجہ سے قرضدار ہو گیا ہے- تو جس کا اس کے ذمہ کچھ قرض ہو وہ کل صبح ہمارے پاس حاضر ہو، ہم اس کا مال ان کے درمیان تقسیم کریں گے- اللہ کے بندو، اللہ سے ڈرو اور قرض سے بچو، اس کا آغاز غم اور انجام لڑائی ہے-﴾

وضاحت :

یہ روایت اگرچہ حدیث نہیں بلکہ صحابہ کا اثر ہے لیکن اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں مفلس کا حکم بیان ہوا ہے یعنی یہ کہ دیوالیہ ہونے پر کیا ہوگا۔ دیوالیہ سے متعلق روایات پہلے گزر چکی ہیں۔

اسطع کے معنی ہیں کالے کھوٹے کے۔ عربیت کے قاعدے سے یہ اسطع کی تصغیر ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ دین اور اخلاق کے تقاضوں سے اعراض کے نتیجہ میں قرض دار ہو گیا ہے۔ قرض اس پر مسلط ہو گیا ہے۔ جس کا حق اس کے ذمہ ہو وہ آئے تو ہم اس کا مال حقداروں کے درمیان تقسیم کریں گے۔ یہ تقسیم کس بنیاد پر ہوگی ؟ میں یہ سمجھتا ہوں کہ "علی سواء" کا طریقہ درست ہے۔ یعنی ایک نسبت سے سب اپنے حق کی وصولی کر لیں۔ میں ان لوگوں کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ ایسے شخص کو جیل بھیجنے کی بجائے موقع دینا چاہیے کہ جدوجہد کر کے کچھ کمائے اور لوگوں کا حق ادا کرے۔ موجودہ زمانے میں بھی یہی اصول ملحوظ ہے البتہ وہ اپنے مال میں تصرف کا مجاز نہیں رہتا۔ صرف بقدر شدید ضرورت ہی وہ تصرف کر سکتا ہے۔

مالکیہ کے نزدیک جو مال اس کے پاس موجود ہے، وہ جن صاحبوں کا ہے وہ اس کو لے سکتے ہیں لیکن میرے نزدیک یہ ٹھیک نہیں۔ جو کچھ بھی اس کے پاس ہے اس میں سب حق داروں کا یکساں نسبت سے حصہ ہوگا۔

کتاب الحدود

مَاجَاء فِي الرَّجْمِ

رجم کے بارے میں روایات

حَدَّثَنَا مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّهُ قَالَ جَاءَتِ الْيَهُودُ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَذَكَرُوا لَهُ أَنَّ رَجُلًا مِنْهُمْ وَامْرَأَةً زَنَيَا فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مَا تَجِدُونَ فِي التَّوْرَاةِ فِي شَأْنِ الرَّجْمِ فَقَالُوا نَفْضَحُهُمْ وَيُجْلَدُونَ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ كَذَبْتُمْ إِنَّ فِيهَا آيَةَ الرَّجْمِ فَأَتَوْا بِالتَّوْرَاةِ فَنَشَرُوهَا فَوَضَعَ أَحَدُهُمْ يَدَهُ عَلَى آيَةِ الرَّجْمِ ثُمَّ قَرَأَ مَا قَبْلَهَا وَمَا بَعْدَهَا فَقَالَ لَهُ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ ارْفَعْ يَدَكَ فَرَفَعَ يَدَهُ فَإِذَا فِيهَا آيَةُ الرَّجْمِ فَقَالُوا صَدَقَ يَا مُحَمَّدُ فِيهَا آيَةُ الرَّجْمِ فَأَمَرَ بِهِمَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فَرُجِمَا فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ فَرَأَيْتُ الرَّجُلَ يَحْنِي عَلَى الْمَرْأَةِ يَقِيهَا الْحِجَارَةَ قَالَ مَالِكٌ يَعْنِي يَحْنِي يَكُبُّ عَلَيْهَا حَتَّى تَقَعَ الْحِجَارَةُ عَلَيْهِ۔

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ یہود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور آپ کے سامنے بیان کیا کہ ان کے ایک مرد اور ایک عورت نے زنا کیا ہے۔ حضور نے فرمایا کہ تم تورات میں رجم کے بارے میں کیا پاتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہم زانیوں کو رسوا کرتے ہیں اور ان کو کوڑے لگائے جاتے ہیں۔ اس پر عبداللہ بن سلامؓ نے کہا کہ تم جھوٹ کہتے ہو۔ اس میں آیت رجم ہے۔ وہ لوگ تورات لے کر آئے اور اس کو کھولا۔ ان میں سے ایک نے آیت رجم پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کے پہلے اور بعد کا حصہ پڑھ دیا۔ عبداللہ بن سلامؓ نے کہا کہ اپنا ہاتھ اٹھاؤ۔ اس نے ہاتھ اٹھایا تو اس میں آیت رجم نکل آئی۔ تب انہوں نے کہا کہ اے محمد یہ ٹھیک کہتے ہیں، اس میں آیت رجم موجود ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں حکم دیا تو ان دونوں کو رجم کر دیا گیا۔ عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آدمی کو دیکھا کہ وہ عورت کے اوپر جھکا پڑتا تھا تاکہ پتھروں سے اس کو بچائے۔ امام مالک کہتے ہیں: مطلب یہ

ہے کہ آدمی عورت پر اس لیے جھکا پڑتا تھا کہ پتھر عورت کی جائے اس پر پڑیں۔﴾

وضاحت:

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جس کا قرآن مجید میں ذکر آتا ہے کہ اہل کتاب اگر تمہارے پاس کوئی مقدمہ لائیں تو ان کے معاملات میں آپ دخل دینے کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ یہود آنحضرتؐ کے پاس اپنے مقدمات شرارت کے لیے لاتے تھے کہ اگر فیصلہ اپنی منشا کے مطابق ہوا تو مانیں گے، ورنہ گریز کر جائیں گے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب مدینہ اور اس کے نواح میں اسلام کا انتظام حکومت مجموعی تو قائم ہو گیا تھا لیکن ابھی بعض قبائل خصوصاً اہل کتاب اپنے معاملات اپنی مقامی عدالتوں میں ہی لے کر جاتے تھے اور ان پر پورے طور پر کنٹرول نہیں تھا۔ اس کو مجبوری دور کی بات کہہ سکتے ہیں۔ یہ کامل غلبے سے پہلے کی بات ہے۔ یہود اس زمانے میں یہ مقدمہ اس لیے لائے ہوں گے کہ ممکن ہے ہمارے منشا کے مطابق فیصلہ ہو جائے۔ یہود تورات میں تحریف کر چکے تھے۔ معلوم ہوتا ہے وہ زانی کا منہ کالا کر کے یا کچھ پٹائی کر کے اس کی رسوائی کر دیتے تھے لیکن اس کو رجم نہیں کرتے تھے۔ دوسری صورت یہ بھی تھی کہ اگر کوئی صاحب عزت و جاہ مجرم ہوتا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے۔ آنحضرتؐ کے دریافت کرنے پر کہ کیا تورات میں زانی کے لیے رجم کا حکم نہیں ہے، یہودیوں نے انکار کر دیا تو عبداللہ بن سلام نے، جو یہودیت کو ترک کر کے مسلمان ہو چکے تھے اور ان کے گھر کے بھیدی تھے، ان کو دھر لیا اور یہود کی تمام تر حق کی کوشش کے باوجود ثابت کیا کہ زانی کے لیے تورات میں رجم کا حکم ہے۔ آخر کار ان کو آنحضرتؐ کے سامنے اعتراف کرنا پڑا۔

تورات کا کتاب الٰہی ہونا مسلم تھا۔ اس معاملہ میں دونوں فریق یہودی تھے لہٰذا کوئی دقت پیش نہیں تھی۔ آنحضرتؐ نے فیصلہ تورات کے مطابق کر دیا۔ اور اس روایت سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ تورات میں زانی کے لیے رجم کا حکم تھا۔ ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس دور میں اپنے ہاں بھی لوگوں کو اس قانون کے تحت سزائیں دی ہوں۔ یہ دستور رہا ہے کہ جن معاملات میں شریعت اسلامی کا کوئی واضح حکم نہیں ہوتا تھا اس میں آپ اہل کتاب کے احکام پر عمل کرتے تھے۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ جب تک کوئی نص صریح وارد نہ ہوا ہو آپؐ زنا کے مجرموں کو رجم کرتے رہے ہوں۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّ رَجُلًا مِنْ أَسْلَمَ جَاءَ إِلَى أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ فَقَالَ لَهُ إِنَّ الْآخَرَ زَنَى فَقَالَ لَهُ أَبُوبَكْرٍ هَلْ ذَكَرْتَ هَذَا لِأَحَدٍ غَيْرِي

فَقَالَ لَا فَقَالَ لَهُ أَبُوبَكْرٍ فَتُبْ إِلَى اللّٰهِ وَاسْتَتِرْ بِسِتْرِ اللّٰهِ فَإِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ فَلَمْ تَقِرَّ نَفْسُهُ حَتّٰى أَتٰى عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ فَقَالَ لَهُ مِثْلَ مَا قَالَ لِأَبِي بَكْرٍ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ مِثْلَ مَا قَالَ لَهُ أَبُوبَكْرٍ فَلَمْ تَقِرَّ نَفْسُهُ حَتّٰى جَاءَ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ لَهُ إِنَّ الْآخَرَ زَنَى فَقَالَ سَعِيدٌ فَأَعْرَضَ عَنْهُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ كُلُّ ذٰلِكَ يُعْرِضُ عَنْهُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ حَتّٰى إِذَا أَكْثَرَ عَلَيْهِ بَعَثَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِلٰى أَهْلِهِ فَقَالَ أَيَشْتَكِي أَمْ بِهِ جِنَّةٌ فَقَالُوا يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَاللّٰهِ إِنَّهُ لَصَحِيحٌ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَبِكْرٌ أَمْ ثَيِّبٌ فَقَالُوا بَلْ ثَيِّبٌ يَا رَسُولَ اللّٰهِ فَأَمَرَ بِهِ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فَرُجِمَ۔

﴿سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ قبیلہ اسلم کا ایک شخص حضرت ابوبکر صدیق کی خدمت میں آیا۔ اس نے کہا کہ اس گنہ گار بندہ کمینہ سے زنا کا گناہ صادر ہوا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا کہ اس کا میرے سوا کسی اور سے بھی ذکر کیا ہے۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا تو اللہ سے توبہ کر اور اللہ کے پردے میں چھپ کہ اللہ اپنے بندے کی توبہ قبول کرتا ہے۔ لیکن اس کا اس پر دل نہ ٹھکا۔ پھر حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور وہی بات کہی جو حضرت ابوبکرؓ سے کہی تھی۔ حضرت عمرؓ نے بھی اس کو اسی طرح کا جواب دیا جو حضرت ابوبکرؓ نے دیا تھا۔ اس پر بھی اس کا دل نہ ٹھکا۔ یہاں تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا اور ان سے کہا کہ اس بندہ کمینہ نے زنا کیا ہے۔ سعید کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منہ پھیر لیا۔ تین مرتبہ اس نے کہا اور ہر مرتبہ حضورؐ اس سے منہ پھیر لیتے رہے۔ جب وہ بیت مصر ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے گھر والوں کے پاس آدمی بھیجا اور پوچھا کہ یہ شخص مریض تو نہیں یا اس کو جنون تو نہیں۔ گھر والوں نے کہا کہ یا رسول اللہ یہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ یہ کنوارہ ہے یا شادی شدہ؟ لوگوں نے کہا کہ شادی شدہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تو اس کو رجم کر دیا گیا۔﴾

وضاحت :

محدثین نے "رجل من اسلم" کے الفاظ سے یہ سمجھا ہے کہ یہ روایت ماعز اسلمی سے متعلق ہے، لیکن موطا میں یہ وضاحت نہیں ہے۔ ان صاحب کے متعلق دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت کو ماعز کے متعلق یہ شکایت ملی تھی کہ جب مسلمان جہاد کے لیے جاتے ہیں تو یہ آدمی مسلمانوں کی بہو بیٹیوں کا پیچھا کرتا ہے اور ان کے پیچھے بھروں کی طرح ممیاتا ہے۔ آنحضرت کو معلوم تھا کہ یہ شریر آدمی ہے لیکن زنا کا معاملہ ایسا ہے کہ جب تک کسی کے متعلق پوری بات متحقق نہ ہو سزا دینے کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ ماعز کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ آنحضرتؐ کے علم میں یہ بات ہے، پھر ایک لونڈی کے ساتھ اس نے زنا کیا اور وہ حاملہ ہو گئی تو معاملہ کے راز رہنے کی کوئی شکل نہ رہی۔ جب ماعز کو یقین ہو گیا کہ اب اس کا جرم راز نہیں رہا تب اس نے لوگوں کے سامنے اقبار قائم کرنے کے لیے اس طرح کہنا شروع کیا جیسا کہ روایت میں بیان ہوا ہے۔ یہ لوگ قاضی نہیں تھے اس لیے یہی مشورہ دیا کہ توبہ استغفار کرو، اللہ توبہ قبول کرے گا۔ لیکن اسے اس پر اطمینان نہیں ہوا۔ اس کے قبیلے والوں نے اس کو یہ بتایا کہ یہ معاملہ تو اب دبنے والا نہیں، اب تم آنحضرت ﷺ کے پاس جاؤ۔ وہ اگر مہربانی کریں تو ان کے اختیار میں ہے۔ تب وہ آپ کے پاس گیا اور اپنے جرم کا اقرار کیا۔ یہ بات بھی ہے کہ جب آدمی سمجھ لیتا ہے کہ اب کوئی مفر نہیں تب اس کے اوپر اتنا بوجھ پڑ جاتا ہے کہ وہ نفسیاتی طور پر کہتا ہے کہ یہ معاملہ اب کسی طرح ختم ہونا چاہیے۔

جب ایک معاملہ قاضی کے سامنے پیش ہوتا ہے تو اس کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ تفتیش کے سارے طریقے اختیار کرے، اگرچہ وہ جانتا ہو کہ یہ شخص مجرم ہے۔ قاضی اپنے علم کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کرتا بلکہ شہادتوں کی بنیاد پر رائے قائم کرتا ہے۔ وہ گواہوں سے معلوم کرتا ہے کہ ملزم کس قسم کا آدمی ہے۔ شادی شدہ ہے یا کنوارا ہے۔ اس کو کوئی دماغی عارضہ تو نہیں۔ اس کو کوئی بیماری تو لاحق نہیں۔ یہ باتیں دریافت کرنا اس کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ اس لیے ماعز کے اقرار پر آنحضرتؐ نے فوراً فیصلہ نہیں کیا بلکہ ذاتی معلومات رکھنے کے باوجود اس کے خاندان والوں سے تحقیقات کی اور اس کے بعد سزا نافذ فرمائی۔

ماعز کے سلسلہ میں کچھ روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ وہ بہت متقی اور پارسا آدمی تھا۔ اگر دامن نچوڑ دیتا تو فرشتے وضو کرتے۔ اس کے خون سے اتنے لاکھ کی نجات ہو جائے گی۔ لوگوں کی ایک رائے یہ بھی رہی ہے۔ لیکن دوسری روایتوں کے مطابق آنحضرت نے ماعز کے رجم کے بعد تقریر فرمائی جس میں اس کی حرکتوں پر نہایت غم

فسہ کا اظہار فرمایا اور اعلان کیا کہ اس طرح کے لوگوں کے ساتھ میں اسی طرح کا معاملہ کروں گا۔ آپ نے اس کے نازے کی نماز بھی نہیں پڑھی۔ عقیدت مندی کا اظہار اپنی جگہ، لیکن ایک محقق کو سب باتیں سامنے رکھ کر تحقیق کر کے حقیقت کو متعین کرنا ہوتا ہے۔

یہ روایت بالاتفاق مرسل ہے۔ زرقانی نے لکھا ہے کہ ہر جگہ یہ مرسل آئی ہے لیکن دوسری صحاح میں موصول بن گئی ہے اور ابن شہاب ہیں جنہوں نے اس کو موصول بنا دیا ہے۔ ابن شہاب کے متعلق زرقانی کا تبصرہ یہ ہے کہ ان کے تو من کی موج ہے وہ جس روایت کو چاہتے ہیں مرسل چھوڑ دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں موصول کر لیتے ہیں۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّهُ قَالَ بَلَغَنِي أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لِرَجُلٍ مِنْ أَسْلَمَ يُقَالُ لَهُ هَزَّالٌ يَا هَزَّالُ لَوْ سَتَرْتَهُ بِرِدَائِكَ لَكَانَ خَيْرًا لَكَ قَالَ يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ فَحَدَّثْتُ بِهَذَا الْحَدِيثِ فِي مَجْلِسٍ فِيهِ يَزِيدُ بْنُ نُعَيْمِ بْنِ هَزَّالٍ الْأَسْلَمِي فَقَالَ يَزِيدُ هَزَّالٌ جَدِّي وَهَذَا الْحَدِيثُ حَقٌّ۔

﴿سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ اسلم کے ایک شخص ہزال نامی سے فرمایا تھا کہ اے ہزال، اگر تم اس کو اپنی چادر کے نیچے چھپا لیتے تو یہ بات تمہارے لیے بہتر ہوتی۔ یحییٰ بن سعید نے کہا کہ میں نے یہ حدیث ایک ایسی مجلس میں بیان کی جس میں یزید بن نعیم بن ہزال اسلمی موجود تھے۔ یزید نے کہا ہزال میرے جد امجد تھے اور یہ حدیث سچی ہے۔﴾

وضاحت :

یہ روایت سعید بن مسیب کے بلاغات میں سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہزال کو کہا کہ اگر تم اس بات کو اپنی چادر کے نیچے چھپاتے تو تمہارے لیے بہتر ہوتا۔ یہ بات خود اپنی جگہ پر ٹھیک ہے کہ کسی کو اپنے یا دوسرے کے گناہوں کا اشتہار دینے کا حق نہیں۔ اگر کوئی اپنے گناہوں کا اشتہار دیتا ہے تو وہ اپنی ہی شامت کو دعوت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت جب ستاری ہے تو ہم جو گناہ کرتے ہیں ان کو اپنے اور اپنے رب کے درمیان ہی رکھنا چاہیے۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ جب تک کوئی معاملہ پولیس کیس نہ بن جائے کسی شہری کو اس میں از خود مداخلت نہیں کرنی

چاہیے۔ اگر کوئی شخص اپنا گناہ بتانے کی غلطی کرے تو اس کو یہی تلقین کرنی چاہیے کہ آپ اس کا اشتہار نہ دو اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔ لیکن جب جرم آشکار ہو جائے اور خود مناوی کرنے لگے تو اس پر قانون کے مطابق کارروائی ہوگی۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ موجودہ زمانے میں جو لوگ اپنی خود نوشت سوانح عمریاں لکھتے ہیں وہ مقابلہ انداز میں اپنے خانگی جرائم کا اشتہار دیتے ہیں۔ اس کی ان کو سزا بھی ملتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی رسوائی کا کافی سامان کر دیتا ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ماعز کے معاملہ میں ہزال نے جا کر رپورٹ کرائی تھی۔ اس پر آنحضرتؐ نے ان کو تنبیہ فرمائی۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ اَنَّهٗ اَخْبَرَهٗ اَنَّ رَجُلًا اعْتَرَفَ عَلٰى نَفْسِهٖ بِالزِّنَا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَشَهِدَ عَلٰى نَفْسِهٖ اَرْبَعَ مَرَّاتٍ فَاَمَرَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَرُجِمَ۔

﴿امام مالک نے بیان کیا کہ ابن شہاب نے ان کو خبر دی کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اپنے بارے میں چار مرتبہ زنا کا اعتراف کیا تو آپ کے حکم سے اس کو رجم کر دیا گیا۔﴾

وضاحت :

یہ روایت نہایت مختصر ہے جس سے مقدمہ کے کوائف معلوم نہیں ہو سکتے۔ اس بیان سے کوئی اصول وضع نہیں کیا جا سکتا۔ امام مالک اور ابن شہاب زہری کا یہ مذہب ہے کہ رجم کے لیے اعتراف زنا ہی کافی ہے لیکن دوسرے فقہاء حضرات یہ شرط بھی لگاتے ہیں کہ جرم شہادت سے ثابت ہونا چاہیے۔ بعض لوگوں کی رائے میں اعتراف دوسرے جرائم کو ثابت نہیں کرتا لیکن زنا کے ثبوت کے لیے خاص ہے۔ میرے نزدیک کسی جرم کو ثابت کرنے کے کئی ذریعے ہیں۔ ان میں سے ایک ذریعہ اعتراف بھی ہے۔ موجودہ زمانے میں اعتراف کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ یہ ایک کھلا ہوا فراڈ بھی ہو سکتا ہے۔ اور جو اعتراف پولیس کراتی ہے وہ تو سب کو معلوم ہے کہ اس کا کوئی وزن ہی نہیں رہا۔ اعتراف کرنے میں بعض اوقات ایسی باتیں مضمر ہوتی ہیں کہ آدمی اعتراف کرتا ہے لیکن وہ غلط ہوتا ہے۔ یہ بات شریعت کے اصول کے بھی خلاف ہے کہ جرم کے ثبوت کے لیے یہ شرط لگائی جائے کہ اگر ملزم اعتراف جرم کرے گا تب سزا ہوگی، بلکہ شہادت کے لیے جو جو طریقے ہیں ان کی رو سے دیکھا جائے گا۔ اگر شہادت موجود ہو اور زانی اعتراف جرم نہ بھی کرے تب بھی سزا ہوگی۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَعْقُوبَ بْنِ زَيْدِ بْنِ طَلْحَةَ عَنْ اَبِيْهِ زَيْدِ بْنِ طَلْحَةَ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِي مُلَيْكَةَ اَنَّهٗ اَخْبَرَهٗ اَنَّ امْرَاَةً جَاءَتْ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَاَخْبَرَتْهُ اَنَّهَا زَنَتْ وَهِيَ حَامِلٌ فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذْهَبِي حَتّٰى تَضَعِي فَلَمَّا وَضَعَتْ جَاءَ تْهُ فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذْهَبِي حَتّٰى تُرْضِعِيْهِ فَلَمَّا اَرْضَعَتْهُ جَاءَ تْهُ فَقَالَ اذْهَبِي فَاسْتَوْدِعِيْهِ قَالَ فَاسْتَوْدَعَتْهُ ثُمَّ جَاءَ تْ فَاَمَرَبِهَا فَرُجِمَتْ۔

﴿ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ ان کو خبر ملی کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ سے بیان کیا کہ اس نے زنا کا ارتکاب کیا ہے اور وہ حاملہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ اور وضع حمل کے بعد آؤ۔ جب وہ وضع حمل کے بعد حاضر ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ بچے کو دودھ پلاؤ۔ جب وہ دودھ پلانے کے بعد حاضر ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ جاؤ بچے کو کسی کے حوالے کر دو۔ راوی کہتے ہیں کہ وہ حوالے کرنے کے بعد حاضر ہوئی تب آپؐ نے حکم دیا تو وہ رجم کر دی گئی۔﴾

وضاحت :

اس روایت سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس عورت سے متعلق ہے لیکن غالباً اس سے مراد غامدیہ ہے جس کے رجم کا واقعہ حدیث کی کتابوں میں ہے۔ مجھے یہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ غامدیہ کون تھی، اس کی شادی ہوئی تھی یا نہیں۔ اس کا کوئی خاندان بھی تھا یا نہیں۔ صحیح مسلم کی روایت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ماعز نے اسی کے ساتھ زنا کیا تھا لیکن کوئی بات یقین سے کہنا مشکل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی ایسی عورت تھی جس کا کنبہ یا خاندان نہیں تھا۔ چنانچہ دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بچے کی کفالت کا مسئلہ پیدا ہوا تو ایک انصاری نے پیش کش کی کہ میں اس کی پرورش کروں گا چنانچہ بچہ اس کے حوالے کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اگر اس عورت کا کوئی کنبہ قبیلہ ہوتا تو بچے کو وہ لے جاتا۔

اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ زنا سے حاملہ ہو جانے والی عورت پر حمل اور رضاعت کی مدت کے دوران حد کا نفاذ نہیں کیا جائے گا۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنْ اَبِي

هُرَيْرَةَ وَزَيْدِ بْنِ خَالِدِ الْجُهَنِيَّ أَنَّهُمَا أَخْبَرَاهُ أَنَّ رَجُلَيْنِ اخْتَصَمَا إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ أَحَدُهُمَا يَا رَسُولَ اللَّهِ اقْضِ بَيْنَنَا بِكِتَابِ اللَّهِ وَ قَالَ الْآخَرُ وَهُوَ أَفْقَهُهُمَا أَجَلْ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَاقْضِ بَيْنَنَا بِكِتَابِ اللَّهِ وَ ائْذَنْ لِي فِي أَنْ أَتَكَلَّمَ فَقَالَ تَكَلَّمْ قَالَ إِنَّ ابْنِي كَانَ عَسِيفًا عَلَى هَذَا فَزَنَى بِامْرَأَتِهِ فَأَخْبَرُونِي أَنَّ عَلَى ابْنِي الرَّجْمَ فَافْتَدَيْتُ مِنْهُ بِمِائَةِ شَاةٍ وَبِجَارِيَةٍ لِي ثُمَّ إِنِّي سَأَلْتُ أَهْلَ الْعِلْمِ فَأَخْبَرُونِي أَنَّ مَا عَلَى ابْنِي جَلْدُ مِائَةٍ وَ تَغْرِيبُ عَامٍ وَ أَخْبَرُونِي أَنَّمَا الرَّجْمُ عَلَى امْرَأَتِهِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَمَا وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَأَقْضِيَنَّ بَيْنَكُمَا بِكِتَابِ اللَّهِ أَمَّا غَنَمُكَ وَجَارِيَتُكَ فَرَدٌّ عَلَيْكَ وَجَلَدَ ابْنَهُ مِائَةً وَغَرَّبَهُ عَامًا وَ أَمَرَ أُنَيْسًا الْأَسْلَمِيَّ أَنْ يَأْتِيَ امْرَأَةَ الْآخَرِ فَإِنِ اعْتَرَفَتْ رَجَمَهَا فَاعْتَرَفَتْ فَرَجَمَهَا قَالَ مَالِكٌ وَالْعَسِيفُ الْأَجِيرُ۔

﴿ابو ہریرہؓ اور خالد الجہنیؓ دونوں نے عبید اللہ کو خبر دی کہ دو آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک مقدمہ لے کر آئے۔ ان میں سے ایک نے کہا یا رسول اللہ! ہمارے درمیان اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ فرمایئے۔ دوسرے نے جو دونوں میں زیادہ سمجھدار تھا کہا کہ ہاں یا رسول اللہ، ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرمایئے اور مجھے اجازت دیجئے کہ پہلے میں بات کروں۔ آپؐ نے فرمایا کہو۔ اس نے کہا کہ میرا بیٹا اس شخص کے ہاں مزدور تھا۔ اس نے اس کی بیوی سے زنا کا ارتکاب کیا۔ اس نے مجھے خبر دی کہ میرے بیٹے کے لیے رجم کی سزا ہے تو میں نے اس کے فدیہ میں ایک سو بکری اور اپنی لونڈی دے دی۔ پھر میں نے اہل علم سے پوچھا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے بیٹے کے اوپر سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی کی سزا ہے۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس شخص کی بیوی پر رجم ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اس کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے، میں تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ تمہاری بکریاں اور تمہاری لونڈی تم کو واپس ہیں۔ آپ نے اس کے بیٹے کو سو کوڑے لگوائے اور ایک سال کے لیے جلاوطن کر دیا اور انیس اسلمی کو حکم دیا کہ وہ دوسرے شخص کی بیوی کے پاس جائیں۔ اگر وہ اعتراف کرے تو اس کو رجم کریں۔ اس عورت نے اعتراف کیا تو وہ

رجم کر دی گئی۔ امام مالک کہتے ہیں کہ عسیف مزدور کو کہتے ہیں۔﴾

وضاحت:

اس روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی قسم کھائی کہ میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ پھر فیصلہ جو کیا اس میں نوجوان کو ایک سو کوڑوں کی سزا دی جو سورہ نور کے مطابق ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے اس کو ایک سال کی جلاوطنی کی سزا بھی دی جو سورہ نور میں نہیں ہے اور ہمارے فقہاء بھی اس کو منسوخ مانتے ہیں۔ یہاں قابل غور سوال یہ ہے کہ آنحضرت نے تغریب عام (یعنی سال بھر کی جلاوطنی) کا حکم کس بنیاد پر دیا۔ اگر سورہ مائدہ کی آیت ۳۳ کے تحت یہ حکم آپ نے دیا تو دوسری چیز جو الجھن پیدا کرتی ہے یہ ہے کہ ایک جرم پر دو مختلف سزائیں ایک وقت کیسے جاری ہو گئیں۔ یہ بات عقل عام کے بھی خلاف ہے اور قرآن سے بھی اس کا ثبوت نہیں ملتا۔

میرے نزدیک زانی کی سزا سو کوڑے ہے جس کا حکم سورہ نور کی آیت ۲ میں ہے۔ اگر مجرم عادی قسم کا ہو یا اس کا جرم دوسرے جرائم کو بھی شامل ہو تو اس کو محاربین کے حکم کے تحت سورہ مائدہ کی آیت ۳۳ کی روشنی میں رجم بھی کیا جا سکتا ہے اور جلاوطنی کی سزا بھی دی جا سکتی ہے۔ لیکن اس آیت کے تحت دو سزائیں جمع نہیں کی جا سکتیں کیونکہ آیت میں حرف عطف "او" (یا) استعمال ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ روایت کے نقل کرنے میں کہیں غلطی ہو گئی ہے۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ سُهَيْلِ بْنِ أَبِي صَالِحٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ سَعْدَ بْنَ عُبَادَةَ قَالَ لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَرَأَيْتَ لَوْ أَنِّي وَجَدْتُ مَعَ امْرَأَتِي رَجُلًا أَ أُمْهِلُهُ حَتَّى آتِيَ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نَعَمْ۔

﴿ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ سعد بن عبادہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ اگر میں اپنی بیوی کے ساتھ کسی آدمی کو پاؤں تو کیا میں اس سے اس وقت تک تعرض نہ کروں جب تک کہ میں چار گواہ نہ لا سکوں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ہاں۔﴾

وضاحت:

یہ روایت پہلے گزر چکی ہے۔ میرے نزدیک اگر شوہر کو یہ اجازت دے دی جائے کہ وہ بیوی کو کسی

مرد کے ساتھ حالت غیر میں دیکھتے ہی اس کی گردن اڑا دے تو اس سے بڑے فساد پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس معاملہ کو عدالت ہی میں ثابت کرنا ہو گا۔ اگر شوہر کے پاس چار گواہ نہ ہوں تو اس صورت میں اس کے سامنے لعان کا اختیار موجود ہے۔ اس طریقہ سے وہ بے وفا بیوی سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ میرے نزدیک جہاں معاملہ اس درجے کا ثابت ہو جائے کہ وہ چار گواہوں کے برابر ہو جائے تب تو "حد" کی سزا ہو گی ورنہ تعزیر کے طور پر کم تر سزا دی جا سکتی ہے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ بْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهٗ قَالَ سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ يَقُوْلُ الرَّجْمُ فِي كِتَابِ اللّٰهِ حَقٌّ عَلٰى مَنْ زَنٰى مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ اِذَا اُحْصِنَ اِذَا قَامَتِ الْبَيِّنَةُ اَوْ كَانَ الْحَبَلُ اَوِ الْاِعْتِرَافُ۔

﴿عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب کو فرماتے سنا کہ رجم کا حکم اللہ کی کتاب میں فی الواقع موجود ہے، ان کے لیے جو مردوں میں سے زنا کریں یا عورتوں میں سے، بشرطیکہ وہ محصن ہوں۔ یہ سزا دی جائے گی جب ان کے خلاف دلیل موجود ہو یا حمل پایا جائے یا اعتراف جرم ہو۔﴾

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ عَنْ اَبِي وَاقِدٍ اللَّيْثِيِّ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اَتَاهُ رَجُلٌ وَهُوَ بِالشَّامِ فَذَكَرَ لَهٗ اَنَّهٗ وَجَدَ مَعَ امْرَاَتِهٖ رَجُلًا فَبَعَثَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اَبَا وَاقِدٍ اللَّيْثِيَّ اِلٰى امْرَاَتِهٖ يَسْاَلُهَا عَنْ ذٰلِكَ فَاَتَاهَا وَ عِنْدَهَا نِسْوَةٌ حَوْلَهَا فَذَكَرَ لَهَا الَّذِي قَالَ زَوْجُهَا لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ وَ اَخْبَرَهَا اَنَّهَا لَا تُؤَاخَذُ بِقَوْلِهٖ وَجَعَلَ يُلَقِّنُهَا اَشْبَاهَ ذٰلِكَ لِتَنْزِعَ فَاَبَتْ اَنْ تَنْزِعَ وَتَمَّتْ عَلَى الْاِعْتِرَافِ فَاَمَرَ بِهَا عُمَرُ فَرُجِمَتْ

﴿ابوواقد اللیثی سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ بن خطاب شام میں تھے کہ ان کے پاس ایک شخص آیا۔ اس نے ذکر کیا کہ اس نے اپنی بیوی کے ساتھ ایک آدمی کو (غیر حالت میں) پایا ہے۔ حضرت عمرؓ نے ابوواقد اللیثی کو اس کی بیوی کے پاس بھیجا کہ اس سے معاملہ دریافت کریں۔ وہ اس عورت کے پاس

آئے تو دوسری عورتیں اس کو گھیرے ہوئے تھیں۔ ابوواقد نے وہ ساری بات اس عورت کو بتائی جس کا ذکر حضرت عمرؓ سے اس کے شوہر نے کیا تھا۔ انہوں نے اس کو بتایا کہ محض شوہر کے قول پر وہ پکڑی نہیں جائے گی۔ وہ اس طرح کی باتیں کرتے رہے تاکہ وہ اپنے فعل سے منحرف ہو جائے لیکن عورت نے ایسا نہیں کیا اور اعتراف پر قائم رہی۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا تو وہ رجم کر دی گئی۔﴾

وضاحت:

ان دو روایتوں سے معلوم ہوا کہ زنا کے جرم کے ثبوت کے لیے ضروری ہو گا کہ یا تو اس کے لیے شہادتیں موجود ہوں یا مجرم خود اپنے جرم کا اعتراف کرلے۔ اگر مجرم ایک بے شوہر عورت ہو تو اس کا حمل بھی زنا کا اتفاقی شہادت پیش کرے گا۔ جرم ثابت ہونے پر مجرم پر حد زنا جاری کی جائے گی۔

جہاں تک رجم کی سزا کے قرآن میں بیان ہونے کا تعلق ہے تو یہ بات روز روشن کی طرح ثابت ہے۔ سورہ مائدہ کی آیت ۳۳ میں قتلوا تقتیلا کے الفاظ بیان ہوئے ہیں۔ ان میں تقتیل کا مفہوم بے نہایت بری طرح قتل کرنا۔ ظاہر ہے کہ ایک مجرم کو سنگسار کر کے قتل کرنا اسی قبیل کی ایک سزا ہے۔ لیکن جہاں تک زنا کی حد کا تعلق ہے تو سورہ نور کی آیت ۲ میں ہر زانی کے لیے سو کوڑے ہی بیان ہوئی ہے۔ نبی ﷺ نے اس کی وضاحت بھی کر دی ہے۔ صحیح مسلم کتاب الحدود کے باب حد الزنا کی روایت ہے:۔

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ كَانَ نَبِيُّ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ كُرِبَ لِذٰلِكَ وَ تَرَبَّدَ لَهٗ وَجْهُهٗ قَالَ فَاُنْزِلَ عَلَيْهِ ذَاتَ يَوْمٍ فَلُقِيَ كَذٰلِكَ فَلَمَّا سُرِّيَ عَنْهُ قَالَ خُذُوْا عَنِّيْ فَقَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا الثَّيِّبُ بِالثَّيِّبِ وَالْبِكْرُ بِالْبِكْرِ الثَّيِّبُ جَلْدُ مِائَةٍ ثُمَّ رَجْمٌ بِالْحِجَارَةِ وَالْبِكْرُ جَلْدُ مِائَةٍ ثُمَّ نَفْيُ سَنَةٍ (مسلم: باب حد الزنی)

﴿عبادہ بن صامت فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ کو اس کی تکلیف محسوس ہوتی اور آپ کا چہرہ متغیر ہو جاتا۔ فرماتے ہیں ایک دن آپ پر وحی نازل ہوئی تو آپ کی یہی کیفیت ہوئی۔ جب اس کا اثر زائل ہوا تو آپ نے فرمایا مجھ سے علم حاصل کرو، عورتوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے راہ نکال دی ہے۔ مجرم شادی شدہ ہوں یا کنوارے۔ شادی شدہ کے لیے سو کوڑے کی سزا ہے پھر رجم۔ کنواروں کے لیے سو کوڑوں کی سزا پھر ایک سال کی جلاوطنی۔﴾

اس روایت سے معلوم ہوا کہ شادی شدہ زانی کو بھی پہلے جرم پر تو سو کوڑوں کی سزا دی جائے گی لیکن اگر اس نے اپنی روش نہ بدلی تو جرم کے اعادہ پر اس کو رجم کر دیا جائے گا، جبکہ کنوارے مجرم کے لیے جرم کے اعادہ پر جلا وطنی کی سزا دی جائے گی، جس کی آج کل کے دور میں عملی شکل سال بھر کے لیے جیل بھیجنا ہے۔

میرے نزدیک احصان (شادی شدہ ہونا) مناط حکم نہیں ہے۔ نبی ﷺ نے جن لوگوں کو رجم کروایا ان میں سب سے زیادہ مفصل بیان ماعز کے رجم کا ہے۔ یہ معاملہ اتفاقی جرم زنا کا معاملہ نہیں تھا۔ چنانچہ آپ نے ماعز کو سورہ مائدہ کے حکم کے تحت ایک محارب کی سزا دی۔ افسوس ہے کہ روایات میں زنا کے دوسرے واقعات نہایت مجمل بیان ہوئے ہیں اس لیے ان مجرموں کے اصل حالات کے بارے میں کوئی بات یقین سے کہنا مشکل ہے۔

ابو واقد لیثی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو نہ صرف شوہر نے دوسرے مرد کے ساتھ حالت غیر میں دیکھ لیا تھا بلکہ یہ معاملہ دوسری عورتوں کے علم میں بھی تھا۔ ابو واقد نے جا کر اطمینان کیا کہ عورت نے واقعی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ انہوں نے اعتراف جرم کے نتائج سے بھی آگاہ کیا تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ سزا سے بے خبر ہو اور اسے ایک معمولی معاملہ سمجھ رہی ہو۔

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّهُ سَمِعَهُ يَقُولُ لَمَّا صَدَرَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ مِنْ مِنًى أَنَاخَ بِالْأَبْطَحِ ثُمَّ كَوَمَ كَوْمَةً بَطْحَاءَ ثُمَّ طَرَحَ عَلَيْهَا رِدَاءَهُ وَ اسْتَلْقَى ثُمَّ مَدَّ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ فَقَالَ اللّٰهُمَّ كَبِرَتْ سِنِّي وَضَعُفَتْ قُوَّتِي وَانْتَشَرَتْ رَعِيَّتِي فَاقْبِضْنِي إِلَيْكَ غَيْرَ مُضَيِّعٍ وَلَا مُفَرِّطٍ ثُمَّ قَدِمَ الْمَدِينَةَ فَخَطَبَ النَّاسَ فَقَالَ أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ سُنَّتْ لَكُمُ السُّنَنُ وَفُرِضَتْ لَكُمُ الْفَرَائِضُ وَ تُرِكْتُمْ عَلَى الْوَاضِحَةِ إِلَّا أَنْ تَضِلُّوا بِالنَّاسِ يَمِينًا وَ شِمَالًا وَضَرَبَ بِإِحْدَى يَدَيْهِ عَلَى الْأُخْرَى ثُمَّ قَالَ إِيَّاكُمْ أَنْ تَهْلِكُوا عَنْ آيَةِ الرَّجْمِ يَقُولُ قَائِلٌ لَا نَجِدُ حَدَّيْنِ فِي كِتَابِ اللّٰهِ فَقَدْ رَجَمَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَرَجَمْنَا وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ لَا أَنْ يَقُولَ النَّاسُ زَادَ عُمَرُ ابْنُ الْخَطَّابِ فِي كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالَى لَكَتَبْتُهَا الشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ فَارْجُمُوهُمَا الْبَتَّةَ فَإِنَّا قَدْ قَرَأْنَاهَا۔

﴿یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن مسیب کو کہتے سنا کہ حضرت عمرؓ جب منیٰ سے لوٹے تو ابطح

میں اونٹنی کو بٹھایا، پھر بطحاء میں کنکریوں کا ایک ڈھیر سا بنایا، پھر اس پر اپنی چادر ڈالی اور ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ پھر اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور دعا کی اے رب! میں بوڑھا ہو گیا، میری قوت کمزور ہو گئی، رعایا بہت پھیل گئی، اب تو مجھے اٹھا لے اس حالت میں کہ میں ضائع کرنے والا نہ ہوں اور نہ ہی کوتاہی کرنے والا (یعنی میں کچھ پانے کا متوقع نہیں ہوں لیکن مجھے دینا نہ پڑ جائے) پھر مدینہ آئے تو آپ نے خطبہ دیا اور کہا، لوگو! تمہارے لئے سنتیں مقرر اور فرائض فرض کر دیئے گئے ہیں اور تم ایک واضح راستے پر چھوڑے گئے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تم داہنے بائیں مڑ کر لوگوں سمیت گمراہ ہو جاؤ۔ پھر انہوں نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر مارا۔ پھر فرمایا خبردار، کہ تم رجم کی آیت سے غافل ہو جاؤ اور کہنے والا کہے کہ ہم تو دو "حدیں" کتاب اللہ میں نہیں پاتے۔ پھر انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا اور ہم نے رجم کیا اور قسم ہے اس ذات کی جس کی مٹھی میں میری جان ہے کہ اگر لوگ یہ نہ کہنے لگیں کہ عمر نے اللہ کی کتاب میں اضافہ کیا ہے تو میں اس آیت کو اس میں لکھ دیتا۔ "الشیخ والشیخہ فارجموھا البتۃ" (شیخ اور شیخہ کو لازماً پتھر مارو) کیونکہ ہم نے یہ آیت پڑھی ہے۔﴾

وضاحت:

زانی کے لیے جرم کی سزا کا موقع و محل اوپر کی روایات کے تحت حضرت عبادہ بن صامتؓ والی حدیث کے حوالہ سے بیان ہو چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ سزا حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی زیر عمل آئی تو انہوں نے لوگوں کو متنبہ فرمایا کہ فرائض و سنن واضح ہو چکے ہیں۔ ان کو مضبوطی سے تھامو ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے۔

زیر بحث روایت کے آخری حصہ میں جو آیت رجم کا حوالہ دیا گیا ہے اس کی نسبت حضرت عمرؓ کی طرف محل نظر ہے۔ اس کے اسباب حسب ذیل ہیں:۔

(۱) قرآن مجید کا طریقہ یہ ہے کہ جن آیات کا حکم کالعدم کر دیا گیا اور ان کی جگہ دوسری آیات نازل کر دی گئیں ان کو بھی قرآن میں باقی رکھا گیا ہے۔ لیکن یہاں عجیب معاملہ ہے کہ جس آیت کا حکم باقی ہے اس کو نکال دیا گیا حتیٰ کہ اکابرین امت کو یہ فکر لاحق ہو گئی کہ لوگ اس کے حکم کو کہیں بھول نہ جائیں۔ عقل کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر ایک آیت نازل ہونے کے بعد منسوخ کر دی گئی تو یہ اس بات کا ثبوت ہوا کہ رجم کا حکم پہلے تھا پھر منسوخ کر دیا گیا،

ورنہ اس کو نکالنے کی مصلحت سمجھ میں نہیں آتی۔

(ب) اگر یہ پوچھا جائے کہ کیا اس بات کی کوئی اور نظیر بھی ہے کہ کسی آیت کو ختم کرنے کے باوجود اس کا حکم برقرار رکھا گیا ہو تو جواب ملتا ہے کہ اس کی کوئی نظیر نہیں۔ صرف یہی ایک آیت ہے کہ جس کو غیر متلو کر دیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا بڈھے زانیوں ہی کی یہ اہمیت تھی کہ ان کے بارے میں ایک خاص آیت نازل کر کے پھر غیر متلو کر دی گئی۔ جبکہ غیر متلو کر دینے میں یہ خطرہ بہر حال موجود ہے کہ اس میں کمی بیشی کر دی جائے، حالانکہ وحی متلو کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے اٹھایا ہے۔

(ج) قرآن مجید کے متعلق ہم سب کا ایمان ہے کہ یہ اپنی ثبت میں سب سے کامل درجے پر ہے۔ اس کو اگر کوئی چیز منسوخ کر سکتی ہے تو وہ اسی کے پائے کی ہونی لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناسخ اور منسوخ دونوں کو قرآن میں رکھنا ضروری ہوا۔ اس نکالی ہوئی آیت کو آپ وحی غیر متلو بھی مان لیں تو یہ وحی متلو کے پائے کو ہرگز نہیں پہنچ سکتی۔ سوال یہ ہے کہ ایسی چیز قرآن کے حکم کی ناسخ کیسے مانی جا سکتی ہے؟

(د) کفار نے جب یہ موقف اختیار کیا کہ جب تک قرآن میں ان کی مرضی کی ترمیم نہیں کی جاتی وہ اس کو مانتے کے نہیں، تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی زبان سے کہلوایا کہ ما یکون لی ان ابدله من تلقاء نفسی (مجھے کیا حق ہے کہ میں اپنے جی سے اس کو بدل ڈالوں) اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے حکم کو منسوخ کرنے کا اختیار نبی ﷺ کو بھی نہیں تھا۔ پھر اگر یہ کتاب اللہ کی آیت تھی تو اس کو اس میں سے نکالا کس نے؟ اور جب نکال دی گئی تو اس کا حکم کس بنیاد پر باقی رہ گیا؟ جب نبی ﷺ قرآن میں ترمیم کا حق نہیں رکھتے تھے تو ان کے ایک امتی کو یہ حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ اس کی خواہش کرتے؟

(ہ) جس عبارت کو قرآن کی آیت کہا جاتا ہے اس کی زبان کو دیکھئے۔ کیا کوئی سلیم الذوق آدمی اس کو قرآن کی زبان کہہ سکتا ہے؟ اس کو تو قول رسول بھی نہیں مانا جا سکتا۔ یہ کسی ملاکی زبان معلوم ہوتی ہے۔ لفظ شیخ کا اطلاق بوڑھے پر ہوتا ہے۔ قرآن میں ھذا بعلی شیخا (یہ میرے میاں تو بوڑھے ہیں) جس مفہوم کے اظہار کے لیے آیا ہے وہ یہ ہے کہ اس بڑی عمر میں مرد جنسی تعلق پر قادر ہی نہیں ہوتا۔ شیخہ کا استعمال بڑی بوڑھی کے لیے بے محل ثابت ہے۔ ان الفاظ سے تو خود یہ مفہوم بھی نہیں نکلتا کہ وہ بوڑھے شادی شدہ بھی ہیں جبکہ روایت سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ شادی شدہ زانیوں پر رجم کی حد لاگو ہو گی۔ پھر عربی زبان کے اسلوب میں، البکر بالبکر اور الثیب بالثیب

کہیں گے، البکر بالبکر و الثیب بالثیبہ نہیں کہیں گے۔ اس اسلوب پر یہاں بھی صحیح عبارت کا تقاضا یہ تھا کہ الشیخ بالشیخ آتا یہ کہ الشیخ بالشیخہ۔

(و) اس وحی غیر متلو کا حال یہ ہے کہ اس کی عبارت پر راویوں کا اتفاق ہی نہیں۔ دوسری کتابوں میں جو روایت آئی ہے اس میں و اذا زنیا کے الفاظ زیادہ ہیں۔ موطا کی اس روایت میں یہ لفظ تک بھی نہیں آئے۔

(ز) حد رجم کو اگر قرآن سے ثابت کرنا تھا تو اس کا حکم مطلق ہونا چاہیے تھا جس سے معلوم ہو سکتا کہ تمام شادی شدہ زانیوں کی سزا رجم ہے۔ اس عبارت میں رجم کو بڈھے بوڑھوں کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اس سے رجم کے لیے عام حکم کیسے اخذ کیا جا سکتا ہے۔

میرے نزدیک رجم کا حکم سورہ مائدہ میں ہے اور اس کو عادی زانیوں یا مرتکب جرم کار تکاب کرنے والوں پر نافذ کیا جا سکتا ہے۔ زنا کی عام حد، کنوارے اور شادی شدہ دونوں قسم کے مجرموں کے لیے، سو کوڑے ہی ہیں۔ جہاں تک اس روایت کی آیت رجم کا تعلق ہے، میرے نزدیک حضرت عمرؓ کے ساتھ اس کو منسوب کرنا ایک سازش کے تحت ہوا۔ شیعہ کا یہ مشن ہے کہ وہ قرآن مجید کی محفوظیت کو مشکوک ثابت کریں۔ اگر وہ اس میں کمی بیشی ثابت نہ کریں تو ان کا کام نہیں چلتا کیونکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کی بہت سی آیات جو حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے حق میں تھیں، ان کو حضرات ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ نے العیاذ باللہ کتاب اللہ سے نکال دیا تھا۔

پھر یہ لوگ حضرت عمرؓ کو بھی متہم کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ کی نسبت لوگوں سے زیادہ ڈرنے والے تھے۔ وہ اگرچہ جانتے تھے کہ ایک آیت وہ پڑھتے رہے ہیں اور اس پر عمل بھی کرتے رہے ہیں لیکن لوگوں کے ڈر سے انہوں نے اس کو قرآن میں لکھوانے کی جرأت نہ کی۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ أُتِيَ بِامْرَأَةٍ قَدْ وَلَدَتْ فِي سِتَّةِ أَشْهُرٍ فَأَمَرَ بِهَا أَنْ تُرْجَمَ فَقَالَ لَهُ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ لَيْسَ ذَلِكَ عَلَيْهَا إِنَّ اللَّهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى يَقُولُ فِي كِتَابِهِ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا وَقَالَ وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ فَالْحَمْلُ يَكُونُ سِتَّةَ أَشْهُرٍ فَلَا رَجْمَ عَلَيْهَا فَبَعَثَ عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ فِي أَثَرِهَا فَوَجَدَهَا قَدْ رُجِمَتْ۔

امام مالک کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عثمانؓ کے سامنے ایک عورت کو پیش کیا گیا جس نے چھ ماہ میں

ایک بچے کو جنم دیا تھا- آپؓ نے حکم دیا کہ اس کو رجم کر دیا جائے- حضرت علیؓ نے کہا کہ اس پر رجم نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ بچے کا حمل اور دودھ چھڑانا تیس ماہ ہیں اور یہ کہ بچوں کی مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں، اس شخص کے لیے جو رضاعت کی تکمیل چاہتا ہو- اس طرح حمل کے صرف چھ ماہ بچتے ہیں لہٰذا اس عورت پر رجم نہیں- حضرت عثمانؓ نے اس عورت کے پیچھے آدمی بھیجا تو معلوم ہوا کہ وہ رجم کر دی گئی تھی-﴾

وضاحت :

یہ روایت امام مالکؒ کی بلاغات میں سے ہے اور ان کی اکثر بلاغات وہ ہیں جن کے پیچھے ان شہاب چھپے ہوتے ہیں- امام مالکؒ ان سے حسن ظن رکھتے تھے لیکن وہ یہ جانتے تھے کہ ان شہاب پر شیعیت کا شبہ کیا جاتا ہے اس لیے وہ ان کو اپنی بلاغات کے پردے میں چھپا لیتے تھے-

معلوم ہوتا ہے یہ روایت بھی حضرت عثمانؓ کے اوپر حضرت علیؓ کی فضیلت کی غرض سے گھڑی گئی ہے- یہ بات قابل یقین نہیں کہ حضرت عثمانؓ بغیر تحقیق کے محض بداعتمادی کی بنا پر ایک بے گناہ عورت کو رجم کرا دیں- یہ ان شہاب کی شرارت ہے جس کا مقصد حضرت عثمانؓ کو بدنام کرنا ہے-

مَا جَاءَ فِي مَنِ اعْتَرَفَ عَلَى نَفْسِهِ بِالزِّنَا

اس شخص کے بارے میں جس نے اپنے متعلق زنا کا اعتراف کر لیا

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ أَنَّ رَجُلًا اعْتَرَفَ عَلَى نَفْسِهِ بِالزِّنَا عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَدَعَا لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِسَوْطٍ فَأُتِيَ بِسَوْطٍ مَكْسُورٍ فَقَالَ فَوْقَ هَذَا فَأُتِيَ بِسَوْطٍ جَدِيدٍ لَمْ تُقْطَعْ ثَمَرَتُهُ فَقَالَ دُونَ هَذَا فَأُوتِيَ بِسَوْطٍ قَدْ رُكِّبَ بِهِ وَلَانَ فَأَمَرَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَجُلِدَ ثُمَّ قَالَ أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ آنَ لَكُمْ أَنْ تَنْتَهُوا عَنْ حُدُودِ اللَّهِ مَنْ أَصَابَ مِنْ هَذِهِ الْقَاذُورَاتِ شَيْئًا فَلْيَسْتَتِرْ بِسِتْرِ اللَّهِ فَإِنَّهُ مَنْ يُبْدِ لَنَا صَفْحَتَهُ نُقِمْ عَلَيْهِ كِتَابَ اللَّهِ-

﴿ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کے زمانے میں اپنے متعلق زنا کا اعتراف کیا- رسول اللہ ﷺ نے

اس کے لیے کوڑا منگوایا تو ٹوٹا ہوا کوڑا لایا گیا- آپؐ نے فرمایا اس سے بہتر لاؤ- ایک نیا کوڑا لایا گیا جس کے پھل کی تیزی ابھی کند نہیں ہوئی تھی- آپ نے فرمایا اس سے کمتر لاؤ- پھر ایک کوڑا لایا گیا جس کو سواری میں استعمال کیا جا چکا تھا اور وہ نرم ہو گیا تھا- آپؐ نے حکم دیا تو آدمی کو اس کوڑے سے مارا گیا- پھر آپ نے فرمایا اے لوگو! اب تمہارے لیے وقت آ گیا ہے کہ اللہ کی حدود کی خلاف ورزی سے باز رہو اور جو شخص اس طرح کی گندگی میں مبتلا ہو جائے تو وہ اللہ کے پردے میں اپنے آپ کو چھپائے- لیکن جو شخص اپنی گردن ہمارے سامنے تانے گا تو ہم اللہ کی حدود اس پر جاری کریں گے-﴾

وضاحت :

ایک بات تو اس روایت میں یہ ہے کہ کوڑا درمیانہ ہونا چاہیے- نہ بالکل نیا ہو اور نہ ہی زیادہ استعمال شدہ کہ ٹوٹنے کے قریب ہو- ہمارے ہاں جیلوں میں جو کوڑا استعمال ہوتا ہے وہ خاص طریقے کا ہوایا جاتا ہے- اس کو باقاعدہ تیل دیا جاتا ہے- اس روایت سے معلوم ہوا کہ ایسا کوڑا اسلام میں مطلوب نہیں ہے- عام کوڑا ہونا چاہیے- آنحضرتؐ نے کوڑا منگوایا تو وہ ٹوٹا ہوا تھا- آپؐ نے اس کو تسلیم نہیں کیا- دوسری دفعہ بالکل تازہ شاخ سے بنایا گیا کوڑا لایا گیا- جس طرح چابک سوار کی رضا کو پھل کہتے ہیں اسی طرح نئے کوڑے کی تیزی کو پھل کہتے ہیں- جوہری نے ثمر سے کوڑے کے کنارے کی گرہیں مراد لی ہیں- یہ گرہیں اس کی گانٹھ ہوتی ہیں- حافظ عبدالبرؒ نے جو وضاحت کی ہے وہ ٹھیک ہے کہ جس کوڑے کو استعمال نہ کیا گیا ہو اور وہ نرم بھی نہ ہوا ہو بلکہ تازہ دم کوڑا ہو اس کو آپ نے نہیں مانا اور ایسا کوڑا استعمال کیا جو چابک کی رأس کا تھا- یہ چابک گھوڑے پر استعمال ہو چکا تھا اور اس میں نرمی پیدا ہو گئی تھی-

دوسری بات یہ ہے کہ جیلوں میں جو لوگ کوڑے لگانے پر مامور ہیں وہ کوڑا زنی کی مشق کرتے ہیں، جس طرح کہ فوجی مشقیں کرتے ہیں- یہ چیز بھی شریعت کے خلاف ہے- کوڑا مارنے کے لیے کسی مشاق پہلوان کو نہیں بلایا جائے گا- حاکم یا سزا دینے کا ذمہ دار شخص کسی بھی آدمی کو جو سامنے موجود ہو اس کو حکم دے دے گا کہ تم مجرم کو اتنے کوڑے لگا دو- صدر اول میں حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ مجرموں کو کوڑے لگاتے تھے لیکن انہوں نے اس کی کوئی ٹریننگ نہیں لی ہوئی تھی-

کوڑا لگانے کے بارے میں یہ ہدایت بھی ہے کہ مارتے وقت بغل نمایاں نہ ہو یعنی کوڑا زیادہ نہ اٹھایا جائے تاکہ متوسط درجے کی چوٹ ہی آسکے۔ یہ بات ایک دوسری روایت میں بیان ہوئی ہے۔

جہاں تک اعتراف کرنے کا تعلق ہے تو سزا صرف اسی مجرم کے لیے نہیں جو گناہ کا اعتراف کرے بلکہ یہ کا قائم ہو جانا اصل چیز ہے۔ ایسی شکلیں بھی ہو سکتی ہیں کہ اعتراف کے باوجود آپ کوڑے نہیں لگا سکتے کیونکہ بعض روایات میں ہے کہ آنحضرتؐ نے اعتراف کے باوجود مجرم کے بارے میں یہ پوچھا کہ وہ پاگل تو نہیں یا کیا اس کی ذہنی کیفیت درست نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالی اعتراف کوئی چیز نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اعتراف کے بعد زیادہ کریدنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

اس روایت میں رجم کا کوئی ذکر نہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ سزا سورہ نور کی جلد والی آیت کے تحت دی گئی۔

آنحضرت ﷺ کے یہ الفاظ کہ "ایھا الناس قد ان لکم ان تنتھوا من حدود اللہ" بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے جو کچھ ہوتا رہا وہ پرانی رسوم اور روایات کے تحت ہوتا رہا یا تورات کے احکام کے تحت ہوا ہوگا۔ آخر معاشرے میں کسی نہ کسی طریقے سے نظم تو قائم رکھنا ہوتا ہے لیکن جو قوانین جاری تھے وہ کسی مضبوط بنیاد پر نہ تھے۔ یہی قوانین جب قرآن میں واضح طریقے پر آگئے تب آپ نے فرمایا کہ وقت آگیا ہے کہ تم لوگ اللہ کے حدود سے باز رہو اور ان گندگیوں سے بچو۔ جو غلطی اس طرح سے ہو جائے تو اللہ کے پردے میں چھپنا چاہیے۔ وہ بے شک اللہ کی طرف رجوع کر کے معافی مانگنی چاہیے لیکن اگر کوئی اپنی گردن دکھائے گا تو ہم اس پر کتاب اللہ کا حکم جاری کریں گے۔ حکم سے اشارہ سورہ نور کے سو کوڑوں کی سزا کی طرف ہے۔

□ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ صَفِيَّةَ بِنْتَ اَبِی عُبَيْدٍ اَخْبَرَتْهُ اَنَّ اَبَابَكْرٍ الصِّدِّيقَ اُتِیَ بِرَجُلٍ قَدْ وَقَعَ عَلٰی جَارِيَةٍ بِكْرٍ فَاَحْبَلَهَا ثُمَّ اعْتَرَفَ عَلٰی نَفْسِهِ بِالزِّنَا وَلَمْ يَكُنْ اُحْصِنَ فَاَمَرَ بِهِ اَبُوبَكْرٍ فَجُلِدَ الْحَدَّ ثُمَّ نُفِیَ اِلٰی فَدَكَ۔

قَالَ مَالِكٌ فِی الَّذِی يَعْتَرِفُ عَلٰی نَفْسِهِ بِالزِّنَا ثُمَّ يَرْجِعُ عَنْ ذٰلِكَ وَيَقُولُ لَمْ اَفْعَلْ وَ اِنَّمَا كَانَ ذٰلِكَ مِنِّی عَلٰی وَجْهِ كَذَا وَ كَذَا لِشَیْءٍ يَذْكُرُهُ اِنَّ ذٰلِكَ يُقْبَلُ مِنْهُ وَلَا يُقَامُ عَلَيْهِ

الْحَدُّ وَذٰلِكَ اَنَّ الْحَدَّ الَّذِی هُوَ لِلّٰهِ لَا يُؤْخَذُ اِلَّا بِاَحَدِ وَجْهَيْنِ اِمَّا بِبَيِّنَةٍ عَادِلَةٍ تُثْبِتُ عَلٰی صَاحِبِهَا وَ اِمَّا بِاعْتِرَافٍ يُقِيمُ عَلَيْهِ حَتّٰی يُقَامَ عَلَيْهِ الْحَدُّ فَاِنْ اَقَامَ عَلٰی اعْتِرَافِهِ اُقِيمَ عَلَيْهِ الْحَدُّ قَالَ مَالِكٌ الَّذِی اَدْرَكْتُ عَلَيْهِ اَهْلَ الْعِلْمِ اَنَّهُ لَا نَفْیَ عَلَی الْعَبِيْدِ اِذَا زَنَوْا۔

﴿حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے ایک کنواری لونڈی سے بدکاری کیا اور وہ حاملہ ہو گئی۔ پھر اس نے زنا کا اعتراف کیا اور وہ شادی شدہ نہ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے حکم دیا تو اس پر کوڑوں کی حد جاری کی گئی پھر اس کو فدک کو جلاوطن کر دیا گیا۔

امام مالک کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص زنا کا اعتراف کر لے پھر اس سے لوٹ جائے اور کہے کہ میں نے ایسا نہیں کیا اور جو کچھ میں نے کہا اس کا یہ یہ پہلو تھا (یعنی اس کی توجیہ کر دے) تو اس کا عذر قبول ہوگا اور اس پر حد جاری نہیں کی جائے گی۔ اس لیے کہ حد جو اللہ کے لیے جاری کی جاتی ہے وہ دو وجہوں میں سے کسی ایک پر جاری کی جاتی ہے۔ ایک تو یہ کہ کوئی واضح دلیل ہو جس سے زنا کا جرم ثابت ہو جائے یا ایسا اعتراف ہو جس پر ملزم حد نافذ ہونے تک قائم رہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اہل علم کو اسی پر پایا اور یہ بات بھی فرمائی کہ غلام جب زنا کریں تو ان پر جلاوطنی کی سزا نہیں۔﴾

وضاحت:

اس روایت میں خاص بات یہ ہے کہ کوڑوں کی سزا کے علاوہ جلاوطنی کا حکم بھی ہے۔ حالانکہ جلاوطنی کی سزا کو سب منسوخ مانتے ہیں۔ اگر حضرت ابوبکرؓ نے یہ سزا بھی دی تو اس کو منسوخ ماننے کی کوئی بنیاد ہونی چاہیے۔

امام صاحب کے فتویٰ سے بھی یہ بات معلوم ہوئی کہ محض اعتراف کوئی چیز نہیں۔ اصل چیز بینہ یعنی دلیل ہے جو ملزم پر جرم ثابت کر دے۔ آج کل بھی پولیس کے آگے لوگ اعتراف کر لیتے ہیں لیکن عدالت میں جا کر رجوع کر لیتے ہیں۔ لہٰذا جو آدمی اپنے اعتراف سے پھر جائے اس پر حد جاری نہیں ہوگی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بغیر اعتراف کے نہیں ہو سکتا تو یہ شیعوں کا مذہب ہے اور کسی کا نہیں۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ غلام پر جلاوطنی نہیں- حالانکہ آگے ایک روایت آرہی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک غلام کو جلاوطنی کی سزا دی- امام مالک کی یہ رائے خلیفہ راشد کے خلاف ہے-

جَامِعُ مَا جَاءَ فِي حَدِّ الزِّنَا

زنا کی سزا کے بارے میں جامع باب

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ وَ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ الْجُهَنِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ سُئِلَ عَنِ الْاَمَةِ اِذَا زَنَتْ وَلَمْ تُحْصَنْ فَقَالَ اِنْ زَنَتْ فَاجْلِدُوْهَا ثُمَّ اِنْ زَنَتْ فَاجْلِدُوْهَا ثُمَّ اِنْ زَنَتْ فَاجْلِدُوْهَا ثُمَّ بِيْعُوْهَا وَلَوْ بِضَفِيْرٍ قَالَ ابْنُ شِهَابٍ لَا اَدْرِي اَبَعْدَ الثَّالِثَةِ اَوِ الرَّابِعَةِ.

﴿ابوہریرہؓ اور زید بن خالد جہنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایسی لونڈی کے لیے حکم پوچھا گیا جو زنا کی مرتکب ہوئی ہو جبکہ وہ محصنہ نہ ہو- آپؐ نے فرمایا کہ اگر زنا کرے تو کوڑے لگاؤ- اگر پھر زنا کرے تو کوڑے لگاؤ- پھر زنا کرے تو کوڑے لگاؤ پھر اس کو بیچ دو اگرچہ ایک رسی کے عوض- ابن شہاب کو معلوم نہیں تھا کہ بیچ دینے کا آپ نے تیسری مرتبہ کے بعد کہا یا چوتھی مرتبہ کے بعد-﴾

وضاحت :

اس روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آپؐ نے کتنے کوڑے مارنے کا حکم دیا- لوگوں کا خیال یہ ہے کہ غلاموں کی سزا آزاد مجرموں سے نصف ہے تو پچاس کوڑے لگانے کا حکم دیا گیا ہوگا- یہ بات قابل ذکر ہے کہ دوبارہ یا سہ بارہ جرم کے ارتکاب پر بھی سزا وہی رکھی گئی ہے اور اس کے بعد فروخت کر دینے کا حکم دیا گیا ہے-

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ عَبْدًا كَانَ يَقُوْمُ عَلٰى رَقِيْقِ الْخُمُسِ وَ اَنَّهُ اسْتَكْرَهَ جَارِيَةً مِنْ ذٰلِكَ الرَّقِيْقِ فَوَقَعَ بِهَا فَجَلَدَهُ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَنَفَاهُ وَلَمْ يَجْلِدِ الْوَلِيْدَةَ لِاَنَّهُ اسْتَكْرَهَهَا-

﴿مالک نافع سے روایت کرتے ہیں کہ ایک غلام غلاموں کی نگرانی پر مامور تھا- اس نے ان میں سے

ایک لونڈی کو مجبور کیا اور اس کے ساتھ بدکاری کی- حضرت عمرؓ نے اس کو کوڑے مارے اور جلاوطن کیا- لیکن لونڈی کو کوڑے نہیں مارے کیونکہ غلام نے اسے مجبور کیا تھا-﴾

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ اَنَّ سُلَيْمَانَ بْنَ يَسَارٍ اَخْبَرَهُ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنِ عَيَّاشِ بْنِ اَبِي رَبِيْعَةَ الْمَخْزُوْمِيَّ قَالَ اَمَرَنِي عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فِي فِتْيَةٍ مِنْ قُرَيْشٍ فَجَلَدْنَا وَلَائِدَ مِنْ وَلَائِدِ الْاِمَارَةِ خَمْسِيْنَ خَمْسِيْنَ فِي الزِّنَا-

﴿عبداللہ بن عیاش مخزومی سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے مجھے حکم دیا تو ہم نے قریش کے نوجوانوں کے معاملہ میں سرکاری لونڈیوں کو زنا کی سزا پچاس پچاس کوڑے لگائے-﴾

وضاحت :

یہ روایت حضرت عمرؓ کے عمل سے متعلق ہے اور اس سے متصل پہلی روایت بھی ان ہی کا اثر ہے- لیکن دونوں میں سزا کا واضح فرق ہے- پہلی روایت میں کوڑوں کے ساتھ جلاوطنی کی سزا بھی ہے- یہ معلوم نہیں کوڑے پچاس مارے گئے یا ایک سو- دوسری روایت کے مطابق لونڈیوں کو پچاس پچاس کوڑے مارے گئے یعنی آزاد مجرموں کی سزا کا نصف- سورہ نساء کی آیت ۲۵ میں صرف محصنہ لونڈیوں کی سزا نصف بتائی ہے جبکہ غلام مردوں کا کوئی ذکر نہیں- سورہ نور والی سزا میں صرف زانی مرد اور عورتوں کی سزا مذکور ہے، آزاد یا غلام کی تمیز نہیں کی گئی- جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زانی غلاموں کی سزا بھی سو کوڑے ہی ہے- صرف زانیہ محصنہ لونڈی کی سزا سورہ نساء کے تحت نصف ہوگی-

امام مالک کا فتویٰ اس عورت کے بارے میں جو حاملہ پائی جائے جبکہ اس کا شوہر نہ ہو، یہ ہے کہ اگر وہ یہ کہے کہ وہ مجبور کی گئی تھی یا یہ کہے کہ اس نے شادی کی تھی تو یہ بات اس کی قبول نہیں کی جائے گی اور اس پر حد جاری کی جائے گی الا آنکہ اس کے نکاح کے دعویٰ پر کوئی دلیل ملے یا وہ اس بات کی دلیل دے کہ وہ مجبور کی گئی-

امام مالک صاحب کا یہ فتویٰ ٹھیک ہے- اس میں بھی یہ ہے کہ مجرد انکار یا اعتراف کوئی چیز نہیں- اصل چیز جرم کی دلیل اور اس کا ثبوت ہے-

روایات پر تبصرہ :

کتاب الحدود کی زنا کے بارے میں تمام روایات اوپر گزر چکیں۔ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف موقعوں پر زنا میں ملوث ہونے والوں کو مختلف سزائیں دی گئیں۔زنا کی سزا کے بارے میں لوگوں میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے مسئلے کو واضح کیا جائے۔

قرآن مجید میں زانی مرد اور زانیہ عورت کو سو کوڑے لگانے کا حکم ہے۔قرآن مجید کے سوا اس سزا کو کوئی اور چیز باطل نہیں کر سکتی۔جہاں تک "الشیخ والشیخة فارجموھا البتہ" کا قرآن مجید کی آیت ہونے کا تعلق ہے اس کو تو انتہائی بد مذاق شخص بھی قرآن مجید کی آیت نہیں مانے گا۔ایک چیز قرآن مجید کی ہو اور وہ اس میں موجود نہ ہو،اس کا حکم موجود ہو اور آیت قرآن مجید میں سے نکال دی گئی ہو بالکل ہی نامعقول بات ہے۔پھر حضرت عمرؓ کو اس کے قرآن کی آیت ہونے پر اتنا جزم ہو لیکن وہ اس کو قرآن مجید میں داخل نہ کریں صرف اس ڈر سے کہ مسلمان کہیں گے کہ انہوں نے قرآن مجید میں اضافہ کر دیا،اس کا قطعاً کوئی امکان نہیں۔یہ بات صرف حضرت عمرؓ کو مطعون کرنے کے لیے گھڑی گئی ہے۔قرآن مجید کی کوئی آیت منسوخ نہیں کی جا سکتی،الا آنکہ خود قرآن مجید اس کو منسوخ کر دے۔اور ناسخ و منسوخ دونوں کا قرآن مجید میں ہونا لازمی ہے۔

میرے نزدیک قرآن مجید میں رجم کی سزا بھی ہے اور جلاوطنی کی سزا بھی۔لیکن یہ دونوں سزائیں عادی یا ہٹ دھرم مجرموں کے لیے ہیں۔

عبادہ بن صامت کی روایت بہترین طریقہ پر اس کی وضاحت کرتی ہے کہ الثیب بالثیب الجلد والرجم۔ البکر بالبکر الجلدوالنفی یعنی شادی شدہ کے لیے کوڑے اور رجم،اور غیر شادی شدہ کے لیے کوڑے اور جلاوطنی۔اس پر سب لوگوں کا اتفاق ہے کہ دونوں حدیں ایک ساتھ نہیں جاری ہو سکتیں۔اس لیے فقہاء اس کو منسوخ مانتے ہیں۔میرے نزدیک یہ عرفی نہ جاننے کی وجہ سے ہے۔اس لیے کہ وافراج ہی کے لیے نہیں آتا تفریق کے لیے بھی آتا ہے۔اس میں پہلی سزا دونوں صورتوں میں جلد ہی ہے۔یعنی پہلی سزا ہر زانی کو قرآن کے مطابق جلد ہی کی دی جائے گی۔اور اگر وہ ہٹ دھرم ہے،شریر ہے،ضدی ہے اور پھر پکڑا جائے تو قاضی شادی شدہ کو رجم کی اور غیر شادی شدہ کو جلاوطنی کی سزا بھی دے سکتا ہے۔

اب آنحضرت ﷺ کے زمانے کے واقعات کو لیں۔ان میں خاص واقعہ ماعز اسلمی کا ہے۔ماعز کے متعلق

روایات میں تضاد معلوم ہوتا ہے۔ایک روایت میں یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے جب ماعز کو رجم کیا تو اس کے بعد سرکاری بیان دیا۔اس میں آپ نے صاف صاف یہ کہا کہ جب ہم فوج لے کر نکلتے ہیں تو ہمارے پیچھے یہ شخص ہماری بہو بیٹیوں کے پیچھے "ینب نیب النبس" سانڈ کی طرح پھرتا۔یہ تقریر آپ نے واقعہ کے فوراً بعد کی تو اسی واقعہ سے متعلق تھی۔دوسری روایت میں نہایت واضح الفاظ میں یہ ہے کہ آنحضرت کو اس کی شرارتوں کا پہلے سے علم تھا لیکن کوئی ایسی بات ابھی علانیہ نہیں ہو سکی تھی جس پر سخت قسم کی سزا ہو۔اس کو بھی معلوم تھا کہ آنحضرتؐ اس کی حرکتوں پر نظر رکھتے ہیں۔جب وہ زنا کے جرم کا مرتکب ہوا تو اس کے قبیلے والوں نے اس کو مشورہ دیا کہ اب اور کوئی شکل چھٹنے کی نہیں تم آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہو جاؤ۔وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور پوچھا کہ آپ کو میرے متعلق کیا بات پہنچی ہے۔لیکن آپ نے اس کو ٹال دیا کیونکہ آپ واقعہ کی پوری تحقیق کر لینا چاہتے تھے۔وہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے پاس گیا۔انہوں نے یہی مشورہ دیا کہ آنحضرت ﷺ کے پاس جاؤ یہ بات آپ کے نوٹس میں ہے۔جب اس کو معلوم ہو گیا کہ اب چھٹنے کی کوئی صورت نہیں تب اس نے جا کر آنحضرت ﷺ کے سامنے جرم کا اعتراف کر لیا۔یہ اس نے خاندان اور قبیلے والوں کے مشورہ سے کیا۔آنحضرت ﷺ کا انداز سمجھنے والوں کا کام تو نہیں۔آپ ٹالتے رہے تو اس سے اس کو گمان ہوا کہ معاف کر دیں گے۔آنحضرت ﷺ کو اگرچہ معلوم تھا لیکن آپ اپنے علم کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کر سکتے تھے بلکہ آپ کو دلائل کی ضرورت تھی۔اس لیے آپ نے تحقیق کی کہ اس کی شادی ہوئی ہے یا نہیں۔اس کا دماغ ٹھیک ہے کہ نہیں۔یہ سب باتیں قدیم ترین قانون کی رو سے چلی آ رہی تھیں اور آج تک چلی آ رہی ہیں۔آخر کار جب آنحضرت ﷺ کو تحقیق ہو گیا کہ یہ شخص مجرم ہے تو آپ نے اس کو رجم کرنے کا حکم دے دیا۔تب اس نے کہا کہ میری قوم نے مجھے مروا دیا۔انہوں نے کہا تھا کہ آنحضرت ﷺ کے پاس جاؤ وہ تمہارے ساتھ رعایت کریں گے۔

اس شخص کے بارے میں کچھ لوگوں نے اس قسم کے سخت فقرے کہے کہ اس کی شامت اعمال نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور وہ کتے کی موت مار دیا گیا۔اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب وہ کیفر کردار تک پہنچ گیا تو اب اس کے معاملے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔بعض لوگوں کے خیال میں چونکہ اس نے آنحضرتؐ کے پاس خود جا کر بار بار کہا کہ مجھے پاک کیجئے اس لیے وہ دولی اللہ تھا۔عاقل یہ سمجھتا ہے کہ مجرم جب بے بس ہو جاتا ہے تو یہ طریقہ اختیار کرتا ہے۔ایمان کی بات یہ ہے کہ اگر ایسی بات ہوتی تو آپ اس کا جنازہ پڑھ دیتے،لیکن روایات میں ہے کہ آپ نے

اس کے لیے نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ اگر وہ سزا پا کر انتہائی مقرب ہو گیا تھا تو آپ نے نماز جنازہ کیوں نہ پڑھی!

دوسرا واقعہ غامدیہ کا ہے۔ اس خاتون کے خاندان کا پتہ نہیں، اس کے شوہر کا پتہ نہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ شادی شدہ تھی یا نہیں اور اس کے متعلق پوچھا بھی نہیں گیا۔ اس کا بچہ بھی کسی انصاری کے حوالے کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کال گرل تھی۔ جب حمل ہو گیا تو جرم ثابت ہو گیا اور اس میں کوئی ابہام بھی نہ رہا۔ ایسے لوگوں کا علاج ایک ہی تھا کہ ان کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ چنانچہ یہ غامدیہ بھی رجم کر دی گئی۔

یہ دو واقعات سنگین قسم کے مجرموں کے ہیں اس لیے ان کو سخت سزا دی گئی اور دونوں کو رجم کر دیا گیا۔

اَلْحَدُّ فِی الْقَذْفِ وَالنَّفْیِ وَالتَّعْرِیْضِ

تہمت لگانے، باپ کا بیٹا ہونے کی نفی کرنے اور ایسا جملہ بولنے پر جس سے تہمت کا مفہوم پیدا ہوتا ہو، کیا حد جاری ہو گی

☐ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ اَبِی الزِّنَادِ اَنَّهٗ قَالَ جَلَدَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِیْزِ عَبْدًا فِی فِرْیَةٍ ثَمَانِیْنَ قَالَ اَبُو الزِّنَادِ فَسَاَلْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عَامِرِ بْنِ رَبِیْعَةَ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ اَدْرَكْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ وَعُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ وَالْخُلَفَاءَ هَلُمَّ جَرًّا فَمَا رَاَیْتُ اَحَدًا جَلَدَ عَبْدًا فِی فِرْیَةٍ اَكْثَرَ مِنْ اَرْبَعِیْنَ۔

﴿حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک غلام کو تہمت لگانے پر اسی کوڑے مارے۔ ابوالزناد کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عامر بن ربیعہ سے اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت عمر بن خطابؓ، عثمان بن عفانؓ اور سب خلفاء کو نہیں دیکھا کہ انہوں نے غلام کو تہمت لگانے کے جرم میں چالیس کوڑے سے زیادہ مارے ہوں۔﴾

وضاحت:

قذف صرف اسی شکل میں ہو گا جب الزام کی نوعیت کسی کے اصل ماں یا باپ ہونے کی نفی کی ہو یا زنا وغیرہ کی تہمت لگائی جائے۔ چوری، رشوت یا دوسرے جرائم کا الزام قذف میں نہیں آتا۔ الزام میں بھی ایک

تصریح کی شکل ہوتی ہے اور ایک تعریض کی، جیسے کہ آج کل مصنف لوگ اپنے متعلق بیان کر دیتے ہیں یا کالم نگار لوگ اپنے حریفوں کے متعلق فقرے لکھ دیتے ہیں جس سے تعریض کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ صریح قذف کی سزا اسی کوڑے ہے۔

اس روایت میں یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک غلام کو اسی کوڑے مارے جبکہ غلام کی سزا نصف ہے۔ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان بن عفانؓ سب کے سب خلفاء صرف چالیس کوڑے ہی لگاتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا شمار بھی خلفائے راشدین میں ہوتا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ ان کو اپنے پیشرو خلفاء کا اس بارے میں عمل اور فتویٰ معلوم نہ رہا ہو اور وہ اس کے خلاف عمل کریں۔ صرف ایک امکان یہ ہے کہ غلام آق (بھاگا ہوا) رہا ہو۔ غلام آق کے بارے میں ایک قوی مذہب یہ ہے کہ اس کے اوپر پوری حد جاری کی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آق ہونے کی وجہ سے چاہے بے قاعدہ ہی سہی وہ غلامی سے نکل جاتا ہے۔ غلامی ایسی چیز نہیں کہ ہر جگہ اس کے ساتھ چمٹی رہے تو غلام آق سے متعلق فقہا کی رائے ٹھیک ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی بھی یہ رائے رہی ہو اور انہوں نے اس غلام پر عبد آق ہونے کی وجہ سے پوری حد جاری کر دی ہو۔

☐ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ زُرَیْقِ بْنِ حَكِیْمٍ الْاَیْلِی اَنَّ رَجُلًا یُقَالُ لَهٗ مِصْبَاحٌ اسْتَعَانَ ابْنًا لَهٗ فَكَاَنَّهٗ اسْتَبْطَاَهٗ فَلَمَّا جَاءَهٗ قَالَ لَهٗ یَا زَانِی قَالَ زُرَیْقٌ فَاسْتَعْدَانِی عَلَیْهِ فَلَمَّا اَرَدْتُ اَنْ اَجْلِدَهٗ قَالَ ابْنُهٗ وَاللّٰهِ لَئِنْ جَلَدْتَهٗ لَاَبُوْءَنَّ عَلٰی نَفْسِی بِالزِّنَا فَلَمَّا قَالَ ذٰلِكَ اَشْكَلَ عَلَیَّ اَمْرُهٗ فَكَتَبْتُ فِیْهِ اِلٰی عُمَرَ بْنِ عَبْدِالْعَزِیْزِ وَهُوَ الْوَالِی یَوْمَئِذٍ اَذْكُرُ لَهٗ ذٰلِكَ فَكَتَبَ اِلَیَّ عُمَرُ اَنْ اَجِزْ عَفْوَهٗ قَالَ زُرَیْقٌ وَ كَتَبْتُ اِلٰی عُمَرَ بْنِ عَبْدِالْعَزِیْزِ اَیْضًا اَرَاَیْتَ رَجُلًا افْتُرِیَ عَلَیْهِ اَوْ عَلٰی اَبَوَیْهِ وَ قَدْ هَلَكَا اَوْ اَحَدُهُمَا قَالَ فَكَتَبَ اِلَیَّ عُمَرُ اِنْ عَفَا فَاَجِزْ عَفْوَهٗ فِیْ نَفْسِهٖ وَاِنِ افْتُرِیَ عَلٰی اَبَوَیْهِ وَقَدْ هَلَكَا اَوْ اَحَدُهُمَا فَخُذْ لَهٗ بِكِتَابِ اللّٰهِ اِلَّا اَنْ یُرِیْدَ سَتْرًا قَالَ یَحْیٰی سَمِعْتُ مَالِكًا یَقُوْلُ وَ ذٰلِكَ اَنْ یَكُوْنَ الرَّجُلُ الْمُفْتَرٰی عَلَیْهِ یَخَافُ اِنْ كُشِفَ ذٰلِكَ مِنْهُ اَنْ تَقُوْمَ عَلَیْهِ بَیِّنَةٌ فَاِذَا كَانَ عَلٰی مَا وَصَفْتُ فَعَفَا جَازَ عَفْوُهٗ

﴿امام مالک زریق بن حکیم سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص جس کا نام مصباح تھا اس نے اپنے بیٹے

سے کسی کام کے لیے کہا لیکن اس نے کچھ دیر لگادی۔ جب وہ آیا تو اس نے کہا او زانی! زریق کہتے ہیں کہ اس نے اپنے والد کے خلاف مجھ سے مدد مانگی۔ جب میں نے چاہا کہ اس کو کوڑے لگاؤں تو اس کے بیٹے نے کہا کہ واللہ، اگر آپ نے میرے ابو کو کوڑا لگایا تو میں اپنے اوپر زنا کا اعتراف کرلوں گا۔ جب اس نے یہ کہا تو میں الجھن میں پڑ گیا۔ میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو، جو اس وقت گورنر تھے، اس کے متعلق لکھا۔ انہوں نے مجھے لکھا کہ اس کی معافی جاری کردو۔ زریق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو یہ بھی لکھا کہ بتایئے کہ اگر ایک شخص کی ذات پر یا اس کے والدین پر افترا کیا گیا ہو اور وہ دونوں کے دونوں یا ان میں سے ایک مر چکا ہو تو اس کا کیا حکم ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے لکھا کہ اگر وہ شخص معاف کردے تو اس کی ذات کے لیے معافی جاری کردو، اور اگر اس کے ماں باپ پر افترا کیا گیا ہو اور وہ دونوں یا ان میں سے ایک مر چکا ہے تو اس کے اوپر اللہ کی کتاب جاری کرو، الا آنکہ وہ اس پر پردہ ڈالنا چاہے۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے مالکؒ کو کہتے سنا کہ یہ ہو سکتا ہے کہ جس پر افترا کیا گیا ہے اس بات کا اندیشہ رکھتا ہو کہ اگر یہ چیز اس سے ظاہر ہو گئی تو اس پر دلیل قائم نہ ہو جائے۔ اگر ایسی صورت ہو اور وہ معاف کردے تو اس کا معاف کرنا درست ہوگا۔﴾

وضاحت :

یہ بات روایت سے ظاہر نہیں کہ کیا زریق صاحب اختیار تھے کہ وہ کوڑے لگانے پر تیار ہو گئے۔ اگر وہ صاحب اختیار نہیں تھے تو ان سے مدد چاہنا اور ان کا کوڑے لگانا سمجھ میں نہیں آتا۔ کوڑے لگانے کا معاملہ پرائیویٹ نہیں ہوتا۔ صرف قاضی یا صاحب امر ہی کوڑے لگا سکتا ہے۔ لہذا ماننا پڑے گا کہ زریق صاحب امر تھے اسی لیے انہوں نے معاملہ گورنر کی طرف بھیجا۔ پہلے تو بیٹے نے باپ کے خلاف زریق کی مدد طلب کی۔ پھر جب دیکھا کہ باپ کو کوڑے لگنے والے ہیں تو اس نے کہا کہ میں اپنے آپ کو زانی ہی تسلیم کرلیتا ہوں، یعنی باپ کو مفتری نہیں بنانا چاہتا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کے جواب میں یہ لکھا کہ بیٹے کی معافی قبول کرلو۔ گویا مفتری علیہ کا معاف کردینا درست ہے۔

زریق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو لکھا کہ بتایئے کہ اگر ایک شخص کے اپنے اوپر یا اس کے ماں باپ پر افترا کیا گیا ہو اور وہ دونوں کے دونوں یا ان میں سے ایک مر چکا ہے تو اس صورت میں کیا کیا جائے گا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے لکھا کہ اگر وہ معاف کردے تو اس کی ذات کے لیے معافی کو جاری کردو۔ اور اگر اس کے ماں باپ پر افترا کیا گیا ہے اور ان میں سے ایک یا دونوں مر چکے ہیں تو اس کے اوپر اللہ کا قانون جاری کروالا آنکہ وہ اس پر پردہ ڈالنا چاہے۔ روایت کا یہ حصہ مشکل ہے کیونکہ اس طرح کسی نے جرم کیا ہے تو جب معاملہ عدالت میں جا چکا ہے تب نہ مجرم کے حق میں سفارش کرنی چاہیے اور نہ ہی کسی کو جرم چھپانے کا مشورہ دینا چاہیے۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرتؐ کے پاس آکر کہا کہ میں نے ملزم کو معاف کردیا۔ آپ نے فرمایا کہ میرے پاس آنے سے پہلے معاف کیا ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ اب تو معاملہ عدالت میں آگیا، وہی فیصلہ کرے گی۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ اَبِي الرِّجَالِ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ حَارِثَةَ بْنِ النُّعْمَانِ الْاَنْصَارِيِّ ثُمَّ مِنْ بَنِي النَّجَّارِ عَنْ اُمِّهِ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّ رَجُلَيْنِ اسْتَبَّا فِي زَمَانِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَالَ اَحَدُهُمَا لِلْآخَرِ وَاللّٰهِ مَا اَبِي بِزَانٍ وَلَا اُمِّي بِزَانِيَةٍ فَاسْتَشَارَ فِي ذٰلِكَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَقَالَ قَائِلٌ مَدَحَ اَبَاهُ وَ اُمَّهُ وَقَالَ آخَرُوْنَ قَدْ كَانَ لِاَبِيْهِ وَاُمِّهِ مَدْحٌ غَيْرُ هٰذَا نَرٰى اَنْ تَجْلِدَهُ الْحَدَّ فَجَلَدَهُ عُمَرُ الْحَدَّ ثَمَانِيْنَ قَالَ مَالِكٌ لَاحَدَّ عِنْدَنَا اِلَّا فِي نَفْيٍ اَوْ قَذْفٍ اَوْ تَعْرِيْضٍ يُرٰى اَنَّ قَائِلَهُ اِنَّمَا اَرَادَ بِذٰلِكَ نَفْيًا اَوْ قَذْفًا فَعَلٰى مَنْ قَالَ ذٰلِكَ الْحَدُّ تَامًّا قَالَ مَالِكٌ الْاَمْرُ عِنْدَنَا اَنَّهُ اِذَا نَفٰى رَجُلٌ رَجُلًا مِنْ اَبِيْهِ فَاِنَّ عَلَيْهِ الْحَدَّ وَ اِنْ كَانَتْ اُمُّ الَّذِي نُفِيَ مَمْلُوْكَةً فَاِنَّ عَلَيْهِ الْحَدَّ۔

﴿عمرہ بنت عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ کے زمانے میں دو آدمی آپس میں گالم گلوچ ہوئے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ نہ میرا باپ زانی ہے اور نہ میری ماں زانیہ۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے اس بارے میں مشورہ طلب کیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ اس نے اپنے ماں باپ کی تعریف کی ہے۔ دوسروں نے کہا کہ ماں باپ کی تعریف ہی کرنی تھی تو اس کے بہت سے دوسرے اسلوب موجود تھے۔ ہمارے خیال میں اس پر آپ کوڑوں کی حد جاری کریں۔ چنانچہ حضرت

عمرؓ نے اس پر اسی کوڑے کی حد جاری کی۔ امام مالک کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک حد صرف نفی یا قذف میں ہے یا پھر ایسی تعریض کی صورت میں جس کے بارے میں یہ رائے دی جائے کہ اس کا مقصد نفی یا قذف سے تھا۔ امام مالک کہتے ہیں کہ حد تب ہو گی جب کوئی شخص دوسرے کے باپ کی نفی کرے۔ اگر اس شخص کی ماں جس کی نفی کی گئی لونڈی بھی ہو جب بھی اس پر حد ہو گی۔﴾

وضاحت :

یہ تعریض کی وہ شکل ہے جس میں ہانیہ حد مانتے ہیں کیونکہ اگر آدمی نے ماں باپ کی تعریف ہی کرنی تھی تو یہ کہہ سکتا تھا کہ میرا باپ بڑا متقی پرہیزگار آدمی تھا اور میری ماں بھی بڑی متقیہ تھی۔ جب اس نے اپنے ماں باپ کے متعلق یوں کہا کہ وہ زناکار نہ تھے تو گویا اس نے اپنے حریف کے ماں باپ پر زناکاری کا الزام لگایا۔ وہ اپنے ماں باپ کی تعریف نہیں بلکہ دوسرے کے ماں باپ پر تعریض کرنا چاہتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے مشورہ کے بعد اس شخص کو قذف کی سزا دی۔ حضرت عمرؓ کے اسی اثر پر ہانیہ کا عمل ہے لیکن احناف اور شوافع اس کے قائل نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حد صرف اسی صورت میں جاری ہو گی جب صریح الفاظ استعمال کیے جائیں۔ کوئی کسی پر قذف کرے کہ تیرا باپ زانی تھا یا تیری ماں فاحشہ تھی۔ اشارہ، کنایہ یا اخباری انداز میں کچھ کہنے سے حد جاری نہیں ہو گی۔ میرے نزدیک احناف کی رائے اس حد تک ٹھیک ہے کہ حد جاری نہیں ہو گی لیکن اگر کسی پر حد جاری کرنے کے لیے پورا مواد موجود نہ ہو تو اس کو یوں ہی چھوڑ نہیں دینا چاہیے بلکہ تعزیر ہونی چاہیے۔ جیسے چوری کا معاملہ ہو تو قطع ید تو تب ہو گا جب مال مسروقہ اتنا ہو جس پر چوری کا اطلاق ہو سکے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ چور کو چھوڑ دیا جائے کہ جا یہ کام کرتے رہو۔ قطع ید سے کمتر سزا تو دی جا سکتی ہے۔

مَالَا حَدَّ فِيهِ

جس صورت میں حد نافذ نہیں ہو گی

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ اَبِي عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ لِرَجُلٍ خَرَجَ بِجَارِيَةٍ لِامْرَاَتِهٖ مَعَهٗ فِي سَفَرٍ فَاَصَابَهَا فَغَارَتِ امْرَاَتُهٗ فَذَكَرَتْ ذٰلِكَ لِعُمَرَ ابْنِ

الْخَطَّابِ فَسَاَلَهٗ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ وَهَبَتْهَا لِي فَقَالَ عُمَرُ لَتَاْتِيَنِّي بِالْبَيِّنَةِ اَوْ لَاَرْمِيَنَّكَ بِالْحِجَارَةِ قَالَ فَاعْتَرَفَتِ امْرَاَتُهٗ اَنَّهَا وَهَبَتْهَا لَهٗ۔

﴿ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ ایک شخص سفر میں نکلا اور اس کے ساتھ اس کی بیوی کی لونڈی تھی۔ وہ اس لونڈی کے ساتھ مرتکب ہو گیا۔ بیوی کو غیرت لاحق ہوئی تو اس نے حضرت عمرؓ سے ذکر کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کے شوہر سے پوچھا تو اس نے کہا کہ یہ لونڈی میری بیوی نے مجھے ہبہ کر دی تھی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ثبوت لاؤ ورنہ میں تمہیں سنگسار کر دوں گا۔ کہتے ہیں کہ اس کی بیوی نے اعتراف کر لیا کہ اس نے لونڈی میاں کو ہبہ کر دی تھی۔﴾

وضاحت :

حضرت عمرؓ کو اگرچہ معلوم تھا کہ عورت نے جب دیکھا کہ شوہر کو رجم کر دیا جائے گا تو اس نے رحم کھا کر ہبہ کرنے کا اعتراف کیا ہے لیکن قانون کے آگے حاکم کچھ نہیں کر سکتا۔ پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ میں تو بہر حال دلائل پر فیصلہ کروں گا، اپنے علم پر تو نہیں کر سکتا۔ اگر تم میرے فیصلے کے ذریعے کوئی ایسا حق لے لو گے جو تمہارا نہیں تو جہنم میں جاؤ گے۔ عدالت کا کام شہادت پر فیصلہ کرنا ہے، خواہ قاضی پر بات کتنی ہی واضح ہو۔ از روئے فقہ اس آدمی پر حد جاری ہوتی لیکن حضرت عمرؓ نے چھوڑ دیا کیونکہ اس کی زوجہ نے لونڈی ہبہ کرنے کا اعتراف کر لیا اور حضرت عمرؓ کو معلوم بھی تھا کہ صرف شوہر کی جان بچانے کی خاطر عورت نے ایسا کیا ہے۔

مَا يَجِبُ فِيهِ الْقَطْعُ

کتنی مقدار کی چوری پر ہاتھ کاٹا جائے گا

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَطَعَ فِي مِجَنٍّ ثَمَنُهٗ ثَلَاثَةُ دَرَاهِمَ۔

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ڈھال جس کی قیمت تین درہم تھی، کی چوری پر ہاتھ کاٹا ہے۔﴾

وضاحت :

چوری کا اطلاق ہر گری پڑی چیز کی چوری پر نہیں ہو تا بلکہ قدر و قیمت رکھنے والی چیز کی چوری پر ہوتا ہے۔اس زمانے کے تین درہم آج کل کے تین سو روپے سے کیا کم ہوں گے۔ مختلف روایات میں عدالتی فیصلوں کی روشنی میں فقہانے قطع ید کے لیے متعدد شرائط بیان کی ہیں۔ مثلاً مال کا محفوظ ہونا،مال میں شراکت کا نہ ہونا،چور کا غلام نہ ہونا، قحط وغیرہ نہ ہونا،مال محروز یعنی محفوظ ہونا چاہیے۔ مختلف اشیاء کے محروز ہونے کی شکل الگ ہے۔اگر مال اپنی معروف شکل میں محروز ہو اور چوری ہو جائے اور اس کی قیمت اتنی ہو جس پر چوری کا اطلاق ہوتا ہو تو چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِی حُسَیْنٍ الْمَكِّی اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا قَطْعَ فِی ثَمَرٍ مُعَلَّقٍ وَلَا فِی حَرِیْسَةِ جَبَلٍ فَاِذَا اٰوَاهُ الْمَرَاحُ اَوِ الْجَرِیْنُ فَالْقَطْعُ فِیْمَا یَبْلُغُ ثَمَنَ الْمِجَنِّ۔

﴿عبداللہ بن عبدالرحمٰن ابن ابی حسین المکی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا شاخ پر لٹکے پھل توڑنے پر اور نہ کسی پہاڑ کے گوشے میں بیٹھے جانور کی چوری پر۔اور ہاتھ کاٹا جائے گا اس جانور کی چوری پر جو باڑے میں یا پھل خشک کرنے کے میدان میں ہو، جس کی قیمت ڈھال کی قیمت کے برابر ہو۔﴾

وضاحت :

درختوں پر لٹکے پھل مال محروز نہیں جب تک باغ کے گرد باڑ اور نگہبانی کا انتظام نہ ہو۔اسی طرح جب تک جانور اس جگہ پر نہ ہوں جہاں گلے ٹھہرائے جاتے ہیں تو وہ بھی مال محروز متصور نہیں ہوں گے۔روایت کا آخری حصہ راوی کا اپنا اضافہ ہے،اگرچہ اس مضمون کی روایت اوپر گزر چکی ہے۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِی بَكْرٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّ سَارِقًا سَرَقَ فِی زَمَانِ عُثْمَانَ اُتْرُجَّةً فَاَمَرَ بِهَا عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ اَنْ تُقَوَّمَ فَقُوِّمَتْ بِثَلَاثَةِ

دَرَاهِمَ مِنْ صَرْفِ اثْنَیْ عَشَرَ دِرْهَمًا بِدِیْنَارٍ فَقَطَعَ عُثْمَانُ یَدَهٗ

﴿عمرہ بنت عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ایک چور نے ایک اترجہ چرا لیا۔حضرت عثمان نے حکم دیا کہ اس کی قیمت لگائی جائے۔ایک دینار کا صرف بارہ درہم بان کر قیمت لگائی گئی تو وہ تین درہم ہوئی۔حضرت عثمانؓ نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا۔﴾

وضاحت :

اترجہ سے مراد خوشبو ڈالنے کے لیے سونے کا زیور لیا گیا ہے۔اس کی قیمت تین درہم کے برابر ہونا سمجھ میں آتی ہے۔ایک دینار میں بارہ درہم ہوتے تھے لیکن اگر درہم ٹوٹے ہوئے یا زیادہ گھسے ہوئے ہوتے یا بعض دوسرے عوامل کے تحت وہ ایک دینار کے عوض بارہ سے زیادہ بھی ہو سکتے تھے۔حضرت عثمان نے قیمت لگوائی تو وہ اترجہ تین درہم کا نکلا۔چنانچہ چور کو قطع ید کی سزا دی گئی۔شاہ ولی اللہ نے اترجہ سے مراد لیموں شیریں لیا ہے تو اس کی قیمت کسی صورت میں بھی تین درہم نہیں ہو سکتی۔اس لیے پہلا مطلب ہی درست معلوم ہوتا ہے۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ یَحْیَی بْنِ سَعِیْدٍ عَنْ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِیِّ ﷺ اَنَّهَا قَالَتْ مَا طَالَ عَلَیَّ وَمَا نَسِیْتُ الْقَطْعَ فِی رُبُعِ دِیْنَارٍ فَصَاعِدًا۔

﴿حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میرے اوپر زیادہ زمانہ بھی نہیں گزرا اور میں بھولی بھی نہیں ہوں کہ ہاتھ جو کاٹا جاتا تھا وہ ایک چوتھائی دینار اور اس سے زائد پر ہوتا تھا۔﴾

وضاحت :

یہ وہی بات ہے جو اوپر کی روایات میں بیان ہوئی کہ تین درہم سے کم قیمت پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ربع دینار بھی تین درہم ہی بنتے ہیں جب ایک دینار میں بارہ درہم کا صرف ہو۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ اَبِی بَكْرِ بْنِ حَزْمٍ عَنْ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّهَا قَالَتْ خَرَجَتْ عَائِشَةُ زَوْجُ النَّبِیِّ ﷺ اِلٰی مَكَّةَ وَمَعَهَا مَوْلَاتَانِ لَهَا وَمَعَهَا غُلَامٌ لِبَنِی عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِی بَكْرٍ الصِّدِّیْقِ فَبَعَثَتْ مَعَ الْمَوْلَاتَیْنِ بِبُرْدٍ مُرَجَّلٍ قَدْ خِیْطَ عَلَیْهِ خِرْقَةٌ

خَضْرَاءُ قَالَتْ فَاَخَذَ الْغُلَامُ الْبُرْدَ فَفَتَقَ عَنْهُ فَاسْتَخْرَجَهُ وَجَعَلَ مَكَانَهُ لِبْدًا اَوْ فَرْوَةً وَ خَاطَ عَلَيْهِ فَلَمَّاقَدِمَتِ الْمَوْلَاتَانِ دَفَعَتَا ذٰلِكَ اِلٰى اَهْلِهِ فَلَمَّا فَتَقُوا عَنْهُ وَجَدُوا فِيهِ اللِّبْدَ وَ لَمْ يَجِدُوا الْبُرْدَ فَكَلَّمُوا الْمَرْاَتَيْنِ فَكَلَّمَتَا عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ اَوْ كَتَبَتَا اِلَيْهَا وَ اَتْهَمَتَا الْعَبْدَ فَسُئِلَ الْعَبْدُ عَنْ ذٰلِكَ فَاعْتَرَفَ فَاَمَرَتْ بِهِ عَائِشَةُ زَوْجُ النَّبِيِّ ﷺ فَقُطِعَتْ يَدُهُ وَقَالَتْ عَائِشَةُ اَلْقَطْعُ فِي رُبُعِ دِينَارٍ فَصَاعِدًا وَقَالَ مَالِكٌ اَحَبُّ مَا يَجِبُ فِيهِ الْقَطْعُ اِلَيَّ ثَلَاثَةُ دَرَاهِمَ وَ اِنِ ارْتَفَعَ الصَّرْفُ اَوِاتَّضَعَ وَ ذٰلِكَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَطَعَ فِي مِجَنٍّ قِيمَتُهُ ثَلَاثَةُ دَرَاهِمَ وَ اَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ قَطَعَ فِي اُتْرُجَّةٍ قُوِّمَتْ بِثَلَاثَةِ دَرَاهِمَ وَ هٰذَا اَحَبُّ مَا سَمِعْتُ اِلَيَّ فِي ذٰلِكَ۔

﴿عمرہ بنت عبدالرحمٰن بیان کرتی ہیں کہ حضرت عائشہؓ کے تشریف لے گئیں تو ان کے ہمراہ ان کی دو آزاد کردہ لونڈیاں اور عبداللہ بن ابی بکر صدیق کے بیٹوں کا ایک غلام تھا۔ حضرت عائشہ نے ان دو لونڈیوں کے ہاتھ مخمل کی ایک چادر بھیجی جس پر کام کیا ہوا تھا اور اس کے اوپر سبز کپڑا لحاف کی شکل میں سلا ہوا تھا۔ غلام نے اسے لیا، کپڑے کو ادھیڑا، اس میں سے چادر نکال لی اور اس کی جگہ نمدہ یا موٹے کمبل کا ٹکڑا ڈال کر پھر سلائی کر دی۔ جب دونوں لونڈیاں آئیں تو انہوں نے امانت مالکوں کے حوالے کی۔ جب انہوں نے اس کو ادھیڑا تو اس میں چادر نہ پائی۔ اس کی جگہ نمدے کا ٹکڑا پایا۔ انہوں نے دونوں عورتوں سے بات کی تو انہوں نے حضرت عائشہ سے ذکر کیا یا ان کو لکھا اور غلام کے اوپر الزام لگایا۔ اس بارے میں غلام سے پوچھا گیا تو اس نے جرم کا اعتراف کر لیا۔ حضرت عائشہؓ نے حکم دیا تو اس غلام کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ حضرت عائشہ نے بتایا کہ ربع دینار یا اس سے زیادہ قیمت کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا ہے۔ امام مالک کہتے ہیں کہ میرے نزدیک قطع ید کے بارے میں پسندیدہ بات یہ ہے کہ مال مسروقہ کی قیمت تین درہم ہو، چاہے صرف کم ہو یا زیادہ۔ کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ڈھال جس کی قیمت تین درہم تھی، کی چوری پر ہاتھ کاٹا اور حضرت عثمان بن

عفان نے ایک اترجہ، جس کی قیمت تین درہم لگائی گئی تھی، پر ہاتھ کاٹا۔﴾

وضاحت:

اس روایت میں بھی مال مسروقہ کی اصل قیمت ربع دینار یا تین درہم ہی بتائی گئی ہے۔ اس میں راوی کی یہ بات درست نہیں کہ حضرت عائشہؓ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ آپ صاحب امر یا قاضی تو نہ تھیں۔ انہوں نے قاضی کے پاس بھیجا ہوگا اور اس نے فیصلہ کیا ہوگا کہ ہاتھ کاٹ دیا جائے۔

میرے نزدیک امام مالک کی یہ بات غلط ہے کہ دینار اور درہم کے صرف کا بھاؤ چاہے زیادہ ہو یا کم، مال مسروقہ کی اصل قیمت تین درہم ہی ہونی چاہیے۔ یہ ان کی سادگی ہے۔ اگر دینار کا بھاؤ زیادہ ہوگا تو درہم زیادہ ہوں گے، جیسے کہ اب روپے کی قیمت ڈالر کے تابع ہے۔ اس کے لیے جو دلیل انہوں نے دی ہے اس میں صرف کے کم یا زیادہ ہونے سے متعلق کوئی بات نہیں کہی گئی۔

مَا جَاءَ فِي قَطْعِ الْآبِقِ وَالسَّارِقِ

مفرور غلام، جو چور ہو، کے ہاتھ کاٹنے سے متعلق روایات

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ عَبْدًا لِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ سَرَقَ وَهُوَ آبِقٌ فَاَرْسَلَ بِهِ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ اِلٰى سَعِيدِ ابْنِ الْعَاصِ وَهُوَ اَمِيرُ الْمَدِينَةِ لِيَقْطَعَ يَدَهُ فَاَبٰى سَعِيدٌ اَنْ يَقْطَعَ يَدَهُ وَ قَالَ لَا تُقْطَعُ يَدُ الْآبِقِ السَّارِقِ اِذَا سَرَقَ فَقَالَ لَهُ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ فِي اَيِّ كِتَابِ اللّٰهِ وَجَدْتَ هٰذَا ثُمَّ اَمَرَ بِهِ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ فَقُطِعَتْ يَدُهُ۔

﴿نافع سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ کے ایک غلام نے چوری کی اور وہ مفرور تھا۔ اس کو پکڑ کر عبداللہ بن عمر نے سعید بن عاص کے پاس بھیجا جو اس وقت مدینہ کے گورنر تھے کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیں۔ سعید نے ہاتھ کاٹنے سے انکار کیا اور یہ کہا کہ مفرور غلام جو چوری کرے اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جاتا۔ عبداللہ بن عمر نے کہا کہ کس کتاب میں آپ نے یہ فتویٰ پڑھا ہے۔ پھر عبداللہ بن عمر نے حکم دیا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔﴾

وضاحت :

سعید بن عاص نے شاید اس بات پر انکار کیا ہوگا کہ غلام ہے اور غلام کا نہ ہاتھ اپنا ہوتا ہے اور نہ مال ہی اس کی ملکیت ہے - لیکن جب وہ آزاد ہے تو نیم آزاد ہے جب تک کہ پھر غلام نہ ہو جائے - حضرت عبداللہ بن عمر کا مقام تو مفتی کی حیثیت سے بڑا ہے - اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے - انہوں نے دوبارہ معاملہ اپنے فتوے کے ساتھ بھیجا ہوگا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے تو امیر مدینہ نے ان کی بات تسلیم کر لی اور ہاتھ کاٹ دیا -

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زُرَيْقِ بْنِ حَكِيمٍ أَنَّهُ أُخْبِرَهُ أَنَّهُ أَخَذَ عَبْدًا آبِقًا قَدْ سَرَقَ قَالَ فَاشْكَلَ عَلَيَّ أَمْرُهُ قَالَ فَكَتَبْتُ فِيهِ إِلَى عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ أَسْأَلُهُ عَنْ ذَلِكَ وَهُوَ الْوَالِي يَوْمَئِذٍ قَالَ فَأَخْبَرْتُهُ أَنِّي كُنْتُ أَسْمَعُ أَنَّ الْعَبْدَ الْآبِقَ إِذَا سَرَقَ وَهُوَ آبِقٌ لَمْ تُقْطَعْ يَدُهُ قَالَ فَكَتَبَ إِلَيَّ عُمَرُ بْنُ عَبْدِالْعَزِيزِ نَفِيضُ كِتَابِي يَقُولُ كَتَبْتَ إِلَيَّ أَنَّكَ كُنْتَ تَسْمَعُ أَنَّ الْعَبْدَ الْآبِقَ إِذَا سَرَقَ لَمْ تُقْطَعْ يَدُهُ وَ أَنَّ اللَّهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى يَقُولُ فِي كِتَابِهِ وَ السَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ فَإِنْ بَلَغَتْ سَرِقَتُهُ رُبُعَ دِينَارٍ فَصَاعِدًا فَاقْطَعْ يَدَهُ -

﴿امام مالکؒ زریق بن حکیم سے روایت کرتے ہیں کہ ان کو خبر دی گئی کہ ایک مفرور غلام پکڑا گیا ہے، اس نے چوری کی ہے - وہ کہتے ہیں کہ مجھے اس کا معاملہ مشکل معلوم ہوا - میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی طرف لکھا جو ان دنوں مدینہ کے گورنر تھے - میں نے ان کو خبر دی کہ میں نے سنا ہوا ہے کہ مفرور غلام اگر چوری کرے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا - کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مجھے جو جواب دیا وہ میرے خط کے مخالف تھا - انہوں نے کہا کہ تم نے لکھا ہے کہ مفرور غلام اگر چوری کرے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا - لیکن اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے کہ چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو - یہ اللہ کی طرف سے سزا اور عبرت ہے اور اللہ زبردست اور صاحب حکمت ہے - پس اگر مال مسروقہ کی قیمت ربع دینار یا اس سے زائد ہے تو اس کا ہاتھ کاٹ دو -﴾

وضاحت :

معاملہ مشکل اس وجہ سے ہوا کہ اگر غلام ہوتا تو حد جاری نہ ہوتی - مفرور ہونے کی وجہ سے وہ نہ غلام رہا اور نہ ہی آزاد سو وہ نیم آزاد ہے اور جو مال وہ چرائے گا وہ اس کا اپنا مال ہوگا - حضرت عمر بن عبدالعزیز نے یہ حکم دیا کہ اگر مال مسروقہ کی قیمت ربع دینار یا اس سے زائد ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے -

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ الْقَاسِمَ بْنَ مُحَمَّدٍ وَ سَالِمَ ابْنَ عَبْدِاللَّهِ وَ عُرْوَةَ بْنَ الزُّبَيْرِ كَانُوا يَقُولُونَ إِذَا سَرَقَ الْعَبْدُ الْآبِقُ مَا يَجِبُ فِيهِ الْقَطْعُ قُطِعَ -

﴿امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ قاسم بن محمد، سالم بن عبداللہ اور عروہ بن زبیر تینوں بزرگوں کا یہ فتویٰ تھا کہ مفرور غلام جب اتنے مال کی چوری کرے جس پر قطع ید کی سزا واجب ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے -﴾

وضاحت :

یہ بھی وہی بات ہے جو پچھلی روایت میں گزری - اس سے معلوم ہوا کہ مفرور غلام کے بارے میں حد جاری کرنے کا مسئلہ مختلف فیہ نہیں ہے - صرف غلام کے بارے میں اختلاف ہے کیونکہ اس کا مال اس کے مالک کا مال ہے - لیکن حضرت عائشہؓ کے متعلق جو روایت گزری ہے اس کے مطابق غلام کا ہاتھ کاٹ دیا گیا تھا -

تَرْكُ الشَّفَاعَةِ لِلسَّارِقِ إِذَا بَلَغَ السُّلْطَانَ

معاملہ صاحب امر تک پہنچ جائے تو چور کے حق میں سفارش نہیں کی جا سکتی

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَبْدِاللَّهِ بْنِ صَفْوَانَ أَنَّ صَفْوَانَ بْنَ أُمَيَّةَ قِيلَ لَهُ إِنَّهُ إِنْ لَمْ يُهَاجِرْ هَلَكَ فَقَدِمَ صَفْوَانُ بْنُ أُمَيَّةَ الْمَدِينَةَ فَنَامَ فِي الْمَسْجِدِ وَتَوَسَّدَ رِدَاءَهُ فَجَاءَ سَارِقٌ فَأَخَذَ رِدَاءَهُ فَأَخَذَ صَفْوَانُ السَّارِقَ فَجَاءَ بِهِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَأَمَرَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ تُقْطَعَ يَدُهُ فَقَالَ لَهُ صَفْوَانُ إِنِّي لَمْ أُرِدْ هَذَا يَا رَسُولَ اللَّهِ هُوَ عَلَيْهِ صَدَقَةٌ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَهَلَّا قَبْلَ أَنْ تَأْتِيَنِي بِهِ -

﴿صفوان بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ صفوان بن امیہ سے کہا گیا کہ اگر انہوں نے ہجرت نہ کی تو وہ ہلاک ہو گئے- اس پر صفوان بن امیہ مدینہ آئے اور مسجد میں سو گئے اور اپنی چادر کا تکیہ بنا لیا- ایک چور آیا تو اس نے چادر اڑا لی- صفوان نے اس کو پکڑ لیا اور اس کو لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے- رسول اللہ نے چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا- صفوان نے کہا حضور، میرا یہ ارادہ تو نہ تھا، میں یہ چادر اس کو صدقہ کرتا ہوں- آپ نے فرمایا تو نے میرے پاس اس کو لانے سے پہلے ایسا کیوں نہ کر دیا؟﴾

وضاحت :

سوتے ہوئے چادر کا تکیہ بنانے کا مطلب یہ ہوا کہ مال محروز تھا- مال محروز نہ ہو تو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جا سکتی- چور کے حق میں سفارش معاملہ عدالت میں پہنچ جانے کے بعد نہیں ہو سکتی- اگر چور کو معاف کرنا تھا یا چوری کا مال اس پر صدقہ کرنا تھا یا معاملہ نپٹانے کی کوئی اور شکل اختیار کرنی تھی تو مقدمہ عدالت میں نہ لے جایا جاتا- وہاں لے جانے کے بعد سب معاملات عدالت کے اختیار میں ہو جاتے ہیں- اس کے بغیر عدلیہ کا وقار ختم ہو جاتا ہے-

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمَنِ أَنَّ الزُّبَيْرَ ابْنَ الْعَوَّامِ لَقِيَ رَجُلًا قَدْ أَخَذَ سَارِقًا وَهُوَ يُرِيدُ أَنْ يَذْهَبَ بِهِ إِلَى السُّلْطَانِ فَشَفَعَ لَهُ الزُّبَيْرُ لِيُرْسِلَهُ فَقَالَ لَا حَتَّى أَبْلُغَ بِهِ السُّلْطَانَ فَقَالَ الزُّبَيْرُ إِذَا بَلَغْتَ بِهِ السُّلْطَانَ فَلَعَنَ اللَّهُ الشَّافِعَ وَالْمُشَفَّعَ-

﴿ربیعہ بن ابی عبدالرحمن سے روایت ہے کہ زبیر بن عوام ایک شخص سے ملے جس نے ایک چور کو پکڑ رکھا تھا- وہ اس کو عدالت میں لے جانا چاہتا تھا- زبیر نے اس کو چھوڑنے کی سفارش کی- اس نے کہا نہیں، جب تک میں اس کو عدالت میں نہ لے جاؤں- زبیر نے کہا جب تو اس کو لے کے عدالت میں پہنچ گیا تو شفاعت کرنے والے اور شفاعت کرانے والے دونوں پر اللہ کی لعنت-﴾

وضاحت :

سلطان کا لفظ صاحب امر یعنی قاضی، حاکم یا عدالت کے لیے عام ہے- عدالت میں معاملہ پہنچ جانے کے

بعد کسی کی سفارش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا- جو سفارش کرے یا کرائے دونوں پر اللہ کی لعنت ہو گی-

جَامِعُ الْقَطْعِ

ہاتھ کاٹنے سے متعلق جامع باب

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِالرَّحْمَنِ بْنِ الْقَاسِمِ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ رَجُلًا مِنْ أَهْلِ الْيَمَنِ أَقْطَعَ الْيَدِ وَالرِّجْلِ قَدِمَ فَنَزَلَ عَلَى أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ فَشَكَا إِلَيْهِ أَنَّ عَامِلَ الْيَمَنِ قَدْ ظَلَمَهُ فَكَانَ يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ فَيَقُولُ أَبُوبَكْرٍ وَ أَبِيكَ مَا لَيْلُكَ بِلَيْلِ سَارِقٍ ثُمَّ إِنَّهُمْ فَقَدُوا عِقْدًا لِأَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ امْرَأَةِ أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ فَجَعَلَ الرَّجُلُ يَطُوفُ مَعَهُمْ وَيَقُولُ اللَّهُمَّ عَلَيْكَ بِمَنْ بَيَّتَ أَهْلَ هَذَا الْبَيْتِ الصَّالِحِ فَوَجَدُوا الْحُلِيَّ عِنْدَ صَائِغٍ زَعَمَ أَنَّ الْأَقْطَعَ جَاءَهُ بِهِ فَاعْتَرَفَ بِهِ الْأَقْطَعُ أَوْ شُهِدَ عَلَيْهِ بِهِ فَأَمَرَ بِهِ أَبُوبَكْرٍ الصِّدِّيقُ فَقُطِعَتْ يَدُهُ الْيُسْرَى وَقَالَ أَبُوبَكْرٍ وَاللَّهِ لَدُعَاؤُهُ عَلَى نَفْسِهِ أَشَدُّ عِنْدِي عَلَيْهِ مِنْ سَرِقَتِهِ-

﴿عبدالرحمن بن القاسم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص اہل یمن میں سے آیا- اس کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کاٹا گیا تھا- وہ حضرت ابوبکر صدیق کا مہمان بنا اور ان سے شکایت کی کہ آپ کے یمن کے گورنر نے میرے اوپر بڑا ظلم کیا ہے- یہ شخص رات کو تہجد پڑھتا تھا- حضرت ابوبکر فرماتے تھے کہ تیرے باپ کی قسم، تیری رات تو چور کی رات نہیں- اس کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت اسماء بنت عمیس زوجہ حضرت ابوبکر صدیق کا ہار گم ہے- لوگ تلاش کرنے لگے تو یہ آدمی بھی ان کے ساتھ گردش کرنے لگا- وہ یہ بددعا کرنے لگا کہ اے اللہ تیری لعنت اس کو پہنچے جس نے ایسے نیک گھرانے والوں پر ایسا اقدام کیا ہے- زیور ایک سنار کے ہاں ملا اور اس نے دعویٰ کیا کہ ایک ہاتھ پاؤں بریدہ شخص اس کو لایا تھا- تو اس شخص نے اعتراف کر لیا یا اس پر گواہی دی گئی تو حضرت ابوبکر صدیق نے حکم دیا کہ اس کا بایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے- حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا اللہ کی قسم، اس کی بددعا جو اس نے

اپنے بارے میں کی میرے نزدیک اس کی چوری سے زیادہ عبرت ناک ہے۔﴾

وضاحت :

اس میں دلچسپ مسئلہ یہ ہے کہ اب تک چور کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کٹ چکے تھے۔ایک ہاتھ رہ گیا تھا سو وہ بھی کاٹ دیا گیا۔مالکیہ اور شافعیہ کا فتویٰ اسی پر ہے۔امام ابو حنیفہ کا فتویٰ یہ ہے کہ ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کٹ جانے کے بعد کچھ اور نہیں کاٹا جائے گا۔اب تعزیر ہو گی۔اس کو جیل بھیج دیں گے یا کچھ اور سزا دیں گے۔امام ابو حنیفہؒ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عمل کو جانتے تھے کہ انہوں نے اپنے عامل کی تصویب کی۔یہ اثر تو بہت بڑا اثر ہے۔قرآن مجید میں چور کے پاؤں کاٹنے کا ذکر نہیں۔وہاں **فاقطعوا ایدیھما** (ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دو) ہے۔از روئے قیاس بار بار چوری پر پاؤں شامل کیے جا سکتے ہیں۔امام ابو حنیفہ کی دلیل یہ رہی ہو گی کہ ہاتھ پاؤں کاٹنے کے بعد دوسرا ہاتھ کاٹنا اس کے وجود کو بالکل معطل کر دینا اور اس شخص کو امت پر مستقل بار بنا دینا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی قضائے حاجت سے بھی معذور ہو جائے۔یہ شریعت کے منشا کے خلاف ہے۔میرے خیال میں امام صاحب کا فتویٰ ٹھیک ہے۔قطع ید کی سزا کے بعد اب صرف تعزیر ہو گی۔لیکن یہ مسئلہ بہت قابل غور ہے۔

□ قَالَ مَالِكٌ اَلْاَمْرُ عِنْدَنَا فِي الَّذِي يَسْرِقُ مِرَارًا ثُمَّ يُسْتَعْدَى عَلَيْهِ اِنَّهُ لَيْسَ عَلَيْهِ اِلَّا اَنْ تُقْطَعَ يَدُهُ لِجَمِيْعِ مَنْ سَرَقَ مِنْهُ اِذَا لَمْ يَكُنْ اُقِيْمَ عَلَيْهِ الْحَدُّ فَاِنْ كَانَ قَدْ اُقِيْمَ عَلَيْهِ الْحَدُّ قَبْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ سَرَقَ مَا يَجِبُ فِيْهِ الْقَطْعُ قُطِعَ اَيْضًا۔

﴿امام مالک کا فتویٰ اس شخص کے بارے میں جس نے بار بار چوری کی ہے، پھر اس کے خلاف مقدمہ دائر ہوتا ہے یہ ہے کہ تمام چوریوں پر اس کا صرف ہاتھ کاٹا جائے گا، جب تک اس پر حد قائم نہ ہوئی ہو۔اگر حد پہلے جاری ہو چکی ہو اور پھر اس نے چوری کی ہو جس پر قطع ید کی سزا ہو تو اس پر دوبارہ یہی حد جاری کر دی جائے گی۔﴾

وضاحت :

میری رائے یہ ہے کہ ایک چوری کے بعد ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔اس کے بعد اگر وہ معاشرے کے لیے

مصیبت بن گیا ہے تو اس کو سورہ مائدہ کی آیت ۳۳ کے تحت سزا دی جائے گی۔اس میں قاضی کو اختیار ہے۔جو سزا چاہے دے سکتا ہے بشرطیکہ اس چور نے امن والوں کا مسئلہ پیدا کر دیا ہو۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّ اَبَا الزِّنَادِ اَخْبَرَهُ اَنَّ عَامِلًا لِعُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيْزِ اَخَذَ نَاسًا فِي حِرَابَةٍ وَلَمْ يَقْتُلُوا اَحَدًا فَاَرَادَ اَنْ يَقْطَعَ اَيْدِيَهُمْ اَوْ يَقْتُلَ فَكَتَبَ اِلٰى عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيْزِ فِي ذٰلِكَ فَكَتَبَ اِلَيْهِ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ لَوْ اَخَذْتَ بِاَيْسَرِ ذٰلِكَ۔

﴿امام مالک سے روایت ہے کہ ابو الزناد نے ان کو خبر دی کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ایک عامل نے کچھ لوگوں کو ڈکیتی میں پکڑا لیکن انہوں نے کسی کو قتل نہیں کیا تھا۔عامل نے چاہا کہ ان کے ہاتھ کاٹ دیں یا قتل کر دیں۔اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو اس کے متعلق لکھا تو انہوں نے لکھا کہ اس سے ہلکا طریقہ اختیار کرتے تو بہتر تھا۔﴾

وضاحت :

روایت میں لفظ حرابہ استعمال ہوا ہے، سرقہ استعمال نہیں ہوا۔حرابہ اور سرقہ میں فرق ہے۔سرقہ تو ظاہر ہے کہ چوری ہے اور حرابہ علی الاعلان چوری ہے جسے ڈکیتی کہتے ہیں۔اس میں قتل یا زخمی کرنے کا امکان بھی ہوتا ہے جب کہ چوری نقب ہے۔حرابہ میں میری رائے وہی ہے جس کا مائدہ ۳۳ میں حکم ہے۔چوری امن والوں کا مسئلہ نہیں پیدا کرتی جبکہ حرابہ میں یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔

حرابہ کی نوعیت کیا تھی یہ معلوم نہیں۔ظاہر ہے کہ معاملے کی نوعیت حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے علم میں رہی ہو گی تبھی تو انہوں نے لکھا کہ اس سے نرم کارروائی کرو۔وہی اس معاملہ میں حکم دے سکتے تھے۔سزا زیادہ یا کم بھی کر سکتے تھے۔

مَالَا قَطْعَ فِيْهِ

جس میں قطع ید کا جواز نہیں

□ حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يَحْيَى بْنِ حَبَّانَ اَنَّ

عَبْدًا سَرَقَ وَدِيًّا مِنْ حَائِطِ رَجُلٍ فَعَرَسَهُ فِي حَائِطِ سَيِّدِهِ فَخَرَجَ صَاحِبُ الْوَدِيِّ يَلْتَمِسُ وَدِيَّهُ فَوَجَدَهُ فَاسْتَعْدَى عَلَى الْعَبْدِ مَرْوَانَ بْنَ الْحَكَمِ فَسَجَنَ مَرْوَانُ الْعَبْدَ وَ اَرَادَ قَطْعَ يَدِهِ فَانْطَلَقَ صَاحِبُ الْعَبْدِ اِلٰى رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ فَسَاَلَهُ عَنْ ذٰلِكَ فَاَخْبَرَهُ اَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ لَا قَطْعَ فِي ثَمَرٍ وَلَا كَثَرٍ وَالْكَثَرُ الْجُمَّارُ فَقَالَ الرَّجُلُ فَاِنَّ مَرْوَانَ بْنَ الْحَكَمِ اَخَذَ غُلَامًا لِي وَهُوَ يُرِيْدُ قَطْعَ يَدِهِ وَ اَنَا اُحِبُّ اَنْ تَمْشِيَ مَعِيَ اِلَيْهِ فَتُخْبِرَهُ بِالَّذِي سَمِعْتَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَمَشٰى مَعَهُ رَافِعٌ اِلٰى مَرْوَانَ بْنِ الْحَكَمِ فَقَالَ اَخَذْتَ غُلَامًا لِهٰذَا فَقَالَ نَعَمْ فَقَالَ مَا اَنْتَ صَانِعٌ بِهِ قَالَ اَرَدْتُ قَطْعَ يَدِهِ فَقَالَ لَهُ رَافِعٌ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ لَا قَطْعَ فِي ثَمَرٍ وَلَا كَثَرٍ فَاَمَرَ مَرْوَانُ بِالْعَبْدِ فَاُرْسِلَ۔

﴿یحییٰ بن حبان سے روایت ہے کہ ایک غلام نے کھجوروں کی قلمیں چرائیں اور لے جا کر اپنے مالک کے باغ میں لگا دیں۔ قلموں کا مالک تلاش کرتا ہوا نکلا تو ان کو اس باغ میں پایا۔ اس نے مروان بن حکم کے پاس باغ کے مالک کے خلاف استغاثہ کر دیا۔ مروان نے غلام کو قید کر لیا اور چاہا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دے۔ غلام کا مالک رافع بن خدیجؓ کے پاس اس کا حکم پوچھنے گیا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ باغ میں لٹکتے ہوئے پھل اور جڑوں سے نکلی ہوئی شاخوں کی چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اس آدمی نے کہا کہ مروان نے میرا غلام پکڑا ہے اور وہ اس کا ہاتھ کاٹنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ اس کے پاس چلیں اور جو کچھ آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے اس کو بتائیں۔ رافع اس کے ساتھ مروان کے پاس گئے اور پوچھا، کیا آپ نے غلام کو اسی جرم میں پکڑا ہے۔ انہوں نے کہا جی۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ اس کو کون سی سزا دینے والے ہیں۔ مروان نے کہا کہ میں اس کا ہاتھ کاٹنے والا ہوں۔ اس پر رافع نے مروان سے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ پھل اور قلم کی چوری میں قطع ید نہیں۔ اس پر مروان نے غلام کو چھوڑنے کا حکم دے دیا۔﴾

وضاحت :

جڑوں سے جو شاخیں نکلتی ہیں ان کو 'کثر' کہتے ہیں۔ 'جمار' کا مطلب کھجور کے تنے سے نکلنے والی شاخیں ہیں۔ ان کو ودی بھی کہتے ہیں۔ یہ شاخیں قلم کا کام دیتی اور خاصی قیمتی ہوتی ہیں۔ بہر حال اگر رطب یا جمار سے زائد بھی ان کی قیمت ہو تب بھی اس میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اسی طرح درختوں پر لگے ہوئے پھلوں کی چوری پر بھی ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ البتہ اگر پھل توڑ کر محفوظ کر لیے گئے ہوں اور وہ چوری ہو جائیں تو چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا بشرطیکہ مسروقہ پھل کی قیمت رطب یا جمار سے زائد ہو۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عَمْرِو بْنِ الْحَضْرَمِي جَاءَ بِغُلَامٍ لَهُ اِلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَالَ لَهُ اقْطَعْ يَدَ غُلَامِي هٰذَا فَاِنَّهُ سَرَقَ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ مَاذَا سَرَقَ فَقَالَ سَرَقَ مِرْآةً لِامْرَاتِي ثَمَنُهَا سِتُّوْنَ دِرْهَمًا فَقَالَ عُمَرُ اَرْسِلْهُ فَلَيْسَ عَلَيْهِ قَطْعٌ خَادِمُكُمْ سَرَقَ مَتَاعَكُمْ۔

﴿سائب بن یزید سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن حضرمی ایک لڑکے کو پکڑ کر حضرت عمر بن خطابؓ کی خدمت میں لائے اور کہا کہ میرے اس لڑکے کا ہاتھ کاٹ دیں کیونکہ اس نے چوری کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کیا چیز چوری کی ہے۔ اس نے کہا میری بیوی کا آئینہ جس کی قیمت ساٹھ درہم ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا اس کو چھوڑ دو۔ اس میں قطع ید کی سزا نہیں۔ یہ نوکر بھی تمہارا ہے اور اس نے مال بھی تمہارا ہی چرایا ہے (گویا اس معاملہ میں کوئی دوسرا فریق مقدمہ نہیں ہے)﴾

وضاحت :

قطع ید کی سزا محفوظ مال پر ہے۔ گھر کے افراد سے حفاظت کرنا ممکن نہیں ہوتا وہ طوافین ہیں۔ اس لیے ان کے ساتھ چوری کا معاملہ نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس سے نوکروں کو حوصلہ ہو گا لیکن حقیقت یہی ہے کہ صاحب خانہ کو خود ہی حفاظت کا اہتمام کرنا چاہیے۔ کمرے میں تالا لگا کر رکھیں یا دوسرے طریقوں سے پوری احتیاط کریں۔ قطع ید سے یہ رعایت غلامی کی بنا پر نہیں بلکہ نوکری کی وجہ سے ہے۔ اس کی علت گھر کا فرد ہونا ہے۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ اَنَّ مَرْوَانَ بْنَ الْحَكَمِ اُتِيَ بِاِنْسَانٍ قَدِ اخْتَلَسَ مَتَاعًا فَاَرَادَ قَطْعَ يَدِهٖ فَاَرْسَلَ اِلٰى زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ فَقَالَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ لَيْسَ فِي الْخِلْسَةِ قَطْعٌ۔

﴿ابن شہاب سے روایت ہے کہ مروان بن حکم کے پاس ایک آدمی کو لایا گیا جس نے مال اچک لیا تھا۔ انہوں نے ارادہ کیا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیں۔ لہٰذا زید بن ثابتؓ سے اس کے متعلق مسئلہ دریافت کرنے کے لیے پیغام بھیجا۔ زید بن ثابت نے کہا کہ مال اچکنے میں قطع ید نہیں۔﴾

وضاحت :

زید بن ثابتؓ مدینہ کے مفتی تھے۔ ان کا یہ فتویٰ ہے کہ مال اچکنے میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی اور سزا بھی نہیں دی جائے گی۔ ہاتھ کاٹنے میں بہت زیادہ رسوائی بھی ہے اور آدمی معذور بھی ہو جاتا ہے۔ اس لیے مال اچکنے پر تعزیر ہوگی۔ تعزیر اگر سخت بھی ہو تب بھی جسمانی سطح تو محفوظ رہتے ہیں۔

کتاب الاشربہ

اَلحَدُّ فِی الخَمرِ

شراب خوری کی حد

"حد" کی تعریف :

کسی جرم کی وہ سزا حد کہلاتی ہے جو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے مقرر کی ہو۔ اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اجماع خلفائے راشدین سے جو سزا مقرر کی گئی ہو وہ بھی "حد" ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین۔ یعنی میری اور خلفائے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے پکڑو۔ کوئی دوسرا شخص حد قائم کرنے کا مجاز نہیں۔ فقہا کے اجتہاد سے کوئی حد مقرر نہیں ہو سکتی اگرچہ اس پر فقہاء کا اجماع بھی ہو جائے۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنِ السَّائِبِ ابْنِ يَزِيدَ اَنَّهُ اَخْبَرَهُ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الخطَّابِ خَرَجَ عَلَيْهِمْ فَقَالَ اِنِّی وَجَدْتُ مِنْ فُلَانٍ رِيحَ شَرَابٍ فَزَعَمَ اَنَّهُ شَرَابُ الطِّلَا وَ اَنَا سَائِلٌ عَمَّا شَرِبَ فَاِنْ كَانَ يُسْكِرُ جَلَدْتُهُ فَجَلَدَهُ عُمَرُ الحَدَّ تَامًّا۔

﴿ابن شہاب سے روایت ہے کہ سائب بن یزید نے ان کو خبر دی کہ حضرت عمر بن خطابؓ ایک دن نکلے تو کہا کہ میں نے فلاں شخص کے منہ سے شراب کی بو محسوس کی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ شراب طلا کی قسم والی شراب ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں اس کے بارے میں پوچھوں گا کہ وہ کیا چیز ہے۔ اگر وہ مسکر ہو گی تو اس کو کوڑے ماروں گا۔ تو حضرت عمرؓ نے اس پر پوری حد جاری کی۔﴾

وضاحت :

طلا اس شراب کو کہتے ہیں جو گاڑھے شیرے سے بنائی جائے۔ لیکن آج کی اور اس زمانے کی شرابوں کا فرق نمایاں ہے کہ دونوں کا مقابلہ مشکل ہے۔ اس زمانے میں زیادہ تر شراب جو کی یا گندم کی ہوتی یا پھر کھجور کی مختلف اقسام کو ملا کر شراب بناتے تھے۔ انگور کی شراب بہت کم اور نایاب تھی۔

شراب کے بارے میں احناف کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ان کے نزدیک خمر کا اطلاق صرف انگور کی شراب پر ہوتا ہے۔ یہ بات درست نہیں۔ عربی زبان کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے میں اس بات پر مطمئن ہوں کہ خمر کا اطلاق ہر قسم کی شراب پر ہوتا ہے۔ مزید برآں انگوری شراب ان کے ہاں قلیل و کثیر دونوں مقداروں میں حرام ہے اور اس پر کوڑوں کی سزا ہوگی، لیکن انگور کے علاوہ جو شرابیں بنتی ہیں وہ اگر اتنی مقدار میں پی جائیں جس سے نشہ ہو جائے تب تو کوڑے مارے جائیں گے لیکن اگر نشہ نہ ہو تو حد جاری نہیں کی جائے گی۔

روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے طلا کے بارے میں تحقیقات کروائی اور اس کے پینے پر اس کے مسکر ہونے کی وجہ سے پوری حد جاری کی۔ پوری حد کا مطلب ہے اسی کوڑے۔ باقی رہ گیا کہ وہ فلاں کون صاحب تھے تو حافظ عبدالبر کی تحقیق یہ ہے کہ وہ حضرت عمرؓ کے بیٹے تھے۔ بہر حال انہوں نے تحقیق کے بعد ان پر حد جاری کی۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ ثَوْرِ بْنِ زَيْدٍ الدِّيلِيِّ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اسْتَشَارَ فِي الْخَمْرِ يَشْرَبُهَا الرَّجُلُ فَقَالَ لَهُ عَلِيُّ ابْنُ اَبِي طَالِبٍ نَرَى اَنْ تَجْلِدَهُ ثَمَانِينَ فَاِنَّهُ اِذَا شَرِبَ سَكِرَ وَ اِذَا سَكِرَ هَذَى وَ اِذَا هَذَى افْتَرَى اَوْ كَمَا قَالَ فَجَلَدَ عُمَرُ فِي الْخَمْرِ ثَمَانِينَ۔

﴿ثور بن زید سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا کہ اگر کوئی شخص شراب پیے تو کیا سزا دی جائے۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ اس کو اسی کوڑے لگانے چاہئیں کیونکہ جب وہ شراب پیے گا تو نشہ میں ہوگا اور جب نشے میں ہوگا تو بکواس کرے گا اور جب بکواس کرے گا تو افترا کرے گا (یا انہوں نے جو کچھ کہا) تو حضرت عمرؓ نے شراب پینے کے جرم میں اسی کوڑوں کی سزا دی۔﴾

وضاحت:

اس روایت میں چند باتیں قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت عمرؓ نے مشورہ تو اجل صحابہ، جن میں نقاہت تھی، سب سے طلب کیا تھا لیکن روایت میں صرف حضرت علیؓ کے مشورہ کا ذکر ہے۔ دوسرے حضرت علیؓ کا مشورہ بھی محل نظر ہے۔ یہ اسی طرح کی بات ہے کہ "تم کو باغ میں جانے نہ دیں، کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا"۔ یہ بات درست ہے کہ شراب پئے گا تو نشہ میں ہوگا۔ نشہ ہوگا تو بکواس کرے گا، بکواس کرے گا تو افترا کرے گا، لیکن یہ تو

ضروری نہیں کہ اس کی بکواس کی نوعیت قذف کی ہو جس کی سزا اسی کوڑے ہے۔ جب آدمی بدمست ہوتا ہے تو اس سے تین قسم کے واقعات بھی سرزد ہوتے ہیں۔ بدمست میں تمیز نہیں کرتا۔ قتل تک کے واقعات ہو جاتے ہیں۔ شرابی جب پھنکارنے پر آتے ہیں تو نہ جانے کیا کیا بکواس کرتے ہیں۔ قذف تو شراب نوشی کا ایک ضمنی سا جرم ہے۔ بادی النظر میں تو یہ نکتہ بڑا عارفانہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی حیثیت اس ایک لطیفے سے زیادہ نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ خود حضرت علیؓ نے اس حد پر عمل نہیں کیا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں انہوں نے ولید کو چالیس کوڑے مارے اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہی کیا اور یہی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کیا اور یہی میں کرتا ہوں۔ یعنی جس نکتے کی بڑی دھوم تھی اس نکتہ پر خود انہوں نے عمل نہیں کیا۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خالدؓ نے امیر المومنین کو لکھا کہ شراب کے پینے کی سزا بالکل معمولی ہے لہٰذا اس کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کے تدارک کی فکر کرنی چاہیے۔ تب حضرت عمرؓ نے صحابہ سے مشورہ کیا تو اجل صحابہ نے یہ مشورہ دیا کہ اقل حد اس پر جاری کر دی جائے جو قذف کی حد ہے۔ یہ فیصلہ ان کا معقول تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس امر کے پیش نظر کہ فتنہ بڑھتا جا رہا ہے اور ایک ذمہ دار آدمی نے اس کے روکنے کے لیے کہا ہے یہ فیصلہ فقیہ صحابہ کے مشورہ سے کیا۔

آنحضرت ﷺ سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص شراب پی کر آیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس کو مارو۔ کسی نے تھپڑ مارا، کسی نے گھونسا مارا، کسی نے جوتا کھینچ مارا، کسی نے اپنی چادر کا کوڑا کر مارا۔ اس کے بعد اس کو چھوڑ دیا گیا۔ تخمینہ لگایا گیا کہ کتنی مار پڑی ہوگی تو لوگوں نے کہا کہ چالیس کوڑے کے قریب۔ پس یہ تخمینہ ہی تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہی مسلک ہے اور یہی مسلک حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا ہے۔ لیکن اس پر اجماع نہیں۔ اگر حضرت عمرؓ کے زمانے میں اسی کوڑوں کی سزا پر اجماع ہو جاتا تو حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ اس کے خلاف کیسے عمل کرتے؟ گویا شرابی کی سزا کا معاملہ حد کا نہیں بلکہ تعزیر کا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور نبی ﷺ نے کوئی حد مقرر نہیں فرمائی۔ ان کے سوا کوئی دوسرا حد مقرر نہیں کر سکتا۔ تعزیر کا معاملہ اجتہادی ہے۔ امیر اپنی رائے یا مشاورت سے حالات کے مطابق سزا دے سکتا ہے۔ فقہاء حالات کے مطابق جو فیصلہ کریں وہ کر سکتے ہیں۔

❐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ اَنَّهٗ سُئِلَ عَنْ حَدِّ الْعَبْدِ فِی الْخَمْرِ فَقَالَ بَلَغَنِی اَنَّ عَلِیًّا نِصْفَ حَدِّ الْحُرِّ فِی الْخَمْرِ وَ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ وَ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ وَ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ قَدْ جَلَدُوْا عَبِیْدَهُمْ نِصْفَ حَدِّ الْحُرِّ فِی الْخَمْرِ۔

﴿ابن شہاب سے پوچھا گیا کہ اگر غلام نے شراب پی ہو تو اس پر کیا سزا ہو گی تو انہوں نے کہا کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ غلام کی سزا آزاد سے آدھی ہے اور حضرت عمر بن خطابؓ، حضرت عثمان بن عفانؓ اور عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے غلاموں کو آزاد سے نصف سزا دی۔﴾

وضاحت :

اس اثر میں بڑا جھگڑا یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے ہاں شرابی کی سزا اسی کوڑے ہے جبکہ حضرت عثمان کے ہاں چالیس کوڑے، تو کس سزا کا نصف ہو گا؟ اللہ کا شکر ہے کہ اب غلامی کا معاملہ ختم ہو گیا ہے۔ اب یہ ہمارا موضوع نہیں رہا۔

❐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ یَحْیٰی بْنِ سَعِیْدٍ اَنَّهٗ سَمِعَ سَعِیْدَ بْنَ الْمُسَیَّبِ یَقُوْلُ مَا مِنْ شَیْءٍ اَلْیَحِبُّ اللّٰهُ اَنْ یَعْفُیَ عَنْهُ مَالَمْ یَكُنْ حَدًّا۔

﴿یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن المسیب سے سنا۔ وہ کہتے تھے کہ کوئی شے ایسی نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ کو معافی زیادہ پسند نہ ہو جب تک کہ وہ حد نہ ہو۔﴾

وضاحت :

سعید بن مسیب مدینہ کے فقہا میں سے تھے۔ یہ ان کا قول ہے۔ حد صرف اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ ہی متعین کر سکتے ہیں اور اگر خلفائے راشدین کا اجماع ہو تو وہ اجتہادی حد سب سے زیادہ قوی ہے۔ حدوں کے علاوہ دوسری تعزیرات سے حتی الامکان درگزر پسندیدہ ہے۔

مَا یُنْهٰی اَنْ یُّنْبَذَ فِیْهِ

کن برتنوں میں نبیذ بنانا ممنوع ہے

نبیذ کا اہل عرب میں بہت رواج تھا۔ یہ ایک مقوی مشروب تھا۔ کھجور میں پانی، کچھ انگور اور مزید کچھ چیزیں ملا کر اس کو خمیر اٹھنے تک رکھ دیا جاتا پھر اس کو پی لیتے۔ بعض حالات میں اس میں جوش (Fermentation) بھی آجاتا ہو گا۔ بہر حال وہ ایک مقوی اور نشاط انگیز چیز بن جاتی تھی۔ نبیذ کو اگر زیادہ دیر کے لیے رکھ دیا جاتا تو وہ شراب کے حکم میں آجاتی تھی۔ جب شراب کی حرمت کا حکم ہوا تو سوال پیدا ہوا کہ کیا نبیذ پینے والے پر بھی حد جاری کر دی جائے گی تاکہ جن چیزوں میں نشہ کا اندیشہ ہو ان سے بھی بچا جائے۔

❐ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ خَطَبَ النَّاسَ فِی بَعْضِ مَغَازِیْهِ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ فَاَقْبَلْتُ نَحْوَهٗ فَانْصَرَفَ قَبْلَ اَنْ اَبْلُغَهٗ فَسَاَلْتُ مَا ذَا قَالَ فَقِیْلَ نَهٰی اَنْ یُّنْبَذَ فِی الدُّبَّاءِ وَالْمُزَفَّتِ

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ کسی غزوہ کے موقع پر خطبہ دیا۔ میں آگے بڑھا تاکہ سنوں لیکن میرے پہنچنے سے پہلے آپؐ نے خطبہ ختم کر دیا۔ میں نے لوگوں سے پوچھا کہ آپ نے کیا فرمایا تو لوگوں نے بتایا کہ آپؐ نے نبیذ کدو اور مزفت میں بنانے سے منع فرمایا ہے۔﴾

وضاحت :

دبا تو کدو کو کہتے ہیں۔ وہ جب خشک ہو جاتا ہے تو اس کے اوپر کا چھلکا سخت اور چکنا ہو جاتا ہے۔ اس میں نبیذ تیار کرنے سے جوش جلدی پیدا ہو جاتا ہے۔

مزفت اس مٹکے کو کہتے ہیں جس کے اوپر تارکول یا کوئی ایسی چیز مل دیں جس سے اس کے مسام بند ہو جائیں۔ اس میں بھی خمیر جلد اٹھتا ہے۔ دبا اور مزفت کا استعمال نبیذ بنانے میں معروف تھا۔ جب شراب حرام کی گئی تو آپ نے فرمایا کہ نبیذ دبا اور مزفت قسم کے برتنوں میں نہ بنائی جائے کیونکہ ان برتنوں میں تیار کردہ نبیذ نشہ آور

ہو جاتی ہے- یہ حکم سدِ ذریعہ کے طور پر تھا تاکہ شراب خوری کی راہ مسدود ہو جائے-

مَا یُکرَہُ اَنْ یُنبَذَ جَمِیعًا

کن چیزوں کو ملا کر نبیذ بنانی مکروہ ہے

☐ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَیْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ یَسَارٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰی اَنْ یُنْبَذَ الْبُسْرُ وَالرُّطَبُ جَمِیعًا وَالتَّمْرُ وَالزَّبِیْبُ جَمِیعًا-

﴿عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پکی کھجور کو تقریباً تیار کھجور کے ساتھ ملا کر، اور خشک کھجور کے ساتھ منقے ملا کر، نبیذ بنانے سے منع فرمایا-﴾

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنِ الثِّقَةِ عِنْدَهُ عَنْ بُكَیْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الْاَشَجِّ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ الْحُبَابِ الْاَنْصَارِیِّ عَنْ اَبِی قَتَادَةَ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰی اَنْ یُشْرَبَ التَّمْرُ وَالزَّبِیْبُ جَمِیعًا وَالزَّهْوُ وَالرُّطَبُ جَمِیعًا-

﴿ابو قتادہ انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خشک کھجور اور منقے کی ایک ساتھ اور پکی کھجور اور تقریباً تیار کھجور کی ایک ساتھ ملا کر تیار کردہ نبیذ پینے سے منع فرمایا-﴾

وضاحت :

نبیذ کی چند ایک قسمیں تھیں- ایک تو مفرد ہوتی یعنی صرف کھجور کو پانی میں بھگو کر نبیذ تیار کر لیتے- دوسری مرکب کہ کھجور کے ساتھ منقے شامل کر لیتے یا پختہ کھجور کے ساتھ پکی کھجور ملا دیتے- اس طرح ایک چیز دوسری چیز کو جوش دلانے میں مددگار ہو جاتی اور مشروب میں تیزی پیدا ہو جاتی تھی- آپؐ نے مرکب نبیذ سے منع فرمایا- یہ حکم بھی سدِ ذریعہ کی نوعیت کا تھا- بعد میں جب لوگوں پر اس کی حکمت واضح ہو گئی اور اس کا اندیشہ نہ رہا کہ لوگ شراب اور نبیذ میں تمیز نہ کریں گے تو آپؐ نے فرمایا کہ میں نے فلاں فلاں قسم کی نبیذ سے روکا تھا، اب تمہیں اس کی اجازت ہے-

بسر رَزہو، رطب، تمر کھجور کے معنی میں ہیں- چونکہ فصل کی تیاری کی مراحل میں ہوتی ہے اس لیے ہر مرحلہ کے الگ نام ہیں- کھجور پکی بھی ملا کر استعمال ہوتی ہے دوسر ہے- اس پر سرخی آجائے تو زہو ہے- تقریباً پک جائے تو رطب ہے اور خشک کھجور کو تمر کہتے ہیں-

تَحْرِیْمُ الْخَمْرِ

شراب کی حرمت

☐ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ اَبِی سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِیِّ ﷺ اَنَّهَا قَالَتْ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْبِتْعِ فَقَالَ كُلُّ شَرَابٍ اَسْكَرَ فَهُوَ حَرَامٌ

﴿حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے بتع کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ہر مشروب جو نشہ آور ہو وہ حرام ہے-﴾

وضاحت :

بتع خاص قسم کی شراب تھی جو وہ شہد سے بناتے تھے- شہد یا اس کا شربت پینے میں کوئی حرج نہیں لیکن جب اس کا خمیر اٹھا لیا جائے اور وہ نشہ آور ہو جائے تو اس کا پینا حرام ہے- مشروبات میں اصل یہی ہے کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے، خواہ اس کی مقدار قلیل ہو یا کثیر-

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَیْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ یَسَارٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ سُئِلَ عَنِ الْغُبَیْرَاءِ فَقَالَ لَا خَیْرَ فِیهَا وَنَهٰی عَنْهَا قَالَ مَالِكٌ فَسَاَلْتُ زَیْدَ بْنَ اَسْلَمَ مَاالْغُبَیْرَاءُ فَقَالَ هِیَ الْمُسْكِرَةُ-

﴿عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے غبیراء کے متعلق سوال کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا اس میں خیر نہیں- اس کے پینے سے آپ نے منع کر دیا- امام مالک کہتے ہیں کہ میں نے زید بن اسلم

سے پوچھا کہ خمیر اہ کیا ہوتی ہے؟انہوں نے کہا کہ وہ اسکر کہ ہوتی ہے۔﴾

وضاحت :

خمیر اہ یا اسکر کہ کے متعلق دو قول ہیں۔ایک یہ کہ یہ باجرے کی شراب ہوتی تھی۔دوسرا یہ کہ اس کو چاول سے بناتے تھے۔آپؐ نے اس کے پینے سے منع فرمادیا۔

اللہ تعالیٰ پیغمبر کو ایسا علم عطا کرتے ہیں کہ وہ ہر چیز کے متعلق پوری قطعیت کے ساتھ رائے دیتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کو وہ ذاتی معلومات کی روشنی میں جانچے ہوئے ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ ایک شعبہ ہی میں نہیں بلکہ ہر شعبہ میں ان کا علم ایسا ہی ہوتا ہے۔یہاں تو کھانے پینے کا ذکر ہے۔اخلاقیات میں، سیاسیات میں، اجتماعیات میں، ہر معاملہ میں پوچھئے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان کو ذاتی تجربہ ہے۔نبوت کے خاص منصب کی خصوصیات ہی سے اس علم کی توجیہ ہو سکتی ہے۔پیغمبر اپنی ذات میں اتنا مکمل اور کامل ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کی اس اونچی سطح پر ہوتا ہے جس تک علماء اور حکماء کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ فِی الدُّنْیَا ثُمَّ لَمْ یَتُبْ مِنْهَا حُرِمَهَا فِی الْآخِرَةِ۔

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے دنیا میں شراب پی پھر اس سے توبہ نہ کی تو وہ اس پر آخرت میں حرام ہو گئی۔﴾

وضاحت :

جنتیوں کو جس شراب طہور کی بشارت دی گئی ہے دنیا کے شرابی اس سے محروم رہیں گے اور عین ممکن ہے شرابی جنت میں داخل ہی نہ ہو سکیں۔شراب ام الخبائث ہے۔تمام اخلاق و کردار کو تباہ کر دیتی ہے۔وہ پینے والے کو جنت میں جانے کے قابل ہی کہاں چھوڑتی ہے۔آپؐ کے فرمان کا اشارہ اسی طرف معلوم ہوتا ہے۔

جَامِعُ تَحْرِیْمِ الْخَمْرِ

شراب کی حرمت سے متعلق جامع باب

☐ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَیْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنِ ابْنِ وَعْلَةَ الْمِصْرِیِّ اَنَّهٗ سَاَلَ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عَبَّاسٍ عَمَّا یُعْصَرُ مِنَ الْعِنَبِ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ اَهْدٰی رَجُلٌ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ رَاوِیَةَ خَمْرٍ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهَا قَالَ لَا فَسَارَّهٗ رَجُلٌ اِلٰی جَنْبِهٖ فَقَالَ لَهٗ ﷺ بِمَ سَارَرْتَهٗ فَقَالَ اَمَرْتُهٗ اَنْ یَبِیْعَهَا فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الَّذِیْ حَرَّمَ شُرْبَهَا حَرَّمَ بَیْعَهَا فَفَتَحَ الرَّجُلُ الْمَزَادَتَیْنِ حَتّٰی ذَهَبَ مَا فِیْهِمَا۔

﴿ابن وعلہ مصری سے روایت ہے کہ انہوں نے عبداللہ بن عباسؓ سے پوچھا کہ انگور کا رس نچوڑ کر جو شراب بنائی جاتی ہے،اس کے متعلق کیا حکم ہے۔ابن عباس نے کہا کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کو ایک اونٹ شراب لادے ہوئے ہدیہ کیا۔رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام کر دیا ہے؟اس نے کہا نہیں۔تو ایک شخص نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ آنحضرتؐ نے اس سے پوچھا کہ آپ نے کیا سرگوشی فرمائی؟اس نے کہا کہ میں نے مشورہ دیا کہ اس کو بیچ دے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس ذات نے اس کا پینا حرام کیا ہے اس نے اس کی بیع بھی حرام کی ہے۔تو اس شخص نے دونوں مشکیزوں کے منہ کھول دیئے اور ان کے اندر جو کچھ تھا وہ بہہ گیا۔﴾

وضاحت :

اس روایت میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس شخص نے آنحضرت ﷺ کو شراب کا تحفہ کیوں دیا۔ جبکہ آپ نے دور جاہلیت میں بھی کبھی شراب نہیں پی۔ہو سکتا ہے عام قبائلی سرداروں کی خدمت میں لوگ اس طرح کے تحفے پیش کرتے رہے ہوں۔

اس روایت سے یہ حکم نکلا کہ شراب کا پینا ہی حرام نہیں بلکہ اس کا کاروبار کرنا بھی ممنوع ہے۔کاروبار کی

ممانعت سدذریعہ کے طور پر ہے۔

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ اِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِی طَلْحَةَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّهٗ قَالَ كُنْتُ اَسْقِی اَبَا عُبَیْدَةَ بْنَ الْجَرَّاحِ وَ اَبَا طَلْحَةَ الْاَنْصَارِیَّ وَ اُبَیَّ بْنَ كَعْبٍ شَرَابًا مِنْ فَضِیْخٍ وَتَمْرٍ قَالَ فَجَاءَ هُمْ آتٍ فَقَالَ اِنَّ الْخَمْرَ قَدْ حُرِّمَتْ فَقَالَ اَبُوطَلْحَةَ یَا اَنَسُ قُمْ اِلٰی هٰذِهِ الْجِرَارِ فَاكْسِرْهَا قَالَ فَقُمْتُ اِلٰی مِهْرَاسٍ لَنَا فَضَرَبْتُهَا بِاَسْفَلِهٖ حَتّٰی تَكَسَّرَتْ

﴿انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ میں ابو عبیدہ بن جراح، ابو طلحہ انصاری اور ابی بن کعب تینوں کو پھٹی ہوئی کچی کھجور اور خشک کھجور کی شراب پلاتا تھا۔ ان کے ہاں ایک شخص آیا اور بتایا کہ شراب حرام کر دی گئی ہے۔ ابو طلحہ نے کہا، اے انس، اٹھو اور یہ سبو جتنے ہیں ان کو توڑ دو۔ انس کہتے ہیں میں اٹھا، ایک پتھر لیا اور ان کے پیندوں پر مارا تو وہ چکنا چور ہو گئے۔﴾

وضاحت :

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب پینے کا رواج عام رہا ہو گا لیکن اللہ تعالیٰ کا حکم آنے کے بعد سب نے فوری طور پر شراب پینا ترک کر دی۔ یہاں حضرات ابو عبیدہ بن الجراحؓ، ابو طلحہ انصاریؓ اور ابی بن کعبؓ کے جذبہ اطاعت کا حوالہ ہے کہ انہوں نے کس طرح فی الفور حکم پر عمل کیا۔ یہ تینوں اجل اور فقیہ صحابہ میں سے تھے۔

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ دَاوُدَ بْنِ الْحُصَیْنِ عَنْ وَاقِدِبْنِ عَمْرِو بْنِ سَعْدِبْنِ مُعَاذٍ اَنَّهٗ اَخْبَرَهٗ عَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ لَبِیْدٍ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ حِیْنَ قَدِمَ الشَّامَ شَكَا اِلَیْهِ اَهْلُ الشَّامِ وَبَاءَ الْاَرْضِ وَ ثِقَلَهَا وَ قَالُوْا لَا یُصْلِحُنَا اِلَّا هٰذَا الشَّرَابُ فَقَالَ عُمَرُ اشْرَبُوْا هٰذَا الْعَسَلَ قَالُوْا لَا یُصْلِحُنَا الْعَسَلُ فَقَالَ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ الْاَرْضِ هَلْ لَكَ اَنْ نَجْعَلَ لَكَ مِنْ هٰذَا الشَّرَابِ شَیْئًا لَا یُسْكِرُ قَالَ نَعَمْ فَطَبَخُوْهُ حَتّٰی ذَهَبَ مِنْهُ الثُّلُثَانِ وَ بَقِیَ الثُّلُثُ فَاَتَوْا بِهٖ عُمَرَ فَاَدْخَلَ فِیْهِ عُمَرُ اُصْبُعَهٗ ثُمَّ رَفَعَ یَدَهٗ فَتَبِعَهَا یَتَمَطَّطُ فَقَالَ هٰذَا الطِّلَا هٰذَا مِثْلُ طِلَاءِ الْاِبِلِ

فَاَمَرَهُمْ عُمَرُ اَنْ یَشْرَبُوْهُ فَقَالَ لَهٗ عُبَادَةُ بْنُ الصَّامِتِ اَحْلَلْتَهَا وَاللّٰهِ فَقَالَ عُمَرُ كَلَّا وَاللّٰهِ اللّٰهُمَّ اِنِّی لَا اُحِلُّ لَهُمْ شَیْئًا حَرَّمْتَهٗ عَلَیْهِمْ وَلَا اُحَرِّمُ عَلَیْهِمْ شَیْئًا اَحْلَلْتَهٗ لَهُمْ۔

﴿محمود بن لبید انصاری سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ جب شام کے دورے پر آئے تو اہل شام نے شکایت کی کہ ہمارا ملک بد آبائی ہے۔ اس کی ہوا میں بڑی ثقالت ہے۔ اور ہمارا مزاج شراب کے بغیر درست نہیں ہوتا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ یہ شہد پیا کرو۔ انہوں نے کہا شہد سے مزاج درست نہیں ہوتا۔ علاقے کے ایک شخص نے کہا کہ اگر میں آپ کے لیے شراب کو غیر مسکر بنا دوں تو آپ خواہش کریں گے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ تو اس نے انگور کی شراب کو اتنا پکایا کہ دو ثلث اس کے ختم کر دیے اور ایک ثلث باقی رہ گیا۔ لوگ اس کو حضرت عمرؓ کے پاس لائے۔ انہوں نے اپنی انگلی اس میں ڈالی۔ نکالی تو اس کا تار چپکا ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا یہ تو رو غن ہے، ایسا رو غن اونٹ کو ملتے ہیں۔ آپ نے لوگوں کو اس کے پینے کی اجازت دی۔ عبادہ بن صامتؓ نے کہا کہ واللہ، آپ نے ان کے لیے شراب حلال کر دی۔ حضرت عمرؓ نے کہا ہرگز نہیں۔ اللہ کی قسم۔ اے اللہ میں نے ان کے لیے کوئی ایسی چیز حلال نہیں کی جو تو نے ان پر حرام کی ہے اور نہ وہ چیز حرام کی ہے جو تو نے ان کے لیے حلال کی ہے۔﴾

وضاحت :

حضرت عمرؓ کا فتویٰ درست ہے۔ شراب کو ابال کر اس کا اگر سرکہ بنا لیا جائے اور وہ مسکر نہ رہے تو وہ حلال ہے، اگرچہ ایک مرحلے میں وہ شراب ہی تھا۔ اس فتویٰ کو بعض حضرات نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے یہ فتویٰ واپس لے لیا تھا۔ اسی لیے انہوں نے اپنے بیٹے کو طلا پینے پر سزا دی تھی۔ حالانکہ جو کچھ ان کے بیٹے نے پیا وہ اور طلا رہا ہو گا جو مسکر ہو گا۔ یہ طلا جو اس شخص نے بنا کر پیش کیا وہ مسکر نہیں تھا۔ شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک مثلث یعنی وہ شراب جو پکنے کے بعد ایک تہائی رہ جائے حلال ہے لیکن زرقانی یہ نہیں مانتے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنی رائے واپس لے لی تھی۔ لیکن رائے واپس لینے کی کیا وجہ تھی یہ ان کو معلوم نہیں۔ میرے نزدیک یہ موقف صحیح ہے کہ جب کوئی چیز مسکر نہ رہے تو وہ جائز ہے اگرچہ کسی مرحلہ میں وہ شراب رہی ہو۔ ظاہر ہے نوعیت بدل جانے پر

وہ شراب کے حکم میں نہیں رہتی۔جب مسکر نہیں رہی تو حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ اَنَّ رِجَالًا مِنْ اَهْلِ الْعِرَاقِ قَالُوا لَهٗ يَا اَبَاعَبْدِالرَّحْمٰنِ اِنَّا نَبْتَاعُ مِنْ ثَمَرِ النَّخْلِ وَالْعِنَبِ فَنَعْصِرُهٗ خَمْرًا فَنَبِيْعُهَا فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ اِنِّی اُشْهِدُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ وَ مَلَائِكَتَهٗ وَ مَنْ سَمِعَ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِّیْ لَا اٰمُرُكُمْ اَنْ تَبِيْعُوْهَا، وَلَا تَبْتَاعُوْهَا، وَلَا تَعْصِرُوْهَا، وَلَا تَشْرَبُوْهَا، وَ لَا تَسْقُوْهَا فَاِنَّهَا رِجْسٌ" مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ۔

﴿اہل عراق میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ اے ابو عبدالرحمٰن، ہم کھجوروں اور انگوروں کی خرید و فروخت کرتے ہیں اور ان کو شراب بنانے کے لیے نچوڑ لیتے اور شراب فروخت کرتے ہیں۔ عبداللہ بن عمرؓ نے کہا میں اللہ کو، اس کے فرشتوں کو اور تمام جن وانس کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں تمہیں اجازت نہیں دیتا کہ تم اس کو بیچو، اس کی خرید و فروخت کرو، یا اس کو نچوڑ کر شراب بناؤ اور اس کو پیو اور پلاؤ۔ یہ سب رجس اور شیطان کا عمل ہے۔﴾

وضاحت :

یہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں، وہ اس سے کم کیا کہہ سکتے تھے۔ حرام چیز کی تجارت کو ذریعہ معاش بنانا بھی حرام ہے۔ باب کے شروع میں روایت گزر چکی ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس ذات نے اس کا پینا حرام کیا ہے اسی نے اس کی خرید و فروخت بھی حرام کی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہی اس کی فروخت حرام کی ہے۔

کتاب العقول

کتاب القسامہ

عقول کا مطلب

عقول کے معنی باندھنے کے ہیں۔ یہ لفظ دیت کے لیے معروف ہے جو جان کے بدلے جان دینے کی بجائے مال کی صورت میں مقتول کے ورثا کو دی جاتی ہے۔ عقال اونٹ کا گھٹنا باندھنے کی رسی کو کہتے ہیں۔ دیت کے لیے لفظ عقول کے استعمال کی وجہ یہ ہے کہ جس پر دیت واجب ہوتی تھی وہ مقررہ تعداد میں اونٹ یا بکریاں لے جا کر مقتول کے صحن میں باندھ دیتا تھا۔ چنانچہ دیت کو عقول سے تعبیر کرنے لگے۔

ذِكْرُ الْعُقُولِ

دیت کا بیان

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِي بَكْرِ ابْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ عَنْ اَبِيهِ اَنَّ فِي الْكِتَابِ الَّذِي كَتَبَهُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لِعَمْرِو بْنِ حَزْمٍ فِي الْعُقُولِ اَنَّ فِي النَّفْسِ مِائَةً مِنَ الْاِبِلِ وَ فِي الْاَنْفِ اِذَا اُوعِيَ جَدْعًا مِائَةٌ مِنَ الْاِبِلِ وَ فِي الْمَأْمُومَةِ ثُلُثُ الدِّيَةِ وَ فِي الْجَائِفَةِ مِثْلُهَا وَفِي الْعَيْنِ خَمْسُونَ وَ فِي الْيَدِ خَمْسُونَ وَ فِي الرِّجْلِ خَمْسُونَ وَ فِي كُلِّ اُصْبُعٍ مِمَّا هُنَالِكَ عَشْرٌ مِنَ الْاِبِلِ وَ فِي السِّنِّ خَمْسٌ وَ فِي الْمُوضِحَةِ خَمْسٌ۔

﴿عبداللہ بن ابی بکر بن محمد اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جو خط عمرو بن حزم کو دیت کے بارے میں لکھا تھا اس میں جان کی دیت سو اونٹ، ناک کی اگر پوری کاٹ دی گئی ہو سو اونٹ، ایسی چوٹ کی جو دماغ تک پہنچتی ہو ایک ثلث دیت اور جو پیٹ کے اندر تک کی چوٹ ہو اس کی ایک ثلث، ایک آنکھ کی پچاس اونٹ، ایک ہاتھ کی پچاس، ایک پاؤں کی پچاس اور ہر ایک انگلی کی دس اونٹ، دانت کی پانچ اونٹ اور ایسے زخم کی جس سے ہڈی ننگی ہو جائے پانچ اونٹ تھی۔﴾

وضاحت :

دیت کے بارے میں یہ خط بنیادی دستاویز ہے کیونکہ اسے نبی ﷺ نے خود لکھوایا۔ یہ صرف دیت کے

متعلق ہی ہے۔اس خط کے ضمن میں بہت بحثیں ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری روایات میں اس میں کچھ اضافے ہیں اور تیسری جگہ مزید اضافے ہیں۔اس وجہ سے یہ متعین کرنا خاصا مشکل ہو گیا ہے کہ خط کا کتنا حصہ اصل کی حیثیت سے قابل اعتماد ہے اور کتنا حصہ ایسا ہے جو اس میں اضافہ ہے۔اس میں تحقیق کی ضرورت ہے۔بہر حال اصل حیثیت تو اس خط ہی کی ہے۔باقی فقہا کے اجتہادات ہیں۔

اس روایت میں تین اصطلاحات نقل ہوئی ہیں۔"مامومہ"۔اس چوٹ کو کہتے ہیں جو دماغ تک پہنچ جائے مثلاً وہ ہڈی ٹوٹ جائے جو دماغ کو محفوظ کرتی ہے۔"جائفہ" وہ چوٹ جو پیٹ کے اندر تک چلی جائے اور "موضحہ" ایسی چوٹ جو گوشت کو اوجیڑ دے اور ہڈی نظر آنے لگے۔

دیت کے جو احکام اس زمانے میں دیے گئے وہ اونٹوں کی تعداد کے حساب سے دیے گئے۔اب اونٹوں اور بکریوں کا زمانہ نہیں ہے لہٰذا اب تقویم ہو گی یعنی سکہ رائج الوقت کے مطابق قیمت ٹھہرائی جائے گی۔

اس سے بھی زیادہ پیچیدہ یہ چیز ہے کہ ایک شخص نے زخم لگایا ہے، آنکھ پھوڑ دی ہے، چہرہ بگاڑ دیا ہے، سر کچل دیا ہے، دماغ ماؤف کر دیا ہے، ٹانگ توڑ دی ہے تو اس میں صحیح عدل کا تقاضا کیا ہو گا؟ دیت ہو گی یا جیسا وہی کچھ کرنا ہو گا جو اس کے ساتھ کیا گیا ہے۔اگر وہی کچھ کرنے کا اختیار دے دیا جائے تو اس سے عدل کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔اگر ضرب زیادہ لگ گئی تو کون ذمہ دار ہو گا اور کس شکل میں نقصان پورا ہو گا۔میرے نزدیک دیت کا معاملہ خاصا پیچیدہ ہے اور موجودہ قانون میں شامل کرنے کے لیے اس پر کافی تحقیق اور غور و فکر کی ضرورت ہے۔

اَلْعَمَلُ فِی الدِّیَةِ

دیت پر عمل کس طریقہ سے ہو گا

☐ حَدَّثَنِی مَالِكٌ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَوَّمَ الدِّیَةَ عَلٰی اَهْلِ الْقُرٰی فَجَعَلَهَا عَلٰی اَهْلِ الذَّهَبِ اَلْفَ دِیْنَارٍ وَ عَلٰی اَهْلِ الْوَرِقِ اثْنَیْ عَشَرَ اَلْفَ دِرْهَمٍ قَالَ مَالِكٌ فَاَهْلُ الذَّهَبِ اَهْلُ الشَّامِ وَ اَهْلُ مِصْرَ وَ اَهْلُ الْوَرِقِ اَهْلُ الْعِرَاقِ۔

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے شہریوں کے لیے دیت کی تقویم کرائی۔ پھر آپ نے یوں مقرر کیا کہ سونے کا سکہ جن کے ہاں رائج ہے ان کے لیے دیت ایک ہزار دینار ہو گی

اور جن کے ہاں چاندی کا سکہ رائج ہے وہاں بارہ ہزار درہم ہو گی۔امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اہل شام اور اہل مصر سونے کے سکے والے اور اہل عراق چاندی کے سکے والے ہیں۔﴾

وضاحت :

لونوں کی صورت میں دیت کی ادائیگی بڑی مشکلات پیدا کرتی ہے۔خصوصاً شہریوں کے لیے بڑی تعداد میں جانور حاصل کرنا خاصا دشوار کام ہے۔لہٰذا اونٹوں کی قیمت نقد میں متعین کرنا ضروری ہے۔حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہی تقویم کی ضرورت پڑ گئی۔انہوں نے لوگوں کی سہولت کے لیے رائج الوقت سکہ دینار اور درہم میں قیمت مقرر کر دی۔معلوم ہوتا ہے اس وقت ایک اونٹ کی قیمت 10 دینار تھی اور دینار میں 12 درہم تھے لہٰذا دیت کی رقم ایک ہزار دینار یا بارہ ہزار درہم مقرر کی گئی۔موجودہ زمانے میں سو اونٹ کی قیمت آج کل کے رائج سکہ میں مقرر کرنا ہو گی تاکہ لوگ آسانی سے دیت ادا کر سکیں۔

امام مالک کے فتوے :

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ دیت تین یا چار سالانہ اقساط میں لی جائے گی۔تین سال کی قسطیں میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں متفق علیہ بات یہ ہے کہ شہریوں سے دیت میں اونٹ نہیں قبول کیے جائیں گے، نہ اہل عمود کی طرف سے سونا یا چاندی، نہ سونے والوں سے چاندی اور نہ چاندی والوں سے سونا۔اہل عمود سے مراد صحرا میں خیموں میں رہنے والے لوگ ہیں۔

میرے نزدیک "اونٹ قبول کرنا" کی بجائے "اونٹ وصول کرنا" کے الفاظ کا استعمال زیادہ مناسب ہے۔کیونکہ یہ بات مسلم ہے کہ حکومت دیت وصول کرے گی۔حدود و تعزیرات وغیرہ حکومت کے واسطے سے جاری ہوتی ہیں۔حکومت ہی دیت وصول کر سکتی یا کوڑے لگا سکتی یا ہاتھ کاٹ سکتی ہے۔قاضی جو فیصلہ کرے گا حکومت اس کو نافذ کرے گی۔امام صاحب کی یہ تجاویز سہولت کے لیے ہیں۔لیکن میرے نزدیک کوئی جس شکل میں دیت ادا کرتا ہے تو قبول کرنی چاہیے۔

مَا جَاءَ فِي دِيَةِ الْعَمْدِ اِذَا قُبِلَتْ وَجِنَايَةِ الْمَجْنُوْنِ

قتل عمد کی دیت جب ورثا اس کا دینا قبول کر لیں اور مجنون کی سزا

□ حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ اَنَّ ابْنَ شِهَابٍ كَانَ يَقُوْلُ فِي دِيَةِ الْعَمْدِاِذَا قُبِلَتْ خَمْسٌ وَ عِشْرُوْنَ بِنْتَ مَخَاضٍ وَ خَمْسٌ وَ عِشْرُوْنَ بِنْتَ لَبُوْنٍ وَ خَمْسٌ وَ عِشْرُوْنَ حِقَّةً وَ خَمْسٌ وَ عِشْرُوْنَ جَذَعَةً-

﴿امام مالکؒ روایت کرتے ہیں کہ ابن شہاب کہتے تھے کہ اگر قتل عمد میں ورثا دیت قبول کر لیں تو پچیس اونٹ دو سالہ، پچیس تین سالہ، پچیس چار سالہ اور پچیس پانچ سالہ ہوں گے-﴾

وضاحت :

یہ روایت حدیث نہیں بلکہ ابن شہاب کی اپنی رائے ہے- اس میں نہ رسول اللہ ﷺ کا حکم ہے نہ صحابہ کا اثر بیان ہوا ہے- اگر خلفائے راشدین اس قسم کا فتویٰ دیتے تب تو اس کی اہمیت تھی- ابن شہاب کو اونٹوں کی عمریں متعین کرنے کا حق کس نے دیا؟ یہ صرف امام مالک کی سادہ لوحی ہے کہ ابن شہاب کی ایک رائے کو اپنی کتاب میں جگہ دے دی-

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيٰى بْنِ سَعِيْدٍ اَنَّ مَرْوَانَ بْنَ الْحَكَمِ كَتَبَ اِلٰى مُعَاوِيَةَ بْنِ اَبِي سُفْيَانَ اَنَّهُ اُتِيَ بِمَجْنُوْنٍ قَتَلَ رَجُلًا فَكَتَبَ اِلَيْهِ مُعَاوِيَةُ اَنِ اعْقِلْهُ وَلَا تُقِدْ مِنْهُ فَاِنَّهُ لَيْسَ عَلٰى مَجْنُوْنٍ قَوَدٌ-

﴿یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ مروان بن حکم نے امیر معاویہؓ کو لکھا کہ ایک مجنون میرے پاس لایا گیا ہے جس نے ایک شخص کو قتل کر دیا ہے- امیر معاویہؓ نے لکھا کہ اس سے دیت لو- قصاص نہیں لے سکتے- مجنون قصاص میں قتل نہیں ہو سکتا-﴾

وضاحت :

یہ حضرت امیر معاویہؓ کا فتویٰ ہے کہ مجنون کے اوپر قتل کی ذمہ داری نہیں ہے اس سے دیت لی جائے- یہ

بات قابل غور ہے کہ اگر قصاص نہیں لیا جا سکتا تو دیت لینے کی کیا بنیاد ہے؟ جو عذر قصاص میں مانع ہے وہی عذر دیت میں بھی مانع ہونا چاہیے- قبیلہ ایک مجنون کی کہاں تک نگرانی کر سکتا اور اس کی ذمہ داری قبول کر سکتا ہے؟

دوسرا مسئلہ قابل غور یہ ہے کہ اتنی بڑی رقم عاقلہ (یعنی قبیلہ کے وہ افراد جو مال جمع کر کے قاتل کی طرف سے دیت ادا کریں گے) پر پڑے گی- ہمارے ہاں عاقلہ کا سسٹم نہیں ہے- یہ نظام قبائلی زندگی کے ساتھ وابستہ تھا، اب ختم ہو گیا- قبائلی زندگی کی وجہ سے وہاں ہر ایک کو دوسرے کے غم اور مصیبت میں اور حقوق و حدود میں شرکت کرنا لازم ہوتا تھا- اس لیے اب یہ مسئلہ بھی غور طلب ہے کہ اس زمانہ میں عاقلہ کا بدل کیا ہوگا-

امام مالک کا ایک فتویٰ یہ ہے کہ اگر ایک بالغ اور ایک کمسن دونوں مل کر ایک شخص کو قتل کر دیں تو بڑے کو قصاص میں قتل کیا جائے گا اور کمسن پر نصف دیت ہوگی- یہ بات نہ حدیث میں آئی ہے نہ صحابہ کے اثر میں- اگر کوئی ایسا واقعہ فی زمانہ پیش آجائے تو فیصلہ کرنے کے لیے اس سے کچھ رہنمائی لی جا سکتی ہے-

دِيَةُ الْخَطَاءِ فِي الْقَتْلِ

غلطی سے قتل ہو جائے تو اس کی دیت

□ حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عِرَاكِ بْنِ مَالِكٍ وَ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ اَنَّ رَجُلًا مِنْ بَنِي سَعْدِ بْنِ لَيْثٍ اَجْرٰى فَرَسًا عَلٰى اُصْبُعِ رَجُلٍ مِنْ جُهَيْنَةَ فَنَزٰى مِنْهَا فَمَاتَ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لِلَّذِي ادُّعِيَ عَلَيْهِمْ اَتَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ خَمْسِيْنَ يَمِيْنًا مَا مَاتَ مِنْهَا فَاَبَوْا وَ تَحَرَّجُوْا وَ قَالَ لِلْاٰخَرِيْنَ اَتَحْلِفُوْنَ اَنْتُمْ فَاَبَوْا فَقَضٰى عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ بِشَطْرِ الدِّيَةِ عَلٰى السَّعْدِيِّيْنَ قَالَ مَالِكٌ وَ لَيْسَ الْعَمَلُ عَلٰى هٰذَا-

﴿عراک بن مالکؒ اور سلیمان بن یسارؒ سے روایت ہے کہ قبیلہ سعد بن لیث کے ایک آدمی نے اپنا گھوڑا دوڑایا- اس نے قبیلہ جہینہ کے ایک آدمی کی انگلی روند دی جس سے اس کا خون نکل گیا اور وہ مر گیا- حضرت عمرؓ نے ان لوگوں سے جن پر دعویٰ کیا گیا تھا کہا کہ کیا تم پچاس قسم کھاؤ گے کہ وہ اس سے نہیں مرا- انہوں نے انکار کیا اور اس کو احتیاط کے خلاف سمجھا- پھر مدعیوں سے پوچھا کہ کیا تم لوگ

قسم کھاتے ہو کہ وہ اس سے مرا ہے تو انہوں نے بھی انکار کیا۔ حضرت عمرؓ نے قبیلہ سعد کے خلاف نصف دیت کا فیصلہ کیا۔ مالک کہتے ہیں کہ اس پر عمل نہیں ہے۔﴾

وضاحت :

اس روداد سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس کو قسامہ کا واقعہ قرار دیا۔ لیکن قسامہ کی شکل یہ ہوتی ہے کہ کسی علاقے میں قتل ہو جائے اور قاتلوں کا سراغ نہ لگتا ہو تو وہاں کے سربرآوردہ لوگوں کو بلا کر ان سے قسم لی جاتی ہے کہ انہیں قاتلوں کا کوئی علم نہیں۔ روایت میں بیان کردہ پچاس قسموں کی بھی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ قسم کے بارے میں یہ قانون بھی ہے کہ الیمین علی من انکر، قسم انکار کرنے والے پر ہے۔ مدعی سے قسم لینے کی کوئی وجہ نہیں۔ قسم کمزور کا ہتھیار ہے۔ مدعا علیہ کے پاس اگر کوئی دلیل نہیں تو اس سے قسم لی جا سکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ پوری تفصیل سے نقل نہیں ہوا۔ جس طرح نقل ہوا ہے اس سے بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں اس پر عمل نہیں۔ یہ نہیں بتایا کہ کیوں اس پر عمل نہیں۔ غالباً انہی وجوہ کی بنا پر جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں وہ اس کو ناقابل عمل پاتے ہوں۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ أَنَّ ابْنَ شِهَابٍ وَ سُلَيْمَانَ بْنَ يَسَارٍ وَ رَبِيعَةَ بْنَ أَبِي عَبْدِالرَّحْمٰنِ كَانُوا يَقُولُونَ دِيَةُ الْخَطَاءِ عِشْرُونَ بِنْتَ مَخَاضٍ وَ عِشْرُونَ بِنْتَ لَبُونٍ وَعِشْرُونَ ابْنَ لَبُونٍ ذَكَرًا وَ عِشْرُونَ حِقَّةً وَعِشْرُونَ جَذَعَةً۔

﴿مالک سے روایت ہے کہ ابن شہاب، سلیمان بن یسار اور ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن کہا کرتے تھے کہ قتل خطاء کی دیت میں دو سالہ اونٹنیاں، میں تین سالہ، میں چار سالہ بالکل جوان اونٹ، میں چار سالہ اور میں پانچ سالہ اونٹنیاں ہیں۔﴾

وضاحت :

اس سے پہلے ابن شہاب کا یہ فتویٰ نقل ہوا ہے کہ دیت میں چار مختلف عمروں کے پچیس پچیس اونٹ دینے ہوں گے۔ یہ فقہاء حضرات کے فتوے ہیں، کوئی حدیث یا اثر نہیں جن کی کچھ اہمیت ہو۔

امام مالک کے فتوے :

امام مالک کہتے ہیں کہ متفق علیہ بات ہمارے ہاں یہ ہے کہ بچوں کے قتل کے معاملے میں قصاص نہیں ہو گا۔ اور ان کا عمداً قتل کرنا خطا ہی تصور ہو گا جب تک کہ ان کے اوپر حدود واجب نہ ہو جائیں اور وہ بلوغت کو نہ پہنچ جائیں۔ اور اگر کوئی بچہ قتل کر دے گا تو وہ خطا ہی شمار ہو گا اور اگر ایک بچہ اور ایک بڑا دونوں کسی آزاد شخص کو غلطی سے قتل کر دیں تو ہر ایک کی عاقلہ پر نصف دیت ہو گی۔

امام مالک کا یہ فتویٰ بچوں کی حد تک تو ٹھیک ہے کہ ان کا کوئی فعل عمداً نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایک بچہ اور ایک بڑا جب کسی آزاد کو قتل کر دیتے ہیں یعنی ان کے کسی فعل کے نتیجے میں قتل ہو جاتا ہے تو امام صاحب ہر ایک کی عاقلہ پر نصف نصف دیت مقرر کرتے ہیں حالانکہ بچہ اگر وہاں معصوم ہے تو یہاں کیوں نہیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔

امام مالک کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک متفق علیہ بات یہ ہے کہ غلطی سے اگر زخم لگ جائے تو اس کی دیت نہیں ہو گی جب تک کہ مجروح ٹھیک نہ ہو جائے۔ اگر کسی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو یا ہاتھ یا پاؤں ٹوٹ گیا ہو یا جسم پر کوئی اور چوٹ آئی ہو تو اگر وہ صحیح ہو جائے اور اپنی اصلی حالت پر لوٹ آئے تو اس میں دیت نہیں ہو گی۔ اور اگر کوئی نقص پیدا ہو گیا تو اس میں نقص کے حساب سے دیت ہو گی۔

امام مالک کہتے ہیں کہ اگر ہڈی ان ہڈیوں میں سے ہو جن کے بارے میں دیت نبی ﷺ نے معین فرمائی ہو تو اسی حساب سے لی جائے گی لیکن اگر اس بارے میں نبی ﷺ سے کوئی معین دیت مروی نہیں اور نہ اس بارے میں کوئی سنت ہے تو اس میں اجتہاد کیا جائے گا۔

اس میں سنت سے مراد صحابہ کرام اور خلفائے راشدین کا عمل ہے۔ فقہا کے قول کو سنت نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ اس صورت میں جب کوئی حکم سنت سے ثابت نہ ہو، اجتہاد کیا جائے گا۔

عَقْلُ الْمَرْأَةِ

عورت کی دیت

☐ حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيٰى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ سَعِيدِ ابْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ تُعَاقِلُ الْمَرْأَةُ الرَّجُلَ إِلٰى ثُلُثِ الدِّيَةِ أَصَابِعُهَا كَأَصَابِعِهِ وَسِنُّهَا كَسِنِّهِ وَ مُوضِحَتُهَا

كَمُوضِحَةٍ وَ مُنَقِّلَتُهَا كَمُنَقِّلَتِهِ۔

□ و حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ وَ بَلَغَهُ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ اَنَّهُمَا كَانَا يَقُولَانِ مِثْلَ قَوْلِ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ فِي الْمَرْاَةِ اَنَّهَا تُعَاقِلُ الرَّجُلَ اِلَى ثُلُثِ دِيَةِ الرَّجُلِ فَاِذَا بَلَغَتْ ثُلُثَ دِيَةِ الرَّجُلِ كَانَتْ اِلَى النِّصْفِ مِنْ دِيَةِ الرَّجُلِ قَالَ مَالِكٌ وَ تَفْسِيرُ ذٰلِكَ اَنَّهَا تُعَاقِلُهُ فِي الْمُوضِحَةِ وَالْمُنَقِّلَةِ وَ مَا دُونَ الْمَامُومَةِ وَالْجَائِفَةِ وَ اَشْبَاهِهِمَا مِمَّا يَكُونُ فِيهِ ثُلُثُ الدِّيَةِ فَصَاعِدًا فَاِذَا بَلَغَتْ ذٰلِكَ كَانَ عَقْلُهَا فِي ذٰلِكَ عَلَى النِّصْفِ مِنْ عَقْلِ الرَّجُلِ۔

﴿سعید بن مسیب فتویٰ دیتے تھے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کے برابر رہے گی ایک تہائی دیت تک کیونکہ اس کی انگلی مرد کی انگلی کی طرح، اس کے دانت مرد کے دانت کی طرح، کھلی ہوئی چوٹ مرد کی چوٹ کی طرح اور ہڈی اکھڑنا مرد کی ہڈی اکھڑنے کی طرح ہے۔

امام مالک ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں اور ان کو یہ بات عروہ بن زبیر سے بھی پہنچی کہ وہ دونوں سعید بن مسیب کے فتوے کی طرح ہی فتویٰ دیتے تھے۔ یعنی یہ کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کے برابر ہوگی ایک تہائی دیت تک اور جب اس کی دیت مرد کی ثلث دیت تک پہنچ جائے گی تو اس سے آگے عورت کی دیت مرد کی نصف دیت کے برابر ہوگی۔ امام مالک اس کی تفسیر کرتے ہیں کہ موضحہ اور منقلہ میں اور مامومہ اور جائفہ سے کم نقصان کی صورت میں جب تک مرد کی ثلث دیت کے برابر تک دیت ہوگی تو اس میں عورت کی دیت مرد کے برابر ہی ہوگی لیکن مامومہ اور جائفہ میں جب وہ اس حد کو عبور کر لیتی ہے تو عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف کر دی جائے گی۔﴾

وضاحت:

موضحہ، ایسا زخم جس سے ہڈی ننگی ہو جائے۔ منقلہ، سر کا زخم جس میں ہڈی کو نقصان ہو۔ ان چوٹوں کی دیت پانچ اونٹ ہے۔

مامومہ ایسی چوٹ جس کا اثر دماغ تک پہنچ جائے۔ جائفہ ایسی چوٹ جس کا اثر پیٹ کے اندر تک چلا

جائے۔ ان چوٹوں کی دیت کل دیت کا ایک تہائی ہوتی ہے۔ سعید بن مسیب کے فتویٰ کی بنیاد کسی مرفوع روایت پر نہیں۔ اگر یہ ان کا اجتہاد ہے تو کس بنیاد پر ہے، یہ واضح نہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ایک ثلث تک تو عورت کی دیت مرد کے برابر قرار دیتے ہیں لیکن جب چوٹ زیادہ ہو تو دیت مرد سے نصف مقرر کرتے ہیں کیونکہ عورت کی دیت کو مرد کے نصف رکھنا ہے۔ اس میں چوٹ یا زخم کے بڑا ہونے کا کوئی لحاظ نہیں۔

میرے نزدیک جب چند چھوٹے چھوٹے اعضاء میں عورت کی دیت مرد کے برابر ہے تو بڑے اعضاء میں بھی برابر ہونی چاہیے۔ نیز جب مرد اور عورت کے قصاص جانی میں کوئی فرق نہیں تو دیت میں فرق کیونکر ہو سکتا ہے۔ النفس بالنفس کا قانون اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے اور نبی ﷺ سے بھی کوئی قول اور فعل ایسا نہیں جو اس کی تبیین کرتا ہو۔ نبی ﷺ کا ارشاد تو ایک طرف، سعید بن مسیب کے فتوے کی بنیاد حضرات ابوبکر صدیقؓ، عمر بن خطابؓ اور علیؓ کے اثر پر بھی نہیں ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے عرب کے قدیم رواج پر فتویٰ دے دیا جو پہلے سے چلا آ رہا تھا۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ سَمِعَ ابْنَ شِهَابٍ يَقُولُ مَضَتِ السُّنَّةُ اَنَّ الرَّجُلَ اِذَا اَصَابَ امْرَاَتَهُ بِجُرْحٍ اَنَّ عَلَيْهِ عَقْلَ ذٰلِكَ الْجُرْحِ وَلَا يُقَادُ مِنْهُ۔

﴿امام مالکؒ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے ابن شہاب کو فتویٰ دیتے سنا کہ عمل اس پر ہے کہ شوہر اگر بیگم کی پٹائی کرتے ہوئے زخم لگا دے تو اس پر اس زخم کی دیت ہوگی، قصاص نہیں لیا جائے گا۔

وضاحت:

حدیث میں یہ ہے کہ بیوی کو ایسی مار نہیں ماری جائے گی جو اپنا اثر چھوڑ دے تو اس پر دیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن ابن شہاب نے قاعدہ دی یہ بنا دیا کہ شوہر اگر بیوی کی ٹانگ توڑ دے، آنکھ پھوڑ دے یا اس طرح کی کوئی اور چوٹ لگا دے تو دیت دینا ہوگی۔

عَقْلُ الْجَنِينِ

حمل کے بچے کی دیت

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ اَبِي سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ

عَنْ اَبِی هُرَیرَةَ اَنَّ امْرَاَتَیْنِ مِنْ هُذَیلٍ رَمَتْ اِحْدَاهُمَا الْاُخْرٰی فَطَرَحَتْ جَنِیْنَهَا فَقَضٰی فِیهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِغُرَّةٍ عَبْدٍ اَوْ وَلِیدَةٍ۔

﴿ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ قبیلہ ہذیل کی دو عورتوں نے ایک دوسرے کو پتھر مارا تو ایک نے اپنا جنین ڈال دیا (یعنی اس کا حمل ساقط ہو گیا) رسول اللہ ﷺ نے اس کے بارے میں ایک لونڈی یا غلام کی دیت کا فیصلہ کیا۔﴾

وضاحت :

مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پتھر مارنے والی عورت یا تو ایک لونڈی یا غلام دیت میں ادا کرے یا ان میں سے کسی کی قیمت لگا کر وہ ادا کرے۔ آپؐ نے جنین کو نفس پر ہی محمول کیا اور اس کی دیت ایک نفس غلام یا لونڈی مقرر فرمائی۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَعِیدِ بْنِ الْمُسَیَّبِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَضٰی فِی الْجَنِینِ یُقْتَلُ فِی بَطْنِ اُمِّهِ بِغُرَّةٍ عَبْدٍ اَوْ وَلِیدَةٍ فَقَالَ الَّذِی قُضِیَ عَلَیْهِ كَیْفَ اَغْرَمُ مَا لَا شَرِبَ وَلَا اَكَلَ وَلَا نَطَقَ وَلَا اسْتَهَلَّ وَ مِثْلُ ذٰلِكَ بَطَلَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّمَا هٰذَا مِنْ اِخْوَانِ الْكُهَّانِ

﴿سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک جنین کے بارے میں جو اپنی ماں کے پیٹ میں قتل ہو گیا ہو، ایک لونڈی یا غلام کا فیصلہ دیا۔ جس کے خلاف آپ نے فیصلہ کیا اس نے کہا کہ میں اس وجود کا کیسے تاوان ادا کروں جس نے نہ کھایا نہ پیا، نہ بولا نہ چیخا۔ اس طرح کے وجود کا معاملہ باطل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ کاہنوں کا بھائی معلوم ہوتا ہے۔﴾

وضاحت :

آنحضرت ﷺ نے اپنا فیصلہ برقرار رکھا اور اس کے اعتراض کو مناسب خیال نہیں کیا۔ اس زمانے میں لونڈی یا غلام تاوان میں دیے جاتے تھے۔ اب تقویم کا قاعدہ چلے گا۔ موجودہ حالات میں کچھ رقم ادا کی جائے گی۔

آدمی نے جو اعتراض کیا اس کی عبارت میں ہم قافیہ الفاظ استعمال کیے۔ کاہنوں کا کلام اسی طرح کا ہوتا تھا اس لیے حضورؐ نے فرمایا کہ یہ شخص کاہنوں کا بھائی معلوم ہوتا ہے۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ رَبِیعَةَ بْنِ اَبِی عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّهُ كَانَ یَقُوْلُ الْغُرَّةُ تُقَوَّمُ بِخَمْسِینَ دِینَارًا اَوْ سِتِّمِائَةِ دِرْهَمٍ وَدِیَةُ الْمَرْاَةِ الْحُرَّةِ الْمُسْلِمَةِ خَمْسُمِائَةِ دِینَارٍ اَوْ سِتَّةُ اٰلَافِ دِرْهَمٍ۔

﴿امام مالکؒ ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فتویٰ دیتے تھے کہ ایک نفر غلام کی قیمت لگائی جائے گی پچاس دینار یا چھ سو درہم اور ایک آزاد مسلمہ عورت کی دیت ہو گی پانچ سو دینار یا چھ ہزار درہم۔﴾

وضاحت :

یہ ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن نے اپنے زمانے کے لحاظ سے تقویم کر دی ہے کہ اگر قیمت دینا ہو گی تو اتنے دینار یا درہم ادا کرنے ہوں گے۔

مَا فِیهِ الدِّیَةُ كَامِلَةً

جس میں کامل دیت ہو گی

☐ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَعِیدِ بْنِ الْمُسَیَّبِ اَنَّهُ كَانَ یَقُوْلُ فِی الشَّفَتَیْنِ الدِّیَةُ كَامِلَةً فَاِذَا قُطِعَتِ السُّفْلٰی فَفِیهَا ثُلُثُ الدِّیَةِ۔

﴿ابن شہاب سعید بن مسیب سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فتوے دیتے تھے کہ دونوں ہونٹوں کی دیت کامل ہو گی اور اگر نیچے کا ہونٹ کٹا ہے تو دیت ایک تہائی حصہ ہو گا۔﴾

وضاحت :

یہ بھی سعید بن مسیب کا فتویٰ ہے۔ کوئی مرفوع حدیث نہیں ہے۔

مَاجَاءَ فِي عَقْلِ الْعَيْنِ اِذَا ذَهَبَ بَصَرُهَا

آنکھ کی دیت جب اس کی بینائی جاتی رہے

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ اَنَّ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ كَانَ يَقُولُ فِي الْعَيْنِ الْقَائِمَةِ اِذَا طُفِئَتْ مِائَةُ دِينَارٍ

﴿سلیمان بن یسار سے روایت ہے کہ زید بن ثابت فتویٰ دیتے تھے اس آنکھ کے بارے میں جو شکلاً تو قائم ہو لیکن اس کا نور ختم کر دیا جائے کہ اس کی دیت ایک سو دینار ہو گی۔﴾

مَاجَاءَ فِي عَقْلِ الشِّجَاجِ

سر اور چہرہ پر زخم کی دیت کیا ہو گی

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ اَنَّهُ قَالَ كُلُّ نَافِذَةٍ فِي عُضْوٍ مِنَ الْاَعْضَاءِ فَفِيهِ ثُلُثُ عَقْلِ ذٰلِكَ الْعُضْوِ

﴿سعید بن مسیب کا فتویٰ ہے کہ اگر اعضاء میں سے کسی عضو میں سوراخ ہو جائے تو اس عضو کی ایک تہائی دیت ہو گی۔﴾

وضاحت :

زخموں کے مختلف نام ہیں جن میں ہمارے لیے یہ متعین کرنا ہی مشکل ہے کہ زخم کی نوعیت اور مقدار کیا ہے۔اب ایسے تمام معاملات کسی ماہر ڈاکٹر کی نگرانی میں دیے جائیں گے۔ڈاکٹر ہی ان کو ناپے گا۔وہی دیکھے گا اور اس کی رپورٹ کے مطابق فیصلہ ہو گا۔وہی بتائے گا کہ اس میں صحیح طور پر جسمانی قصاص لینا ممکن ہے یا نہیں۔عدالت اس کی رپورٹ کی روشنی میں فیصلہ کرے گی۔

دیت کے معاملات کی بنیاد نبی ﷺ کا وہ نامہ ہے جو آپ نے اہل حزم کے نام لکھا۔اس کے سوا یہ سب چیزیں اجتہادی کی ہیں۔اصحاب علم اس میں فیصلہ کریں گے۔امام مالک بتاتے ہیں کہ اس بارے میں مدینہ کے اہل

علم کے درمیان کوئی اختلاف شدہ نہیں ہے۔

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ اَبِي عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ الزُّبَيْرِ اَقَادَ مِنَ الْمِنْقَلَةِ۔

﴿امام مالک ربیعہ بن عبدالرحمٰن سے روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن زبیرؓ نے منقلہ میں قصاص دلوایا۔﴾

وضاحت :

سر کی ہڈی کے اوپر جو کھال ہوتی ہے وہ اتر جائے تو اس زخم کو منقلہ کہتے ہیں۔عبداللہ بن زبیرؓ نے اس چوٹ پر قصاص دلوایا۔مالکیہ کا فتویٰ یہ ہے کہ اس میں قصاص نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں کمی بیشی کا خطرہ ہے، عدل ممکن نہیں۔اس لیے دیت ہو گی۔میرے نزدیک اس صورت میں دیت ہی بہتر صورت ہے۔

مَاجَاءَ فِي عَقْلِ الْاَصَابِعِ

انگلیوں کی دیت کیا ہو گی

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ اَبِي عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّهُ قَالَ سَاَلْتُ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ كَمْ فِي اِصْبَعِ الْمَرْاَةِ فَقَالَ عَشْرٌ مِنَ الْاِبِلِ فَقُلْتُ كَمْ فِي اِصْبَعَيْنِ قَالَ عِشْرُونَ مِنَ الْاِبِلِ فَقُلْتُ كَمْ فِي ثَلَاثٍ فَقَالَ ثَلَاثُونَ مِنَ الْاِبِلِ فَقُلْتُ كَمْ فِي اَرْبَعٍ قَالَ عِشْرُونَ مِنَ الْاِبِلِ فَقُلْتُ حِينَ عَظُمَ جُرْحُهَا وَاشْتَدَّتْ مُصِيبَتُهَا نَقَصَ عَقْلُهَا فَقَالَ سَعِيدٌ" اَعِرَاقِيٌّ اَنْتَ فَقُلْتُ بَلْ عَالِمٌ مُثَبِّتٌ اَوْ جَاهِلٌ مُتَعَلِّمٌ فَقَالَ سَعِيدٌ هِيَ السُّنَّةُ يَا ابْنَ اَخِي۔

﴿ربیعہ بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن مسیب سے پوچھا عورت کی انگلی کی دیت کیا ہے تو انہوں نے کہا دس اونٹ۔دو انگلیوں کا پوچھا تو انہوں نے کہا کہ بیس اونٹ۔تین انگلیوں کا پوچھا تو انہوں نے کہا تیس اونٹ۔پھر چار انگلیوں کا پوچھا تو انہوں نے کہا کہ بیس اونٹ۔میں نے کہا عجیب

بات ہے زخم بھاری، مصیبت بڑی اور دیت کم! تو سعید نے کہا تم عراقی معلوم ہوتے ہو- میں نے کہا آپ مجھے ایک عالم تحقیق کرنے والا فرض کر لیں یا ایک جاہل علم سیکھنے والا- تو سعید نے کہا میرے بھتیجے سنت یہی ہے-﴾

وضاحت :

یہ سعید بن مسیب کا فتویٰ ہے- عراقی اس زمانے میں طنزیہ استعمال ہوتا تھا ان لوگوں کے لیے جو دین میں عقل کو دخل دیتے تھے- عراق فقہ حنفی کا مرکز تھا اور عقلیت کے لیے مشہور تھا- یہ اسی طرح کی بات ہے جس طرح اس زمانے میں کسی حدیث پر تنقید کریں تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو ہمی ہے، یعنی دین میں عقل کو دخل دیتا ہے-

تیس اونٹ تک عورت کی دیت مرد کے برابر ہے- لیکن جیسے ہی چالیس ہوئی مرد کی دیت سے آدھی رہ گئی اور دس ہو گئی- اس پر ربیعہ نے کہا کہ حضرت یہ کیا کہ مصیبت زیادہ اور دیت کم ہو گئی- سعید سے جواب نہ بن پڑا اور عراقی ہونے کا طعنہ دیا تو ربیعہ نے کہا نہیں میں تو تحقیق کرنے والا عالم ہوں یا جاہل علم حاصل کرنے والا- یہ آپ کس اصول پر کہتے ہیں کہ عورت کی دیت ایک ثلث تک تو مرد کے برابر ہے، ثلث سے زیادہ ہو تو گر دیں گے تاکہ عورت کی دیت مرد کی دیت کے نصف کے برابر رہ جائے-

معلوم ہوتا ہے کہ ربیعہ بن عبدالرحمٰن کا معارضہ درست تھا جس کا سعید کوئی معقول جواب نہ دے سکے- اور یہ کہا کہ سنت یہی ہے- حالانکہ یہ سنت تو نہیں بلکہ ان کا فتویٰ ہے اور ربیعہ نے اس کا مذاق اڑایا ہے-

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں احناف کے متعلق عقلیت کا اعتراف تھا- بعد میں اس نے طنز کی شکل اختیار کر لی اور احناف اس بارے میں متہم رہے کہ عقلی گھوڑے لگاتے ہیں- بعض لوگوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ حدیث کی پروا نہیں کرتے- اصل بات یہ ہے کہ وہ عموم بلوی کے معاملات میں جن کا تعلق عام زندگی سے ہے وہ اخبار احاد کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور یہ کہتے ہیں کہ ایسے معاملات میں روایت بہت سے طریقوں سے ہونی چاہیے- اسی طرح مالکیہ بھی عمل اہل مدینہ کو اخبار احاد پر ترجیح دیتے ہیں- ان کا کہنا یہ ہے کہ مدینہ تمام علماء کا مرکز رہا ہے- علمائے مدینہ کا اگر ایک مسئلے پر اتفاق ہے تو اس کے مقابلے میں خبر واحد کی کیا حیثیت ہے- یہ دلیل بڑی قوی

ہے- اگرچہ مالکیہ اور حنفیہ دونوں عقلیت کے مجرم ہیں، لیکن عقلیت کا الزام زیادہ احناف پر آیا کیونکہ ان کی فقہ کو اس طریقے پر زیادہ فروغ حاصل ہوا-

جَامِعُ عَقْلِ الْأَسْنَانِ

دانتوں کی دیت کے بارے میں جامع باب

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ مُسْلِمِ بْنِ جُنْدُبٍ عَنْ أَسْلَمَ مَوْلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَضَى فِي الضِّرْسِ بِجَمَلٍ وَ فِي التَّرْقُوَةِ بِجَمَلٍ وَ فِي الضِّلَعِ بِجَمَلٍ-

﴿حضرت عمرؓ کے آزاد کردہ غلام اسلم روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے چوپڑ کے دانت کی دیت میں ایک اونٹ کا فیصلہ کیا- پچھلے دانت کا بھی ایک اونٹ اور پسلی کا بھی ایک اونٹ-﴾

وضاحت :

یہ روایت حضرت عمرؓ کا اثر ہے- کسی فقیہ کا فتویٰ نہیں- فی زمانہ ایک اونٹ کی قیمت لگا کر دیت ادا کی جائے گی-

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ أَنَّهُ سَمِعَ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ يَقُولُ قَضَى عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فِي الْأَضْرَاسِ بِبَعِيرٍ وَ قَضَى مُعَاوِيَةُ بْنُ أَبِي سُفْيَانَ فِي الْأَضْرَاسِ بِخَمْسَةِ أَبْعِرَةٍ-

﴿سعید بن مسیب بتاتے تھے کہ حضرت عمرؓ نے چوپڑ کے دانتوں کی دیت کے بارے میں ایک اونٹ کا فیصلہ کیا اور حضرت معاویہؓ نے انہی کے بارے میں پانچ اونٹ کا فیصلہ کیا-﴾

وضاحت :

امام مالکؒ امیر معاویہؓ کے فتوے بھی نقل کرتے ہیں اور مروان بن حکم کے بھی- وہ ان لوگوں کو نظر انداز

نہیں کرتے بلکہ اہمیت دیتے ہیں- چونکہ دانتوں کی دیت نبی ﷺ نے متعین نہیں فرمائی اس لیے مقدمے کا فیصلہ وقت کے حالات کی رعایت سے کیا گیا ہوگا جس کے نتیجہ میں اختلاف واقع ہوا-

اَلعَمَلُ فِی عَقلِ الأَسنَانِ

دانتوں کی دیت کے بارے میں عمل

❐ حَدَّثَنِی یَحیَی عَنْ مَالِكٍ عَنْ دَاوُدَ بْنِ الحُصَیْنِ عَنْ اَبِی غَطفَانَ بْنِ طَرِیفٍ المُرِّیِّ اَنَّهٗ اَخبَرَهٗ اَنَّ مَرْوَانَ بْنَ الحَكَمِ بَعَثَهٗ اِلَی عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ یَسْاَلُهٗ مَاذَا فِی الضِّرْسِ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عَبَّاسٍ فِیهِ خَمْسٌ" مِنَ الاِبِلِ قَالَ فَرَدَّنِی مَرْوَانُ اِلَی عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ فَقَالَ اَتَجْعَلُ مُقَدَّمَ الفَمِ مِثْلَ الاَضْرَاسِ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عَبَّاسٍ لَو لَمْ تَعتَبِرْ ذٰلِكَ اِلَّا بِالاَصَابِعِ عَقْلُهَا سَوَاءٌ-

﴿ابو غطفان بن طریف مری روایت کرتے ہیں کہ مروان بن حکم نے ان کو عبداللہ بن عباس کے پاس بھیجا تاکہ ان سے چوپڑ کے دانتوں کی دیت کے بارے میں پوچھے تو عبداللہ بن عباس نے کہا کہ ان میں پانچ اونٹ کی دیت ہے- وہ کہتے ہیں کہ مروان نے مجھے پھر عبداللہ بن عباس کی طرف لوٹایا اور یہ پیغام دیا کہ کیا آپ منہ کے اگلے حصہ کو چوپڑ کے دانتوں کے برابر رکھتے ہیں تو عبداللہ بن عباس نے کہا کہ اگر آپ کو اس کا اعتبار نہیں تو انگلیوں پر قیاس کر لو کہ ان کی دیت بھی یکی ہے-﴾

وضاحت :

حضرت ابن عباسؓ کی بات کا مفہوم یہ ہے کہ یہ تعین نہیں ہو سکتا کہ ایک دانت اور دوسرے دانت میں کیا فرق ہے- ہو سکتا ہے کہ ایک دانت میں گوشت کی کمی ہو لیکن اس کا نکل جانا آپ کا چہرہ ہی بگاڑ دے لہذا مختلف دانتوں کی دیت یکساں ہے-

❐ حَدَّثَنِی یَحیَی عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِیهِ اَنَّهٗ كَانَ یُسَوِّی بَیْنَ الاَسْنَانِ

فِی العَقْلِ وَلَا یُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلَی بَعْضٍ.

﴿ہشام بن عروہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ تمام دانتوں کو برابر ہی رکھتے تھے- ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتے تھے-﴾

وضاحت :

یہی مذہب امام مالک کا بھی ہے- وہ سامنے کے دانتوں، داڑھوں اور چوپڑ کے دانتوں کو یکساں اہمیت دیتے اور ان کی دیت برابر ٹھہراتے ہیں-

مَاجَاءَ فِی دِیَةِ جِرَاحِ العَبْدِ

غلاموں کے زخموں کی دیت

اس باب میں نہ کوئی مرفوع روایت ہے اور نہ خلفائے راشدین کا کوئی اثر- اب غلامی کا مسئلہ ختم ہو چکا اور ہم اس سے بری ہیں- غلاموں کے ساتھ مال اسباب کا سا معاملہ کرنا قرآن مجید کے بالکل خلاف ہے- قرآن غلاموں کو انسان مانتا ہے اور اسی بنا پر ان کے حقوق اور ذمہ داریاں ہیں لیکن لوگوں نے اس کا لحاظ نہیں کیا-

مَاجَاءَ فِی دِیَةِ أَهْلِ الذِّمَّةِ

ذمیوں کی دیت

❐ حَدَّثَنِی یَحیَی عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ العَزِیزِ قَضَی اَنَّ دِیَةَ الیَهُودِیِّ وَالنَّصْرَانِیِّ اِذَا قُتِلَ اَحَدُهُمَا مِثْلُ نِصْفِ دِیَةِ الحُرِّ المُسْلِمِ قَالَ مَالِكٌ اَلاَمْرُ عِنْدَنَا اَنْ لَا یُقْتَلَ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ اِلَّا اَنْ یَقْتُلَهٗ مُسْلِمٌ قَتْلَ غِیلَةٍ فَیُقْتَلُ بِهٖ-

﴿امام مالک کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فیصلہ کیا کہ یہودی یا نصرانی اگر قتل ہو جائے تو اس کی دیت آزاد مسلم کی دیت کے نصف کے برابر ہو گی- امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک فتویٰ یہ ہے کہ کوئی مسلم کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا الا یہ کہ

مسلمان نے اس کو دھوکہ دے کر قتل کیا ہو۔ تب وہ اس کے بدلے میں قتل ہوگا۔﴾

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى ابْنِ سَعِيدٍ اَنَّ سُلَيْمَانَ بْنَ يَسَارٍ كَانَ يَقُولُ دِيَةُ الْمَجُوسِيِّ ثَمَانُمِائَةِ دِرْهَمٍ قَالَ مَالِكٌ وَهُوَ الْاَمْرُ عِنْدَنَا۔

﴿یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ سلیمان بن یسار فتویٰ دیتے تھے کہ مجوسی کی دیت 800 درہم ہے۔ امام مالک کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک بھی یہی فتویٰ ہے۔﴾

وضاحت:

امام مالک نے جو کچھ نقل کیا ہے وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا اثر ہے۔ خلفائے راشدین میں سے کسی کا بھی عمل نہیں۔ مالکیہ کا یہی مذہب ہے لیکن احناف کے نزدیک ذمی اور مسلمان کی دیت برابر برابر ہی ہوگی۔ وہ النفس بالنفس کے قانون کی بناء پر ایسے کہتے ہیں۔ مالکیہ حضرات ان نصوص میں تخصیص مانتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ تخصیص کی توجیہ کیا ہے۔ کیا کوئی قول یا روایت قرآن مجید کے حکم کو کسی معین طبقہ کے لیے خاص کر سکتا ہے۔ احناف کے سامنے بھی یہ روایتیں تھیں تو وہ ان روایتوں کو تخصص ہونے کا درجہ کیوں نہیں دیتے۔

نیز یہ بات بھی ہے کہ اہل ذمہ کے جان، مال اور ناموس کی حفاظت کی ذمہ داری حکومت کی ہے۔ جب اہل ذمہ کا آدمی قتل کردے تو وہ قصاص میں قتل ہوگا لیکن جب مسلمانوں کا آدمی کسی اہل ذمہ کو قتل کردے تب اگر وہ قتل نہیں ہوگا تو اہل ذمہ کی حفاظت کی ذمہ داری تو پوری نہ ہوئی۔ اس لحاظ سے بھی مالکیہ کا نقطہ نظر صحیح نہیں ہے۔ اس زمانے میں رائج تصورات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو کسی جمہوریت میں اس کی گنجائش نہیں ہو سکتی کہ رعایا کے اندر فوجداری قوانین میں اس طرح کا فرق ہو کہ اقلیت کا آدمی قتل کرے گا تو قتل ہوگا لیکن اکثریت سے تعلق رکھنے والا قاتل ہوگا تو وہ قتل نہیں ہوگا۔ کوئی جمہوریت اس کو مان نہیں سکتی۔

نیز یہ بات بین الاقوامی قانون کے بھی خلاف ہے۔ وہ ملک آج دنیا میں نکو بن کر رہ جائے گا جس کے قانون میں ایسا امتیاز روا رکھا جائے گا۔ میرے نزدیک مالکیہ اور شوافع کا مذہب کمزور ہے۔ احناف کا مذہب مضبوط ہے۔ یہ مسئلہ بھی ان چیزوں میں سے ہے جنہوں نے احناف کے مذہب کو دوسرے مذاہب کے مقابلے میں تقویت دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر احناف میں کبیر کے فقیر فقہاء نہ پیدا ہو گئے ہوتے تو یہ مذہب زمانے کے قوانین کے مقابلے

میں بہت اعلیٰ سطح پر پیش کیا جا سکتا تھا۔

مَا يُوجِبُ الْعَقْلَ عَلَى الرَّجُلِ فِي خَاصَّةِ مَالِهِ

ایسی صورتیں جن میں آدمی کی دیت خاص اسی کے مال سے دی جائے گی

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيهِ اَنَّهُ كَانَ يَقُولُ لَيْسَ عَلَى الْعَاقِلَةِ عَقْلٌ فِي قَتْلِ الْعَمْدِ اِنَّمَا عَلَيْهِمْ عَقْلُ قَتْلِ الْخَطَاءِ۔

﴿ہشام بن عروہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ کہتے تھے کہ عاقلہ کے اوپر قتل عمد کے بارے میں دیت نہیں۔ صرف قتل خطا میں عاقلہ پر دیت کی ذمہ داری ہے۔﴾

وضاحت:

"عاقلہ" سے مراد آدمی کے اہل عصبہ ہیں۔ اہل عصبہ میں وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جن کو وراثت ملتی ہے۔ دوسرے اعزہ و اقربا اس میں شامل نہیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں ایک دفتر قائم کیا تھا جس میں ہر آدمی کے عاقلہ میں جو لوگ شریک تھے ان کا اندراج ہو جاتا تھا تاکہ وقت پر کوئی ملزم بھاگ نہ سکے۔ قبائلی نظام میں یہ ایک ناگزیر چیز تھی اس لیے کہ ان کے ہاں اکثر مار دھاڑ ہوتی رہتی تھی۔ اس لیے انہوں نے خود ہی اپنی سہولت کے پیش نظر یہ نظام قائم کر لیا تھا۔ ان کے ہاں عصبہ کا نظام تو خیر فطرت کا تقاضا تھا "ولاء" کا نظام بھی اتنا محکم تھا کہ اس میں بھی کبھی فرق نہیں آیا تھا۔ ہمارے ہاں عاقلہ اور ولاء دونوں کا تصور نہیں ہے۔

امام مالکؒ نے ہشام کے والد کا فتویٰ نقل کیا ہے کہ عاقلہ کے اوپر اس قتل کی دیت نہیں ہوگی جو کسی نے جان بوجھ کر کیا ہوگا۔ اس صورت میں مجرم کو قصاص میں قتل کیا جائے گا اور اگر مقتول کے وارثوں نے دیت لینی قبول کر لی ہے تو اس شکل میں دیت صرف مجرم کے مال سے دی جائے گی۔ یہ بات عقل کے مطابق ہے۔ ہاں اگر کسی شخص سے خطا قتل ہو جاتا ہے اور وہ محتاج بھی ہے تو اس کی مدد کی جائے گی۔ اعزہ و اقربا کا فرض ہے کہ اس کی مدد کریں۔ یہ بات بھی عقل کے مطابق ہے۔ امام صاحب نے اس فتویٰ کی تائید میں آگے ابن شہاب اور یحییٰ بن سعید کی رائے بھی نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں اس بارے میں یہی سنت چلی آ رہی ہے۔

امام مالکؒ کا فتویٰ یہ ہے کہ عاقلہ کے اوپر دیت اس وقت تک واجب نہیں ہوگی جب تک اس کی مقدار

ثلث یا اس سے زیادہ ہو۔ اس سے کم مقدار میں عاقلہ کو تکلیف نہیں دی جائے گی بلکہ صرف جارح کے مال میں سے ہی دیت ادا کی جائے گی۔

یہ امام مالکؒ نے نیا نکتہ پیدا کیا ہے لیکن بات بالکل معقول ہے کہ دیت کا وہ حصہ اگر زیادہ ہو تب تو عاقلہ کو شریک ہونا چاہیے لیکن اگر تھوڑی سی دیت ہے تو وہ سروں پر کیوں لاد جائے۔

مَاجَاءَ فِي مِيرَاثِ الْعَقْلِ وَالتَّغْلِيظِ فِيهِ

دیت کی میراث اور اس میں سختی کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ نَشَدَ النَّاسَ بِمِنًى مَنْ كَانَ عِنْدَهُ عِلْمٌ مِنَ الدِّيَةِ اَنْ يُخْبِرَنِي فَقَامَ الضَّحَّاكُ بْنُ سُفْيَانَ الْكِلَابِي فَقَالَ كَتَبَ اِلَيَّ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ اُوَرِّثَ امْرَاَةَ اَشْيَمَ الضَّبَابِي مِنْ دِيَةِ زَوْجِهَا فَقَالَ لَهُ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ ادْخُلِ الْخِبَاءَ حَتّٰى آتِيَكَ فَلَمَّا نَزَلَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اَخْبَرَهُ الضَّحَّاكُ فَقَضٰى بِذٰلِكَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ قَالَ ابْنُ شِهَابٍ وَكَانَ قَتْلُ اَشْيَمَ خَطَاً۔

﴿ابن شہاب راوی ہیں کہ عمر بن خطابؓ نے منیٰ میں لوگوں سے مطالبہ کیا کہ جس کے پاس دیت کے بارے میں کچھ علم ہو تو وہ مجھے خبر کرے۔ ضحاک بن سفیان کلابی کھڑے ہوئے اور کہا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے لکھا تھا کہ میں اشیم الضبابی کی بیوی کو اس کے شوہر کی دیت میں سے وارث بناؤں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ خیمہ میں چلو، میں آتا ہوں۔ جب حضرت عمرؓ آئے تو ضحاک نے ان کو اس واقعہ کی خبر دی تو حضرت عمرؓ نے اس کے مطابق فیصلہ کیا۔ ابن شہاب کہتے ہیں کہ اشیم کا قتل قتل خطا تھا﴾

وضاحت:

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیت کی وراثت بیوی کو بھی پہنچے گی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو لوگ جائداد میں وارث ہوتے ہیں وہ دیت میں بھی وارث ہوں گے۔ یہ بات تو معقول ہے لیکن تحقیق کی ضرورت غالباً اس لیے پڑی ہوگی کہ معاملہ دیت کا تھا اور سوال یہ تھا کہ وراثت کے قانون ہی کے مطابق اس میں فیصلہ ہوگا یا اس میں کچھ

مختلف ہوگا۔ اشیم کا قتل قتل خطا تھا اس لیے اس کی دیت جو مثلی تھی اس میں حضرت عمرؓ نے سب ورثاء کو شریک کیا۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ اَنَّ رَجُلًا مِنْ بَنِي مُدْلِجٍ يُقَالُ لَهُ قَتَادَةُ حَذَفَ ابْنَهُ بِالسَّيْفِ فَاَصَابَ سَاقَهُ فَنَزَى فِي جُرْحِهِ فَمَاتَ فَقَدِمَ سُرَاقَةُ بْنُ جُعْشُمٍ عَلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهُ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ اعْدُدْ عَلٰى مَاءٍ قُدَيْدٍ عِشْرِينَ وَمِائَةَ بَعِيرٍ حَتّٰى اَقْدَمَ عَلَيْكَ فَلَمَّا قَدِمَ اِلَيْهِ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اَخَذَ مِنْ تِلْكَ الْاِبِلِ ثَلَاثِينَ حِقَّةً وَثَلَاثِينَ جَذَعَةً وَاَرْبَعِينَ خَلِفَةً ثُمَّ قَالَ اَيْنَ اَخُو الْمَقْتُولِ قَالَ هَا اَنَا ذَا قَالَ خُذْهَا فَاِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَيْسَ لِقَاتِلٍ شَيْءٌ"

﴿عمرو بن شعیب راوی ہیں کہ بنو مدلج کے ایک شخص نے، جس کا نام قتادہ تھا، تلوار پھینک ماری تو وہ اس کے بیٹے کو پنڈلی میں لگی جس سے اس کا خون بہہ گیا اور وہ مر گیا۔ سراقہ بن جعشم حضرت عمر بن خطابؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس واقعہ کا ذکر کیا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ جاؤ اور قدید کے چشمے پر ایک سو بیس اونٹ جمع کرو، میں آتا ہوں۔ حضرت عمرؓ آئے تو انہوں نے اونٹوں میں سے تیس حقہ، تیس جذعہ اور چالیس خلفہ لیے۔ پھر پوچھا کہ مقتول کا بھائی کہاں ہے۔ اس نے کہا میں حاضر ہوں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ یہ لے لو اس لیے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ قاتل کے لیے کچھ نہیں۔﴾

وضاحت:

"حقہ" وہ اونٹ جس کی عمر دو سال سے زیادہ لیکن تین سال سے کم ہو۔

"جذعہ" وہ اونٹ جس کی عمر تین سال اور چار سال کے درمیان ہو۔

"خلفہ" تین سال اور چار سال کے درمیان دودھ دینے والی اونٹنی کو کہتے ہیں۔

اس روایت میں یہ مسئلہ بتایا ہے کہ قاتل کو کچھ نہیں ملے گا اگرچہ وہ وراثت کے حقداروں میں سے ہو۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے مقتول کے بھائی کو وارث بنایا اور باپ چونکہ قاتل تھا، اس کو بالکل محروم کر دیا۔

حضرت عمرؓ نے اونٹ تو 120 جمع کرنے کا حکم دیا لیکن دیت میں 100 ہی دیے۔ صرف خلفہ کی تعداد

بڑھادی۔ چونکہ قاتل نے باپ ہو کر حماقت کی تھی، اس لیے آپ نے خلفہ کی تعداد بڑھادی تاکہ سزا ذرا سخت ہو۔ اسی طرح اگر حالت احرام میں یا شہر حرم میں قتل ہو تو اونٹوں کی صفات میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ کل تعداد ایک سو ہی رہے۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ وَسُلَيْمَانَ بْنَ يَسَارٍ سُئِلَا أَتُغَلَّظُ الدِّيَةُ فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ فَقَالَا لَا وَلَكِنْ يُزَادُ فِيهَا لِلْحُرْمَةِ فَقِيلَ لِسَعِيدٍ هَلْ يُزَادُ فِي الْجِرَاحِ كَمَا يُزَادُ فِي النَّفْسِ فَقَالَ نَعَمْ قَالَ مَالِكٌ أَرَاهُمَا أَرَادَا مِثْلَ الَّذِي صَنَعَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فِي عَقْلِ الْمُدْلِجِيِّ حِينَ أَصَابَ ابْنَهُ۔

﴿امام مالک کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ سعید بن مسیب اور سلیمان بن یسار سے پوچھا گیا کہ کیا دیت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے، اگر جرم محترم مہینوں میں کیا گیا ہو۔ دونوں نے فتویٰ دیا کہ نہیں البتہ حرمت کی بناء پر اس میں اضافہ ہوگا۔ سعید سے کہا گیا کہ کیا زخموں کے بارے میں بھی یہ بات ہو سکتی ہے جیسا کہ نفس کے بارے میں ہے تو انہوں نے کہا ہاں۔ امام مالک کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ ان کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح حضرت عمرؓ نے اونٹوں کی صفات میں اس وقت اضافہ کیا تھا جب مدلجی نے اپنے بیٹے کو مار ڈالا تھا، اسی طرح کا اضافہ ہو سکتا ہے۔﴾

وضاحت :

مدلجی کے بیٹے کے قتل کی دیت دلاتے وقت حضرت عمرؓ نے تعداد سو ہی رکھی تھی، صرف اونٹوں کی عمروں میں اضافہ کیا تھا اسی طرح محترم مہینوں کی حرمت کے لحاظ کرتے ہوئے اونٹوں کی صفات میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ لیکن تعداد سو ہی رہے گی۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ أَنَّ رَجُلًا مِنَ الْأَنْصَارِ يُقَالُ لَهُ أُحَيْحَةُ بْنُ الْجُلَاحِ كَانَ لَهُ عَمٌّ صَغِيرٌ هُوَ أَصْغَرُ مِنْ أُحَيْحَةَ وَكَانَ عِنْدَ أَخْوَالِهِ فَأَخَذَهُ أُحَيْحَةُ فَقَتَلَهُ فَقَالَ أَخْوَالُهُ كُنَّا أَهْلَ نَمَهِ وَرَمْيِهِ حَتَّى إِذَا اسْتَوَى عَلَى عُمُومَتِهِ غَلَبَنَا حَقُّ امْرِئٍ

فِي عَمِّهِ قَالَ عُرْوَةُ فَلِذَلِكَ لَا يَرِثُ قَاتِلُ مَنْ قَتَلَ قَالَ مَالِكٌ الْأَمْرُ الَّذِي لَا اخْتِلَافَ فِيهِ عِنْدَنَا أَنَّ قَاتِلَ الْعَمْدِ لَا يَرِثُ مِنْ دِيَةِ مَنْ قَتَلَ شَيْئًا۔

﴿عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ ایک انصاری احیحہ بن جلاح کا ایک چچا اس سے عمر میں چھوٹا تھا۔ وہ اپنے ماموؤں کے پاس رہتا تھا۔ اس کو احیحہ نے پکڑا اور قتل کر دیا۔ اس کے ماموؤں نے کہا کہ اس کے پوتڑے دھونے اور پالنے پوسنے کے لیے ہم تھے اور جب وہ جوانی کو پہنچا تو چچاؤں میں آدمی کا حق ہم پر غالب آگیا۔ عروہ کہتے ہیں کہ اسی لیے مقتول کا قاتل اس کی دیت کا وارث نہیں ہوتا۔ امام مالک کہتے ہیں کہ جس نے قتل عمد کیا اس کو دیت میں سے کچھ نہیں ملے گا۔ اس مسئلہ میں ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔﴾

وضاحت :

دیت میں ماموں شریک نہیں ہوتے۔ جب مقتول کی دیت طے ہو گی تو ماموؤں کو اس میں سے کچھ نہیں ملا ہو گا اس لیے انہوں نے کہا کہ دیکھ بھال تو ہم کرتے رہے اور دیت دوسرے یعنی اسکے چچازاد بھائی لے گئے۔

جَامِعُ الْعَقْلِ

دیت کے بارے میں جامع باب

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَعِيدِ ابْنِ الْمُسَيَّبِ وَ أَبِي سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ جَرْحُ الْعَجْمَاءِ جُبَارٌ وَالْبِئْرُ جُبَارٌ وَالْمَعْدِنُ جُبَارٌ وَ فِي الرِّكَازِ الْخُمُسُ قَالَ مَالِكٌ وَ تَفْسِيرُ الْجُبَارِ أَنَّهُ لَا دِيَةَ فِيهِ وَ قَالَ مَالِكٌ الْقَائِدُ وَالسَّائِقُ وَالرَّاكِبُ كُلُّهُمْ ضَامِنُونَ لِمَا أَصَابَتِ الدَّابَّةُ إِلَّا أَنْ تَرْمَحَ الدَّابَّةُ مِنْ غَيْرِ أَنْ يُفْعَلَ بِهَا شَيْءٌ تَرْمَحُ لَهُ وَ قَدْ قَضَى عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فِي الَّذِي أَجْرَى فَرَسَهُ بِالْعَقْلِ قَالَ مَالِكٌ فَالْقَائِدُ وَالرَّاكِبُ وَالسَّائِقُ أَجْرَى أَنْ يَغْرَمُوا مِنَ الَّذِي أَجْرَى فَرَسَهُ۔

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جانوروں کا لگایا ہوا زخم ہدر ہے، کنویں میں گرنے کا نقصان ہدر ہے، کانوں میں پیش آنے والا حادثہ ہدر ہے اور کان سے نکلنے والی معدنیات کا پانچواں حصہ دیت المال کا ہوگا- مالک کہتے ہیں کہ ہدر کا مطلب یہ ہے کہ ان صورتوں میں دیت نہیں ہوگی- مالک کہتے ہیں کہ سواری کو چلانے والا، اس کو ہانکنے والا اور اس کا سوار سب کے سب اس نقصان کے ضامن ہوں گے جو ان کا جانور دوسرے کو پہنچائے گا، بجز اس صورت کے کہ جانور بدک جائے، بغیر کسی ایسے فعل کے جو بدکانے والا ہو- حضرت عمرؓ نے اس شخص سے دیت دلوائی جس نے اپنا گھوڑا دوڑا دیا تھا- امام مالک کہتے ہیں کہ جب گھوڑا دوڑانے والے کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا تو گاڑی چلانے والا اور سوار اور ڈرائیور تو بدرجہ اولیٰ نقصان کے ذمہ دار ہوں گے-﴾

وضاحت :

آنحضرت ﷺ کا فرمانا تو یہ ہے کہ جانور کا لگایا ہوا زخم ہدر ہے، یعنی اس کی ذمہ داری کسی پر نہیں ہوگی کہ دیت دلائی جائے لیکن امام مالک کا فتویٰ بظاہر اس کے خلاف ہے- وہ کہتے ہیں کہ جانور کی سواری کرنے والا نقصان کا ضامن ہوگا اور اس کے لیے جیاد وہ حضرت عمرؓ کے اثر کو بتاتے ہیں کہ انہوں نے اس شخص سے دیت دلوائی جس نے اپنا گھوڑا دوسرے پر دوڑا کر اس کو زخمی کر دیا تھا- ہاں اگر جانور از خود بدک کر کسی کو نقصان پہنچادے تو مالک پر دیت نہیں ہوگی جب تک کہ اس نے کوئی بدکانے والا کام نہ کیا ہو- میرے نزدیک نبی ﷺ کے فرمان کا مقصد یہ ہے کہ جب جانور اپنے مالک کے کنٹرول میں نہ ہو یا کنویں پر متنبہ کرنے والا کوئی نہ ہو یا کان کسی وقت بیٹھ جائے اور جانی نقصان ہو جائے تو ان صورتوں میں غیر حاضر مالکوں کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جائے گا- حضرت عمرؓ کا اثر اس صورت کے لیے ہے جب جانور پر کوئی شخص سوار ہو اور وہ اس پر قابو رکھتا ہو- آج کل مشینی سواری آگئی ہے جس کو ڈرائیور کنٹرول کر رہا ہوتا ہے- اس کو پکڑ لیا جانا ضروری ہے کہ ایسے ہی غیر ذمہ داری میں لوگوں کو روندتا نہ پھرے- کسی کی جان لینے سے بہتر ہے کہ گاڑی کو روک لے- اگر نہیں روکتا تو اس پر دیت کی ذمہ داری ہونی چاہیے- اس کی عاقلہ کا معاملہ البتہ غور طلب ہے-

مَاجَاءَ فِي الْغِيلَةِ وَالسِّحْرِ

دھوکے سے قتل کرنے اور جادو کرنے کے بارے میں

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَتَلَ نَفَرًا خَمْسَةً اَوْ سَبْعَةً بِرَجُلٍ وَاحِدٍ قَتَلُوهُ قَتْلَ غِيلَةٍ وَقَالَ عُمَرُ لَوْ تَمَالَاَ عَلَيْهِ اَهْلُ صَنْعَاءَ لَقَتَلْتُهُمْ جَمِيعًا-

﴿سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ایک پوری پارٹی کے آدمیوں کو جو پانچ یا سات تھے، ایک شخص کے بدلے میں قتل کر دیا، اس لیے کہ انہوں نے دھوکہ سے اس کو قتل کیا تھا- حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر اس قتل میں صنعا کی پوری آبادی نے سازش کی ہوتی تو میں ان سب کو قتل کر دیتا-﴾

وضاحت :

دوسری روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قتل یمن کے شہر صنعاء میں ایک خاتون کے ایما پر ہوا تھا- اس میں کچھ لوگوں نے مقتول کو قتل کرنے کی سازش کی ہوگی، کسی نے دھوکہ سے مقتول کو کہیں بلایا ہوگا، کسی نے سواری مہیا کی ہوگی، کسی نے بہانے سے کچھ کھلایا پایا ہوگا اور دوسروں نے قتل میں مدد کی ہوگی- حضرت عمرؓ نے تمام لوگوں کو دھر لیا اور یہ بھی فرمایا کہ اگر صنعاء کے تمام شہری اس سازش میں شریک ہوتے تو میں سب کو قتل کرنے سے دریغ نہ کرتا- اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی قتل کی سازش میں جتنے لوگ شریک ہوں گے وہ سب مجرم ہیں- صرف وہی شخص قصاص میں قتل نہیں ہوگا جس نے براہ راست قتل کیا، گلا گھونٹا، تلوار چلائی یا عدوق رافی بسمہ سازش کرنے والا پورا طائفہ مجرم گردانا جائے گا- یہ بات قانون اور عقل کے مطابق ہے-

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ سَعْدِبْنِ زُرَارَةَ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ

حَفْصَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ قَتَلَتْ جَارِيَةً لَهَا سَحَرَتْهَا وَ قَدْ كَانَتْ دَبَّرَتْهَا فَأَمَرَتْ بِهَا فَقُتِلَتْ قَالَ مَالِكٌ السَّاحِرُ الَّذِي يَعْمَلُ السِّحْرَ وَلَمْ يَعْمَلْ ذٰلِكَ لَهُ غَيْرُهُ هُوَ مِثْلُ الَّذِي قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى فِي كِتَابِهِ: وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَالَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ. فَأَرٰى أَنْ يُقْتَلَ ذٰلِكَ إِذَا عَمِلَ ذٰلِكَ هُوَ نَفْسُهُ۔

﴿محمد بن عبدالرحمن بن سعد بن زرارہ کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ نبی ﷺ کی زوجہ حضرت حفصہؓ نے ایک لونڈی کو جس نے ان پر جادو کیا تھا، حالانکہ انہوں نے اس لونڈی کو مدبر کر رکھا تھا، قتل کر دیا۔ انہوں نے حکم دیا تو وہ قتل کر دی گئی۔

امام مالک کہتے ہیں کہ ساحر وہ ہے جو خود سحر کا عمل کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی دوسرا اس کے لیے یہ کام کرے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا کہ "ان کو یہ علم تھا کہ جس نے اس کو (جادو کو) اختیار کیا اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں"۔ امام مالک کہتے ہیں کہ میری رائے یہ ہے کہ جو کوئی خود یہ عمل کرے تو اس کو قتل کیا جائے گا۔﴾

وضاحت :

اس روایت میں ایک مشکل ہے۔ راوی صاحب یہ کہتے ہیں کہ حضرت حفصہؓ نے لونڈی کو قتل کر دیا ان کے حکم سے وہ قتل کر دی گئی۔ ظاہر ہے کہ حضرت حفصہؓ خود تو قتل نہیں کر سکتیں۔ انہوں نے قاضی یا حاکم کے آگے معاملہ پیش کیا ہوگا جس نے تحقیق کر کے قتل کا حکم دیا ہوگا۔ راوی صاحب نے واقعہ کو بیان کرنے میں معاملہ کی تفصیلات لپیٹ دی ہیں۔ میں نے بہت سی روایات دیکھی ہیں جن میں راوی حضرات اس طرح کی بے احتیاطی کر جاتے ہیں۔ ایسی روایات کو موقع کے لحاظ سے سمجھنا چاہیے۔

مدبر اس غلام یا لونڈی کو کہتے ہیں جس کو اس کا مالک یہ کہے کہ میرے مرنے کے بعد تم آزاد ہو گے۔ اس لونڈی نے سوچا ہوگا کہ معلوم نہیں مالکن کب تک زندہ رہے۔ اس نے حضرت حفصہؓ پر جادو کر دیا۔ معلوم یہ ہوتا

ہے کہ حضرت حفصہؓ کو اس جادو سے کچھ نقصان نہیں پہنچا لیکن اس کے باوجود معاملہ حاکم کے سپرد کر دیا جس نے اس لونڈی کو قتل کروا دیا۔ ظاہر ہے اس نے مجرد حضرت حفصہؓ کے کہنے پر تو قتل کا حکم نہیں دیا ہوگا۔ قانون کے مطابق تحقیق کی ہوگی۔ بہر حال یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجرد کسی پر جادو کرنا موجب قتل ہے۔

امام مالکؒ نے بقرہ کی آیت نمبر 102 نقل کر کے یہ استدلال کیا ہے کہ جو کوئی جادو کا عمل کرے وہ موجب قتل ہے۔ بہر حال یہ ان کی رائے یا ان کا فتویٰ ہے۔ آیت کے الفاظ میں یہ بات نہیں ہے۔

مَا يَجِبُ فِي الْعَمْدِ
قتل عمد کے بارے میں حکم

حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عُمَرَ بْنِ حُسَيْنٍ مَوْلٰى عَائِشَةَ بِنْتِ قُدَامَةَ أَنَّ عَبْدَالْمَلِكِ بْنَ مَرْوَانَ أَقَادَ وَلِيَّ رَجُلٍ مِنْ رَجُلٍ قَتَلَهُ بِعَصًا فَقَتَلَهُ وَلِيُّهُ بِعَصًا قَالَ مَالِكٌ وَالْأَمْرُ الْمُجْتَمَعُ عَلَيْهِ الَّذِي لَا اخْتِلَافَ فِيهِ عِنْدَنَا أَنَّ الرَّجُلَ إِذَا ضَرَبَ الرَّجُلَ بِعَصًا أَوْ رَمَاهُ بِحَجَرٍ أَوْ ضَرَبَهُ عَمْدًا فَمَاتَ مِنْ ذٰلِكَ فَإِنَّ ذٰلِكَ هُوَ الْعَمْدُ وَ فِيهِ الْقِصَاصُ قَالَ مَالِكٌ فَقَتْلُ الْعَمْدِ عِنْدَنَا أَنْ يَعْمِدَ الرَّجُلُ إِلَى الرَّجُلِ فَيَضْرِبَهُ حَتّٰى تَفِيضَ نَفْسُهُ وَ مِنَ الْعَمْدِ أَيْضًا أَنْ يَضْرِبَ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِي الثَّائِرَةِ تَكُونُ بَيْنَهُمَا ثُمَّ يَنْصَرِفُ عَنْهُ وَهُوَ حَيٌّ فَيَنْزٰى فِي ضَرْبِهِ فَيَمُوتُ فَتَكُونُ فِي ذٰلِكَ الْقَسَامَةُ قَالَ مَالِكٌ الْأَمْرُ عِنْدَنَا أَنَّهُ يُقْتَلُ فِي الْعَمْدِ الرِّجَالُ الْأَحْرَارُ بِالرَّجُلِ الْحُرِّ الْوَاحِدِ وَالنِّسَاءُ بِالْمَرْأَةِ كَذٰلِكَ وَالْعَبِيدُ بِالْعَبِيدِ كَذٰلِكَ۔

﴿عمر بن حسین جو عائشہ بنت قدامہ کے آزاد کردہ غلام ہیں روایت کرتے ہیں کہ عبدالملک بن مروان نے ایک شخص کے ولی کو دوسرے شخص کے بدلے میں، جس کو اس نے لاٹھی سے قتل کر دیا تھا، قصاص دلوایا تو اس کے ولی نے اس شخص کو لاٹھی سے قتل کر دیا۔ امام مالک کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک

متفق بات یہ ہے، اور اس میں اہل مدینہ میں کوئی اختلاف نہیں، کہ اگر کوئی شخص دوسرے کو عمداً ڈنڈے سے مارے یا پتھر یا چوٹ لگائے اور وہ اس سے مر جائے تو وہ بھی قتل عمد ہی ہوگا اور اس میں قصاص ہوگا۔ امام مالک کا فتویٰ یہ بھی ہے کہ اگر ایک شخص دوسرے کو مارنے کا قصد کرے اور اتنا مارے کہ اس کی جان نکل جائے تو یہ بھی قتل عمد ہی ہوگا۔ قتل عمد کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ ایک شخص دوسرے کو کسی ہنگامے میں جو ان دونوں کے درمیان ہو گیا پیٹے، پھر وہ لوٹ جائے جبکہ دوسرا شخص ابھی زندہ ہو، پھر اس کا خون اس کی مار کی وجہ سے بہہ جائے اور اس معاملہ میں قسامہ ہو۔ امام مالک کا فتویٰ یہ بھی ہے کہ قتل عمد میں ایک آزاد آدمی کے بدلے میں کئی آزاد آدمی اور ایک عورت کے بدلے میں کئی عورتیں قتل کیے جا سکتے ہیں۔ غلاموں کے بارے میں بھی یہی قانون ہوگا۔

وضاحت :

ایک شخص دوسرے کو تلوار سے قتل کر دے یا لاٹھی کی ضرب سے مار دے یا اوپر سے نیچے گرا کر مار دے یہ سب قتل عمد ہی ہوگا۔ مالکیہ کا فتویٰ یہی ہے لیکن احناف کے نزدیک جب تک قتل کے لیے دھار دار آلہ استعمال نہ کیا جائے اس وقت تک اس کو قتل عمد نہیں کہتے۔ مثلاً دو فریقوں کی لڑائی میں اگر کسی نے لاٹھی ماری یا پتھر مار دیا تو وہ اس کو قتل عمد میں شامل نہیں کرتے۔ اس فتویٰ سے قصاص کی شکل بدل جاتی ہے۔ قتل عمد میں تو قصاص میں جان لی جاتی ہے اور اگر عمد نہ ہو تو اس میں دیت ہو سکتی ہے۔ نقطہ نظر کے اسی اختلاف کو اس روایت میں واضح کیا گیا ہے۔

میرے نزدیک احناف کا مسلک کمزور ہے کیونکہ قتل عمد میں اس بات کا تو لحاظ نہیں ہوتا کہ مارنے کا آلہ کیا ہے۔ جملہ واقعہ کا ہوتا ہے۔ پیچھے ایک روایت گزر چکی ہے کہ باپ نے تلوار پھینک ماری اور وہ بیٹے کی پنڈلی میں لگی۔ اس کا سارا خون بہہ گیا اور وہ مر گیا، لیکن اس میں دیت ہی ہوئی۔ حالانکہ مارنے کا آلہ دھار دار تھا۔ احناف کے فتویٰ کے لحاظ سے یہ قتل عمد کا معاملہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن باپ بیٹے کا معاملہ ہونے کی وجہ سے اس کو قتل عمد قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ میرے نزدیک جس شکل میں بھی موت واقع ہو جائے، خواہ وہ پتھر یا ڈنڈے سے ہو یا کسی اور چیز سے یہ قتل

عمد ہی ہوگا۔ اس زمانے میں تو جو ڈوکرانے میں گرانے سے بھی موت واقع ہو سکتی ہے اور بعض شکلیں ایسی بھی ہیں کہ پتہ بھی نہ چلے اور ایک شخص دوسرے کو مسل کر مار دے۔ پھر آج کل بندوق، پستول اور کلاشنکوف بھی اس معنی میں دھار دار تو نہیں جن سے قتل پر احناف قتل عمد کا اطلاق کر سکیں۔ تو واضح بات یہی ہے کہ جس طریقے سے بھی قتل ہو قتل عمد ہی ہوگا الا یہ کہ واقعات اس کے خلاف ہوں۔

اگر کسی جھگڑے میں مار پیٹ ہوئی، ہنگامی جوش اور دنگا فساد کی وجہ سے کوئی ایسا واقعہ ہو گیا کہ ایک شخص کو چوٹ لگی، وہ گھر واپس آیا تو خون بہہ گیا، طبی امداد نہ مل سکنے کے باعث مر گیا تو اس شکل میں کیا یہ قتل عمد ہوگا یا نہیں۔ امام مالک کہتے ہیں کہ اس میں قسامہ ہوگا۔ قسامہ یہ کہ اولیاء مقتول جن کو ملزم قرار دیں گے ان سے پچاس قسمیں لیں گے کہ یہ مقتول ان کی لاٹھی سے نہیں مرا اور اسی طرح اولیائے مقتول پچاس قسمیں کھائیں گے کہ مقتول ہمارے دو لوگوں کے ہاتھوں مرا۔ اگر ایک فریق قسم کھانے سے انکار کر دے تو فیصلہ قسم کھانے والے فریق کے حق میں ہوگا۔

قتل عمد میں ایک آزاد آدمی کے بدلے میں بیسیوں سے قتل ہو سکتے ہیں۔ پیچھے حضرت عمرؓ کا اثر گزر چکا جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ اگر پوری بستی کے لوگ قتل کی سازش میں شریک ہوتے تو میں سب کو قصاص میں قتل کروا دیتا۔ ایک شخص کا قتل ان تمام لوگوں کو شامل کر لیتا ہے جو اس واردات میں ملوث پائے جائیں۔ یہ عدالت کا کام ہے کہ دیکھے کہ تلوث کس نوعیت کا ہے۔ عورتوں اور غلاموں کے بارے میں بھی یہی ہوگا۔

اَلْقِصَاصُ فِی الْقَتْلِ

قتل کے قصاص کے بارے میں

❑ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ مَرْوَانَ ابْنَ الْحَكَمِ كَتَبَ اِلٰی مُعَاوِیَةَ بْنِ اَبِی سُفْیَانَ یَذْكُرُ اَنَّهٗ اُتِیَ بِسُكْرَانَ قَدْ قَتَلَ رَجُلًا فَكَتَبَ اِلَیْهِ مُعَاوِیَةُ اَنِ اقْتُلْهُ بِهٖ

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی ہے کہ مروان بن حکم نے معاویہ بن ابی سفیانؓ کو لکھا کہ میرے پاس ایک شرابی کو لایا گیا ہے جس نے ایک شخص کو قتل کر دیا ہے۔ تو معاویہؓ نے ان کو جواب دیا کہ شرابی کو قصاص میں قتل کر دیں۔﴾

وضاحت :

یہ امام مالکؒ کی بلاغات میں سے ہے، کوئی مرفوع روایت نہیں۔اس میں حضرت معاویہؓ کا وہ فیصلہ بیان ہوا ہے جو انہوں نے اپنے ایک عامل مروان بن حکم کے استفسار پر صادر کیا۔

کتاب القسامہ

قسامہ

قسامہ کا مطلب قسما قسمی ہے۔ جب ایک علاقے میں قتل ہو جائے اور قاتل کا پتہ نہ چل رہا ہو تو ظاہر ہے کہ قسما قسمی کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔ علاقے کے لوگوں سے قسم لی جائے گی اور اس کے مطابق فیصلہ ہو گا۔ اس کی کیا شکلیں ہیں، یہ آگے آ رہا ہے۔

تَبْدِئَةُ أَهْلِ الدَّمِ فِي الْقَسَامَةِ

قسامہ کا آغاز مدعیوں سے کیا جائے گا

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ أَبِي لَيْلَى بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ سَهْلٍ عَنْ سَهْلِ بْنِ أَبِي حَثْمَةَ أَنَّهُ أَخْبَرَهُ رِجَالٌ مِنْ كُبَرَاءِ قَوْمِهِ أَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ سَهْلٍ وَ مُحَيِّصَةَ خَرَجَا إِلَى خَيْبَرَ مِنْ جَهْدٍ أَصَابَهُمْ فَأُتِيَ مُحَيِّصَةُ فَأُخْبِرَ أَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ سَهْلٍ قَدْ قُتِلَ وَطُرِحَ فِي فَقِيرٍ بِئْرٍ أَوْ عَيْنٍ فَأَتَى يَهُودَ فَقَالَ أَنْتُمْ وَاللّٰهِ قَتَلْتُمُوهُ فَقَالُوا وَاللّٰهِ مَا قَتَلْنَاهُ فَأَقْبَلَ حَتّٰى قَدِمَ عَلَى قَوْمِهِ فَذَكَرَ لَهُمْ ذٰلِكَ ثُمَّ أَقْبَلَ هُوَ وَ أَخُوهُ حُوَيِّصَةُ وَهُوَ أَكْبَرُ مِنْهُ وَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ فَذَهَبَ مُحَيِّصَةُ لِيَتَكَلَّمَ وَهُوَ الَّذِي كَانَ بِخَيْبَرَ فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ كَبِّرْ كَبِّرْ يُرِيدُ السِّنَّ فَتَكَلَّمَ حُوَيِّصَةُ ثُمَّ تَكَلَّمَ مُحَيِّصَةُ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِمَّا أَنْ يَدُوا صَاحِبَكُمْ وَ إِمَّا أَنْ يَأْذَنُوا بِحَرْبٍ فَكَتَبَ إِلَيْهِمْ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِي ذٰلِكَ فَكَتَبُوا إِنَّا وَاللّٰهِ مَا قَتَلْنَاهُ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لِحُوَيِّصَةَ وَ مُحَيِّصَةَ وَ عَبْدِالرَّحْمٰنِ أَتَحْلِفُونَ وَتَسْتَحِقُّونَ دَمَ صَاحِبِكُمْ فَقَالُوا لَا قَالَ أَفَتَحْلِفُ لَكُمْ يَهُودُ قَالُوا لَيْسُوا بِمُسْلِمِينَ فَوَدَاهُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مِنْ عِنْدِهِ فَبَعَثَ إِلَيْهِمْ بِمِائَةِ نَاقَةٍ حَتّٰى أُدْخِلَتْ عَلَيْهِمُ الدَّارَ قَالَ سَهْلٌ لَقَدْ رَكَضَتْنِي مِنْهَا نَاقَةٌ حَمْرَاءُ۔

﴿سہل بن ابی حثمہ سے روایت ہے کہ ان کو ان کی قوم کے بعض بڑوں نے خبر دی کہ عبداللہ بن سہل

اور محیصہ اپنی کسی مشکل کی وجہ سے، جس میں مبتلا ہو گئے تھے، خیبر گئے- محیصہ کے پاس کسی نے آکر خبر دی کہ عبداللہ بن سہل قتل کر دیئے گئے ہیں اور ان کو ایک کنوئیں کی تہ میں یا ایک چشمے کے اندر ڈال دیا گیا ہے- وہ یہود کے پاس آئے اور کہا کہ خدا کی قسم، تم لوگوں نے اس کو قتل کیا ہے- انہوں نے کہا خدا کی قسم، ہم نے اس کو قتل نہیں کیا- محیصہ اپنی قوم کے پاس آئے اور ان سے اس کا ذکر کیا- پھر وہ، ان کے بھائی حویصہ جو ان سے عمر میں بڑے تھے اور عبدالرحمٰن مل کر گئے- محیصہ بات کرنے لگے اور وہی خیبر میں بھی تھے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بڑے کو موقع دو، بڑے کو موقع دو- تو حویصہ نے بات شروع کی- پھر محیصہ نے بات کی- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اب دو ہی شکلیں ہیں- یا تو وہ تمہارے ساتھی کی دیت دیں یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جائیں- یہ بات یہود کی طرف رسول اللہ ﷺ نے لکھی تو انہوں نے جواب دیا کہ خدا کی قسم، ہم نے ان کو قتل نہیں کیا- تب آپ نے محیصہ، حویصہ اور عبدالرحمٰن سے فرمایا کہ آپ لوگ قسم کھانے کو تیار ہو تا کہ اپنے بھائی کے خون کے مستحق بن سکو- انہوں نے کہا کہ ہم قسم نہیں کھا سکتے- آپ نے فرمایا کہ اگر یہود قسم کھائیں تب- تو انہوں نے کہا کہ وہ تو مسلمان نہیں- تب رسول اللہ ﷺ نے اپنے پاس سے دیت دے دی اور ان کے پاس سو اونٹ بھیج یہاں تک کہ وہ ان کے گھر میں داخل کر دیے گئے- سہل نے کہا کہ ان میں سے ایک سرخ اونٹنی نے ان کے پاؤں کو دبا دیا تھا-﴾

□ قَالَ يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ بُشَيْرِ بْنِ يَسَارٍ اَنَّهُ اَخْبَرَهُ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ ابْنَ سَهْلٍ الْاَنْصَارِيَّ وَ مُحَيِّصَةَ بْنَ مَسْعُودٍ خَرَجَا اِلٰى خَيْبَرَ فَتَفَرَّقَا فِي جَوَائِحِهَا فَقُتِلَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ سَهْلٍ فَقَدِمَ مُحَيِّصَةُ فَاَتٰى هُوَ وَ اَخُوْهُ حُوَيِّصَةُ وَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ ابْنُ سَهْلٍ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَذَهَبَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ لِيَتَكَلَّمَ لِمَكَانِهِ مِنْ اَخِيهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كَبِّرْ كَبِّرْ فَتَكَلَّمَ حُوَيِّصَةُ وَ مُحَيِّصَةُ فَذَكَرَا شَاْنَ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَهْلٍ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَتَحْلِفُوْنَ خَمْسِيْنَ يَمِيْنًا وَ تَسْتَحِقُّوْنَ دَمَ صَاحِبِكُمْ اَوْ قَاتِلَكُمْ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَمْ نَشْهَدْ وَلَمْ نَحْضُرْ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَتُبَرِّئُكُمْ يَهُوْدُ بِخَمْسِيْنَ يَمِيْنًا فَقَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ

كَيْفَ نَقْبَلُ اَيْمَانَ قَوْمٍ كُفَّارٍ فَقَالَ يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ فَزَعَمَ بُشَيْرُ بْنُ يَسَارٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَدَاهُ مِنْ عِنْدِهِ-

﴿بشیر بن یسار سے روایت ہے کہ عبداللہ بن سہل انصاری اور محیصہ بن مسعود خیبر کو گئے اور دونوں الگ ہو کر اپنے اپنے کاموں میں نکل گئے- عبداللہ بن سہل قتل کر دیے گئے تو محیصہ آئے- وہ، ان کا بھائی حویصہ اور عبدالرحمٰن بن سہل نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے- عبدالرحمٰن نے چاہا کہ اپنے بھائی کے تعلق سے وہ خود بات کریں لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بڑے کو موقع دو، بڑے کو موقع دو- اس پر حویصہ اور محیصہ نے بات کی اور عبداللہ بن سہل کا معاملہ پیش کیا- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم پچاس قسمیں کھاتے ہو تا کہ اپنے بھائی کے خون کی دیت لو یا اپنے قاتل کو لو- انہوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! ہم نے دیکھا نہیں، ہم موجود نہیں تھے- رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا تو پھر یہود پچاس قسمیں کھا کر تم کو سبکدوش کر دیں گے- انہوں نے کہا کہ کافر لوگوں کی قسم کا ہم کیا اعتبار کریں- یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ بشیر بن یسار کا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے پاس سے ان کو دیت دی-﴾

وضاحت :

قسامہ میں یہ ہوتا ہے کہ پہلے مدعیوں سے قسم لی جائے گی حالانکہ عام طریقہ یہ ہے کہ البینة للمدعی والیمین لمن انکر یعنی مدعی کے اوپر ثبوت فراہم کرنے کی ذمہ داری ہو گی اور مدعا علیہ قسم کھا سکتا ہے- لیکن قسامہ میں الٹا معاملہ ہے- اس میں یہ چیز ہے کہ اگر مدعی قسم کھا کے کہیں کہ فلاں لوگوں نے قتل کیا ہے تب مقدمہ آگے چلتا ہے-

عبداللہ بن سہل کے قتل میں مدعیوں نے قسم کھانے سے انکار کیا کیونکہ وہ موقع پر موجود تو تھے نہیں کہ قسم کھائیں- انہوں نے یہود پر صرف شک کا اظہار کیا تھا- شک کے اوپر قسم نہیں کھائی جا سکتی- قسم تو قطعی بات پر کھائی جا سکتی ہے- اس پر آنحضرتؐ نے یہود کے متعلق کہا کہ اگر وہ قسم کھا لیں تو قضیہ کا فیصلہ ہو جاتا ہے- لیکن مدعیوں نے اس کو نہیں مانا اور کہا کہ ہم کافروں کی قسم کیسے باور کریں- نتیجہ یہ ہوا کہ مقدمہ عدالت سے خارج ہو گیا اور قتل کی دیت سرکاری خزانے سے دلوا دی گئی-

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مدعی کے قسم کھا لینے سے بھی مقدمہ بن سکتا ہے- اس روایت

میں اس کا جواب اثبات میں ملتا ہے۔ مالکیہ کا مذہب تو یہی ہے جو ان روایات میں بیان ہوا۔ شوافع کے ہاں قدیم رائے یہی تھی لیکن پھر بدل گئی۔ ان کے ہاں قدیم اور جدید کا جھگڑا ہے۔ احناف کے متعلق زرقانی اور شاہ ولی اللہ نے کچھ نہیں لکھا۔ البتہ قاضی ابو یوسفؒ نے کتاب الآثار میں حضرت عمرؓ کا اثر نقل کیا ہے کہ ان کو یمن کے گورنر نے لکھا کہ یہاں ایک قتل ہو گیا ہے لیکن قاتل کا پتہ نہیں چل رہا تو اس صورت میں کیا کیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ مقتول کی جگہ سے سب سے قریب جو آبادی ہے اس آبادی کے پچاس آدمیوں سے قسم لو۔ وہ برأت کا کہیں تب بھی قسم کھائیں اور اگر اعتراف کریں تب بھی قسم کھائیں۔ اور اگر قسم نہ کھائیں تو پھر کسی پر الزام نہیں البتہ دیت کی ادائیگی کے وہ ضامن ہوں گے۔ یہ اس لیے کہ ان کے علاقے میں قتل ہوا ہے۔ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ منقطع ہے۔

قسم کے متعلق یہ بات ہے کہ وہ صرف ذمے دار لوگوں سے ہی لی جائے گی اور ایک آدمی ایک قسم کھائے گا۔ اگر قریب کی آبادی میں پچاس سے کم آدمی ہوں تو جتنے ہوں ان کی قسم ہی کافی ہو گی۔

حضرت عمرؓ کا مسلک تورات کے موافق ہے اور اس کے متعلق شارحین لکھتے ہیں کہ یہی طریقہ جاہلیت میں رائج تھا۔ اسی پر آنحضرتؐ نے عمل کیا۔ اگر آنحضرتؐ نے جاہلیت کے کسی قانون پر عمل کیا تو وہ اسلام کا حصہ ہو گیا۔ آنحضرتؐ کا یہ معمول رہا کہ جس معاملے میں اسلام کا قانون نہیں آتا تھا تو اس میں آپؐ اہل کتاب کی پیروی کرتے۔ اہل کتاب کے ہاں یہ ہوتا تھا کہ قریب کی آبادی کے سرغنوں کو بلا کر ان سے قسم لی جاتی تھی اور یہ بات بھی تھی کہ قربانی کر کے اس کا خون مقتول پر چھڑک کر قسم لیتے تھے تاکہ قسم کو زیادہ مقدس کیا جائے لیکن قسم کا طریقہ یہی تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ طریقہ آنحضرتؐ کے زمانے میں رائج ہو چکا تھا تو حضرت عمرؓ نے اس کو کیوں اختیار نہ کیا۔ یہ اختلاف کوئی معمولی بات نہیں۔ میرے نزدیک انہوں نے اس کو اس لیے نہیں مانا کہ روایت میں بیان کردہ واقعہ میں آنحضرتؐ نے پچ کے آدمی کے طور پر معاملہ رفع کر دیا اور مدعیان کو دیت اھال سے دیت دلا دی۔ اس کو اسلامی قانون کا حصہ نہیں بنایا۔ حضرت عمرؓ نے یمن کی واردات میں خلیفہ راشد کی حیثیت سے تورات کا طریقہ جاری کیا۔ حضرت عمرؓ کے اس اثر پر احناف کا مسلک یہ ہے کہ قریب کی آبادی والوں سے مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ قسم کھائیں کہ وہ نہیں جانتے یا جانتے ہیں۔ اگر وہ قسم کھالیں تو قتل سے بری ہو جائیں گے لیکن دیت دینی پڑے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس علاقے میں قتل کا واقعہ ہو اس کی ذمہ داری علاقے کے لوگوں پر ہوتی ہے تاکہ ان میں یہ احساس ہو کہ اگر ایسا واقعہ ان کے علاقے میں ہوا تو سب اس کو بھگتیں گے۔ یہ ذمہ داری اس لیے بھی ضروری ہے کہ قتل اور ڈکیتی جیسے جرائم کا سدباب ہو سکے۔ احناف کا مذہب زیادہ معقول ہے۔

کتاب الجامع

الدُّعَا لِلْمَدِيْنَةِ وَ اَهْلِهَا

مدینہ اور اس کے لوگوں کے لیے دعا

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ ابْنُ اَنَسٍ عَنْ اِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِي طَلْحَةَ الْاَنْصَارِي عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَهُمْ فِي مِكْيَالِهِمْ وَبَارِكْ لَهُمْ فِي صَاعِهِمْ وَمُدِّهِمْ يَعْنِي اَهْلَ الْمَدِيْنَةِ.

﴿انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ برکت ڈال ان کے پیمانوں میں، ان کے صاع میں اور ان کے مُد میں۔ آپ کا اشارہ اہل مدینہ کی طرف تھا۔﴾

وضاحت:

مکیال، صاع اور مد وزن کرنے کے پیمانے ہیں۔ ان میں برکت ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں میں برکت ڈال دے جو ان پیمانوں سے ناپی جاتی یا وزن کی جاتی ہیں۔ یہ بات دوسری زبانوں میں بھی ہے کہ ظرف بول کر مظروف کو مراد لیتے ہیں۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ اس زمین میں برکت ڈال تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس زمین کی پیداوار میں برکت دے۔ نبی ﷺ نے بھی یہاں ظرف بول کر مظروف مراد لیا ہے۔ آگے والی روایت سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ ایسی دعائیں تو ہم بھی کرتے ہیں، آنحضرت ﷺ تو تمام دنیا کے لیے رحمت و برکت تھے تو اس شہر کے لیے کیوں دعا نہ کرتے جو آپ کا دار الہجرت تھا۔

□ حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ سُهَيْلِ بْنِ اَبِي صَالِحٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّهُ قَالَ كَانَ النَّاسُ اِذَا رَاَوْا اَوَّلَ الثَّمَرِ جَاؤُا بِهٖ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَاِذَا اَخَذَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي ثَمَرِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِي مَدِيْنَتِنَا وَ بَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا وَ بَارِكْ لَنَا فِي مُدِّنَا اَللّٰهُمَّ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ عَبْدُكَ وَ خَلِيْلُكَ وَ نَبِيُّكَ وَ اِنِّي عَبْدُكَ وَ نَبِيُّكَ وَ اِنَّهُ دَعَاكَ لِمَكَّةَ وَ اِنِّي اَدْعُوْكَ لِلْمَدِيْنَةِ بِمِثْلِ مَا دَعَاكَ بِهٖ لِمَكَّةَ وَ مِثْلَهُ مَعَهُ ثُمَّ يَدْعُو اَصْغَرَ وَلِيْدٍ يَرَاهُ فَيُعْطِيْهِ ذٰلِكَ الثَّمَرَ.

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگوں کا حال یہ تھا کہ جب فصل کا پہلا پھل آتا تو

اس کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لے کر آتے۔ جب رسول اللہ ﷺ اس کو قبول کرتے تو دعا کرتے کہ اے رب ہمارے پھلوں میں برکت دے اور ہمارے شہر میں برکت دے اور ہمارے صاع میں اور مد میں برکت دے۔ اور اے اللہ! ابراہیم تیرے بندے، تیرے دوست اور تیرے نبی تھے اور میں بھی تیرا بندہ اور تیرا نبی ہوں۔ انہوں نے مکہ کے لیے دعا کی اور میں بھی ایسی ہی دعا مدینہ کے لیے کرتا ہوں جیسی انہوں نے مکہ کے لیے کی، اور اسی کی مانند اور بھی۔ یہ دعا کرنے کے بعد آپ وہ پھل سب سے چھوٹے بچے کو، جو سامنے ہوتا دے دیتے۔﴾

وضاحت :

موسم کا پہلا پھل بزرگوں کو پیش کرنا ہمیشہ سے روایت رہی ہے، البتہ اب ہم لوگ بخیل ہو گئے ہیں۔ پہلا پھل کسی بزرگ کے پاس لے جانا چاہیے اور ایسا کرنے کا نقصان نہیں ہوتا۔ دیکھئے آنحضرت ﷺ نے اس پر کتنی دعا فرمادی اور آنحضرت ﷺ کی دعا کوئی عام چیز تو نہیں، بڑی ہی برکت والی چیز ہے۔ اس دعا میں آنحضرت ﷺ نے حضرت ابراہیم کی دعا کا جو حوالہ دیا ہے وہ ان کی وہ دعا ہے جس کا حوالہ قرآن مجید میں ان الفاظ میں آتا ہے فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ.

مدینہ کے لیے یہ دعا کرنا آپ کا حق تھا۔ یہیں پر آپ نے ہجرت کی تھی۔ بیشتر صحابہ یہیں رہ رہے تھے اور سب کو رزق اسی مرکز سے مل رہا تھا۔

آنحضرت ﷺ نے حضرت ابراہیمؑ کے لیے خلیل اللہ کا لفظ استعمال کیا لیکن اپنے لیے نہیں کیا، اگرچہ آپ بھی خلیل اللہ تھے۔ ایسا آپ نے تواضع کی خاطر کیا۔ حضورؐ پہلا پھل چھوٹے بچے کو اس لیے دیتے کہ وہ معصوم ہے تو سب سے پہلے وہی اس کو چکھے۔

مَاجَاءَ فِي سُكْنَى الْمَدِينَةِ وَالْخُرُوْجِ مِنْهَا

مدینہ کی رہائش اور اس سے نکلنے کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ قَطَنِ بْنِ وَهْبٍ بْنِ عُمَيْرِ بْنِ الْأَجْدَعِ أَنَّ يُحَنِّسَ مَوْلَى

الزُّبَيْرِ بْنِ الْعَوَّامِ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ كَانَ جَالِسًا عِنْدَ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ فِي الْفِتْنَةِ فَأَتَتْهُ مَوْلَاةٌ لَهُ تُسَلِّمُ عَلَيْهِ فَقَالَتْ إِنِّي أَرَدْتُ الْخُرُوجَ يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اشْتَدَّ عَلَيْنَا الزَّمَانُ فَقَالَ لَهَا عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ اقْعُدِي لَكَعُ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ لَا يَصْبِرُ عَلَى لَأْوَائِهَا وَشِدَّتِهَا أَحَدٌ إِلَّا كُنْتُ لَهُ شَفِيعًا أَوْ شَهِيدًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

﴿قطن بن وھب سے روایت ہے کہ ان کو محنس نے، جو زبیر بن عوام کے آزاد کردہ غلام تھے، خبر دی کہ جب مدینہ کے فتنہ کے زمانہ میں وہ عبداللہ بن عمرؓ کے پاس بیٹھے تھے تو ان کی آزاد کردہ لونڈی سلام کرنے آئی اور اس نے کہا کہ اے ابو عبدالرحمٰن، میں نے یہاں سے نکل جانے کا ارادہ کیا ہے، ہمارے اوپر زمانہ بہت سخت ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ نے اس سے کہا کہ اے بھولی بھالی عورت! بیٹھی رہ۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے، آپ فرماتے تھے کہ اس شہر کی شدت پر اور اس کے مصائب پر جو صبر کرے گا تو میں اس کے لیے قیامت کے دن شفیع یا شہید ہوں گا۔﴾

وضاحت :

فتنہ سے مراد غالباً وہ دور ہے جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے زمانے میں مکہ اور مدینہ میں خوراک وغیرہ کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

لونڈی کے الفاظ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا گزارہ مشکل ہو گیا ہوگا۔ شاید آزاد کردہ لونڈی ہونے کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ لکع یا کاع سے مراد بے وقوف بد صورت بھولی بھالی ہے۔

شفیعا اور شہیدا سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راوی کو شک ہے کہ آنحضرتؐ نے ان میں سے کون سا لفظ استعمال کیا لیکن محدثین حضرات کہتے ہیں کہ اس روایت کی سندیت مضبوط ہے، اس لیے شک کی گنجائش نہیں، لہٰذا دونوں الفاظ کو سامنے رکھ کر ان کی توجیہ کرنی پڑے گی۔

قرآن مجید میں جس شفاعت اور شہادت کا ذکر ہے یہ اسی کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں سورہ مائدہ 109 میں ہے يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَا أُجِبْتُمْ قَالُوا لَا عِلْمَ لَنَا إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ. (جس دن اللہ رسولوں کو جمع کرے گا اور ان سے پوچھے گا کہ آپ کو کیا جواب دیا گیا تو وہ کہیں گے ہم کو کیا علم۔ تو غیب

کا جانے والا ہے)۔

اس گواہی میں انبیاء علیہم السلام اپنی زندگی کے دوران اپنی تعلیمات اور لوگوں کے رویہ کی شہادت دیں گے جب کہ بعد والوں کے بارے میں وہ صاف کہہ دیں گے کہ بعد میں انہوں نے کیا کیا، ہمیں اس کی خبر نہیں۔ اسی موقع پر انبیاء کی شفاعت کی نوعیت بھی بیان کر دی گئی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالہ سے بیان ہوا ہے کہ وہ اپنی امت کی شفاعت ان الفاظ میں کریں گے: اے اللہ! اگر آپ ان کو عذاب دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر ان کو بخش دیں تو آپ عزیز و حکیم ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ معاملہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ خدا کے سپرد کر دیں گے۔ ایسی ہی شفاعت نبی ﷺ اپنی امت کے لیے کریں گے۔

میرے نزدیک آنحضرتؐ کے شفیع اور شہید ہونے کی توجیہ یہ ہوگی کہ اہل مدینہ میں سے جن لوگوں کی بڑی بڑی خدمات رہی ہوں گی، جنہوں نے سرفروشی سے ساتھ دیا ہوگا ان کے لیے حضور شفاعت اور شہادت دیں گے، مثلاً احد کے شہداء کے متعلق آپ نے فرمایا کہ میں ان کے حق میں قیامت میں شہادت دوں گا۔

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ اَنَّ اَعْرَابِيًا بَايَعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى الْاِسْلَامِ فَاَصَابَ الْاَعْرَابِيَّ وَعْكٌ بِالْمَدِيْنَةِ فَاَتَى رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَقِلْنِي بَيْعَتِيْ فَاَبَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثُمَّ جَاءَهُ فَقَالَ اَقِلْنِي بَيْعَتِي فَاَبَى ثُمَّ جَاءَهُ فَقَالَ اَقِلْنِي بَيْعَتِيْ فَاَبَى فَخَرَجَ الْاَعْرَابِيُّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّمَا الْمَدِيْنَةُ كَالْكِيْرِ تَنْفِي خَبَثَهَا وَ يَنْصَعُ طِيْبُهَا.

﴿جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ایک بدو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا اور اس نے اسلام پر آپ سے بیعت کی۔ بدو کو مدینے میں وبائی بخار نے پکڑ لیا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میری بیعت فسخ کر دیجئے۔ آپ نے انکار کر دیا۔ پھر آیا اور بیعت فسخ کرنے کو کہا۔ آپ نے پھر انکار کر دیا۔ پھر آیا اور درخواست کی کہ میری بیعت فسخ کر دیجئے۔ رسول اللہ ﷺ نے پھر انکار کر دیا۔ پھر وہ خود ہی مدینے سے چلا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مدینے کی مثال بھٹی کی ہے جو کھوٹ کو دور کر دیتی اور خالص کو باقی رکھتی ہے۔﴾

وضاحت:

اس بدو نے بیعت صرف اسلام پر کی تھی۔ مدینے میں جب اس کو بخار آگیا تو وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ جناب میری بیعت فسخ کر دیں۔ بیعت فسخ کرنے سے جو اس کا مطلب تھا وہ حضور ﷺ نے سمجھ لیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اسلام سے دستبردار ہوا بلکہ وہ مدینہ سے جانا چاہتا تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ بیعت کا مطلب یہ ہے کہ وہ لازماً مدینہ میں ہی رہے۔ چونکہ اس کی ہجرت ہو گئی تھی، اس کے بعد اس کے لیے مدینہ کو چھوڑنا ٹھیک نہیں تھا۔ مہاجرین کسی اشد ضرورت کے تحت تو مدینہ سے نکل سکتے تھے لیکن بغیر ضرورت کے نہیں جا سکتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد لوگوں کو آزادی تھی کہ چھوڑنا چاہیں تو مدینہ چھوڑ دیں۔ اس سے قبل ہجرت کرنے کے بعد ضروری تھا کہ لوگ آنحضرتؐ کے ساتھ مدینے میں رہیں، برکت حاصل کریں اور جہاد میں اور دوسری مہمات میں شریک ہوں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ مہاجرین کے حق میں دعا کیا کرتے کہ اے اللہ تو میرے صحابہ کی ہجرت کو مکمل کر۔ عملاً ہجرت کے بعد اگر کوئی واپس لوٹ جاتا تو اس کو رجعت ہی سمجھا جاتا تھا۔ بدو کے چلے جانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مدینہ ایسی بھٹی ہے کہ اگر اس کے اندر لوہا ڈالا جائے تو لوہے کا سارا کھوٹ دور کر دیتی ہے۔ صرف خالص بچ رہتا ہے۔ اس زمانے میں مدینے کا قیام بہت پر آزمائش تھا۔ تمام لوگ ہجرت کر کے آرہے تھے جب کہ ذرائع و وسائل محدود تھے۔ فتوحات کا ابھی آغاز نہیں ہوا تھا۔ دشمنوں کی نظر بھی مدینے پر تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر مسلمان یہاں جمع ہو کر اپنی جڑیں جمانے میں کامیاب ہو گئے تو بہت خطرہ ہے۔ پھر یہ بھی تھا کہ نئے آنے والوں کو مدینہ کی آب و ہوا بھی راس نہیں آتی تھی۔ اکثر وبائی امراض کا شکار ہو جاتے۔ اس لیے آپ نے مدینہ کو بھٹی سے تشبیہ دی اور فرمایا کہ اس میں وہی رہیں گے جو خالص ہیں۔ آگے اور روایات بھی آئیں گی کہ جن لوگوں نے مدینے سے جانے کی اجازت چاہی ان کو روکا گیا تاکہ ہجرت کا اصل منشاء پورا ہو اور یہ بات بھی مدنظر تھی کہ اس کسوٹی پر وہ لوگ پرکھ لیے جائیں جو خالص ہیں۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ اَنَّهُ قَالَ سَمِعْتُ اَبَا الْحُبَابِ سَعِيْدَ بْنَ يَسَارٍ يَقُوْلُ سَمِعْتُ اَبَا هُرَيْرَةَ يَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اُمِرْتُ بِقَرْيَةٍ تَاْكُلُ الْقُرٰى يَقُوْلُوْنَ يَثْرِبُ وَ هِيَ الْمَدِيْنَةُ تَنْفِي النَّاسَ كَمَا يَنْفِي الْكِيْرُ خَبَثَ الْحَدِيْدِ.

﴿حضرت ابوہریرہؓ فرماتے تھے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ مجھے ایسے قریہ کی طرف

ہجرت کا حکم ہوا جو تمام دوسرے قریوں کو ہڑپ کر جائے گا۔ لوگ اس کو یثرب کہتے ہیں لیکن ہے وہ مدینہ، جو لوگوں کے کھوٹ کو اس طرح دور کر دے گا جس طرح بھٹی لوہے سے کھوٹ کو دور کر دیتی ہے۔﴾

وضاحت :

ہجرت کا دور، جیسا کہ اوپر والی روایت میں ہے، امتحان کا دور تھا۔ اس دور میں مدینہ کو قریوں یعنی آبادیوں کو ہڑپ کرنے والا کہا گیا ہے کیونکہ جب وہ ہجرت کا مرکز بن گیا تو لوگ کھنچ کھنچ کر اس کی طرف آنے لگے۔ پھر جب فتوحات کا آغاز ہوا تو مسلمانوں نے ملکوں کو فتح کر لیا۔ مدینہ کے دارالسلطنت بننے پر اس کے اندر یہ کشش پیدا ہو گئی۔ جب کوئی شہر دارالحکومت بن جائے تو لوگ وہاں جمع ہو جاتے ہیں۔ قریوں کو ہڑپ کرنے میں یہ مفہوم بھی مدنظر ہے۔ دور جاہلیت میں مدینہ کا نام یثرب تھا۔ اس کا مطلب الزام ہے۔ آنحضرتؐ نے اس کو مدینہ سے موسوم کر دیا۔ جن ناموں میں معنی و مفہوم کی خرابی کی کوئی جھلک ہوتی تھی، حضورؐ ان کو بدل کر ایسے نئے نام رکھ دیا کرتے تھے جن میں قباحت کا پہلو نہ ہوتا۔ یثرب کا نام بھی اسی لیے بدلا گیا۔

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا يَخْرُجُ اَحَدٌ مِنَ الْمَدِيْنَةِ رَغْبَةً عَنْهَا اِلَّا اَبْدَلَهَا اللّٰهُ خَيْرًا مِنْهُ.

﴿ہشام بن عروہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مدینہ سے بے زار ہو کر اسے کوئی نہیں چھوڑے گا مگر یہ کہ اللہ اس شہر کو اس سے بہتر باسی دے دے گا۔﴾

وضاحت :

مدینہ ایسی بابرکت جگہ ہے کہ اگر کوئی شخص بغیر کسی اہم سبب کے اس کو چھوڑے تو یہ اس کی نالائقی ہے۔ ایسی بابرکت جگہ کے لیے تو لوگ ٹوٹ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول اللہ کا دارالہجرت بننے کے بعد مدینہ ایک ایسا مرکز تھا کہ جو تمام مسلمانوں کا بلاوا تھا۔ وہاں ایک ایک شخص کی موجودگی بے حد اہم تھی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ کسی کے یہاں سے چلے جانے سے مدینہ کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ مدینہ کو اس سے بہتر لوگ مل جائیں گے۔ یہ سنت الٰہی ہے کہ بہتر آدمی کا ساتھ جو لوگ چھوڑتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس آدمی کو ان کا نعم البدل بھی

دے فرما دیتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف حضورؐ نے توجہ دلائی۔

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ سُفْيَانَ بْنِ اَبِي زُهَيْرٍ اَنَّهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ يُفْتَحُ الْيَمَنُ فَيَاْتِي قَوْمٌ يَبِسُّوْنَ فَيَتَحَمَّلُوْنَ بِاَهْلِيْهِمْ وَ مَنْ اَطَاعَهُمْ وَالْمَدِيْنَةُ خَيْرٌ لَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُوْنَ وَ يُفْتَحُ الشَّامُ فَيَاْتِي قَوْمٌ يَبِسُّوْنَ فَيَتَحَمَّلُوْنَ بِاَهْلِيْهِمْ وَ مَنْ اَطَاعَهُمْ وَالْمَدِيْنَةُ خَيْرٌ لَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُوْنَ وَ يُفْتَحُ الْعِرَاقُ فَيَاْتِي قَوْمٌ يَبِسُّوْنَ فَيَتَحَمَّلُوْنَ بِاَهْلِيْهِمْ وَمَنْ اَطَاعَهُمْ وَالْمَدِيْنَةُ خَيْرٌ لَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُوْنَ.

﴿سفیان بن ابی زہیر سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپؐ فرماتے تھے کہ یمن فتح ہوگا اور کچھ لوگ آئیں گے اپنے اونٹوں کو ہنکاتے ہوئے اور لاد کر لے جائیں گے ان پر اپنے اہل و عیال کو اور ان کو، جو ان کا ساتھ دیں گے، حالانکہ مدینہ ان کے لیے بہتر جگہ ہے اگر وہ جانتے۔ شام فتح ہوگا اور لوگ اپنی سواریوں کو لیے ہوئے آئیں گے اور اپنے اہل و عیال کو اور ان کو، جو ان کے ماننے والے ہوں گے، ان پر لاد کر چل دیں گے حالانکہ مدینہ ان کے لیے بہتر ہوگا اگر وہ اس کی قدر و قیمت جانیں۔ عراق فتح ہوگا اور لوگ اپنی سواریوں پر اپنے اہل و عیال کو اور ان لوگوں کو، جو ان کے ماننے والے ہوں گے، لاد کر چل دیں گے حالانکہ مدینہ ان کے لیے بہتر ہے اگر وہ جانیں۔﴾

وضاحت :

یہ مدینہ منورہ کی فضیلت ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا دارالہجرت بنا اور مسلمانوں کو اس شہر کی طرف ہجرت کا حکم ہوا۔ چنانچہ ہر طرف سے مسلمان کھنچے ہوئے اس کی طرف آئے اور اس شہر نے سب کو جمع کر لیا۔ لیکن جب فتوحات کا دور آیا تو فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والوں پر مدینہ کی طرف ہجرت کی پابندی ختم ہو گئی۔ لہٰذا اب ان کے لیے ممکن ہو گیا کہ اگر وہ چاہیں تو یمن، شام اور عراق کے بہت زرخیز اور سرسبز علاقوں میں جا بسیں۔ اسی بارے میں آنحضرتؐ نے پیشگوئی فرمائی کہ یمن فتح ہوگا تو قافلوں میں سے کچھ لوگ وہاں کی آب و ہوا اور زرخیزی کو دیکھ کر

کہیں گے کہ وہاں چلو۔ اپنے اونٹ لائیں گے اور ان لوگوں کو جو ان کی بات مانیں گے ساتھ لے کر چل دیں گے حالانکہ بہتر یہ ہے کہ وہ مدینہ ہی میں رہیں کیونکہ مدینہ اپنی خیر و برکت کی وجہ سے بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ دنیوی وسائل و ذرائع کی فکر میں اس کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔ شام اور عراق فتح ہوں گے تو کچھ لوگ اسی طرح اپنی سواریوں پر اپنے اہل و عیال اور اپنے ہم خیال لوگوں کو لاد کر وہاں چلے جائیں گے، حالانکہ مدینہ ان کے لیے بہتر ہوگا۔ یہ گویا حضورؐ نے پیشگوئی فرمائی کہ مدینہ کو ایک دفعہ تو اتنی رونق ملے گی کہ تمام شہروں کو جمع کرلے گا اور مرکز کی حیثیت اختیار کرلے گا لیکن فتوحات کے بعد اس کا زوال شروع ہوگا کیونکہ اس کی آبادی تقسیم ہونا شروع ہو جائے گی۔ اس کے باوجود یہی شہر بہترین شہر ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شہر علم دین کا اور صحابہ کرام کا مرکز اور تمام خیر و برکت کا منبع ہوگا۔ آنحضرت کی یہ پیشگوئی پوری ہوئی اور عراق، شام اور مصر فتح ہوئے تو دارالحکومت تک بھی پہلے کوفہ اور پھر دمشق کو منتقل ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ دارالحکومت بہت سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیا کرتا ہے۔ اس لیے مدینہ منورہ سے آبادی کا ایک کافی تعداد میں ہوا۔

□ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ حِمَامٍ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَتُتْرَكَنَّ الْمَدِیْنَةُ عَلٰی اَحْسَنِ مَا كَانَتْ حَتّٰی یَدْخُلَ الْكَلْبُ اَوِ الذِّئْبُ فَیَعْدُوْ عَلٰی بَعْضِ سَوَارِی الْمَسْجِدِ اَوْ عَلَی الْمِنْبَرِ فَقَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَلِمَنْ تَكُوْنُ الثِّمَارُ ذٰلِكَ الزَّمَانَ قَالَ لِلْعَوَافِی الطَّیْرِ وَالسِّبَاعِ.

﴿حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مدینہ کو چھوڑا جائے گا جبکہ اس کے شباب کا دور ہوگا۔ پھر یہ حالت ہو جائے گی کہ کتے یا بھیڑیے اس میں داخل ہو کر مسجد کے بعض ستونوں پر یا منبر پر پیشاب کریں گے۔ لوگوں نے پوچھا کہ اس زمانے میں مدینے کے پھل کون کھائے گا تو آپؐ نے فرمایا کہ آوارہ پرندے اور درندے۔﴾

وضاحت :

اس روایت کے متعلق اختلاف ہے کہ یہ پیشگوئی ہے جو قیامت کے قریب ظاہر ہوگی یا یہ ایک واقعہ ہے جو قریب ہی میں گزر چکا۔ اوپر والی روایت میں تو یہ ہے کہ جب فتوحات کا دور ہوگا اس وقت مدینہ کی جمعیت میں

انتشار پیدا ہوگا اور لوگ وہاں سے چلے جائیں گے۔ فی الواقع سب سے زیادہ انتشار اس وقت ہوا جب دارالحکومت کوفہ اور پھر دمشق کو منتقل ہو گیا۔ تمام کشش وہاں پیدا ہو گئی۔ جتنے لوگ جا سکتے تھے وہاں چلے گئے۔ نیز بہت سے لوگوں کو حاکموں نے بلا لیا۔ لہٰذا مرکزیت رکھنے والے تمام لوگ وہاں سے چلے گئے۔ مدینہ میں صرف امام مالکؒ کی قد آور شخصیت رہ گئی۔ ان کے اندر مدینہ کی خاصی عصبیت موجود ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ روایت میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ مستقبل قریب میں پیش آنے والی صورت حال کا تذکرہ اس روایت میں ہے۔ واقعات و حالات سے متعلق جو پیشگوئیاں ہوتی ہیں وہ مجاز کے رنگ میں بیان ہوتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مدینہ اس طرح اجڑ جائے گا کہ مسجد نبوی کی اہمیت رہے گی نہ کسی اور چیز کی۔ کتے یہاں گھومتے پھریں گے۔ لوگوں نے پوچھا کہ پھلوں کا کیا ہوگا تو آپؐ نے فرمایا کہ آوارہ درندے اور پرندے ان کو کھائیں گے کیونکہ لوگ تو چلے جائیں گے۔ بڑے شہروں پر اس طرح کے دور گزرتے رہے ہیں۔ اسی طرح کا دور دہلی، قرطبہ اور غرناطہ پر بھی گزرا ہے۔ آدمیوں کی ساری رونق ہوتی ہے۔ اگر آدمی نہ ہوں تو مثل مشہور ہے۔ خانہ خالی را دیو می گیرد۔ گھر میں آدمی نہ ہوں تو شیطان اور بھوت پریت اپنے ڈیرے جما لیتے ہیں۔ مدینہ پر یہ دور اس وقت آیا جب مدینہ دارالحکومت نہ رہا۔

□ حَدَّثَنِی مَالِكٌ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ عُمَرَ ابْنَ عَبْدِ الْعَزِیْزِ حِیْنَ خَرَجَ مِنَ الْمَدِیْنَةِ الْتَفَتَ اِلَیْهَا فَبَكٰی ثُمَّ قَالَ یَا مُزَاحِمُ اَتَخْشٰی اَنْ نَكُوْنَ مِمَّنْ نَفَتِ الْمَدِیْنَةُ.

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جب مدینہ سے نکلے تو انہوں نے خاص طور پر شہر پر نظر ڈالی اور رونے لگے۔ پھر انہوں نے (اپنے آزاد کردہ غلام) مزاحم سے پوچھا کہ کیا تم اندیشہ رکھتے ہو کہ ہم بھی ان لوگوں میں سے ہیں جن کو مدینہ نے نکال باہر کیا ہے؟﴾

وضاحت :

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی بات کا مفہوم یہ ہے کہ ہمارے مدینہ سے نکلنے کے دو سبب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم یہاں سے جائیں اور ہمارا جانا اللہ کی مرضی کے مطابق ہو۔ اور دوسرا یہ کہ ہم کو مدینہ نے نکال دیا ہو۔ یعنی آنحضرتؐ کے ارشاد کے مطابق کہ مدینہ ایک بھٹی کی مانند ہے ہم کھوٹ کی طرح نکالے جا رہے ہوں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے اپنے دل میں جو اندیشہ تھا وہ انہوں نے اپنے ساتھی پر ظاہر کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا تمہارے

اندر بھی یہ اندیشہ ہے۔ تمہارے دل کا کیا حال ہے۔ اس پر وہ خاموش رہے۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو مدینہ سے کس درجہ کی انسیت تھی۔ ان کے دل میں رسول اللہ ﷺ کے دارالہجرت کی کتنی قدر تھی۔ اس سے ان کا گاؤ تھا جس کا اظہار انہوں نے ان الفاظ میں کیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم مدینہ سے محروم کیے جا رہے ہوں۔

مَا جَاءَ فِي تَحْرِيمِ الْمَدِينَةِ

مدینہ کی حرمت کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَمْرٍو مَوْلَى الْمُطَّلِبِ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ طَلَعَ لَهُ أُحُدٌ فَقَالَ هَذَا جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَ نُحِبُّهُ اَللّٰهُمَّ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ وَ أَنَا أُحَرِّمُ مَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا.

﴿انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب احد کا پہاڑ نظر آیا تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ اے اللہ، ابراہیمؑ نے مکہ کو محترم قرار دیا اور میں اس شہر کی دو پہاڑیوں کے درمیان کے علاقے کو حرم بناتا ہوں۔﴾

وضاحت:

"لابۃ" پہاڑ کی گھاٹی کو بھی کہتے ہیں اور سنگریلی زمین کو بھی۔ پہاڑیوں پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ ہر آدمی کو اپنے وطن کے پہاڑ، ٹیلے، وادیاں، مرغزار، چراگاہیں اور نشیب و فراز محبوب ہوتے ہیں۔ طویل قیام کی وجہ سے وطن کی ان چیزوں سے ہر شخص کے دل میں ایک درجہ انسیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ ایک فطری اور جذباتی بات ہوتی ہے۔ کوہ احد کے متعلق نبی ﷺ نے اپنے جذبات کا اظہار فرمایا۔ پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے، یہ مجازاً کہا گیا ہے۔ یہ بات آپؐ نے خیبر سے واپسی پر فرمائی جیسا کہ اسامہ بن زید کی روایت میں آیا ہے۔ اس کے مطابق جب آپ نے احد کو دیکھا تو فرمایا کہ مدینہ سے نکل کر ایک شخص جب سفر کرتا اور اس کے بعد گھر کو لوٹتا ہے تو اس کو مدینہ کے قریب سنتری کی طرح کھڑے کوہ احد کے سوا کون ہوگا جو بشارت دے گا کہ آپ آئے آپ کا گھر آگیا۔ اگرچہ یہ جذبہ شاعرانہ

ہے لیکن انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ علامہ اقبال نے کوہ ہمالیہ کے بارے میں کہا تھا ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا۔ اس شعر میں بھی ایسا ہی جذبہ کارفرما ہے۔

آنحضرت کا یہ فرمانا کہ مکہ کو حضرت ابراہیمؑ نے محترم قرار دیا تو میں ان دو پہاڑوں یا سنگلاخ سنگریلی زمین کے درمیان کے علاقہ کو محترم قرار دیتا ہوں، اس معنی میں نہیں ہو سکتا کہ اس حرم اور حرم مکہ کی ایک حیثیت ہو جائے گی، اس لیے کہ مکہ کے حرم کی نوعیت دوسری ہے۔ اس کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس کو محترم قرار دے دیا اور اس کی حرمت کے احکام قرآن مجید میں موجود ہیں۔ نبی ﷺ نے وہاں کے درخت کاٹنے اور شکار کرنے سے منع فرمایا۔ مکہ کا اپنا مقام ہے۔ وہ تمام دنیا جہان والوں کا مرکز ہے۔ وہاں اللہ کا گھر اور مسجد حرام ہے جو تمام مسلمانوں کا قبلہ ہے۔ مدینہ کا اپنا مقام ہے۔ یہ آنحضرتؐ کی جائے ہجرت اور آپ کا مدفن ہے۔ یہاں آنحضرتؐ کی مسجد ہے، یہ صحابہ کا مرکز ہے، یہ اس کی برکتیں ہیں۔ لیکن ایسی کوئی روایت موجود نہیں کہ آنحضرتؐ نے یہاں کے درخت کاٹنے یا شکار سے منع فرمایا ہو۔ حنفیہ ان احکام کو جو حرم مکہ کے لیے ہیں مدینہ پر نافذ نہیں کرتے، اس لیے کہ حرم مکہ کی تمام چیزیں آنحضرتؐ کے اپنے ذریعے سے منصوص ہیں جب کہ حرم مدینہ کی یہ حیثیت نہیں۔ اس لیے جو لوگ حرم مدینہ کو حرم مکہ پر ترجیح دیتے ہیں میرے نزدیک ان کی رائے غلو پر مبنی ہے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ لَوْ رَأَيْتُ الظِّبَاءَ بِالْمَدِينَةِ تَرْتَعُ مَا ذَعَرْتُهَا قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا حَرَامٌ.

﴿سعید بن مسیب روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ یہ کہا کرتے تھے کہ اگر میں ہرنوں کو مدینہ میں چرتا پاؤں گا تو ان کو وحشت زدہ نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پہاڑیوں کے درمیان جو کچھ ہے وہ محترم ہے۔﴾

وضاحت:

یہ حضرت ابوہریرہؓ کا جذبہ ہے اور اس میں کوئی چیز قابل اعتراض نہیں ہے۔ اس کے حق میں وہ یہ دلیل دیتے تھے کہ مدینہ کو محترم قرار دیا گیا ہے۔ لیکن خود آنحضرت ﷺ سے اس بارے میں کوئی روایت نہیں کہ یہاں کے جانور کو کوئی نہ مارے یا درخت کو کوئی نہ کاٹے۔ جبکہ آپ نے حرم مکہ کے متعلق خود فرمایا کہ یہاں کی کسی چیز کو نہ

کاٹا جائے اور نہ ہی جانوروں کا شکار کیا جائے۔

☐ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ يُونُسَ بْنِ يُوسُفَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ اَبِی اَيُّوبَ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّهُ وَجَدَ غِلْمَانًا قَدْ اَلْجَئُوا ثَعْلَبًا اِلٰی زَاوِيَةٍ فَطَرَدَهُمْ عَنْهُ.

﴿ابو ایوب انصاریؓ فرماتے تھے کہ میں نے بچوں کو دیکھا کہ وہ ایک لومڑی کو ایک گوشے میں گھیر کر اس کے درپے ہو گئے ہیں تو میں نے بچوں کو اس لومڑی سے ہٹا دیا۔﴾

وضاحت :

یہ بھی ابو ایوب انصاریؓ کا ایک مستحسن جذبہ ہے، آنحضرت ﷺ کا ارشاد نہیں۔

☐ حَدَّثَنِی يَحْيٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ رَجُلٍ قَالَ دَخَلَ عَلَیَّ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ وَ اَنَا بِالْاَسْوَافِ فَقَدِ اصْطَدْتُ نُهَسًا فَاَخَذَهُ مِنْ يَدِی فَاَرْسَلَهُ.

﴿امام مالک ایک شخص سے روایت کرتے ہیں کہ زید بن ثابت میرے ہاں آئے جب میں اسواف میں تھا۔ میں نے نہس نام کا پرندہ شکار کر رکھا تھا۔ انہوں نے اس پرندے کو میرے ہاتھ سے لے لیا اور آزاد کر دیا۔﴾

وضاحت :

یہ بھی زید بن ثابت کا عمل ہے۔ آنحضرت ﷺ سے اس بارے میں کچھ منقول نہیں۔

مَاجَاءَ فِی وَبَاءِ الْمَدِينَةِ

مدینہ کی وبا کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيهِ عَنْ عَائِشَةَ اُمِّ الْمُؤْمِنِينَ اَنَّهَا قَالَتْ لَمَّا قَدِمَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ الْمَدِينَةَ وُعِكَ اَبُوبَكْرٍ وَ بِلَالٌ قَالَ فَدَخَلْتُ عَلَيْهِمَا فَقُلْتُ يَا اَبَتِ كَيْفَ تَجِدُكَ وَ يَا بِلَالُ كَيْفَ تَجِدُكَ قَالَتْ فَكَانَ اَبُوبَكْرٍ اِذَا اَخَذَتْهُ الْحُمّٰی يَقُولُ :

كُلُّ امْرِئٍ مُصَبَّحٌ فِی اَهْلِهِ وَالْمَوْتُ اَدْنٰی مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهِ

وَ كَانَ بِلَالٌ اِذَا اُقْلِعَ عَنْهُ يَرْفَعُ عَقِيرَتَهُ فَيَقُولُ:

اَلَا لَيْتَ شِعْرِی هَلْ اَبِيتَنَّ لَيْلَةً بِوَادٍ وَ حَوْلِی اِذْخِرٌ وَ جَلِيلٌ

وَهَلْ اَرِدَنْ يَوْمًا مِيَاهَ مِجَنَّةٍ وَ هَلْ يَبْدُوَنْ لِی شَامَةٌ وَ طَفِيلٌ

قَالَتْ عَائِشَةُ فَجِئْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ فَاَخْبَرْتُهُ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ حَبِّبْ اِلَيْنَا الْمَدِينَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ اَوْ اَشَدَّ وَ صَحِّحْهَا وَ بَارِكْ لَنَا فِی مُدِّهَا وَ صَاعِهَا وَانْقُلْ حُمَّاهَا فَاجْعَلْهَا بِالْجُحْفَةِ.

﴿حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو حضرت ابوبکرؓ اور بلالؓ بخار میں مبتلا ہو گئے۔ وہ کہتی ہیں کہ وہ دونوں کے پاس گئیں۔ میں نے پوچھا ابا جان اب کیسا محسوس کر رہے ہیں اور بلال تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ ابوبکرؓ کا حال یہ تھا کہ جب بخار چڑھتا تو وہ یہ شعر پڑھتے :

"آدمی کو گھر میں صبح خیر کہا جاتا ہے حالانکہ موت اس کے جوتے کے تسمے سے بھی قریب تر ہے"

اور بلال کا یہ حال تھا کہ جب بخار ذرا اترتا تو بلند آواز سے یہ شعر پڑھتے :

"کاش میں جان پاتا کہ کبھی رات آئے گی جو میں اس وادی میں بسر کروں گا جس کے ارد گرد اذخر اور جلیل کی خوشبوئیں اڑ رہی ہوں گی اور کبھی وہ دن بھی ہو گا کہ میں مجنہ کے چشمے پر اتروں گا اور شامہ اور طفیل کی پہاڑیاں مجھے نظر آئیں گی"۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے جا کر نبی کریم ﷺ کو ان کا حال بتایا تو آپؐ نے دعا کی کہ اے اللہ! ہم سب کے لیے مدینہ کو محبوب کر دے جیسا کہ مکہ کو محبوب کیا ہے یا اس سے بھی زیادہ۔ اور اس کو صحت بخش مقام بنا دے اور اس کے مد اور صاع میں برکت ڈال دے۔ اے اللہ اس کا بخار یہاں سے اٹھا کر جحفہ میں پھینک دے۔﴾

وضاحت :

اذخر اور جلیل دو قسم کے گھاس تھے جو نہایت خوشبودار تھے اور صرف وادی مکہ میں پیدا ہوتے تھے۔ ہر شخص اپنے مقام کے لحاظ سے بات کرتا اور اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ مدینہ میں حضرت ابوبکرؓ کے جذبات یہ تھے کہ لوگ تو آکر مزاج پوچھتے اور صبحك الله بالخير کی دعا دیتے اور وہ اپنی حالت یوں محسوس کرتے کہ جیسے موت ان کے جوتے کے تسمے کے ساتھ لگی کھڑی ہے۔ اس کے برعکس حضرت بلالؓ کو وادی مکہ کی یاد ستاتی اور وہ وہاں کی راتوں اور دنوں کو اور وہاں کی وادیوں، پہاڑیوں اور گھاس کو یاد کرتے۔ آدمی بخار میں کمزور ہو جاتا ہے تو اس کے اوپر جذبات کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اس کے اس وقت کے جذبات عام جذبات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے محسوس فرمالیا کہ میرے ساتھی مکہ کو نہیں بھولتے۔ اس لیے آپ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ ہمارے لیے مدینہ کو بھی اتنا ہی یا اس سے زیادہ محبوب بنادے جتنا کہ مکہ محبوب ہے۔ ساتھ ہی اس کی پیداوار میں برکت کی دعا فرمائی اور یہ کہ اس شہر کو صحت افزا مقام بنادے اور اس کے بخار کو جحفہ کی وادی میں پھینک دے۔ جحفہ یہود کی ایک بستی تھی۔

اس روایت سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی کمسنی کی بھی نفی ہوتی ہے۔ یہ اندازِ روایت کسی بچی کا نہیں ہو سکتا۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نُعَيْمِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ الْمُجْمِرِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّهٗ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى اَنْقَابِ الْمَدِيْنَةِ مَلَائِكَةٌ لَا يَدْخُلُهَا الطَّاعُوْنُ وَلَا الدَّجَّالُ.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مدینہ کی گلیوں کے نکڑوں پر فرشتے مقرر ہیں۔ اس میں طاعون اور دجال داخل نہیں ہو سکتے۔﴾

وضاحت :

یہ روایت جس طرح موطا میں آئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خبر ہے اور آنحضرت ﷺ کی خبر آفاقی شہادت ہوتی ہے۔ ایسی خبر جب واقعات سے سچی ثابت ہو جائے تو وہ حضورؐ کی نبوت کی صداقت کی دلیل ہو گی۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے انشاء اللہ بھی فرمایا۔ تو ایک خوش آئند بشارت ہو گی۔ اگر اس کے خلاف بھی ہو تب بھی اس کی نفی نہیں ہوتی۔ انشاء اللہ تو ایک مشروط بات ہوتی ہے یعنی اگر طاعون آجائے تو آجائے۔

مَا جَاءَ فِي اِجْلَاءِ الْيَهُوْدِ مِنَ الْمَدِيْنَةِ

یہود کے مدینہ سے جلاوطن کرنے کی روایات

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ اِسْمٰعِيْلَ بْنِ اَبِي حَكِيْمٍ اَنَّهٗ سَمِعَ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيْزِ يَقُوْلُ كَانَ مِنْ آخِرِ مَا تَكَلَّمَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ قَالَ قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ لَا يَبْقَيَنَّ دِيْنَانِ بِاَرْضِ الْعَرَبِ.

﴿اسمٰعیل بن ابی حکیم کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے سنا، وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو آخری ارشادات فرمائے ان میں یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو معبد بنالیا۔ عرب کی سرزمین میں دو دین باقی نہیں رہیں گے۔﴾

وضاحت :

حدیث کے یہ دونوں ٹکڑے معنوی طور پر کچھ بے ربط سے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیچ میں کچھ باتیں حذف کر دی گئی ہیں۔ موقع کی بات جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمائی تو اس میں صرف دو باتوں کا ذکر کیا ہے۔

پہلی یہ کہ آپ نے یہود و نصاریٰ پر لعنت فرمائی کہ انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا۔ ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ نصاریٰ میں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوا کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا تو اس سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ اسلوبیات عام لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور علی سبیل التغلیب اس میں اوروں کو شامل کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی نبیوں کا لفظ اولیاء و صلحاء پر بھی حاوی کر دیں تو معنا یہ بات صحیح ہو جاتی ہے۔ نصاریٰ نے حضرت مسیحؑ اور اپنے نیک لوگوں کے مت بھی بنائے، وہ ان کی پوجا بھی کرتے ہیں اور ان کی قبروں پر انہوں نے گرجے بھی تعمیر کیے۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ جزیرہ عرب میں دو دین نہیں رہیں گے۔ یہ بات ہے تو خبر یہ جملہ لیکن مسلمانوں کو نصیحت و وصیت کے طور پر ہے۔ اس حکم کی تعمیل حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں کی اور یہود کو ملک سے نکال باہر کیا۔ یہ بات کہ عرب میں دو دین نہیں رہیں گے اور یہ کہ کوئی غیر مسلم نہیں رہے گا دو مختلف باتیں ہیں اور ان میں

فرق ہے۔ اسلام سے پہلے یہودیت اور نصرانیت دونوں دین عرب میں خاصے باوقار اور بااختیار تھے۔ ان کے اثر کے اپنے اپنے دائرے تھے۔ مذکور حکم میں ان کی اس حیثیت کی نفی ہے۔ فرمایا ہے کہ ان کی یہ حیثیت باقی نہیں رہے گی۔ جماعتی حیثیت سے ان دونوں گروہوں کا وہاں سے خاتمہ کر دیا جائے گا۔ باقی رہ گئی یہ بات کہ غیر مسلموں کے بارے میں کیا حکم ہے تو وہ ملک میں آجا سکتے ہیں۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ یہود کی جلاوطنی اور عرب میں مختلف ادیان کو جمع کرنے کی ممانعت دونوں حضور کی حیات مبارکہ کے آخری دور کی ہدایات ہیں۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا يَجْتَمِعُ دِيْنَانِ فِی جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ قَالَ مَالِكٌ" قَالَ ابْنُ شِهَابٍ فَفَحَصَ عَنْ ذٰلِكَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ حَتّٰی اَتَاهُ الْعِلْمُ وَالْيَقِيْنُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا يَجْتَمِعُ دِيْنَانِ فِی جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ فَاَجْلٰی يَهُوْدَ خَيْبَرَ.

﴿امام مالک ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جزیرۃ العرب میں دو دین جمع نہیں رہیں گے۔ امام مالک کہتے ہیں کہ ابن شہاب کا قول ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس قول کی پوری تحقیق کی یہاں تک کہ ان کو پورا اطمینان قلب ہو گیا کہ یہ بات آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ جزیرہ عرب میں دو دین جمع نہیں ہوں گے تو انہوں نے یہود خیبر کو جلاوطن کر دیا۔﴾

وضاحت :

ایک طرف یمن اور دوسری طرف شام کے کنارے تک جزیرۃ العرب کا علاقہ ہے جس کے متعلق آپؐ نے یہ ارشاد فرمایا۔ اس کی بنیاد وجہ حرم شریف کا تحفظ ہے۔ جس طرح علاقائی سمندر ہوتا ہے کہ اس کے بغیر آپ کے ساحل اور آپ کے ملک کی حفاظت نہیں ہو سکتی تو اسی طریقہ سے حرم کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ جس علاقے میں حرم واقع ہے اس علاقے کو دور دور تک غیر لوگوں سے پاک رکھا جائے۔

باقی رہا دو دین جمع نہ کرنے کا معاملہ تو ایسا ہر مملکت میں ہوتا ہے۔ بااختیار تو ایک دین ہی ہوتا ہے۔ امریکہ اور برطانیہ وغیرہ میں بھی ایسا ہے اور پاکستان و ایران میں بھی ایسا ہی ہے۔ کئی دین یک وقت بااختیار نہیں ہو سکتے لہٰذا

اس ہدایت پر تعجب کی کوئی بات نہیں۔

حضرت عمرؓ نے اس حکم پر یوں عمل کیا کہ فدک اور خیبر کے یہودیوں کو شام کی طرف جلاوطن کر دیا۔ خیبر کے یہود وہاں سے نکل گئے تو ان کا پھل میں کچھ حصہ رہا نہ زمین میں۔ رہے یہود فدک تو ان کے لیے نصف پھل اور نصف زمین کا وعدہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے اسی بنیاد پر مصالحت کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے نصف پھل، نصف زمین اور یہود کے تمام سامان کی قیمت لگوا کر ان کو ادا کر دی۔ چونکہ وہ اہل صلح تھے اس لیے معاہدے کی رو سے ان سے ٹھیک ٹھیک انصاف کیا گیا۔

جَامِعُ مَا جَاءَ فِی اَمْرِ الْمَدِيْنَةِ

مدینہ کے بارے میں جامع باب

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ طَلَعَ لَهٗ اُحُدٌ فَقَالَ هٰذَا جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَ نُحِبُّهٗ.

﴿ہشام بن عروہؒ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے احد آیا تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔﴾

وضاحت :

یہ روایت اوپر گزر چکی ہے۔ اس کی وضاحت وہاں دیکھی جائے۔ یہ خیبر سے واپسی کا واقعہ ہے۔ اپنے علاقے کی وادی یا پہاڑ یا ندی سے محبت ہونا فطری بات ہے اور یہ بات کہ پہاڑ محبت کرتا ہے مجازی معنوں میں ہے۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيٰی بْنِ سَعِيْدِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ الْقَاسِمِ اَنَّ اَسْلَمَ مَوْلٰی عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَخْبَرَهٗ اَنَّهٗ زَارَ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عَيَّاشٍ الْمَخْزُوْمِیَّ فَرَاٰی عِنْدَهٗ نَبِيْذًا وَهُوَ بِطَرِيْقِ مَكَّةَ فَقَالَ لَهٗ اَسْلَمُ اِنَّ هٰذَا الشَّرَابَ يُحِبُّهٗ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَحَمَلَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عَيَّاشٍ قَدَحًا عَظِيْمًا فَجَاءَ بِهٖ اِلٰی عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَوَضَعَهٗ فِی يَدَيْهِ فَقَرَّبَهٗ عُمَرُ اِلٰی فِيْهِ ثُمَّ رَفَعَ رَاْسَهٗ فَقَالَ عُمَرُ اِنَّ هٰذَا لَشَرَابٌ طَيِّبٌ فَشَرِبَ مِنْهُ ثُمَّ نَاوَلَهٗ رَجُلًا عَنْ يَمِيْنِهٖ فَلَمَّا اَدْبَرَ

عَبْدُاللّٰهِ نَادَاهُ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَقَالَ اَ اَنْتَ الْقَائِلُ لَمَكَّةُ خَيْرٌ مِنَ الْمَدِيْنَةِ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ فَقُلْتُ هِيَ حَرَمُ اللّٰهِ وَ اَمْنُهُ وَ فِيْهَا بَيْتُهُ فَقَالَ عُمَرُ لَا اَقُوْلُ فِي بَيْتِ اللّٰهِ وَلَا فِي حَرَمِهِ شَيْئًا ثُمَّ قَالَ عُمَرُ اَنْتَ الْقَائِلُ لَمَكَّةُ خَيْرٌ مِنَ الْمَدِيْنَةِ قَالَ فَقُلْتُ هِيَ حَرَمُ اللّٰهِ وَ اَمْنُهُ وَ فِيْهَا بَيْتُهُ فَقَالَ عُمَرُ لَا اَقُوْلُ فِي حَرَمِ اللّٰهِ وَلَا فِي بَيْتِهِ شَيْئًا ثُمَّ انْصَرَفَ.

﴿عبدالرحمٰن بن قاسم کہتے ہیں کہ اسلم نے، جو حضرت عمرؓ کے آزاد کردہ غلام تھے، خبر دی کہ انہوں نے مکہ کے راستے میں عبداللہ بن عیاش مخزومی سے ملاقات کی تو ان کے پاس نبیذ دیکھی۔ اسلم نے بتایا کہ اس مشروب کو حضرت عمرؓ بہت پسند فرماتے ہیں۔ اس پر عبداللہ بن عیاشؓ ایک بڑا پیالہ لے کر حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور اس کو ان کے ہاتھ میں تھمادیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے منہ کے قریب لے گئے، پھر سر اٹھالیا اور فرمایا کہ یہ مشروب بڑا پاکیزہ ہے۔ انہوں نے اس میں سے پیا اور پھر اپنے ساتھ والے ایک شخص کو پکڑا دیا۔ جب عبداللہ چلے تو حضرت عمرؓ نے ان کو پکارا اور پوچھا کہ کیا آپ یہ کہتے ہیں کہ مکہ مدینہ سے بہتر ہے؟ عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ وہ اللہ کا حرم اور دارالامن ہے اور اس میں اللہ کا گھر ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں بیت اللہ اور حرم کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ حضرت عمرؓ نے پھر پوچھا کہ کیا آپ واقعی یہ کہتے ہیں کہ مکہ مدینہ سے بہتر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ وہ اللہ کا حرم اور دارالامن ہے اور اس میں اللہ کا گھر ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں بیت اللہ اور حرم کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ پھر وہ چلے گئے۔﴾

وضاحت:

یہ روایت امام مالک نے اس لیے نقل کی ہے کہ وہ اس سے اس بات کی تائید چاہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا رجحان مکہ پر مدینہ کی ترجیح کی طرف تھا، لیکن واقعہ یہ نہیں ہے۔ روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے علم میں یہ بات آئی کہ لوگوں میں یہ بحث چل رہی ہے کہ مکہ اور مدینہ میں سے کون سا شہر افضل ہے۔ بعض لوگ مکہ کو ترجیح دے رہے ہیں اور بعض مدینہ کو۔ حضرت عبداللہ بن عیاشؓ کا نام ان لوگوں میں رہا ہوگا جو مکہ کو ترجیح دیتے

تھے۔ ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کو خود ایسی واضح بات کے بارے میں کوئی اشتباہ نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے چاہا کہ عبداللہؓ سے ان کے مؤقف کی تصدیق کرلی جائے۔ جب لوگوں کے اندر کسی بات کا چرچا ہو رہا ہو اور اس سے بظاہر معصیت جاہلیت کے ابھرنے کا اندیشہ ہو تو حاکم کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس کی تحقیق کرے اور اس کے بارے میں لوگوں کے موقف کو سمجھے۔ حضرت عمرؓ کا یہ فرض تھا کہ جب قضیہ چل پڑا ہے تو معلوم کریں کہ لوگ کس طریقہ سے سوچ رہے ہیں اور ان کے دلائل کیا ہیں۔ ان جیسے مدبر سے یہ توقع بھی تھی کہ وہ صورت حال کا اندازہ کرلیں اور بلا ضرورت پارٹی نہ بنیں۔ انہوں نے یہی تحقیق کرنی چاہی لیکن اپنا کوئی رجحان ظاہر نہیں کیا۔ عبداللہؓ نے جو بات کہی اس کو مان لیا۔ دوبارہ پوچھنے کا مقصد بھی تفتیش ہی تھا۔ عبداللہؓ نے اپنے موقف کے حق میں دلائل واضح کردیے۔ انہوں نے مکہ کو ترجیح دینے کی بنیاد قرآن مجید پر رکھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرم قرار دیا ہے۔ جو شخص اس میں داخل ہو وہ مامون ہوتا ہے اور اس شہر میں اللہ کا گھر ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی مقام کو شرف تو اللہ تعالیٰ کے دینے ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ کو عبداللہؓ کی بات سن کر اور ان کے دلائل سے واقف ہو کر اطمینان ہو گیا کہ ان کی سوچ درست ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس پر خاموشی اختیار کی۔

مَاجَاءَ فِي الطَّاعُوْنِ

طاعون کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عَبْدِ الْحَمِيْدِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ زَيْدِ بْنِ الْخَطَّابِ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ الْحَارِثِ بْنِ نَوْفَلٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ خَرَجَ اِلَى الشَّامِ حَتّٰى اِذَا كَانَ بِسَرْغَ لَقِيَهُ اُمَرَاءُ الْاَجْنَادِ اَبُو عُبَيْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ وَاَصْحَابُهُ فَاَخْبَرُوْهُ اَنَّ الْوَبَاءَ قَدْ وَقَعَ بِاَرْضِ الشَّامِ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ ادْعُ لِي الْمُهَاجِرِيْنَ الْاَوَّلِيْنَ فَدَعَاهُمْ فَاسْتَشَارَهُمْ وَ اَخْبَرَهُمْ اَنَّ الْوَبَاءَ قَدْ وَقَعَ بِالشَّامِ فَاخْتَلَفُوْا فَقَالَ بَعْضُهُمْ قَدْ خَرَجْتَ لِاَمْرٍ وَلَا نَرَى اَنْ تَرْجِعَ عَنْهُ وَقَالَ بَعْضُهُمْ مَعَكَ بَقِيَّةُ النَّاسِ وَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَلَا نَرَى اَنْ تُقْدِمَهُمْ عَلٰى هٰذَا الْوَبَاءِ فَقَالَ عُمَرُ

ارْتَفِعُوا عَنِّي ثُمَّ قَالَ ادْعُ لِي الْأَنْصَارَ فَدَعَوْهُمْ فَاسْتَشَارَهُمْ فَسَلَكُوا سَبِيلَ الْمُهَاجِرِينَ وَاخْتَلَفُوا كَاخْتِلَافِهِمْ فَقَالَ ارْتَفِعُوا عَنِّي ثُمَّ قَالَ ادْعُ لِي مَنْ كَانَ هَاهُنَا مِنْ مَشْيَخَةِ قُرَيْشٍ مِنْ مُهَاجِرَةِ الْفَتْحِ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَخْتَلِفْ عَلَيْهِ مِنْهُمْ رَجُلَانِ فَقَالُوا نَرَى أَنْ تَرْجِعَ بِالنَّاسِ وَلَا تُقْدِمَهُمْ عَلَى هَذَا الْوَبَاءِ فَنَادَى عُمَرُ فِي النَّاسِ إِنِّي مُصَبِّحٌ عَلَى ظَهْرٍ فَأَصْبِحُوا عَلَيْهِ فَقَالَ أَبُو عُبَيْدَةَ أَفِرَارًا مِنْ قَدَرِ اللَّهِ فَقَالَ عُمَرُ لَوْ غَيْرُكَ قَالَهَا يَا أَبَا عُبَيْدَةَ نَعَمْ نَفِرُّ مِنْ قَدَرِ اللَّهِ إِلَى قَدَرِ اللَّهِ أَرَأَيْتَ لَوْ كَانَ لَكَ إِبِلٌ فَهَبَطَتْ وَادِيًا لَهُ عُدْوَتَانِ إِحْدَاهُمَا مُخْصِبَةٌ وَالْأُخْرَى جَدْبَةٌ أَلَيْسَ إِنْ رَعَيْتَ الْمُخْصِبَةَ رَعَيْتَهَا بِقَدَرِ اللَّهِ وَإِنْ رَعَيْتَ الْجَدْبَةَ رَعَيْتَهَا بِقَدَرِ اللَّهِ فَجَاءَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ عَوْفٍ وَكَانَ غَائِبًا فِي بَعْضِ حَاجَتِهِ فَقَالَ إِنَّ عِنْدِي مِنْ هَذَا عِلْمًا سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ إِذَا سَمِعْتُمْ بِهِ بِأَرْضٍ فَلَا تَقْدَمُوا عَلَيْهِ وَإِذَا وَقَعَ بِأَرْضٍ وَأَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوا فِرَارًا مِنْهُ قَالَ فَحَمِدَ اللَّهَ عُمَرُ ثُمَّ انْصَرَفَ.

﴿عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ شام تشریف لے گئے۔ جب آپ سرغ کے مقام پر تھے تو سپہ سالاروں، ابو عبیدہ بن الجراحؓ اور ان کے ساتھیوں نے ان سے ملاقات کی اور یہ اطلاع دی کہ ملک شام میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی ہے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ ابتدائی مہاجرین کو میرے پاس لایا جائے۔ آپ نے ان کو بلایا، ان سے مشورہ کیا اور ان کو بتایا کہ شام میں وبا پھوٹ پڑی ہے (اس صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟) اس پر یہ لوگ مختلف الرائے تھے۔ بعض نے تو یہ کہا کہ آپ ایک مقصد سے تشریف لائے ہیں۔ ہماری رائے میں اس کو پورا کیے بغیر آپ کو واپس نہیں جانا چاہیے۔ دوسروں نے کہا آپ کے ہمراہ سرکردہ لوگ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھی ہیں۔ ہمارے خیال میں آپ کو انہیں وبا کے علاقہ میں نہیں لے جانا چاہیے۔ حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو رخصت کر دیا کہ آپ لوگ تشریف لے جائیں۔ پھر فرمایا کہ اب میرے پاس انصار کو لاؤ۔ امرائے لشکر ان کو لے آئے، آپ نے ان سے مشورہ کیا تو انہوں نے بھی مہاجرین ہی کا موقف اختیار

کیا۔ ان کی رایوں میں بھی اسی طرح کا اختلاف تھا۔ آپ نے ان کو بھی رخصت کر دیا۔ پھر فرمایا کہ فتح مکہ سے پہلے کے مہاجرین میں سے قریشی سرداروں میں سے جو یہاں ہوں ان کو بلایا جائے۔ امرائے لشکر نے ان کو طلب کر لیا تو ان میں سے کوئی دو آدمی بھی مختلف الرائے نہیں تھے۔ سب کا کہنا یہ تھا کہ آپ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس چلے جائیں اور اس وبا میں ان کو نہ لے جائیں۔ تب حضرت عمرؓ نے لوگوں میں اعلان کر دیا کہ میں صبح اپنی سواری پر واپس جا رہا ہوں، آپ لوگ بھی تیار رہیں۔ اس پر حضرت ابو عبیدہؓ نے سوال کیا، کیا اللہ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا، اگر آپ کے سوا کوئی اور یہ سوال کرتا تو مجھے تعجب نہ ہوتا۔ ابو عبیدہ! ہاں، ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ کی تقدیر ہی کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ اگر آپ کے کچھ اونٹ ہوں اور وہ کسی ایسی وادی میں جا اتریں کہ جس کی دو اطراف میں سے ایک سرسبز و شاداب ہو اور دوسری بنجر، تو کیا یہ بات نہیں ہوتی کہ اگر آپ اونٹوں کو شاداب حصے میں چرائیں تو یہ بات اللہ کی تقدیر کے مطابق ہو گی اور اگر بنجر حصہ میں چرائیں تب بھی آپ اللہ کی تقدیر کے مطابق عمل کر رہے ہوں گے۔ اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ آئے جو کسی ضرورت سے پہلے موقع پر موجود نہیں تھے۔ تو انہوں نے کہا کہ میرے پاس اس بارے میں کچھ معلومات ہیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا، جب کسی علاقے میں اس وبا کی خبر سنو تو اس علاقے میں نہ آؤ۔ اور جب کسی علاقے میں تمہاری موجودگی میں وبا پھوٹ پڑے تو اس سے بھاگ کر وہاں سے نہ نکلو۔ اس پر حضرت عمرؓ نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ پھر واپس تشریف لے گئے۔﴾

وضاحت:

یہ روایت اس زمانے سے تعلق رکھتی ہے جب اسلامی لشکر اردن، شام اور فلسطین کے علاقے میں رومیوں سے برسرپیکار تھے۔ حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ ان کے سپہ سالار تھے اور حضرت عمرؓ نے ان کی دعوت پر اس علاقے کا دورہ رکھ لیا۔ جب آپ مقام سرغ میں پہنچے، جو حجاز اور شام کی سرحد پر ایک قصبہ تھا، تو امرائے لشکر ان کے

استقبال کے لیے آئے اور یہ اطلاع دی کہ شام کے علاقے میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہو گیا کہ کیا حضرت عمرؓ کو وبازدہ علاقے میں داخل ہونا چاہیے یا مدینہ منورہ واپس لوٹ جانا چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے آپ کے ہمراہ سرکردہ صحابہ کرام کا ایک وفد بھی تھا۔ حضرت عمرؓ نے ایک خلیفہ راشد کی حیثیت سے وبا کے علاقے میں داخل ہونے کے بارے میں شرعی حکم کے تعین کے لیے مشاورت کا فیصلہ کیا اور اس کی شکل یہ اختیار کی کہ سب سے پہلے وہاں موجود قدیم الاسلام مہاجرین سے مشاورت کی۔ پھر انصار کو بلایا اور اس کے بعد ان قریشی سرداروں کو بلایا جو فتح مکہ سے پہلے اور معاہدہ حدیبیہ کے بعد مدینہ ہجرت کر چکے تھے۔ اول الذکر دونوں گروہوں نے کوئی متفقہ رائے نہیں دی۔ بعض چاہتے تھے کہ حضرت عمرؓ جس مقصد سے آئے ہیں اس کو پورا کیے بغیر واپس نہ جائیں۔ دوسرے یہ کہتے تھے کہ رسول اللہ کے بلند مرتبہ ساتھیوں کی ایک جماعت کو وبازدہ علاقے میں لے جا کر خطرہ سے دوچار کرنا مناسب نہیں۔ البتہ قریشی سرداروں کا موقف ایک ہی تھا کہ مدینہ کو لوٹ جانا ہی مناسب ہے۔ مشاورت کے نتیجہ میں حضرت عمرؓ نے واپس کوچ کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس پر حضرت ابو عبیدہؓ نے اعتراض کیا کہ ایسا کرنا اللہ کی تقدیر سے فرار اختیار کرنے کے مترادف ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے ان کی اس معنی آفرینی کو ان کے مرتبہ سے کم تر محسوس کیا اور فرمایا کہ کاش، تمہارے سوا کوئی اور شخص یہ بات کرتا تو مجھے اس پر حیرت نہ ہوتی۔ پھر ایک مثال سے ان کو سمجھایا کہ جب آپ کے لیے دو راستے یکساں کھلے ہوں تو آپ جس راستے کو بھی اختیار کریں گے تو اللہ کی تقدیر کے مطابق ہوگا، خواہ آپ سہل راستہ اختیار کریں یا مشکل۔ لہٰذا ہم نے اگر اپنے لیے واپسی کا راستہ اختیار کیا ہے تو اس میں بھی ہم اللہ کی تقدیر ہی کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ اس موقع پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کہیں سے آ نکلے۔ انہوں نے جب سنا کہ وبا کے مسئلہ پر مشاورت ہوئی ہے اور لوگ مختلف الرائے ہو رہے ہیں تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث سنائی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ اگر سنو کہ کسی علاقہ میں وبا پھیلی ہوئی ہے تو اس میں نہ جاؤ، لیکن جب تمہارے وہاں ہوتے ہوئے وبا پھوٹ پڑے تو اس علاقہ سے فرار اختیار نہ کرو۔ حضرت عمرؓ نے جب یہ حدیث سنی تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ مشاورت کے نتیجہ میں اپنے اجتہاد سے وہ جس نتیجہ تک پہنچے تھے وہ حدیث کے ساتھ مطابقت رکھتا تھا۔

اس روایت سے ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ اجتہادی امور میں خلفائے راشدین مشاورت کو کس قدر اہمیت دیتے تھے۔ اس مشاورت میں وہ صحابہ کرامؓ کے مختلف طبقات کی رائے لیتے جس میں یہ بات ملحوظ ہوتی کہ

سبقت فی الاسلام اور اسلام کی خاطر قربانیوں میں ان کا حصہ نمایاں ہو۔ بلاشبہ یہ اجتہاد کی سب سے اعلیٰ شکل تھی۔ دوسرے مسئلہ زیر بحث میں دین کا مزاج یہ سامنے آیا کہ وبازدہ علاقہ سے دوسرے علاقوں میں منتقل ہونا مناسب نہیں لیکن جو لوگ اس علاقے سے باہر ہوں انہیں اس علاقہ میں داخل ہونے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ جدید معلومات کی روشنی میں وبازدہ علاقہ سے منتقل ہونے والا شخص اس وبا کو دوسرے علاقہ میں پھیلانے کا باعث بن سکتا ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اس ترقی یافتہ زمانہ میں چونکہ آمد و رفت کے ذرائع بہت وسعت اختیار کر گئے ہیں اس لیے وبائیں بسا اوقات کئی کئی ملکوں بلکہ مختلف براعظموں میں پھیل جاتی ہیں۔

جہاں تک تقدیر کا تعلق ہے آدمی ہر جگہ اس کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ جب کسی علاقے میں وبا پھوٹتی ہے تو آخر پہلا شخص جو اس کے پھیلانے کا باعث بنا اس کی بیماری کا سبب مرض کا متعدی ہونا تو نہ تھا۔ وہ اللہ کی تقدیر ہی سے اس بیماری سے متاثر ہوا۔ پھر کتنے ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو مریضوں کی تیمارداری اور علاج پر متعین ہوتے ہیں اور وبا سے متاثر افراد کے ساتھ رہنے کے باوجود ان پر بیماری کا حملہ نہیں ہوتا۔ یہ بھی اللہ کی تقدیر ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ وَ عَنْ سَالِمِ بْنِ اَبِي النَّضْرِ مَوْلَى عُمَرَ بْنِ عُبَيْدِاللّٰهِ عَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدِ بْنِ اَبِي وَقَّاصٍ عَنْ اَبِيهِ اَنَّهُ سَمِعَهُ يَسْاَلُ اُسَامَةَ بْنَ زَيْدٍ مَا سَمِعْتَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِي الطَّاعُوْنِ فَقَالَ اُسَامَةُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلطَّاعُوْنُ رِجْزٌ اُرْسِلَ عَلٰى طَائِفَةٍ مِنْ بَنِي اِسْرَائِيْلَ اَوْ عَلٰى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ فَاِذَا سَمِعْتُمْ بِهٖ بِاَرْضٍ فَلَا تَدْخُلُوْا عَلَيْهِ وَ اِذَا وَقَعَ بِاَرْضٍ وَ اَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوْا فِرَارًا مِنْهُ.

﴿عامر بن سعد روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے والد سعد بن ابی وقاصؓ کو حضرت اسامہ بن زیدؓ سے یہ سوال کرتے سنا کہ آپ نے طاعون کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے کیا کچھ سنا ہے۔ اسامہ نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ طاعون ایک عذاب ہے جو بنی اسرائیل کے ایک گروہ پر یا تم سے پہلے کسی قوم پر بھیجا گیا۔ اس لیے جب کسی علاقے میں تم اس کے حملہ کی خبر سنو تو اس میں داخل نہ ہوا کرو لیکن اگر یہ کسی سرزمین میں پھوٹ پڑے جبکہ تم وہاں موجود ہو تو اس بیماری سے بھاگ کر علاقہ سے نہ نکلو۔﴾

وضاحت :

ہر آفت اور مصیبت جو کسی قوم پر آتی ہے اس کی حکمت الگ الگ ہوتی ہے۔ مثلاً وہ لوگوں کے امتحان کے لیے ہو سکتی ہے یا اس کی نوعیت قوم کے لیے ایک تنبیہی عذاب کی ہو سکتی ہے تاکہ وہ اپنی اصلاح کرلے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ تیسری شکل ایک تباہ کن عذاب کی ہو سکتی ہے جو کسی ناہنجار قوم کو ہلاکت کرنے کے لیے آتا ہے۔ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ طاعون کی وبا ماری قبل از اسلام کسی قوم پر عذاب کے طور پر بھیجی گئی۔ مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس وبا ماری کا نقطہ آغاز وہ عذاب ہوا۔ بعد میں مختلف ادوار میں اس وبا کا ظہور جو ہوا تو اس کے مقاصد الگ الگ ہو سکتے ہیں۔

طاعون زدہ علاقہ میں داخلہ کے بارے میں حکم کی وضاحت اوپر کی روایت میں ہو چکی ہے۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِاللّٰهِ بْنِ عَامِرِ بْنِ رَبِيْعَةَ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ خَرَجَ اِلَى الشَّامِ فَلَمَّا جَاءَ سَرْغَ بَلَغَهُ اَنَّ الْوَبَاءَ قَدْوَقَعَ بِالشَّامِ فَاَخْبَرَهُ عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِذَا سَمِعْتُمْ بِهٖ بِاَرْضٍ فَلَا تَقْدَمُوْا عَلَيْهِ وَ اِذَا وَقَعَ بِاَرْضٍ وَ اَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوْا فِرَارًا مِنْهُ فَرَجَعَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ مِنْ سَرْغَ

﴿عبداللہ بن عامر بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطابؓ شام تشریف لے گئے۔ جب آپ سرغ کے مقام پر پہنچے تو اطلاع ملی کہ شام میں وبا پھیل گئی ہے تو عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے انہیں بتایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب کسی علاقہ میں اس وبا ماری کے حملہ کا سنو تو وہاں نہ جاؤ اور جب کسی علاقہ میں وبا پھوٹ پڑے جبکہ تم وہاں مقیم ہو تو وبا ماری سے بھاگ کر اس علاقہ سے مت نکلو۔ چنانچہ حضرت عمر بن الخطابؓ سرغ سے لوٹ گئے۔﴾

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اِنَّمَا رَجَعَ بِالنَّاسِ مِنْ سَرْغَ عَنْ حَدِيْثِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ.

﴿سالم بن عبداللہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطابؓ عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی بیان کردہ حدیث کے

مطابق سرغ سے لوگوں کو لے کر واپس لوٹے۔﴾

وضاحت :

اس روایت کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ یہاں راوی نے مختصر الفاظ میں مذکورہ واقعہ کا حوالہ دیا ہے۔

النَّهْيُ عَنِ الْقَوْلِ بِالْقَدَرِ

تقدیر پر کلام کی ممانعت

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِی الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ تَحَاجَّ آدَمُ وَ مُوْسٰى فَحَجَّ آدَمُ مُوْسٰى قَالَ لَهٗ مُوْسٰى اَنْتَ آدَمُ الَّذِی اَغْوَيْتَ النَّاسَ وَ اَخْرَجْتَهُمْ مِنَ الْجَنَّةِ فَقَالَ لَهٗ آدَمُ اَنْتَ مُوْسَى الَّذِی اَعْطَاهُ اللّٰهُ عِلْمَ كُلِّ شَیْءٍ وَ اصْطَفَاهُ عَلَى النَّاسِ بِرِسَالَتِهٖ قَالَ نَعَمْ قَالَ اَفَتَلُوْمُنِی عَلٰى اَمْرٍ قَدْ قُدِّرَ عَلَیَّ قَبْلَ اَنْ اُخْلَقَ.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حضرت آدم اور حضرت موسیٰ کے مابین حجت ہوئی تو آدم نے موسیٰ کو لاجواب کر دیا۔ موسیٰ نے ان سے کہا، آپ وہی آدم ہیں جنہوں نے لوگوں کو بھٹکایا اور ان کو جنت سے نکالا؟ اس پر آدم نے انہیں جواب دیا، آپ وہی موسیٰ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا علم دیا اور رسالت سے سرفراز فرما کر تمام انسانوں پر فضیلت بخشی۔ موسیٰ نے کہا ہاں۔ تو آدم نے کہا: کیا آپ مجھے ایک ایسی بات پر ملامت کر رہے ہیں جو میری تخلیق سے قبل ہی مجھ پر لکھ دی گئی تھی۔﴾

وضاحت :

حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے مابین یہ حجت کب اور کہاں ہوئی اس کے بارے میں روایت خاموش ہے۔ ہو سکتا ہے اسے عالم مثال کے ایک واقعہ کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہو اور اس کا مقصد ان لوگوں کی اصلاح ہو جو آدم علیہ السلام کو مورد الزام سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی نسل کو جنت سے نکلوایا۔ دوسری بات یہ ہو

سکتی ہے کہ اس کا تعلق امر الٰہیات سے ہو۔ یہود میں اس طرح کی بہت سی کہانیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کرۂ زمین پر ایک بالاختیار مخلوق بسانے کا فیصلہ تو پہلے ہو چکا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فیصلہ سے فرشتوں کو آگاہ بھی کر دیا تھا۔ اس مخلوق کو نیکی اور بدی کے ارتکاب اور اطاعت اور نافرمانی دونوں کی صلاحیت دی جانی مقصود تھی۔ آدم علیہ السلام کو جنت میں امتحان کے لیے رکھا گیا اور جب ان سے شجر ممنوعہ کا پھل کھانے کی خطا سرزد ہوئی تو ان کو زمین پر اسی فیصلہ کے مطابق بھیجا گیا جس سے فرشتوں کو پہلے آگاہ کیا جا چکا تھا۔ آدم علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو یہی حقیقت بتا کر لاجواب کر دیا۔

❐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَبِي أُنَيْسَةَ عَنْ عَبْدِ الْحَمِيدِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ زَيْدِ بْنِ الْخَطَّابِ أَنَّهُ أَخْبَرَهُ عَنْ مُسْلِمِ بْنِ يَسَارٍ الْجُهَنِيِّ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ سُئِلَ عَنْ هٰذِهِ الْآيَةِ وَ إِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ أَشْهَدَهُمْ عَلَى أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَى شَهِدْنَا أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غَافِلِينَ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يُسْأَلُ عَنْهَا فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى خَلَقَ آدَمَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهُ بِيَمِينِهِ حَتَّى اسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً فَقَالَ خَلَقْتُ هٰؤُلَاءِ لِلْجَنَّةِ وَ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ يَعْمَلُونَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهُ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً فَقَالَ خَلَقْتُ هٰؤُلَاءِ لِلنَّارِ وَ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ يَعْمَلُونَ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللّٰهِ فَفِيمَ الْعَمَلُ قَالَ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِنَّ اللّٰهَ إِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلْجَنَّةِ اسْتَعْمَلَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى يَمُوتَ عَلٰى عَمَلٍ مِنْ أَعْمَالِ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيُدْخِلُهُ رَبُّهُ الْجَنَّةَ وَ إِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلنَّارِ اسْتَعْمَلَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتّٰى يَمُوتَ عَلٰى عَمَلٍ مِنْ أَعْمَالِ أَهْلِ النَّارِ فَيُدْخِلُهُ رَبُّهُ النَّارَ.

﴿مسلم بن یسار جہنی بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ سے آیت وَ إِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ الخ (اور یاد کرو جب نکالا تمہارے رب نے بنی آدم سے ..... ان کی پیٹھوں سے ..... ان کی ذریت کو اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ بولے

ہاں تو ہمارا رب ہے۔ ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ مبادا قیامت کو تم عذر کرو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے) کی بابت سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں جب سوال کیا گیا تو میں نے وہ سنا تھا۔ رسول اللہؐ نے اس کا جواب یہ دیا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا، پھر اپنا ہاتھ ان کی کمر پر پھیرا یہاں تک کہ ان کی کچھ ذریت اس میں سے نکال لی اور فرمایا کہ ان لوگوں کو میں نے جنت کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ جنتیوں کے عمل کریں گے۔ پھر اس نے آدم کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کچھ ذریت نکالی اور فرمایا کہ ان لوگوں کو میں نے دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ دوزخیوں کے کام کریں گے۔ اس پر ایک آدمی نے سوال کیا، یا رسول اللہ، پھر عمل کی کیا وقعت رہی۔ تو رسول اللہؐ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے ایک بندے کو جنت کے لیے پیدا کیا تو وہ اس سے جنتیوں کے کام کرواتا ہے یہاں تک کہ اس کی موت جنتیوں کے کسی عمل پر واقع ہوتی ہے تو اس کا رب اس کو جنت میں داخل کر دیتا ہے اور جب خدا کسی بندے کو دوزخ کے لیے پیدا کرتا ہے تو اس سے دوزخیوں کے کام کرواتا ہے یہاں تک کہ اس کی موت دوزخیوں کے کسی عمل پر واقع ہوتی ہے تو اس کا رب اس کو دوزخ میں داخل کر دیتا ہے۔﴾

وضاحت :

وہ آیت جس کے بارے میں حضرت عمرؓ سے سوال کیا گیا سورہ اعراف کی آیت ۱۷۲ ہے۔ اس میں قریش کو وہ عہد فطرت یاد دلایا ہے جو تمام بنی آدم سے اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید و ربوبیت کا لیا اور اس کو بنیاد قرار دے کر ان پر حجت قائم کی ہے کہ کل کو خدا کے حضور میں تم یہ عذر نہیں کر سکو گے کہ تم اس چیز سے بے خبر تھے۔ اس کے بعد آگے یہ وضاحت فرمائی ہے کہ ہم نے ان جن و انس کو جہنم کے لیے پیدا کیا ہے جن کو ہم نے دل عطا فرمائے لیکن انہوں نے اس سے سمجھنے کا کام نہ لیا، ان کو آنکھیں عطا فرمائیں لیکن ان کی مدد سے انہوں نے حقیقت کو دیکھا نہیں، ان کو کان عطا کیے لیکن ان کی مدد سے انہوں نے پیغمبر کی بات نہ سنی۔ ان لوگوں نے جانوروں کی مانند زندگی گزار دی اور دل و دماغ کی صلاحیتوں اور سمع و بصر کی قوتوں کو کام میں نہ لائے۔

قرآن مجید میں عہد فطرت کا جو بیان ہے اس کے مطابق اس عہد کا تقاضا یہ ہے کہ تمام لوگ اپنی عقل، اپنے شعور اور اپنے حواس کو کام میں لاتے ہوئے اپنے رب کی اطاعت پر قائم رہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو جہنم میں ان کا ٹھکانا ہوگا۔ اس کی وضاحت میں قرآن مجید میں مفصل بحثیں ملتی ہیں۔ اس کے برعکس اس روایت میں یہ تو بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہنم کے لیے ان لوگوں کو پیدا کیا جو جہنمیوں کے کام کریں گے اور جنت کے لیے ان لوگوں کو پیدا کیا جو جنتیوں کے عمل کریں گے لیکن اس اہم حقیقت کا بیان اس میں نہیں ہے کہ جنت اور جہنم کا سامان وہ قدرت کی طرف سے عطا کردہ قوتوں اور صلاحیتوں کے صحیح یا غلط استعمال کے نتیجہ میں کریں گے۔ لہٰذا روایت ناتمام معلوم ہوتی ہے اور یہ تاثر دیتی ہے جیسے انسانوں کو پہلے ہی سے جنتی یا جہنمی بنا کر دنیا میں بھیج دیا گیا ہے۔

صحیح مسلم میں اس ضمن کی بہت سی روایتیں جمع کی گئی ہیں لیکن زیر بحث روایت اس میں نہیں لی گئی۔ جبکہ دیگر روایات میں صورت واقعہ نہایت واضح طور پر بیان ہوئی ہے۔ مثلاً حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ بقیع کے قبرستان میں کسی جنازہ کے ساتھ تھے کہ نبی ﷺ تشریف لائے اور لوگوں میں بیٹھ گئے۔ آپ سر جھکا کر اپنی چھڑی سے زمین کریدنے لگے۔ پھر فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص کا مقام جنت یا جہنم میں مقرر کر دیا گیا ہے اور یہ بات واجب کر دی گئی ہے کہ وہ خوش بخت ہوگا یا بدبخت۔ اس پر ایک شخص نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ، پھر ہم عمل کو چھوڑ کر اپنے لکھے ہوئے پر ہی کیوں نہ قانع ہو جائیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ خوش بخت آدمی سعادت مندوں کا عمل اختیار کرے گا اور جو بدبخت ہوگا وہ بدبختوں ہی کا عمل اختیار کرے گا۔ لہٰذا تم عمل کرو۔ دونوں قسم کے لوگوں کے لیے عمل کی راہ ہموار کی جائے گی۔ سعادت مند لوگوں کو سعادت مندوں ہی کے عمل کی توفیق عطا کی جائے گی اور بدبختوں کے لیے بدبختوں کے عمل ہی کی راہ ہموار کی جائے گی۔ پھر آپ نے یہ آیات پڑھیں:

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی وَ اَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی (جس شخص نے مال دیا، پرہیزگاری اختیار کی اور اچھے انجام کو سچ جانا اس کو تو ہم اہل بنائیں گے راحت کی منزل کا اور جس نے بخل کیا، بے پروائی کی اور اچھے انجام کو جھٹلایا تو ہم اس کو ڈھیل دیں گے کٹھن منزل کے لیے) اس سے معلوم ہوا کہ بندہ جس عمل کو اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ کا اس سے یہ وعدہ ہے کہ اسی عمل کی راہ اس کے لیے ہموار کرے گا اور اسی سے اس کی تقدیر وجود میں آئے گی۔

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ تَرَكْتُ فِيْكُمْ اَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا

مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابَ اللّٰهِ وَ سُنَّةَ نَبِيِّهٖ.

﴿امام مالک کو یہ بات پہنچی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے تم میں دو چیزیں ایسی چھوڑی ہیں جن کو تم اگر مضبوطی سے تھامو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت۔﴾

وضاحت:

اللہ کی کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے اور سنت نبی سے مراد رسول اللہ ﷺ کا وہ طریقہ ہے جو آپ نے بطور معلم شریعت اور حیثیت کامل نمونہ کے احکام و مناسک کے ادا کرنے اور زندگی کو اللہ تعالیٰ کی پسند کے سانچہ میں ڈھالنے کے لیے لوگوں کو بتایا اور سکھایا۔ قرآن اور سنت میں تعلق روح اور قالب کا ہے۔ قرآن مجید میں جو روح ہے اس کو سنت رسول اللہ ﷺ سے قالب نصیب ہوتا ہے۔ ان دونوں کی باہمی ترکیب سے دین کا نظام کھڑا ہوتا ہے اور اگر کسی ایک کو الگ کر لیجئے تو سارا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا۔

امام صاحب اس روایت کو تقدیر کے باب میں لائے ہیں۔ اس سے شائد یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ انسان اپنی دنیاوی زندگی میں نیکوں یا بدوں کے اعمال کرنے کا اختیار رکھتا ہے لیکن اگر قرآن مجید اور سنت رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں چلے تو وہ کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا اور اپنے لیے جنت کی راہ ہموار کر سکتا ہے۔

دیکھا جائے تو یہ مان لینے کے بعد کہ جنت یا دوزخ کا مقام انسانوں کے لیے پہلے ہی سے طے کر دیا گیا ہے، نہ سلسلۂ انبیاء کی ضرورت رہتی نہ آسمانی صحیفوں کی۔ اگر اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجنے کا سلسلہ جاری کیا اور وحی کی رہنمائی انسانوں کو مہیا کی تو ظاہر ہے کہ انسان تربیت پانے کا اہل ہے اور تربیت پا کر اپنی اصلاح کرنے اور جنت میں اپنا مقام بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ رہی یہ بات کہ انسان نیکی کی راہ اختیار کرے گا یا بدی کی، تو یہ اللہ تعالیٰ کے محیط کل علم میں ہے۔ لیکن یہ علم اس کا سبب نہیں بنا اور نہ ہی انسان کو مجبور کر کے نیکی یا بدی کی راہ پر لگایا گیا ہے۔

□ حَدَّثَنِی يَحْيٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ زِيَادِ بْنِ سَعْدٍ عَنْ عَمْرِو بْنِ مُسْلِمٍ عَنْ طَاوُسٍ الْيَمَانِيِّ اَنَّهٗ قَالَ اَدْرَكْتُ نَاسًا مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُوْنَ كُلُّ شَیْءٍ بِقَدَرٍ قَالَ طَاوُسٌ وَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ يَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كُلُّ شَیْءٍ بِقَدَرٍ حَتّٰی الْعَجْزِ وَالْكَيْسِ اَوِ الْكَيْسِ وَالْعَجْزِ.

﴿طاؤس یمانی کا قول ہے کہ میں نے اصحاب رسول اللہ ﷺ میں سے بہت سے لوگوں کو پایا جو اس کے قائل تھے کہ ہر چیز تقدیر سے ہے، اور میں نے عبداللہ بن عمرؓ کو بیان کرتے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر چیز تقدیر سے ہے، یہاں تک کہ بلاہت اور زیرکی بھی، یا زیرکی اور بلاہت بھی۔﴾

وضاحت :

صحابہ کرامؓ کے اس قول اور آنحضرتؐ کے ارشاد میں تھوڑی سی تشریح ہے۔ ایک بلاہت، سفاہت اور بے وقوفی، یا زیرکی، ہوشیاری اور فہم تو وہ ہے جس کو انسان علم، محنت، غور و فکر اور تربیت سے خود ترقی دیتا ہے۔ اور ایک وہ ہے جو خلقی ہے مثلاً کوئی پیدائی ہوا ہے بے وقوف یا ادرز اوا ندھا۔ اس طرح کے لوگ جو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے کوئی نقص لے کر پیدا ہوتے ہیں ان کا معاملہ تو بالکل صاف ہے اور ان کا انعام بھی بہت بڑا ہے۔ قیامت کے روز لوگ ان پر رشک کریں گے اور کہیں گے کہ کاش ہم فقیر ہوتے، کاش ہم سڑک پر پھرنے والے دیوانے ہوتے۔ اس دنیا کے پیچھے پڑ کے ہم نے اپنی زندگی تباہ کر لی۔ یہ ناقص الخلقت لوگ خدائی ڈیوٹی پر ہیں۔ یہ سڑک پر لگے ہوئے پتھر ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ یہ ادرز اوا ندھے کیوں پیدا کیے گئے تو آپ نے فرمایا تاکہ آنکھ والوں کو بھائی دے۔ ان کو بھی نظر آئے کہ خدا ہم کو بھی ایسا بنا سکتا تھا۔ اور اس طرح اپنی سلامتی پر اللہ کا شکر ادا کریں۔

رہے وہ لوگ جو خلقی اعتبار سے اچھے خاصے پیدا ہوتے ہیں، اگر ان کے ماں باپ نے بچپن میں ان کی کوئی تربیت نہ بھی کی ہو تب بھی یہ ہوش سنبھالنے پر اپنی تربیت کی صلاحیت و نشوونما کی عقل رکھتے ہیں، ایسے لوگوں کو اچھے لوگوں میں بیٹھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسی طرح اگر کسی کو علم و فن حاصل کرنے کا موقع ہے تو خالی دنیا ہی کا فن سیکھنے کی کوشش نہ کرے بلکہ وسیع دائرے میں ترقی کرنے کی کوشش کرے۔ یہ چیزیں ان کے اختیار میں ہیں اور انتخاب سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگر آپ اچھے گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں، کالجوں کی تعلیم حاصل کی ہے، آپ نے ایک چالاک اور ہوشیار آدمی بننے کی کوشش کی ہے، نیک بننے کی کوئی کوشش نہیں کی، تو آپ اس کے مسئول ہیں۔ لہٰذا جہاں تک بلاہت اور زیرکی کا تعلق فطری صلاحیت سے ہے تو وہ خدا کی طرف سے ہے۔ باقی میں کسی نہ کسی پر ذمہ داری ضرور آئے گی۔ اگر ماں باپ اس قابل تھے کہ تربیت کرتے اور انہوں نے نہیں کی تو ان پر اس ذمہ داری کا بوجھ ہوگا اور اگر آپ نے خود جدوجہد نہیں کی تو آپ پر بھی ذمہ داری آئے گی۔ ذمہ داری یہ کہ کر ٹالی نہیں جا سکتی کہ یہ تو

تقدیر تھی۔ ساری زندگی خود بیکار بنے رہے تو اس کے نتائج کا خواہ مخواہ اللہ تعالیٰ پر الزام نہیں رکھا جا سکتا۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زِيَادِ بْنِ سَعْدٍ عَنْ عَمْرِو بْنِ دِينَارٍ أَنَّهُ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ الزُّبَيْرِ يَقُولُ فِي خُطْبَتِهِ إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْهَادِي وَالْفَاتِنُ.

﴿عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن زبیرؓ کو خطبے میں یہ کہتے سنا کہ اللہ ہی ہدایت دینے والا ہے اور وہی فتنے میں ڈالنے والا ہے۔﴾

وضاحت :

یہ بات ٹھیک ہے لیکن اس میں بھی تھوڑی سی شرح ہے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے اور فتنے میں ڈالتا بھی اس کے اختیار میں ہے لیکن یہ سب کچھ اس کی سنت کے تحت ہوتا ہے۔ وہ ہدایت اس کو دیتا ہے جو ہدایت کے طالب بنتے ہیں۔ فتنوں میں ان کو ڈالتا ہے جو فتنے میں پڑنے میں بے باک ہوتے ہیں۔ اس روایت کے حوالے سے یہ بات بھی یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف جو افعال منسوب ہوتے ہیں ان افعال سے اللہ کی صفت بنانا درست نہیں۔ اسمائے صفات وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق خود استعمال کیے ہیں۔ لفظ فاتن خدا کے اسمائے صفات میں نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے سنت الٰہی باطل ہوتی ہے اور فتنہ میں پڑنے میں آدمی کا اپنا دخل سامنے نہیں آتا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کو فاتن کہنا درست نہیں۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَمِّهِ أَبِي سُهَيْلِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّهُ قَالَ كُنْتُ أَسِيرُ مَعَ عُمَرَ بْنِ عَبْدِالْعَزِيزِ فَقَالَ مَارَأْيُكَ فِي هٰؤُلَاءِ الْقَدَرِيَّةِ فَقُلْتُ رَأْيِي أَنْ تَسْتَتِيبَهُمْ فَإِنْ تَابُوا وَ إِلَّا عَرَضْتَهُمْ عَلَى السَّيْفِ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِالْعَزِيزِ وَ ذٰلِكَ رَأْيِي قَالَ مَالِكٌ وَ ذٰلِكَ رَأْيِي.

﴿امام مالک اپنے چچا ابو سہیل سے روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ساتھ چل رہا تھا کہ انہوں نے پوچھا کہ تمہاری رائے ان قدریہ کے بارے میں کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ آپ ان سے توبہ کا مطالبہ کریں۔ اگر توبہ کر لیں تو فبہا ورنہ ان کو تلوار کے حوالہ کریں۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا کہ میری رائے بھی یہی ہے۔ مالک کہتے ہیں کہ یہی میری رائے ہے۔﴾

وضاحت :

اس روایت میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قدریہ سے مراد کون لوگ ہیں۔ ظاہر ہے کہ تقدیر کو ماننے والے مراد نہیں ہو سکتے کہ ان کو واجب القتل ٹھہرایا جائے۔ قدریہ وہ لوگ ہونے چاہئیں جو تقدیر پر معترض ہوں، جو بندے کو مختار مطلق سمجھتے اور اس کے افعال کا خالق خود اسی کو سمجھتے ہوں۔ کیونکہ یہی نقطہ نظر قرآن مجید کی تصریحات کے خلاف ہے۔

خود تقدیر کے مسئلہ میں بھی لوگ واضح نہیں ہیں۔ اس کے ماننے والے اس کی تعبیر اس طریقہ سے کر دیتے ہیں کہ جس سے آدمی کی بدی اور گمراہی کا الزام بھی اللہ تعالیٰ پر آتا ہے۔ ان کے نزدیک ہر فعل کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ جبکہ قرآن مجید میں ہے کہ :

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی وَ اَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی (اللیل ۵۔۱۰)

(سو جس نے انفاق کیا اور پرہیزگاری اختیار کی اور اچھے انجام کو سچ جانا اس کو تو ہم راہ بنائیں گے راحت کی منزل کا اور جس نے بخالت کی اور بے پروا ہوا اور اچھے انجام کو جھٹلایا اس کو ہم ڈھیل دیں گے کٹھن منزل کے لیے)

اس سے معلوم ہوا کہ جتنی نیکیاں انسان کرتا ہے ان کی توفیق اللہ تعالیٰ دیتا ہے اور جتنی برائیوں کا وہ ارتکاب کرتا ہے ان کو بھی وہ اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو ڈھیل نہ ملے۔ کسی عمل کی توفیق ملنے اور ڈھیل حاصل ہونے میں اور خدا کے اس عمل کا خالق ہونے میں جو فرق ہے وہ نہایت واضح ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیت آپ کو دی ہے اسی کے لحاظ سے آپ سے گواہی لی ہے اور نیکی اور بدی کا امتیاز عطا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو بھیجا تاکہ آپ کو یاد دہانی کرا دیں۔ تذکیر کریں تاکہ آپ کی صلاحیتیں ابھریں۔ چنانچہ آپ نیکی یا بدی کا ارادہ کر سکتے ہیں، اس کے لیے تدبیر کر سکتے ہیں، اس کے لیے اقدام اور جدوجہد کر سکتے ہیں۔ لیکن اس ارادہ کو روبہ کار لانا اللہ کے اختیار میں ہے۔ آپ کے اندر جنت حاصل کرنے کی صلاحیت ہے۔ اگر آپ اس کے خلاف چلتے ہیں تو اپنی صلاحیت کی ناقدری کرتے ہیں۔ آپ کے اندر اصل صلاحیت خیر کی ودیعت کی گئی ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ آپ اس کو اختیار کریں۔ انسان کے اندر ارادہ کے پیدا کرنے میں بہت سی چیزوں کو دخل ہوتا ہے۔ یہ اس کے افعال کا محرک بنتی ہیں۔ ارادہ میں جذبات و خواہشات کو بھی دخل ہے اور ضروریات کو بھی۔

ہے، حوصلہ، غصہ، نفس امارہ یا سوء یہ سب محرک ہیں۔ اس کے علاوہ انسان کے اندر روحانی قوت اور ملکہ بھی ہے جو اس کے ارادے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس بات کی تمیز دی ہے کہ ہم اپنے ہر فعل پر حکم لگا سکیں کہ اس کا محرک ہماری روح ملکوتی ہے یا حیوانی خواہشات۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ غلط محرک کے آگے رکاوٹ کھڑی کر دے۔ اگر وہ ایسا نہ کر پائے گا تو وہ صبر میں کمزور ہے۔ وہ اپنے نفس کو لگام نہیں دے پاتا۔ اگر وہ غلط محرک کو روک دیتا ہے تو یہ اس کے عزم و ہمت پر دلیل ہے۔ اسی چیز میں انسان کا امتحان ہے اور اسی پر جزا یا سزا مترتب ہوگی۔

قرآن مجید میں یہ جو آتا ہے کہ مَنْ شَاءَ فَلْیُؤْمِنْ وَ مَنْ شَاءَ فَلْیَكْفُرْ (جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے) تو یہ آپ کے اختیار کی تعبیر ہے۔ یعنی آپ کو ایمان اور کفر دونوں کا اختیار ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ چاہتا یہ ہے کہ آپ ایمان لائیں اور ہدایت کا راستہ اختیار کریں۔ وہ بالجبر کسی پر کوئی چیز نہیں ٹھونستا۔ یہ جو آتا ہے کہ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ یا یُضِلُّ مَنْ یَّشَاءُ اس کو خدا کے پسند کرنے کے معنی میں لینا درست نہیں۔ بلکہ اس سے اس کی مشیت کا مطلق ہونا مراد ہے اور یہ اس کی تعبیر کے لیے آتا ہے۔ جن چیزوں کو وہ چاہتا ہے اس کی مشیت ان کی ڈھیل دے دیتی ہے لیکن وہ ان چیزوں کو بھی ڈھیل دے دیتا ہے جن کو وہ نہیں چاہتا۔ اگر خدا وند نہ چاہے تو بندے سے سوا فرعون بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن چاہنے کے معنی پسند کرنے کے ہرگز نہیں ہیں۔ یشاء کے معنی پسند کرنا لے کر امت کے کئی فرقوں نے بات کو کچھ کا کچھ بنا دیا ہے جس سے تقدیر کا مسئلہ الجھ کر رہ گیا ہے۔

اب ایک سوال باقی ہے کہ کیا مسئلہ تقدیر میں غلطی کی بنا پر لوگوں کو توبہ کی مہلت دی جائے گی اور رجوع نہ کرنے پر قتل کر دیا جائے گا، تو امام مالک کا مذہب یہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حوالہ سے ان کا جو مسلک سامنے آتا ہے تو اس کے مطابق انہوں نے اپنے دور حکومت میں کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ شاید معاملہ رائے ہی تک محدود رہا اور اسی پر ختم ہو گیا۔

تقدیر کی بحث میں ایک سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کہ کیا یہ بات اللہ تعالیٰ نے لکھ دی ہے کہ فلاں شخص جنت میں جائے گا اور فلاں شخص دوزخ میں، تو یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ ایک شخص فلاں عمل کر کے جنت یا دوزخ میں جائے گا۔ گویا دوزخ یا جنت میں جانے کا ذریعہ انسان کے اپنے اعمال ہوں گے۔ باقی رہ گیا خدا کا علم تو وہ ہر چیز پر محیط ہے۔ لہٰذا وہ ہر انسان کے انجام کو بھی محیط ہے۔ لیکن خدا کا علم کسی کو جنت یا دوزخ میں لے جانے کا سبب نہیں بنے گا۔ سبب انسان کے اعمال ہی ہوں گے۔

جَامِعُ مَاجَاءَ فِي أَهْلِ الْقَدَرِ

اہل قدر کے بارے میں جامع باب

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا تَسْاَلِ الْمَرْاَةُ طَلَاقَ اُخْتِهَا لِتَسْتَفْرِغَ صَفْحَتَهَا وَلْتَنْكِحْ فَاِنَّمَا لَهَا مَا قُدِّرَ لَهَا.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی عورت اپنی بہن کی طلاق کا مطالبہ نہ کرے تاکہ اس کے حصے کی روٹی پر قبضہ کرلے اور نکاح کرلے۔ اس کو یاد رکھنا چاہیے کہ اس کو وہی ملے گا جو اللہ نے اس کے لیے مقدر کر رکھا ہے۔﴾

وضاحت :

مطلب یہ ہے کہ کسی عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی مرد سے یہ کہے کہ اگر تم اپنی موجودہ بیوی کو طلاق دے دو تو میں تم سے نکاح کرلوں گی۔ یہ نہایت ہی دناءت کی بات ہے کہ وہ دوسری عورت کی رکابی یا اس کے حصے کی روٹی پر قبضہ کرلے اور اس کے شوہر کو اس سے جدا کر کے اس سے خود نکاح کرلے۔ اس کی دلیل حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمائی کہ اس کو ملے گا وہی جو اللہ تعالیٰ نے مقدر کر رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ عمر مقدر ہے، رزق مقدر ہے، صحت مقدر ہے، اولاد مقدر ہے، جب یہ سب چیزیں مقدر ہیں تو آدمی کو کم ظرفی اور دناءت کا معاملہ نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہوگا وہی جو خدا کو منظور ہوگا۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَزِيدَ بْنِ زِيَادٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ كَعْبٍ الْقُرَظِيِّ قَالَ قَالَ مُعَاوِيَةُ بْنُ اَبِي سُفْيَانَ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّهُ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَى اللّٰهُ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعَ اللّٰهُ وَلَا يَنْفَعُ ذَالْجَدِّ مِنْهُ الْجَدُّ مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ ثُمَّ قَالَ مُعَاوِيَةُ سَمِعْتُ هٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ عَلَى هٰذِهِ الْاَعْوَادِ.

﴿محمد بن کعب قرظی کہتے ہیں کہ معاویہؓ بن ابوسفیان نے، جب وہ منبر پر تھے، کہا اے لوگو! کوئی اس چیز کو روک نہیں سکتا جو اللہ دینا چاہے اور کوئی دے نہیں سکتا جس کو اللہ روک دے۔ اور کسی زور آور کا زور

اللہ کے مقابل اس کے کام نہیں آسکتا۔ اللہ جس کے ساتھ بھلائی چاہتا ہے اس کو دین کا فہم عطا کر دیتا ہے۔ پھر معاویہ نے کہا کہ میں نے یہ شاندار باتیں رسول اللہ ﷺ سے اس منبر پر سنیں۔﴾

وضاحت :

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ جس کو دینا چاہے اسے کون روک سکتا ہے اور اگر اللہ روک لے تو کون دے سکتا ہے۔ آپ کتنے ہی زور آور ہوں، ہفت آور ہوں لیکن یہ چیز اللہ سے چھا نہیں سکتی۔ اللہ تعالیٰ جب چاہے گا ہاتھ ڈال لے گا اور کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اللہ جس کے ساتھ بھلائی چاہتا ہے اس کو دین کا فہم عطا کر دیتا ہے۔ اس جملہ میں خاص مفہوم یہ ہے کہ دنیا کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے آدمی خواہ مخواہ میں کیوں ہراساں اور پریشان ہو۔ اللہ تعالیٰ سے وہ نعمت چاہے جس کو کوئی چھین نہیں سکتا۔ سب سے بڑی نعمت دین کی سمجھ ہے۔ یہ گویا چھوٹی باتوں کی جائے بڑی دولت کی طرف اشارہ کر دیا۔ آج کے ماحول میں یہی بات یوں کہی جاسکتی ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ چھوڑ دیتا ہے اس کو موجودہ زمانے کی وزارت و صدارت دے دیتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسا آدمی متروک و مہجور ہو جاتا ہے۔ وہ اللہ کی عنایت سے بالکل محروم ہو جاتا ہے۔ لیکن دین کے فہم کی قدر یہ لوگ کہاں جانتے ہیں!۔

پھر معاویہؓ نے کہا کہ یہ شاندار باتیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس منبر پر سنیں۔ ھٰؤلاء کا ترجمہ میں نے شاندار کیا ہے اس لیے کہ ھٰؤلاء کا اشارہ مذکر کے لیے آتا ہے اور یہاں مؤنث کے لیے آیا ہے۔ عربیت میں یہ ایک قاعدہ ہے کہ ضمیروں اور اشارے استعمال کر کے گویا ایک چیز کی شان بڑھا دی جاتی ہے۔ جیسے قرآن مجید میں فرشتوں اور حضرت قوم کے قصہ میں ہے کہ مجھے ان لوگوں کے نام بتاؤ (باسماء ھٰؤلاء) اگر تم سچے ہو۔ تو اس وقت فرشتوں سے جن ناموں کے متعلق پوچھا گیا تو اصل میں کچھ جلیل القدر لوگوں کی طرف اشارہ تھا۔

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّهُ كَانَ يُقَالُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ كَمَا يَنْبَغِي الَّذِي لَا يَعْجَلُ شَيْءٌ اَتَاهُ وَ قَدَّرَهُ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَ كَفَى سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ دَعَا لَيْسَ وَرَاءَ اللّٰهِ مَرْمًى.

﴿امام مالک کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ یوں دعا کی جاتی رہی ہے کہ اس اللہ کا شکر ہے جس نے پیدا کیا جیسا کہ چاہیے تھا۔ وہ اللہ کہ کوئی چیز جو اس کے پاس آئی ہے اور جس کو اس نے مقدر کیا ہے وہ اس

سے عجلت نہیں کرتی۔ اللہ میرے لیے کافی ہے۔ اللہ نے اس کی سن لی جس نے اس سے دعا کی۔ اللہ کے علاوہ آدمی کے لیے کوئی ہدف نہیں۔﴾

وضاحت :

یہ روایت امام مالک کے بلاغات میں سے ہے۔ امام مالک کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مرسل، موقوف، منقطع سب ہی قسم کی روایات لے لیتے ہیں۔ وہ بات کو دیکھتے ہیں۔ اگر وہ بات رسول اللہ ﷺ فرما سکتے ہیں تو وہ لے لیتے ہیں۔ سند کی پروا نہیں کرتے۔ روایت میں بات دیکھی جاتی ہے۔ اگر وہ آنحضرت ﷺ کے فرمانے کی ہے تب زیادہ سند کی کھوج کی ضرورت نہیں اور اگر ایسی بات ہے جو آنحضرت ﷺ سے منسوب نہیں کی جا سکتی تو پھر چاہے بے حد مضبوط ہو، رد کر دی جائے گی۔ یہی بات امام مالک کے عمل سے نکلتی ہے۔ وہ عمل اہل مدینہ کے مقابل میں سند یا روایت کو اہمیت نہیں دیتے۔ یہ بات بھی ان کے قاعدے کے مطابق ہے، اس لیے کہ مدینہ صحابہ کرام کا مرکز تھا۔ بڑے علماء وہی لوگ تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کو خبر نہ ہو اور ان کا عمل آنحضرت ﷺ کے عمل سے الگ ہو۔ یہ بات دل کو اپیل کرتی ہے۔

اب اس روایت کو لیں۔ یہ دعا انہوں نے کسی کو پڑھتے سن لی ہو گی اور نقل کر دی۔ الفاظ صاف معلوم ہوتا ہے کہ غیر مرتب ہیں۔ فقرے اور عبارت شستہ نہیں۔ اگرچہ جتنے بھی ٹکڑے ہیں اسلامی عقائد کے مطابق ہیں۔ امام صاحب کا ظن غالب یہی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بات فرمائی ہو گی۔ لیکن میرا ظن غالب یہ ہے کہ یہ بات آنحضرت ﷺ نے نہیں فرمائی۔ حضور کی دعاؤں کا مزاج اور ان کے الفاظ اتنے اعلیٰ اور ان کی ترکیب اتنی چست ہوتی ہے کہ معجزہ ہوتی ہے۔ کوئی بھی دعا ہو وہ بے حد بلیغ اور جامع ہوتی ہے۔ اس سے اوپر بس قرآن ہی کی زبان ہوتی ہے۔ اس روایت کی دعا میں وہ بلاغت اور شستگی نہیں جو نبی ﷺ کی دعاؤں کا خاصہ ہے اور اس کی ترتیب بھی ویسی نہیں۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّهُ كَانَ يُقَالُ اِنَّ اَحَدًا لَنْ يَمُوتَ حَتّٰى يَسْتَكْمِلَ رِزْقَهُ فَاَجْمِلُوا فِي الطَّلَبِ.

﴿امام مالک کو یہ بات پہنچی کہ یہ کہا جاتا رہا ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک کہ وہ

اپنا رزق مکمل نہ کر لے۔ تو رزق کی طلب میں خوصورت طریقہ اختیار کرو۔﴾

وضاحت :

جو رزق مقدر ہے اور اللہ تعالیٰ نے لکھ رکھا ہے وہ تو مل کر رہے گا۔ آپ کا کام یہ ہے کہ آپ خوصورت طریقے سے اس کو طلب کریں۔ اس میں ایک بات تو یہ ہے کہ رزق مقدر ہونے کے باوجود یہ فرمایا کہ طلب آپ کو ہی کرنا ہے۔ اس لیے کہ آپ کے ارادے اور جدوجہد کا امتحان تو خدا کرے گا ہی، ارادے کو روئے کار لانا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ جتنا اس نے مقدر کیا ہے وہ دے گا تاہی۔ اب اگر ایک شخص کا عقیدہ یہ ہے کہ جو رزق اللہ نے میرے لیے لکھ رکھا ہے وہ تو مجھے ملے گا ہی، تو وہ جدوجہد کرنے میں چوری، بے ایمانی، رشوت یا اس قسم کی دوسری حرکتیں نہیں کرے گا۔ بلکہ جو صحیح راستہ ہے وہ اختیار کرے گا۔

یہ روایت بھی امام مالکؒ کے بلاغات میں سے ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے الفاظ ہیں۔ عبارت کی چستی اور الفاظ میں معنی کا طرز بیکراں ہے کہ جس کی شرح نہیں ہو سکتی۔

مَاجَاءَ فِي حُسْنِ الْخُلُقِ

حسن اخلاق کے بارے میں روایات

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّ مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ قَالَ آخِرُ مَا اَوْصَانِي بِهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حِيْنَ وَضَعْتُ رِجْلِي فِي الْغَرْزِ اَنْ قَالَ اَحْسِنْ خُلُقَكَ لِلنَّاسِ يَا مُعَاذُ بْنَ جَبَلٍ.

﴿معاذ بن جبلؓ نے بیان کیا کہ آخری بات، جس کی رسول اللہ ﷺ نے مجھے اس وقت نصیحت فرمائی جس وقت میں نے رکاب میں اپنا پاؤں رکھا، یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک رکھنا، اے معاذ بن جبل﴾

وضاحت :

اس روایت میں انقطاع ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام مالک کو اصل مطلب بات سے ہے۔ سند کو وہ زیادہ اہمیت نہیں دے رہے ہیں اور یہ بات بھی نبی ﷺ کے اپنے الفاظ میں معلوم ہوتی ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اس موقع کی ہے جب معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجا گیا۔ چونکہ ان کو وہاں گورنری کے

عہدہ پر بھیجا گیا تھا تو سب سے اہم نصیحت ان کو اس موقع پر یہی کی جا سکتی تھی کہ لوگوں کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آئیں۔ نبی ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تمہارے سامنے کوئی معاملہ آئے تو کیسے فیصلہ کرو گے۔ انہوں نے کہا کہ کتاب اللہ کی روشنی میں فیصلہ کروں گا۔ اگر کتاب اللہ سے رہنمائی نہ ملی تو سنت رسول سے مدد لوں گا۔ اگر وہاں بھی کچھ نہ پایا تو اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔ نبی ﷺ نے اس جواب پر معاذ کی تحسین فرمائی اور وہ آخری ہدایت دی جو اس روایت میں ہے۔

یہ ہدایت بہت اہم ہے اس لیے کہ اعلیٰ اخلاق یوں تو سب کے لیے بے حد ضروری ہے لیکن خاص کر حکمرانوں کا اخلاق تو بہت اچھا اور بے حد شریفانہ ہونا چاہیے تاکہ عوام اپنے مسائل ان کے آگے بلا خوف پیش کر سکیں اور انصاف حاصل کر سکیں۔ لیکن بالعموم ہوتا یہ ہے کہ حکمران عرش پر چڑھ جاتے ہیں اور کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتے۔ آنحضرت کی نصیحت حکمرانوں کے لیے نہایت برمحل ہے۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهَا قَالَتْ مَا خُيِّرَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي أَمْرَيْنِ قَطُّ إِلَّا أَخَذَ أَيْسَرَهُمَا مَالَمْ يَكُنْ إِثْمًا فَإِنْ كَانَ إِثْمًا كَانَ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنْهُ وَمَا انْتَقَمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِنَفْسِهِ إِلَّا أَنْ تُنْتَهَكَ حُرْمَةُ اللَّهِ فَيَنْتَقِمُ لِلَّهِ بِهَا.

﴿حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے جب ایسی صورت آتی کہ جس میں دو پہلو ہوتے تو آپ اس پہلو کو اختیار کرتے جو دونوں میں سے آسان تر ہوتا، بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہوتا۔ اگر وہ گناہ ہوتا تو آپ لوگوں میں سب سے زیادہ گناہ سے دور تر رہتے تھے اور رسول اللہ ﷺ نے کبھی اپنی ذات کا انتقام نہیں لیا۔ ہاں اگر دین کی بے حرمتی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کی خاطر اس کا انتقام لیتے تھے۔﴾

وضاحت :

اگر کوئی ایسا معاملہ درپیش ہو جس میں آپ کو فیصلہ کرنا ہو اور اس میں دو پہلو ہوں جن میں سے کسی بھی پہلو کو اختیار کرنے میں آپ آزاد ہوں تو وہ پہلو اختیار کرنا چاہیے جو سہل تر ہو۔ دین کے ہر معاملہ میں صحیح بات یہی ہے کہ وہ پہلو اختیار کریں جو آسان ہو اس لیے کہ اگر آپ شش و پنج میں آ کر یہ کریں کہ میں تو سخت پہلو ہی اختیار کروں گا

تو ہار کھا جائیں گے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص دین کے ساتھ دھینگا مشتی کرے گا تو دین اس کو پچھاڑ دے گا اور وہ شخص اپنے ارادے کو پورا کرنے میں ناکام ہو جائے گا۔ نبی ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جب کسی معاملہ میں دو پہلو ممکن ہوتے تو آپ اس میں سے وہ پہلو اختیار کر لیتے جو سہل تر ہوتا، بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو۔ اگر گناہ کا شائبہ تک بھی ہوتا تو آپ اسے اختیار نہیں کرتے تھے۔

دوسری بات یہ تھی کہ آپؐ اپنی ذات کے لیے کبھی انتقام نہ لیتے۔ آپ کو گالی دی گئی اور توہین کی گئی۔ آپ نے یہ سب کچھ برداشت کر لیا کیونکہ یہ آپ کی ذات کا معاملہ تھا۔ لیکن اللہ کے دین کی حرمت کو جن لوگوں نے نقصان پہنچایا تو ان سے آخر آپ نے جنگ بھی کی۔ اسی طرح اگر کسی نے دین کی بے حرمتی کی تو اس کو آپؐ نے سزا بھی دی۔ کسی نے کوئی حق تلفی کی تب بھی آپ نے مظلوم کو اس کا حق دلایا۔ لیکن اپنی ذات کے معاملہ میں آپ لوگوں کے لیے بے حد فیاض، کریم النفس اور درگزر فرمانے والے تھے۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عَلِيِّ بْنِ حُسَيْنِ بْنِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَالَا يَعْنِيهِ.

﴿علی بن حسینؒ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی کے اسلام کی خوبیوں میں سے یہ ہے کہ وہ اس چیز کو چھوڑ دے جو اس کے متعلق نہ ہو۔﴾

وضاحت :

مطلب یہ ہے کہ جیسے آپ کہتے ہیں کہ اس چیز سے میرا کیا واسطہ، یہ میرا Concern نہیں، تو یہ اسلام کی خوبیوں میں سے ہے۔ اسلام کے بہت سے درجے ہیں۔ اسلام کو اگر کوئی شخص بہترین طریقے پر اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مقصد زندگی سے غیر متعلق باتوں میں نہ پڑے۔ یہاں منہیات کا سوال نہیں ہے۔ ان سے بچنا تو واجبات دین میں سے ہے۔ یہاں مراد وہ چیزیں ہیں جو جائز ہیں لیکن مقصد زندگی کے لحاظ سے کچھ اہمیت نہیں رکھتیں۔ آنحضرت کا یہ ارشاد بہت بڑی حکمت کی بات ہے۔ اس حدیث کے متعلق لوگوں نے کہا ہے کہ یہ ان تین بڑی حدیثوں میں سے ایک ہے جو اصولی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کی حکمت بیان نہیں ہو سکتی۔

جو چیزیں زندگی میں جائز ہیں ان میں سے ہر چیز کو تو اختیار کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ آپ اپنی زندگی کے لیے کوئی ایک لائن اختیار کریں گے تو اس لائن سے جو چیزیں موافقت رکھتی ہیں، جو چیزیں مقصد میں مددگار ہو سکتی ہیں

اور آپ کے لیے بابرکت ہو سکتی ہیں صرف وہی آپ کو اختیار کرنی چاہیں۔ باقی دوسری چیزوں میں خواہ مخواہ میں چونچیں لڑانا اور ہر میدان کا غازی بننے کی کوشش کرنا ایک غیر مفید کام ہوتا ہے۔ یہ اصول سیاست میں، مذہب میں، تحقیق میں، غرض سب چیزوں میں کار آمد ہے۔ دنیا میں جتنے بھی قابل ذکر لوگ گزرے ہیں ان کی یہ حالت نہیں تھی کہ خدائی فوجدار کی طرح ہر چیز میں ٹانگ اڑاتے پھریں۔ بلکہ انہوں نے ایک لائن اختیار کی اور مضبوطی سے اس پر جمے رہے اور تمام غیر متعلق چیزوں کو انہوں نے نظر انداز کیا۔

اس بات کو یوں بھی سمجھ لیں کہ اپنی زندگی کو سنگھار کھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کے جو فرائض متعین کیے ہیں وہ بجالائیں۔ مثلاً یہ فرمایا کہ "کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ" تم میں سے ہر ایک راعی بنایا گیا ہے اور اس سے اس کے گلے کے متعلق پوچھا جائے گا۔ تو اپنے گلے کی فکر کریں۔ اگر اپنے گلے کو چھوڑ کر دوسروں کے گلوں کی چرواہی کرتے پھریں تو یہ حماقت ہے۔ فرض کریں کہ ایک شخص ہے۔ اس کا مقدم فریضہ ہے کہ اپنے خاندان کو، اپنے بچوں کو سنبھالے۔ یہ جواب اس کے لیے ٹھیک نہ ہوگا کہ میں تو خلق خدا کی تربیت پر لگا رہا۔ میرے بچے گمراہ ہو گئے تو میں کیا کرتا۔ یہ جواب آپ کو بچا نہ سکے گا۔ علیٰ ھذا القیاس آپ کے پڑوس سے متعلق آپ کی ذمہ داری ہے۔ آپ اس کی فکر کریں۔ آپ ساری دنیا کی فکر تو نہیں کر سکتے۔ اسی طرح یہ ذمہ داری بھی ہے کہ جو کوئی برائی دیکھے تو اس کی اصلاح کرے۔ اگر طاقت رکھتا ہو تو ہاتھ سے ورنہ زبان سے روکے، اور یہ بھی نہ ہو تو دل میں برا جانے۔ یہ کمزور ترین ایمان ہے۔ اصلاح کا یہ کام آپ کی زندگی کی مہمات میں سے ہے۔ اس سے زیادہ کے لیے آپ کے پاس فرصت ہے تو کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر غیر ضروری معاملات میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ زندگی کے جو اصل فرائض ہیں انسان اگر ان کو ہی صحیح طور پر ادا کرنا چاہے تو یہ واقعہ ہے کہ ان کو بھی صحیح طور پر ادا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جب انہی کو انجام دینا مشکل ہے تو غیر ضروری پرائے جھگڑے آپ اپنے سر پر کیوں لیں۔

اگر آپ کو خدمت خلق کا شوق ہے لیکن گھر کی خبر نہیں اور باہر کے تمام لوگوں کے لیے بھاگے پھرتے ہیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرہ تباہ ہو کے رہ جائے گا۔ اچھے لوگ، قابل لوگ، ذمہ دار لوگ اور قوم وملت کی خدمت کرنے والے وہی لوگ ہوں گے جو اپنی زندگی اس اصول کے تحت گزاریں کہ میں ایک مسلم ہوں۔ مسلم کی حیثیت سے مجھے اپنی زندگی کا نصب العین مقرر کر لینا ہے۔ اور جو چیزیں اس سے لگا کھاتی ہیں صرف ان کو لینا ہے اور جو ان

سے بے جوڑ ہیں ان سے احتراز کرنا ہے۔ آپ لوگوں کا حال تو یہ ہے کہ نہ معلوم کتنا وقت کرکٹ کھیلنے اور دیکھنے میں گزار دیتے ہیں۔ جو بات اپنے سروکار کی نہ ہو اس میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ ہر وقت اپنے نصب العین کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ یہ روایت بہت شاندار ہے۔

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِیِّ ﷺ اَنَّهَا قَالَتْ اسْتَاْذَنَ رَجُلٌ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَتْ عَائِشَةُ وَ اَنَا مَعَهٗ فِی الْبَیْتِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِئْسَ ابْنُ الْعَشِیْرَةِ ثُمَّ اَذِنَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَالَتْ عَائِشَةُ فَلَمْ اَنْشَبْ اَنْ سَمِعْتُ ضَحِكَ النَّبِیِّ ﷺ مَعَهٗ فَلَمَّا خَرَجَ الرَّجُلُ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ قُلْتَ فِیْهِ مَا قُلْتَ ثُمَّ لَمْ تَنْشَبْ اَنْ ضَحِكْتَ مَعَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ مِنْ شَرِّ النَّاسِ مَنِ اتَّقَاهُ النَّاسُ لِشَرِّهٖ.

﴿حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے آنے کی اجازت مانگی۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں گھر میں آپ کے ساتھ تھی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ قبیلے کا برا آدمی ہے۔ پھر اس کو اجازت دے دی۔ زیادہ دیر نہ گزری کہ میں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ اس کے ساتھ ہنس رہے ہیں۔ جب وہ شخص نکل گیا تو میں نے کہا یا رسول اللہ! آپ نے اس کے بارے میں جو بات کہی وہ تو کہی اور پھر میں نے آپ کو دیکھا کہ زیادہ دیر نہیں گزری کہ آپ اس کے ساتھ ہنس کر باتیں کر رہے ہیں، یہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بدترین آدمی وہ ہے کہ جس کے شر کی وجہ سے لوگ اس سے ملنا جلنا ترک کر دیں۔﴾

وضاحت:

آدمی سے ملاقات کے دوران آنحضرت ﷺ نے ہنس ہنس کر باتیں کیں تو یہ حقیقت میں آداب گفتگو اور آداب ملاقات میں سے ہے۔ ملنے والا دوست ہو یا دشمن، آدمی کو ملاقات اور گفتگو کے معاملے میں سیاسی ہونا چاہیے۔ یہ مناسب نہیں ہوتا کہ آپ ہر وقت منہ لے کے بات کریں کہ تو کافر ہے، مرتد ہے، جاہل ہے، میں تجھ سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ جو بھی آئے اس سے بات قرینے سے کریں، دلیل سے کریں، مہذب اور شائستہ طریقے سے

کریں۔ یہ آداب گفتگو میں سے ہے۔

آنحضرتؐ نے اس شخص کے متعلق جو یہ فرمایا کہ بئس ابن العشیرۃ اس پر لوگ بحث کرتے ہیں کہ آپ نے یہ غیبت کیوں کر جائز کرلی۔ میرے نزدیک نہ یہ غیبت تھی اور نہ آنحضرتؐ نے غیبت کو جائز کرلیا۔ غیبت وہ ہوتی ہے جس میں کسی کو بدنام کرنا مقصود ہو اور آدمی یہ کام اس کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر کر رہا ہو۔ رستہ چلتے کسی کے بارے میں رائے دینا اس ذیل میں نہیں آتا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ جو لوگ پبلک زندگی گزارنے کے عادی ہیں، وہ ہمارے لیڈر اور امام بن کر سامنے آتے ہیں، لوگوں سے وفاداری اور سمع و طاعت کا اقرار لینے کی جدوجہد کرتے ہیں تو ان کی زندگی پبلک ہوتی ہے۔ آپ ان پر ہر جگہ تنقید کرسکتے ہیں، بحث کرسکتے ہیں، اخباروں میں لکھ سکتے ہیں، ان کی ایک ایک چیز پر ان کے لتے لے سکتے ہیں، اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے متعلق کچھ کہنا غیبت نہیں۔ جن لوگوں نے اس کو غیبت سمجھا ہے میں نہیں جانتا کہ انہوں نے غیبت کا مفہوم کیا سمجھا ہے۔ جو لوگ پبلک میں نہیں جاتے، کوئی دعویٰ نہیں کرتے اور اپنی توفیق کے مطابق جو خدمت بن آئے وہ کرتے ہیں، اس قسم کے لوگوں کے متعلق اگر کوئی شخص پس پردہ بات کرے اور وہ بات ایسی ہو کہ اس کی خواہش یہ ہو کہ وہ متعلقہ آدمی نہ جاننے پائے تو یہ غیبت ہے، چاہے بات چاہے خود صحیح ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو دوسرے کے منہ پر کہنے کا تو حق حاصل ہے تاکہ اس کو نصیحت ہو لیکن پس پردہ کہنے کا کیا فائدہ۔ اس نے اپنے آپ کو پبلک میں تو پیش نہیں کیا ہے۔ لہٰذا میرے نزدیک آنحضرت ﷺ کی اس بات کو غیبت کہنا غلط ہے۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَمِّهِ أَبِي سُهَيْلِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ كَعْبِ الْأَحْبَارِ أَنَّهُ قَالَ إِذَا أَحْبَبْتُمْ أَنْ تَعْلَمُوا مَا لِلْعَبْدِ عِنْدَ رَبِّهِ فَانْظُرُوا مَاذَا يَتْبَعُهُ مِنْ حُسْنِ الثَّنَاءِ.

﴿ابو سہیل بن مالک اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ کعب احبار نے کہا کہ جب تم یہ جاننا چاہو کہ اس بندے کا اللہ کے ہاں کیا مرتبہ ہے تو اس بات کو دیکھو کہ لوگ اس کے پیچھے کیا تعریف کرتے ہیں۔﴾

وضاحت :

یہ رسول اللہ ﷺ کا قول نہیں بلکہ کعب احبار کی بات ہے۔ میرے خیال میں یہ بات انہوں نے اپنے اس علم کے مطابق کہی ہوگی جو ان کو یہود سے ملا تھا۔ ہمارے ہاں یہ مضمون اس سے قدرے مختلف آتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ایک شخص کا جنازہ جا رہا تھا تو لوگوں نے کہا کہ مرنے والا بہت صالح اور متقی بندہ تھا، شاید اس نے جنت پالی۔ اسی

طریقے سے ایک دوسرے آدمی کا جنازہ اٹھا تو لوگوں نے مرنے والے کو برا آدمی کہا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ دونوں آدمیوں کے ساتھ معاملہ لوگوں کی رائے کے مطابق ہوگا کیونکہ تم لوگ شهداء الله في الارض (روئے زمین پر اللہ کے گواہ) ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک یہ امت شهداء الله في الارض کے مقام پر فائز ہی اس وقت تک اس کی شہادت کا یہی درجہ تھا کہ جس کے متعلق اس نے کہا کہ خیر ہے، خدا کے ہاں بھی وہ خیر ہی قرار پایا۔ لیکن جب امت اس مرتبہ سے گر گئی تب ان کی شہادت کا کچھ وزن نہیں۔ اس وقت عالم اسلام کے چوٹی کے لیڈروں کا جو پوری قوم کے ماں باپ سمجھے جاتے ہیں، حال یہ ہے کہ ان کی زندگیوں کا اسلام سے کوئی تعلق جوڑنا چاہے تو مشکل سے بھی آپ کو اس کا کوئی سرا ہاتھ نہیں لگے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شهداء الله في الارض نہیں رہے۔

حضرت کعبؒ کی بات ان لوگوں کے متعلق درست ہے جو اپنے صحیح مقام پر ہیں۔ یہ صالحین اور ابرار کے تعلق سے درست ہے، ہمارے اول دور کے متعلق درست ہے، لیکن اس زمانے میں یہ بات غلط ہے کہ جس کے پیچھے جتنے زیادہ لوگ ہیں وہ اتنا ہی بڑا بنتی ہے۔ ہمارے معاشرہ میں آج کل جتنا ہی کوئی بڑا ممدوح ہے وہ اتنا ہی دین کے اعتبار سے ناقص نظر آتا ہے۔ لیکن لوگ اس کے شیدائی ہوتے ہیں۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ أَنَّهُ قَالَ بَلَغَنِي أَنَّ الْمَرْءَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهِ دَرَجَةَ الْقَائِمِ بِاللَّيْلِ الظَّامِئِ بِالْهَوَاجِرِ.

﴿یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ آدمی اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے رات میں نماز کے لیے کھڑے ہونے والے اور سخت دھوپ میں روزہ رکھنے والے کا درجہ حاصل کرلیتا ہے۔﴾

وضاحت :

حسن اخلاق سے مراد دانت نکال کر بات کرنا نہیں بلکہ لوگوں کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش آنا، لوگوں کی خدمت کرنا، ان سے ہمدردی کرنا، ان کی صحیح رہنمائی کرنا اور ان کی غلطیوں کو معاف کرنا ہے۔ یہ تمام کام جو شخص کرتا ہے وہ قائم باللیل اور صائم بالنہار کا ثواب حاصل کرسکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ نماز چھوڑ دیں، روزہ نہ رکھیں اور پھر بھی وہ مرتبہ آپ کو مل جائے۔ نہیں، آپ نماز پڑھتے رہیں گے، روزہ رکھیں گے اور حسن اخلاق سے پیش آئیں گے تو اگرچہ آپ نے زیادہ نمازیں نہیں پڑھیں، زیادہ روزے نہیں رکھے تو حسن خلق کی وجہ سے ان کی قدرے تلافی ہو جائے گی۔ مقصود آپ کو باکردار آدمی بنانا ہے۔

حدیث میں دوسری جگہ یہ بات بھی آئی ہے کہ ایک خاتون نمازیں تو زیادہ نہیں پڑھتی تھی لیکن دوسرے اس کی اذیت سے محفوظ رہتے اور وہ کچھ خیرات بھی کرتی تھی، تو آپ نے فرمایا کہ وہ جنتی ہے۔ عبادات میں جتنا فرض اور واجب ہے وہ کرنا ضروری ہے۔ اگر نماز روزہ چھوڑ دیں گے اور دن رات لوگوں کی خدمت کرتے رہیں گے تو آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ لیکن اگر آپ نماز روزہ واجب طریقے سے کرتے ہیں اور خدمت خلق بھی کرتے ہیں تو بلاشبہ آپ کا جتنا خلق اچھا ہوگا اس سے عبادات میں کمی کی تلافی ہوتی رہے گی۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ اَنَّهُ قَالَ سَمِعْتُ سَعِيْدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ يَقُوْلُ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِخَيْرٍ مِنْ كَثِيْرٍ مِنَ الصَّلَاةِ وَالصَّدَقَةِ قَالُوْا بَلٰى قَالَ اِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ وَ اِيَّاكُمْ وَالْبَغْضَةَ فَاِنَّهَا هِيَ الْحَالِقَةُ.

﴿یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ میں نے سعید بن مسیب سے سنا۔ وہ لوگوں سے پوچھ رہے تھے کہ کیا میں تم کو بتاؤں کہ زیادہ نماز اور زیادہ صدقہ سے بہتر کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں۔ تو کہنے لگے کہ دو آدمیوں کے درمیان معاملہ کی اصلاح کر دینا اور بغض اور عناد سے بچنا کہ یہ چیز مونڈ دینے والی ہے۔﴾

وضاحت :

مونڈ دینے کا مطلب یہ ہے کہ پھر اس کے بعد آدمی کے اندر دین کا کوئی شائبہ روہی نہیں جاتا۔ جس طرح سے حجام سر مونڈ دیتا ہے اسی طریقے سے باہمی بغض و عناد سارے دین کا تیاپانچہ کر دیتا ہے۔ یہ صائع مسلمانوں کے لحاظ سے درست بات ہے۔ لیکن جو شخص دین کا دشمن ہو گیا ہو اس سے بغض رکھنا ایمان کی علامت ہے۔

اس روایت کا مطلب بھی اوپر والی روایت کا ہی ہے کہ زیادہ نماز اور زیادہ صدقہ سے بڑھ کر اصلاح ذات البین کا مقام ہے۔ یعنی اگر آپ کے علم میں ہے کہ دو اچھے بھائیوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا ہے تو اس اختلاف کو دور کرانا اور ان میں صلح کرا دینا بہت بڑی نیکی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان باہم مل کر ایک دیوار کی طرح ہیں جس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے۔ اگر ایک اینٹ بھی کھسک جائے تو پوری دیوار میں رخنہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس وحدت کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اختلافات دور کیے جائیں۔ یہاں بھی یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اگر دین کے معاملے میں اختلاف ہے تو اس میں خدا کے واسطے سے صلح کرانے کی کوشش نہ کریں۔ اگر آپ کو

پورا علم نہیں ہے تو خواہ مخواہ اس میں دخل نہ دیں۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ قَدْ بَلَغَهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ.

﴿امام مالک کو یہ بات پہنچی کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں بھیجا گیا ہوں کہ حسن اخلاق کی تکمیل کروں۔﴾

وضاحت :

بعض روایتوں میں حسن اخلاق کی جگہ مکارم الاخلاق ہے۔ روایت کے معنی کے لحاظ سے میں اس کو ترجیح دیتا ہوں۔ یہ فرق روایت بالمعنی ہونے کی وجہ سے ہے۔

جب آنحضرت ﷺ دین مکمل کرنے کے لیے مبعوث ہوئے تو مکارم اخلاق کی تکمیل بھی آپ کے فرائض منصبی میں شامل تھی۔ تمام اعلیٰ اخلاق، اعلیٰ کردار جس کو آپ کہہ سکتے ہیں، اور اس میں قومی کردار بھی شامل ہے اور انفرادی کردار بھی، ان سب میں نقطہ کمال سے آپ نے امت کو آگاہ فرمایا تاکہ کوئی خلا باقی نہ رہ جائے۔ اور آپ نے اس کا حق ادا کر دیا۔

مَاجَاءَ فِي الْحَيَاءِ

حیا کے بارے میں روایات

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ سَلَمَةَ بْنِ صَفْوَانَ بْنِ سَلَمَةَ الزُّرَقِي عَنْ زَيْدِ بْنِ طَلْحَةَ بْنِ رُكَانَةَ يَرْفَعُهُ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِكُلِّ دِيْنٍ خُلُقٌ وَ خُلُقُ الْاِسْلَامِ الْحَيَاءُ.

﴿زید بن طلحہ بن رکانہ اس روایت کو نبی ﷺ تک مرفوع کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر دین کا ایک خلق خاص ہوتا ہے اور اسلام کا خلق خاص حیا ہے۔﴾

وضاحت :

زید بن طلحہ بن رکانہ کی صحابیت مشکوک ہے، اس لیے یہ روایت موقوف ہے۔ لیکن بات جائے خود اپنی

جگہ پر مبنی برحق ہو تو بات مان لی جائے گی۔ یہ روایت بھی اسی طرح کی ہے کہ نبی ﷺ کا ارشاد معلوم ہوتی ہے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر محمد رسول اللہ تک تمام انبیاء کا دین ایک ہی تھا اور وہ دین فطرت ہے، اس لیے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی چیز ہر پیغمبر کے ساتھ کیسے مخصوص ہو گی۔ لیکن یہ بات ہو سکتی ہے کہ ایک دین میں کسی خاص کردار پر زیادہ زور دیا گیا ہو اور دوسرے دین میں کسی دوسرے کردار پر۔ اس کی مثالیں تاریخ ادیان میں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاں ترک دنیا اور زہد پر اس مؤثر طریقہ پر زور دیا گیا ہے کہ بعد والوں کو مغالطہ ہو گیا اور رہبانیت کی طرف ان کا رجحان زیادہ ہو گیا۔ یہ بات نہیں ہے کہ ترک دنیا اور زہد کی تعلیم سے دوسرے ادیان خالی ہیں لیکن عیسائیت میں اس کا غلبہ ہو گیا۔ ٹھیک اسی طرح اسلام میں حیا کو خاص اہمیت دی گئی اور یہ مسلمان کا خاص کردار ہے۔

جہاں تک احادیث کا تعلق ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ ان میں حیا کی خاص تعلیم ہے۔ مثلاً الحیاء شعبة من الایمان (حیا ایمان کی ایک شاخ ہے) بہت سی نیکیوں کو فروغ دینے میں حیا کا خاص دخل ہے۔ سب سے زیادہ حیا تو آدمی کو خدا تعالیٰ سے ہونی چاہیے۔ اس سے بہت سی نیکیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کردار کے بہت سے پہلو اس میں آتے ہیں اور میرے نزدیک تو یہ ہے کہ آدمی کے اندر اگر حیا نہ ہو تو کوئی بری سے بری چیز بھی اس سے بعید نہیں۔

یہ بات نہیں کہ اسلام کے ساتھ ہی حیا کو خصوصیت ہے اور دوسرے ادیان اس سے خالی ہیں۔ بلکہ تمام ادیان میں اس کا ایک مقام ہے۔ لیکن اسلام میں اس پر زور دیا گیا ہے۔ خاص طریقے پر آنحضرت ﷺ نے اپنے عمل سے اس کو نمایاں کیا ہے۔ آنحضرتؐ کے متعلق احادیث میں آیا ہے کہ آپ کنواری لڑکی کی طرح شرمیلے تھے۔ ظاہر ہے کہ پیغمبر کا جب یہ کردار ہو گا تو امت کے اندر وہی چیز اس کے قول اور فعل سے منتقل ہو گی۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ عرب ذرا کھڑے تھے تو ان کے اس مزاج کی درستی کے لیے حیا پر زیادہ زور دیا گیا۔

الحیاء شعبة من الایمان سے متعلق ایک اور بات یاد رکھیے۔ صوفیاء کے نزدیک کردار کی منزلیں ہوتی ہیں۔ ان کے نزدیک حیا ایک منزل ہے۔ یعنی کچھ روز آپ اس منزل پر قیام کریں گے، پھر دوسری جگہ جائیں گے، اس کے بعد تیسری جگہ۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ الگ الگ مقامات کوئی نہیں ہیں کہ کچھ دن آپ حیا میں مشغول رہیں، اس کے بعد فتوت میں منتقل ہو جائیں، اس کے بعد وجودیت میں چلے جائیں وغیرہ۔ کردار حقیقت میں سبھی ایک ساتھ چلتا ہے، ہر آدمی ایک وقت ان تمام کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ایمان ان کا جامع ہے اور یہ سب اس کی فروع ہیں۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَرَّ عَلٰى رَجُلٍ وَهُوَ يَعِظُ اَخَاهُ فِي الْحَيَاءِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ دَعْهُ فَاِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْاِيْمَانِ.

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر ایک شخص پر ہوا جبکہ وہ اپنے بھائی کو حیا کے بارے میں ملامت کر رہا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑو، حیاء تو ایمان کا شعبہ ہے۔﴾

وضاحت:

مطلب یہ ہے کہ حیاء تو ایمان کے شجرہ طیبہ کی ایک شاخ ہے۔ اگرچہ یہ بہت بڑی شاخ ہے، لیکن ہے ایک شاخ ہی، مقام یا منزل نہیں کہ آپ کچھ دن اس پر قیام کریں تو پھر آپ مسلمان ہیں۔

آدمی کے اپنے بھائی کو ملامت کرنے کے دو مطلب نکل سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اس کو اس بات پر ملامت کر رہا تھا کہ تو نالائق ہے، عورتوں کی طرح شرماتا ہے، دنیا کا کیا کام کرے گا، بیکار رہے۔ دوسرا یہ کہ وہ اس کو بے حیائی پر سرزنش کر رہا تھا۔ میرے نزدیک وہ شخص بھائی کے شرمیلے پن پر ملامت کر رہا تھا۔ اس پر نبی ﷺ نے فرمایا اس کی جان چھوڑو۔ حیا تو ایمان کے تقاضوں میں سے ہے۔

مَاجَاءَ فِي الْغَضَبِ

غصے کے بارے میں روایات

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ حُمَيْدِ ابْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ اَنَّ رَجُلًا اَتَى اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ عَلِّمْنِي كَلِمَاتٍ اَعِيْشُ بِهِنَّ وَلَا تُكْثِرْ عَلَيَّ فَاَنْسٰى فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَغْضَبْ.

﴿حمید بن عبدالرحمٰن روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا۔ اس نے کہا کہ یا رسول اللہ، مجھے کچھ ایسے کلمات نصیحت فرما دیجئے کہ میں ان کی رہنمائی میں صحیح زندگی گزار سکوں۔ کلمات کچھ زیادہ نہ ہوں کہ میں بھول جاؤں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ غصہ سے باز رہو۔﴾

وضاحت :

اس حدیث پر غور کرتے ہوئے مجھے یہ پریشانی پیش آئی کہ غصہ تو محبت، نفرت، شجاعت وغیرہ جیسے جذبات کی طرح فطرت کا تقاضا ہے۔ یہ غیرت کا تقاضا بھی ہے اور عدل کا بھی۔ اسی کے باعث آدمی مدافعت کرتا اور اپنے دشمنوں سے انتقام لیتا ہے۔ نکما ہے وہ آدمی کہ جس کو غصہ نہ آئے۔ غصہ آنا تو فطری امر ہے پھر رسول اللہ ﷺ نے ممانعت کس چیز کی کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ غصہ تو آنا چاہیے لیکن غصے سے مغلوب ہو کر کوئی غلط اقدام نہیں کرنا چاہیے۔ گویا ممانعت غصہ آنے کی نہیں بلکہ غصہ میں ایسی حرکت کرنے کی ہے جو عدل سے متجاوز ہو۔ غصہ کے دو حصے ہو سکتے ہیں۔ ایک قولی اور دوسرا عملی۔ ایک یہ کہ غصہ آیا تو اول فول بکنا شروع کر دیا۔ گالیاں دینا شروع کر دیں اور دوسرا یہ کہ پتھر مار دیا۔ ڈنڈا اٹھا دیا۔ یہ دونوں کام غلط ہیں۔ غصہ کے اس طرح اظہار پر قابو پانا چاہیے اور اگر ایسی غلطی ہو جائے تو جس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہو اس سے معافی مانگنی چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے اس نصیحت میں انسانوں کی ایک بہت بڑی کمزوری کی طرف توجہ دلائی ہے۔ غصے کے محرکات بہت سارے ہوتے ہیں لیکن ان کی وجہ سے حدود سے تجاوز نہیں ہونا چاہیے۔ آنحضرت ﷺ نے غصہ پر قابو پانے کے طریقے بھی بتائے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر آپ کھڑے ہیں تو بیٹھ جائیں اور اگر بیٹھے ہیں تو لیٹ جائیں۔ بہر حال ایک مسلمان کا عزم ہونا چاہیے کہ میں غصے کا ساتھ نہیں دوں گا، چاہے کچھ ہو جائے۔ اگر آپ اس میں کامیاب ہو گئے تو آپ کو اپنی تربیت میں نمایاں کامیابی ہو جائے گی اور اگر ناکام ہوئے تو پھر جس سے زیادتی ہو اس سے معافی مانگے تاکہ نفس کے زور کا کسر ہوتا رہے۔ اللہ تعالیٰ سے بھی معافی مانگتے رہنا چاہیے تاکہ وہ بھی اس زیادتی کو معاف کر دے۔

آنحضرتؐ کے عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دین و شریعت کے تشکک کا معاملہ ہوتا تو غصہ سے آپ کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ آنکھوں میں سرخی آجاتی۔ مجرموں کے ساتھ معاملہ میں آپ رواداری نہ کرتے۔ اس لیے میری رائے یہ ہے کہ شیطان صفت انسانوں کا معاملہ الگ ہے۔ ان پر خوب گرفت کرنی چاہیے کہ دین کے لیے غیرت کا یہی تقاضا ہے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ اِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ.

﴿سعید بن مسیب ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پہلوان وہ نہیں جو لوگوں کو پچھاڑ لینے والا ہو بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھ سکے۔﴾

وضاحت :

صرعہ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ صرعہ وہ ہے جو اپنی گھونسے بازی کی بدولت اپنے دشمن کو پچھاڑ دے اور اس کا ناطقہ بند کر دے۔ اس طرح کی پہلوانی بہادری نہیں بلکہ طاقت کی علامت ہوتی ہے۔ بہادری یہ ہے کہ جب آدمی کو زک پہنچا کر غصہ دلا دیا جائے تو وہ اس وقت بھی اپنے آپ کو قابو میں رکھے اور کوئی کام خلاف عدل نہ کرے۔ یہ تجربی بات پیغمبر ﷺ ہی فرما سکتے ہیں۔

مَاجَاءَ فِي الْمُهَاجَرَةِ

روٹھ کر چھوڑنے کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عَطَاءِ ابْنِ يَزِيْدَ اللَّيْثِيِّ عَنْ اَبِي اَيُّوْبَ الْاَنْصَارِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ يَهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ يَلْتَقِيَانِ فَيُعْرِضُ هٰذَا وَيُعْرِضُ هٰذَا وَخَيْرُهُمَا الَّذِي يَبْدَأُ بِالسَّلَامِ.

﴿حضرت ابوایوب انصاریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی سے روٹھا رہے تین دن سے زیادہ اور ملے تو اس طرح سے کہ یہ ادھر منہ پھیرے ہوئے ہو اور وہ ادھر۔ ان دونوں میں سے بہتر وہ ہوگا جو سلام کرنے میں پہل کرے۔﴾

وضاحت :

روایت میں تین رات کا ذکر ہے لیکن میں نے ترجمہ تین دن کیا ہے کیونکہ رات سے مراد دن اور رات کا دورانیہ ہے۔ لفظ کا یہ استعمال ہماری زبان میں بھی ہے۔

تین دن کی مدت حکم پر عمل کے معاملہ میں سہولت کے لیے ہے۔ جب آدمی روٹھتا ہے تو راضی ہونے میں کچھ وقت تو لگتا ہے جس میں آدمی کوئی بہانہ پاتا ہے کہ غلط فہمی دور کر سکے۔ یہ اس مقصد کے لیے مہلت کی حد

بتائی ہے کہ معاملہ تین دن سے بڑھنے نہ دیا جائے۔ جب ناراضی ہوتی ہے تو اس کے بعد آدمی کو یہ شرم لاحق ہو جاتی ہے کہ میں صلح کے لیے پہلے سلام کیسے کروں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ بازی اسی کی ہوتی ہے جو پہلے سلام کر کے اپنے تعلقات کو ہموار کرلے اور اپنی انا کو آڑے نہ آنے دے۔

اس بارہ میں ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن لوگوں سے دین کے معاملے میں یا ان کے مسلک یا کردار کے معاملے میں اختلافات ہوں تو ان کے ضمن میں کیا کرے۔ محدثین کہتے ہیں کہ اہل بدعت اور اہل ضلالت اس ہدایت میں شامل نہیں ہیں۔ لفظ "اخاہ" کا تقاضا یہ ہے کہ صحیح معنوں میں مسلمان ہو ہمرلوجہ۔

اس معاملے میں میرے نزدیک یہ اصول مدنظر رکھنا چاہیے کہ جن لوگوں سے مسلک کا، رائے کا، عقیدے کا، نظریے کا، یا زندگی کی روش کا اختلاف ہے تو ان سے آپ سیاسی اختلاف رکھ سکتے ہیں لیکن جب ان سے ملیں تو خندہ پیشانی سے ملیں۔ دل میں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بئس ابن العشیرۃ (سوسائٹی کا یہ کتنا برا آدمی ہے) ملاقات کے آداب الگ ہیں اور دل کے معاملات الگ ہیں۔ بات ایسے لوگوں سے آپ معروف طریقے سے ہی کریں گے۔ وہ رخصت ہونے لگیں تو باہر تک چھوڑنے بھی جائیں گے۔ ان کی خاطر مدارات بھی کریں لیکن دل میں رہے کہ یہ شیطان ہے۔ باقی تمام مسلمانوں سے اچھی طرح دل سے ملیں۔

روٹھنے کی مدت کا تعلق اختلاف کی نوعیت سے بھی ہوتا ہے۔ غزوہ تبوک میں جو مسلمان وسائل رکھنے کے باوجود شریک نہ ہوئے تو نبی ﷺ ان سے قطع تعلق کی مدت کو تین ماہ تک لے گئے تھے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق بھی روایت ہے کہ اپنے ایک بیٹے سے کئی ماہ تک نہیں بولے۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ اَنَسِ ابْنِ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا وَلَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ يَهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ.

﴿انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو۔ آپس میں حسد نہ کرو اور ایک دوسرے سے منہ پھیرنے کی روش اختیار نہ کرو۔ اللہ کے بندو، بھائی بھائی بن کے رہو۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑے۔﴾

وضاحت :

اس روایت میں بہت سی ایسی ہدایات جمع ہو گئی ہیں جو اسلامی معاشرہ میں مسلمانوں کے باہمی تعلقات کے بارے میں رہنمائی دیتی ہیں۔ بعض اخلاق فاسدہ سے ہونا چاہیے، دوسرے مسلمان بھائیوں سے نہیں۔ حسد ایک اخلاقی بیماری ہے۔ کسی کے علم و عمل پر رشک کرنا تو جائز ہے لیکن حسد ایک منفی صفت ہے جس سے ہر مسلمان کو اجتناب کرنا چاہیے۔ تدابر کے معنی خود امام مالکؒ نے بیان کر دیے ہیں اور وہ میرے نزدیک صحیح ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔ لا احسب التدابر الا الاعراض عن اخیك المسلم، فتدبر عنه بوجهك (میرے نزدیک تدابر کا مفہوم یہ ہے کہ تم اپنے مسلمان بھائی سے اعراض کرو اور اپنا منہ اس سے پھیر لیا کرو) یہ طریقہ نہیں ہونا چاہیے کہ جہاں ملاقات ہوئی منہ پھیر کر چلتے رہے بلکہ السلام علیکم اور مصافحہ ہونا چاہیے۔ یہ چیز اختلافات کو خود زائل کر دیتی ہے۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَكْذَبُ الْحَدِيْثِ وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا تَحَسَّسُوْا وَلَا تَنَافَسُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا.

﴿ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ چوکنا گمان (یعنی سوء ظن) سے کیونکہ سوء ظن سب سے بڑا جھوٹ ہے، اور تجسس میں اور ٹوہ میں نہ رہو، ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے کی جدوجہد میں نہ پڑو، باہم حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے غصہ نہ رکھو اور ایک دوسرے سے رخ نہ موڑو اور اللہ کے بندو سب بھائی بھائی بن کے رہو۔﴾

وضاحت :

حدیث میں لفظ ظن سے مراد سوء ظن ہے۔ حسن ظن رکھنے سے آدمی کسی وقت غلط فہمی میں تو پڑ سکتا یا قدرے نقصان اٹھا سکتا ہے اور اسی لیے بعض لوگ اسے بے وقوفی قرار دیتے ہیں لیکن اس میں کوئی زیادہ حرج نہیں۔ اگر زیادہ سنگین معاملہ نہ ہو تو یہ گوارا ہے۔ اس کے برعکس سوء ظن سب سے بڑا جھوٹ بھی ہے اور سب سے بڑی بیماری بھی ہے۔ لوگوں کے متعلق یہ خیال کر کے کہ ضرور یہ میرے خلاف سازش کرنے جا رہے ہیں حالانکہ ان کے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں ہوتا، آپ اپنے آپ کو ایک بڑے جھوٹ میں مبتلا کر لیتے اور اپنے آپ کو طعنہ

میں بھی ڈال لیتے ہیں۔ اس لیے جب تک کسی چیز کا ثبوت نہ ہو سوء ظن کرنے کا حق نہیں۔ حسن ظن ہی رکھیں اور اگر حسن ظن نہیں رکھنا چاہتے تو کم از کم سوء ظن بھی نہ رکھیں۔ یہ ضروری ہے۔

تحسس اور تجسس دونوں لفظوں کا مطلب ٹوہ میں لگنا اور جستجو میں پڑنا ہے۔ عمومی طور پر یہ ہم معنی ہیں۔ کان لگا کر سن گن لینا تحسس ہوتا ہے اور ٹوہ میں لگنا اور کھوج لگانا تجسس کہلاتا ہے۔ ممانعت بری نیت سے کسی کے عیوب اور معاملات کی ٹوہ لینے اور غلط مقصد کے لیے جاسوسی کرنے کی ہے۔ بعض لوگ ہر طرح کے معاملات میں تجسس کو غلط سمجھتے ہیں اور اسی بنیاد پر جاسوسی کے محکمہ کو بھی غلط قرار دیتے ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا خلیفہ راشد بھی ایک خطرناک آدمی ثابت ہوتا ہے۔ آپ بھی تجسس کرنا چاہیں تو خیر کے لیے کر سکتے ہیں۔ مثلاً آپ کے پڑوسی گھر کا مالک موجود نہیں تو آپ معلوم کر سکتے ہیں کہ اس کے بچوں نے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں، کس طرح ان کی گزر اوقات ہو رہی ہے۔ یہ پڑوسی سے متعلق آپ کے فرائض میں سے ہے۔ ایسا کرنے کی ممانعت نہیں۔ لیکن ٹوہ میں لگے رہنا کہ ایک شخص کی کوئی کمزوری ہاتھ آجائے اور آپ اس کو جلد سے جلد کہیں بیان کر کے یا اخبار میں دے کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کریں تو یہ کمینہ پن ہے۔ ایسا کرنے کی اجازت نہیں۔ اگر کوئی شخص ان چیزوں میں فرق نہ کرے تو بہت مشکل میں پڑ جائے گا۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَطَاءِ بْنِ اَبِي مُسْلِمٍ عَبْدِ اللّٰهِ الْخُرَاسَانِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تَصَافَحُوْا يَذْهَبِ الْغِلُّ وَتَهَادَوْا تَحَابُّوْا وَتَذْهَبِ الشَّحْنَاءُ.

﴿عبداللہ خراسانی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مصافحہ کیا کرو کہ اس سے کینہ دور ہوتا ہے اور ہدیہ دیتے رہو اس سے تمہارے درمیان محبت پیدا ہو گی اور طبیعت کا بغض یا نفرت دور ہو جائے گی۔﴾

وضاحت :

یہ ہدایت بھی معاشرتی زندگی میں حسن پیدا کرنے والی ہے۔ مصافحہ میں بڑی برکت ہے۔ بہت سی شکایتیں دھل جاتی ہیں۔ دل کے اندر سے کدورت نکل جاتی ہے۔ اسی طرح ہدیہ بھیجنا کدورت کو دور کرتا اور آپس کے تعلقات کو خوشگوار بناتا ہے۔ تحفہ بھیجنا، مصافحہ کرنا اور سلام میں سبقت کرنا یہ سب بہت بابرکت چیزیں ہیں۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ سُهَيْلِ بْنِ اَبِي صَالِحٍ عَنْ اَبِيهِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ تُفْتَحُ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَ يَوْمَ الْخَمِيْسِ فَيُغْفَرُ لِكُلِّ عَبْدٍ مُسْلِمٍ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا اِلَّا رَجُلًا كَانَتْ بَيْنَهُ وَ بَيْنَ اَخِيْهِ شَحْنَاءُ فَيُقَالُ اَنْظِرُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا اَنْظِرُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنت کے دروازے پیر کو اور جمعرات کو کھول دیے جاتے ہیں اور ہر ایسے مسلمان کو بخش دیا جاتا ہے جو کسی کو اللہ کا شریک نہیں ٹھہراتا، بجز اس کے کہ جس کے اور اس کے بھائی کے درمیان کوئی کدورت یا کینہ ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کو ابھی رہنے دو یہاں تک کہ آپس میں صلح کر لیں، ان دونوں کے صلح کر لینے تک ابھی انتظار کرو۔﴾

وضاحت :

یہ روایت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس کی ایک مشکل جنت کے دروازوں کا پیر اور جمعرات کو کھولا جانا ہے جبکہ یہ دن ہماری دنیاوی زندگی کے ایام ہیں۔ اللہ کے ہاں ایام ان سے مختلف ہیں اور وہ ہزار ہزار سال کے ہیں۔ پیر اور جمعرات کے دنوں میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پر ان دونوں کا انتخاب کیا گیا ہے تو اس کی حکمت اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ روایت کی دوسری مشکل یہ ہے کہ قرآن مجید کی روشنی میں جہاں تک اس زندگی کا تعلق ہے تو صالحین پر ان کے اعمال کے لحاظ سے اچھے اثرات اور اشقیاء پر برے اثرات ضرور مرتب ہوتے ہیں لیکن اس مرحلے میں نہ ہی جنت میں جانے کا سوال ہے اور نہ ہی مغفرت کا۔ اس کے لیے ایک خاص دن مقرر ہے جس کا اعلان ابھی ہو جاتا ہے۔ لہٰذا میرے نزدیک اس روایت میں کچھ گھپلا ہو گیا ہے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُسْلِمِ بْنِ اَبِي مَرْيَمَ عَنْ اَبِي صَالِحٍ السَّمَّانِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّهُ قَالَ تُعْرَضُ اَعْمَالُ النَّاسِ كُلَّ جُمُعَةٍ مَرَّتَيْنِ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَيَوْمَ الْخَمِيْسِ فَيُغْفَرُ لِكُلِّ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ اِلَّا عَبْدًا كَانَتْ بَيْنَهُ وَبَيْنَ اَخِيْهِ شَحْنَاءُ فَيُقَالُ اُتْرُكُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَفِيْئَا اَوْ اُتْرُكُوْا هٰذَيْنِ

حَتّٰى يَفِيْئَا

﴿حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ لوگوں کے اعمال پیش ہوتے ہیں ہر ہفتے میں دو مرتبہ، پیر اور جمعرات کو۔ ہر مومن بندہ بخش دیا جاتا ہے سوائے اس شخص کے کہ اس کے اور اس کے بھائی کے درمیان کدورت ہو، تو ان کے متعلق حکم ہوتا ہے کہ ان کو چھوڑ دو یہاں تک کہ صلح کر لیں۔﴾

وضاحت :

یہ روایت مرفوع نہیں ہے۔ پچھلی روایت مرفوع تھی لہٰذا اس کو بھی اسی پر قیاس کیا جائے گا۔ اس روایت میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں میں ان کا ذکر کر چکا ہوں۔ یہاں ذکر جنت کے دروازے کھولے جانے کے بجائے اعمال کے پیش ہونے کا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ملائکہ اپنی رپورٹ دیتے ہوں اور یہ ابتدائی فیصلہ ہوتا ہو کہ فلاں آدمی صالحین میں سے ہے اور فلاں اشقیاء میں سے۔ اجزاء کی تفصیل تو قیامت کے دن ہو گی لیکن ایک اجمالی کام یہ ہوتا ہے کہ اعمال پیش ہوتے ہیں۔ اور اس پیشی کے نتیجہ میں یہ ہوتا ہے کہ جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں جس کا پچھلی روایت میں ذکر ہے۔ اگر یوں توجیہ کی جائے تو یہ بات قرین قیاس ہے۔

اب رہے وہ اشخاص جن کے درمیان کچھ کدورت ہو یا قضیہ ہو تو ان کا معاملہ اس وقت تک تعفیہ طلب رہتا ہے جب تک وہ آپس میں صلح نہ کر لیں۔ اگر اصلاح نہ کی تو برائی کے کھاتے میں چلے جائیں گے۔ بہر حال تفصیلی فیصلہ اور اعمال کا حتمی نتیجہ قیامت کے روز سامنے آئے گا۔ اس روایت میں لفظ بعد سے پورا بفتہ مراد لیا گیا ہے۔ اترکوا اور ارکوا دونوں لفظوں کا مفہوم ایک ہی ہے یعنی چھوڑ دو، رہنے دو۔

مَاجَاءَ فِي لُبْسِ الثِّيَابِ لِلْجَمَالِ بِهَا

زینت کے لیے لباس پہننے کے بارے میں

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ ابْنِ اَسْلَمَ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ الْاَنْصَارِيِّ اَنَّهٗ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِي غَزْوَةِ بَنِي اَنْمَارٍ قَالَ جَابِرٌ فَبَيْنَا اَنَا نَازِلٌ تَحْتَ شَجَرَةٍ اِذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَقْبَلَ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَلُمَّ اِلَى الظِّلِّ قَالَ فَنَزَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ

فَقُمْتُ اِلٰى غَرَارَةٍ لَنَا فَالْتَمَسْتُ فِيْهَا شَيْئًا فَوَجَدْتُ فِيْهَا جِرْوَ قِثَّاءٍ فَكَسَرْتُهٗ ثُمَّ قَرَّبْتُهٗ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ مِنْ اَيْنَ لَكُمْ هٰذَا قَالَ فَقُلْتُ خَرَجْنَا بِهٖ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مِنَ الْمَدِيْنَةِ قَالَ جَابِرٌ وَ عِنْدَنَا صَاحِبٌ لَنَا نُجَهِّزُهٗ يَذْهَبُ يَرْعٰى قَالَ فَجَهَّزْتُهٗ ثُمَّ اَدْبَرَ يَذْهَبُ فِي الظَّهْرِ وَ عَلَيْهِ بُرْدَانِ لَهٗ قَدْ خَلَقَا قَالَ فَنَظَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِلَيْهِ فَقَالَ اَمَالَهٗ ثَوْبَانِ غَيْرُ هٰذَيْنِ فَقُلْتُ بَلٰى يَارَسُوْلَ اللّٰهِ لَهٗ ثَوْبَانِ فِي الْعَيْبَةِ كَسَوْتُهٗ اِيَّاهُمَا قَالَ فَادْعُهٗ فَمُرْهُ فَلْيَلْبَسْهُمَا قَالَ فَدَعَوْتُهٗ فَلْبَسَهُمَا ثُمَّ وَلّٰى يَذْهَبُ قَالَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَالَهٗ ضَرَبَ اللّٰهُ عُنُقَهٗ اَلَيْسَ هٰذَا خَيْرًا لَهٗ قَالَ فَسَمِعَهٗ الرَّجُلُ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ فَقُتِلَ الرَّجُلُ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ

﴿جابر بن عبداللہ انصاری کہتے ہیں کہ ہم ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوہ بنی انمار میں نکلے۔ جابر کہتے ہیں کہ میں ایک درخت کے نیچے ٹھہرا ہوا تھا۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو میں نے کہا حضور، سائے میں آجایئے تو رسول اللہ ﷺ بھی وہیں اترے۔ میں نے اٹھ کر اپنے توشہ دان کا جائزہ لیا تو اس میں ایک چھوٹی سی ککڑی مل گئی۔ میں نے اس کو توڑا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کی۔ آپ نے پوچھا بھئی تمہیں یہ کہاں سے مل گئی؟ میں نے کہا یا رسول اللہ ہم یہ مدینہ سے لائے ہیں۔ جابرؓ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس ایک ہمارا آدمی تھا جس کو ہم سواریوں کو چرانے کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ میں نے اس کو تیار کیا۔ وہ سواری کے جانور لے کر جانے لگا تو وہ اپنے اوپر دو چادریں لیے ہوئے تھا جو پرانی ہو چکی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ کیا اس کے پاس ان دو کپڑوں کے علاوہ دو چادریں نہیں؟ میں نے کہا ہاں یا رسول اللہ، گٹھڑی میں اس کے دو کپڑے اور ہیں جو میں نے اسے پہننے کے لیے دے رکھے ہیں۔ آپ نے فرمایا اس کو بلاؤ اور کہو کہ وہ دوسرے کپڑے پہنے۔ میں نے اس کو بلایا تو اس نے وہ کپڑے پہن لیے۔ پھر وہ جانے کے لیے مڑا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ اس کی گردن مارے۔ کیا یہ حالت پہلی سے بہتر نہیں؟ اس شخص نے یہ بات سن لی اور

کمایارسول اللہ، اللہ میری گردن اپنے راستے میں مارے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایاہاں اللہ کی راہ میں ہو۔بعد میں وہ شخص اللہ کی راہ میں شہید ہوا۔﴾

وضاحت :

مزدور دو سیدھی چادریں باندھے ہوئے تھا۔ نبی ﷺ کو معلوم ہوا کہ اس کے پاس اچھے کپڑے بھی ہیں تو اس کو بلوایا اور دوسرے کپڑے پہننے کا حکم دیا۔ ان کپڑوں میں وہ بھلا آدمی لگا تو حضور نے اس کے لیے بہت شاندار لفظ کہے کہ خدا کے بندے اب تمہاری شکل نکلی کہ نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مہذب، شائستہ اور صاف ستھرا رہنا تقویٰ کے منافی نہیں بلکہ اسلام کا تقاضا ہے۔ اس سے قومی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ غریبوں کو بھی اس کا خیال رکھنا چاہیے۔ ہمارے ہاں بے شمار آدمی اس طرح میلے بنے رہتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر وحشت ہوتی ہے لیکن ان کے چوہدریوں کو احساس نہیں ہوتا کہ ان کو صاف ستھرا رہنے میں مدد دیں یا اس کی تلقین کریں۔ پس معلوم ہوا کہ شائستہ اور صاف ستھرا رہنا اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہے۔ اور جن لوگوں کے ہاتھ میں معاملات کی باگ ڈور ہے وہ اپنی قوم کے افراد کو مہذب بنانے کی کوشش کریں، ان کو تعلیم دیں اور ان کے لیے وسائل بھی پیدا کریں۔

ضرب اللہ عنقہ (اللہ اس کی گردن مارے) عربی میں پیار کا کلمہ ہے۔ یہ بد دعا نہیں ہے۔ ہمارے ہاں بھی لوگ جب کہتے ہیں 'تمہاری ماں مرے' تو یہ بھی پیار کا کلمہ ہوتا ہے۔ اس کا مفہوم بد دعا کا نہیں ہوتا۔ آنحضرت نے بھی قومی کی تحسین کے لیے یہ جملہ استعمال کیا کہ دیکھو پہلے کی نسبت یہ کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ قومی سمجھدار تھا اس نے کلمات کو لفظی معنی میں لے کر درخواست کر دی کہ یارسول اللہ یہ بھی دعا کیجئے کہ یہ گردن اللہ کی راہ میں ماری جائے۔ دیکھئے نبی ﷺ کی زبان سے اس وقت جو مبارک کلمہ نکل گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو حقیقت بنا دیا۔ آپ نے جو فرمایا کہ اللہ کے راستے میں گردن ماری جائے تو وہ شخص جہاد میں شریک ہوا اور شہادت کا رتبہ پایا۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَيُّوبَ بْنِ أَبِي تَمِيمَةَ عَنِ ابْنِ سِيرِينَ قَالَ قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ إِذَا أَوْسَعَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَأَوْسِعُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ جَمَعَ رَجُلٌ عَلَيْهِ ثِيَابَهُ.

﴿ابن سیرین کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ تم کو وسعت بخشے تو تم بھی اپنے اوپر وسعت کرو۔ ایک شخص نے اپنے کپڑوں پر پیوند لگا رکھے تھے۔﴾

وضاحت :

حضرت عمرؓ کے متعلق آیا ہے کہ ان کے کپڑوں میں چھ چھ پیوند لگے رہتے تھے حالانکہ وہ وقت کے خلیفہ تھے۔ ذاتی حیثیت میں وہ غریب آدمی نہ تھے اور انتظامی صلاحیت قومی اتنا غریب ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ لیکن جب وہ خلیفہ تھے تو اتنی خستہ حالت میں کیوں رہتے تھے جب کہ ان کا مسلک یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے فراخی عطا کی ہے تو اپنے نفس کے لیے بھی فراخی ہونی چاہیے۔ دراصل یہ دوسرا شعبہ ہے۔ ایک وہ شخص ہوتا ہے جو دوسروں کے لیے نمونہ ہوتا ہے تو اس کے لیے بہر حال وہ معیار ہونا چاہیے جس کی غریب سے غریب آدمی بھی تقلید کر سکے۔ لہٰذا حضرت عمرؓ کا اپنا عمل عوام کے ایک لیڈر کی حیثیت سے ہے۔ ہمارا عمل اس سے الگ ہونا چاہیے۔ صاف ستھرے کپڑے پہننے چاہئیں تاکہ آدمی حقیر نہ معلوم ہو۔ اس کے لباس کا دوسروں پر اچھا اثر پڑے۔ لوگ اس کی صحبت سے وحشت زدہ نہ ہوں بلکہ پسند کریں۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ إِنِّي لَأُحِبُّ أَنْ أَنْظُرَ إِلَى الْقَارِئِ أَبْيَضَ الثِّيَابِ.

﴿امام مالک کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عمر بن خطابؓ کہتے تھے کہ مجھے یہ بات محبوب ہے کہ میں قاری کو سفید کپڑوں میں دیکھوں۔﴾

وضاحت :

قاری کا لفظ عرفی میں عالم دین کے لیے بولا جاتا ہے جیسے ہم مولوی صاحب کا لفظ بولتے ہیں۔ یہ خاص لفظ قرآن مجید کے عالم کے لیے ہے کیونکہ اس زمانے میں قرآن ہی تمام علوم کا مجموعہ تھا اور اسی کے علم سے آدمی کا علم تولا جاتا تھا۔ لہٰذا حضرت عمرؓ کا مدعا یہ ہے کہ مولوی صاحب کو خوش لباس ہونا چاہیے۔ ان کو سفید کپڑے پہننے چاہئیں یعنی سنجیدہ لباس میں ہونا چاہیے اور فیشن سے اجتناب کرنا چاہیے۔

اس روایت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ خلیفہ وقت کو قوم کے مزاج کا علم ہوتا ہے اور تمام پہلوؤں پر اس کی نظر ہوتی ہے۔ وہ ہر طبقے کی رہنمائی کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایرانی سپہ سالار رستم کہا کرتا تھا کہ یہ عمر تو میرا کلیجہ کھا گیا، یہ کتوں کو تو اب سکھا رہا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ عربوں کو دنیا کی قیادت کے لیے تیار کرنے کا جن

لوگوں نے کام کیا ان میں آنحضرت ﷺ کو چھوڑ کر سب سے شاندار رول سیدنا عمرؓ کا ہے۔

مَاجَاءَ فِي لُبْسِ الثِّيَابِ الْمُصَبَّغَةِ وَالذَّهَبِ

رنگ دار کپڑے اور سونا پہننے کے بارے میں

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ أَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ يَلْبَسُ الثَّوْبَ الْمَصْبُوغَ بِالْمَشْقِ وَالثَّوْبَ الْمَصْبُوغَ بِالزَّعْفَرَانِ.

﴿نافع روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ گیروے رنگے ہوئے اور زعفران سے رنگے ہوئے کپڑے پہنا کرتے تھے۔﴾

وضاحت :

مشق، گیروا یا مٹیالا رنگ جو جوگیوں اور صوفیوں کا ہے۔ یہ رنگ بہت بازار ہے۔ یہ ایک قدرتی رنگ ہے۔ بعض علاقوں میں اس رنگ کی روئی بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح کے کپڑے مصنوعی رنگ میں بھی ملتے ہیں۔ زعفران کے متعلق روایات میں اختلاف ہے۔ ہلکے رنگ میں تو کوئی قباحت نہیں لیکن گہرا ہو تو اس پر زنانہ پن غالب آجاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جن روایات سے لوگ اس کے خلاف دلیل لائے ہیں وہ احرام سے متعلق ہیں۔ احرام میں چونکہ زعفرانی رنگ جائز نہیں اس لیے اس کو لوگوں نے ناجائز قرار دے دیا۔ عبداللہ بن عمرؓ بے محتاط آدمی ہیں۔ وہ اگر زعفران سے رنگا ہوا کپڑا پہنتے تھے تو اس کے جائز ہونے میں کلام نہیں۔ بلکہ زعفرانی رنگ بہت اچھا اور خوشگوار ہوتا ہے۔

□ قَالَ يَحْيٰى وَ سَمِعْتُ مَالِكًا يَقُولُ وَ أَنَا أَكْرَهُ أَنْ يَلْبَسَ الْغُلَامُ شَيْئًا مِنَ الذَّهَبِ لِأَنَّهُ بَلَغَنِي أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ تَخَتُّمِ الذَّهَبِ فَأَنَا أَكْرَهُهُ لِلرِّجَالِ الْكَبِيرِ مِنْهُمْ وَالصَّغِيرِ.

﴿یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے مالک کو کہتے سنا کہ میں مکروہ سمجھتا ہوں کہ لڑکے سونے کی کوئی چیز پہنیں کیونکہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سونے کی انگوٹھی پہننے سے روکا ہے، تو میں بڑے اور چھوٹے کے لیے اس کو مکروہ سمجھتا ہوں۔﴾

وضاحت :

امام صاحب کا یہ فتویٰ ٹھیک ہے۔ سونے کی کوئی چیز پہننا کسی مذہب آدمی کے لیے درست نہیں۔ اس زمانے میں لوگ فخریہ سونے کی زنجیر، انگوٹھیاں اور کانوں کا زیور استعمال کرتے ہیں۔ یہ بے حد ناپسندیدہ رواج ہے۔

□ قَالَ يَحْيٰى وَ سَمِعْتُ مَالِكًا يَقُولُ فِي الْمَلَاحِفِ الْمُعَصْفَرَةِ فِي الْبُيُوتِ لِلرِّجَالِ وَ فِي الْأَفْنِيَةِ قَالَ لَا أَعْلَمُ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا حَرَامًا وَ غَيْرُ ذٰلِكَ مِنَ اللِّبَاسِ أَحَبُّ إِلَيَّ.

﴿یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے مالک سے سنا۔ وہ کہتے تھے کہ وہ زرد گوں لحاف جو مردوں کے لیے گھروں میں اور صحنوں میں رکھے ہوتے ہیں اس میں کسی چیز کو حرام تو نہیں جانتا لیکن پسندیدہ یہی ہے کہ پہننے کی چیز اس کے علاوہ ہو۔﴾

وضاحت :

لحاف اور کمبل عام طور پر رنگین اور اکثر ریشمی ہوتے ہیں۔ امام مالک کے نزدیک ان سے اجتناب بہتر ہے اگرچہ ان کا استعمال حرام نہیں۔

مَاجَاءَ فِي لُبْسِ الْخَزِّ

ریشم پہننے کے بارے میں

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهَا كَسَتْ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ الزُّبَيْرِ مِطْرَفَ خَزٍّ كَانَتْ عَائِشَةُ تَلْبَسُهُ.

﴿ہشام اپنے باپ عروہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے ایک ریشمی مطرف عبداللہ بن زبیر کو پہنایا جو حضرت عائشہ خود پہنا کرتی تھیں۔﴾

وضاحت :

مطرف سے مراد وہ اونی کپڑا ہے جس کا تانا ریشم کا اور بانا اون کا ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے اگر یہ عبداللہ

ان نیز کو پہننے کے لیے دیا تو اس کے جائز ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ کپڑا اگر پورے کا پورا ریشم ہو تو پھر سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ریشم کا پہننا مردوں کے لیے بالاتفاق جائز نہیں۔ تاہم اگر کسی اور چیز میں ریشم ملا ہوا ہو تو احتیاط کرنی چاہیے، اگرچہ اس کو حرام نہیں کہہ سکتے۔

مَا يُكْرَهُ لِلنِّسَاءِ لُبْسُهُ مِنَ الثِّيَابِ

عورتوں کے لیے کون سا کپڑا پہننا مکروہ ہے

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَلْقَمَةَ ابْنِ اَبِي عَلْقَمَةَ عَنْ اُمِّهِ اَنَّهَا قَالَتْ دَخَلَتْ حَفْصَةُ بِنْتُ عَبْدِالرَّحْمٰنِ عَلٰى عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ وَ عَلٰى حَفْصَةَ خِمَارٌ رَقِيقٌ فَشَقَّتْهُ عَائِشَةُ وَ كَسَتْهَا خِمَارًا كَثِيفًا .

﴿عائشہ بن ابی علقمہ کی والدہ بیان کرتی ہیں کہ حفصہ بنت عبدالرحمٰن حضرت عائشہؓ کے پاس گئیں تو حفصہ نے اپنے اوپر ایک باریک اوڑھنی لے رکھی تھی۔ حضرت عائشہؓ نے اس کو پھاڑ کر پھینک دیا اور ان کو ایک موٹی اوڑھنی پہنا دی۔﴾

وضاحت :

حضرت عائشہؓ کے اس عمل سے معلوم ہوا کہ عورت کو سر ڈھانپنا بھی چاہیے اور دوپٹہ دبیز بھی ہو۔ اگر باریک اوڑھنی ہوا سے اڑ جائے تو اس پہننے کا کیا فائدہ؟ آج کل کے دوپٹے تو محض تہمت ہی ہیں۔ عورتیں سر سے زیادہ ان کو گلے میں پہنتی ہیں۔ دین میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُسْلِمِ بْنِ اَبِي مَرْيَمَ عَنْ اَبِي صَالِحٍ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّهُ قَالَ نِسَاءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ مَائِلَاتٌ مُمِيلَاتٌ لَا يَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يَجِدْنَ رِيحَهَا وَ رِيحُهَا يُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ خَمْسِمِائَةِ عَامٍ.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ عورتیں کپڑے پہنے ہوئے بھی عریاں، مٹکنے مٹکانے والی جنت میں داخل نہیں ہوں گی اور اس کی خوشبو بھی نہیں سونگھیں گی اگرچہ اس کی خوشبو پانچ سو سال کی

مسافت پر محسوس ہو گی۔﴾

وضاحت :

کاسیات عاریات کا مطلب 'جامے کے اندر پاجامے سے باہر' ہے۔ وہ لباس پہنے ہوئے بھی عریاں نظر آتی ہیں اور ان کا انگ انگ دیکھا جا سکتا ہے۔ مائلات کے معنی حق سے منحرف کے کیے گئے ہیں۔ لہٰذا مائلات ممیلات سے مراد یہ ہو گی کہ خود بھی سیدھی راہ سے ہٹی ہوتی ہیں اور خاوند کو بھی ہٹاتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ معنی صحیح نہیں۔ اصل میں مراد ہے مٹکنے مٹکانے والی یعنی وہ گردن اور جسم کو مٹکاتی ہوئی چلتی ہیں اور دوسروں کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ ایسی عورتیں جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکیں گی۔ پانچ سو سال کی مسافت تعبیر ہے ایک طویل فاصلہ کی۔ یہ روایت ابوہریرہ سے ہے جبکہ اس کے تیور ایسے ہیں کہ یہ نبی ﷺ کا ارشاد ہو گا۔ بعض راویوں نے اس کو مرفوع بیان کیا ہے۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَامَ مِنَ اللَّيْلِ فَنَظَرَ فِي اُفُقِ السَّمَاءِ فَقَالَ مَاذَا فُتِحَ اللَّيْلَةَ مِنَ الْخَزَائِنِ وَمَاذَا وَقَعَ مِنَ الْفِتَنِ كَمْ مِنْ كَاسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَيْقِظُوا صَوَاحِبَ الْحُجَرِ.

﴿ابن شہاب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک رات اٹھے۔ آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی تو زبان سے یہ کلمہ نکلا۔ سبحان اللہ! آج کی رات کیا کیا خزانے کھولے گئے ہیں اور کیا کیا فتنے واقع ہوئے ہیں۔ کتنی ہی جامہ پوش جو دنیا میں ہیں وہ قیامت کے روز عریاں ہوں گی۔ ان کوٹھڑی والیوں کو جگاؤ کہ (اللہ کو یاد کریں)﴾

وضاحت :

یہ ایک حقیقت بیان ہوئی ہے لیکن اس کو دیکھنے کے لیے چشم بصیرت چاہیے کہ ہر وقت خزانوں کی بھی بارش ہوتی رہتی ہے اور لوٹنے والے ان کو لوٹ لیتے ہیں، اور فتنے بھی برپا ہوتے رہتے ہیں اور ان کے رسیا ان کو بھی لوٹ لیتے ہیں۔ یہی راتیں تو ہوتی ہیں جن میں شب بیداری کرنے والے نہ جانے کتنے خزانے پاتے ہیں اور یہی راتیں ہوتی ہیں جن میں لوگوں کی کارستانیوں کی خبریں ہر صبح اخباروں میں آتی ہیں۔ نبی ﷺ نے اسی کے بارے

میں اپنا تاثر بیان فرمایا۔ دوسری بات جس کی طرف آنحضرت نے توجہ دلائی یہ ہے کہ لباس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جسم کی جو چیزیں چھپانے کی ہیں ان کو چھپایا جائے۔ موجودہ زمانے کا فیشن یہ ہے کہ جو چیز چھپانے کی ہے اس کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنے کے لیے لباس تراشا اور پہنا جاتا ہے۔ اس وقت تمام ممالک میں یہی مذاق فیشن بن چکا ہے۔ قیامت کے دن یہ لباس عریانی قرار پائے گا۔ پچھلی روایت اس دنیا سے متعلق تھی اور یہ روایت قیامت سے متعلق ہے۔ صواحب الحجر سے ازواج مطہرات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ جاگیں اور نیکی کے خزانے لوٹیں۔

مَاجَاءَ فِی اِسْبَالِ الرَّجُلِ ثَوْبَهُ

مرد کے اپنی تہمد لٹکانے کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ الَّذِی يَجُرُّ ثَوْبَهُ خُيَلَاءَ لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ اِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنی تہمد غرور سے گھسیٹتا ہوا چلے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نگاہ نہیں کریں گے۔﴾

وضاحت:

عرب میں فقروں کا طریقہ تھا کہ وہ نیچی تہمد پہنتے اور اس کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے چلتے تھے۔ میں نے اپنے دیہاتوں اور شہروں میں بھی دیکھا ہے کہ بانکے اور چھبیلے لوگ تہمد گھسیٹتے ہوئے چلتے ہیں۔ یہ غرور کی نشانی ہے۔ عام لوگوں میں اگر کسی کی تہمد ڈھیلی رہ جائے تو وہ غرور میں داخل نہیں۔ جو لوگ غرور سے چلیں گے تو خدا ان کی طرف نگاہ نہیں کرے گا یعنی توجہ یا التفات نہیں کرے گا۔ آخرت میں کامیابی کا انحصار اللہ کی عنایت پر ہوگا لہٰذا جس کی طرف اللہ تعالیٰ کی عنایت ہی نہیں ہوگی تو اس کی بدبختی میں کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔ اس روایت میں اصل چیز خیلاء ہے یعنی غرور و استکبار۔ یہ جس شکل میں بھی ہو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرک ہے، اس لیے کہ کبریائی صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔ کسی مخلوق کو کوئی حق نہیں کہ اس میں کبریائی ہو۔ اگر کوئی اللہ کی کبریائی میں شریک ہوتا ہے تو وہ شرک کا مرتکب ہوتا ہے۔

بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں کہ ایک ڈھب کی چال ان میں جائز ہوتی ہے، مثلاً جہاں اسلام کی شان و شوکت کو نمایاں کرنا ہو۔ کسی غزوہ کے دن آنحضرت نے ایک سپاہی کو دیکھا کہ بہت اکڑے ہوئے نکلے اور ھل من مبارز (ہے کوئی مقابلہ کرنے والا) کا نعرہ لگایا۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ چال بہت ناپسند ہے لیکن آج کے دن یہ محبوب ہے۔ معلوم ہوا کہ اہل کفر کے مقابلے میں اسلام کی قوت اور شان کا مظاہرہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ مستثنیٰ ہے۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِی الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰی يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلٰی مَنْ يَجُرُّ اِزَارَهُ بَطَرًا.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس شخص کی طرف نہیں دیکھے گا جو اپنا تہمد غرور سے گھسیٹتا ہوا چلتا ہے۔﴾

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ وَ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ وَ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ كُلُّهُمْ يُخْبِرُهُ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلٰی مَنْ يَجُرُّ ثَوْبَهُ خُيَلَاءَ.

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نگاہ نہیں کرے گا قیامت کے روز ان لوگوں کی طرف جو اپنا تہمد غرور کے باعث گھسیٹتے ہوئے چلتے ہیں۔﴾

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنِ الْعَلَاءِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ عَنْ اَبِيهِ اَنَّهُ قَالَ سَاَلْتُ اَبَا سَعِيدٍ الْخُدْرِیَّ عَنِ الْاِزَارِ فَقَالَ اَنَا اُخْبِرُكَ بِعِلْمٍ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اُزْرَةُ الْمُؤْمِنِ اِلٰی اَنْصَافِ سَاقَيْهِ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِ فِيمَا بَيْنَهُ وَ بَيْنَ الْكَعْبَيْنِ مَا اَسْفَلَ مِنْ ذٰلِكَ فَفِی النَّارِ مَا اَسْفَلَ مِنْ ذٰلِكَ فَفِی النَّارِ لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلٰی مَنْ جَرَّ اِزَارَهُ بَطَرًا.

﴿علاء بن عبدالرحمٰن اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے ابوسعید خدری سے تہمد کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ہاں میں تم کو علم کی روشنی میں خبر دیتا ہوں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ مومن کا تہمد نصف ساق تک ہونا چاہیے۔ نصف ساق اور ٹخنوں کے بین بین ہو تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔ اس سے نیچے جو ہے وہ آگ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نگاہ نہیں

کرے گا جو اپنا تہمد غرور سے گھسیٹتا ہوا چلتا ہے۔﴾

وضاحت :

یہ تمام روایات ایک ہی مضمون کی حامل ہیں۔ ان میں صرف سند اور الفاظ کا فرق ہے۔ آخری روایت میں تہمد کے طول کی حد بندی ہو گئی ہے جو پنڈلی کے نصف اور ٹخنے کے درمیان ہے۔ گویا اصل میں ٹخنے تک کی حد ہے۔ کپڑا اس سے نیچے نہیں ہونا چاہیے۔ پاجامے اور شلوار کے متعلق بھی یہی حکم ہے۔

مَاجَاءَ فِی اِسْبَالِ الْمَرْاَةِ ثَوْبَهَا

عورت کے کپڑا لٹکانے کے بارے میں

☐ وَ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِی بَكْرِ بْنِ نَافِعٍ عَنْ اَبِیْهِ نَافِعٍ مَوْلَی ابْنِ عُمَرَ عَنْ صَفِیَّةَ بِنْتِ اَبِی عُبَیْدٍ اَنَّهَا اَخْبَرَتْهُ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ زَوْجِ النَّبِیِّ ﷺ اَنَّهَا قَالَتْ حِیْنَ ذُكِرَ الْاِزَارُ فَالْمَرْاَةُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ تُرْخِیْهِ شِبْرًا قَالَتْ اُمُّ سَلَمَةَ اِذًا یَنْكَشِفَ عَنْهَا قَالَ فَذِرَاعًا لَا تَزِیْدُ عَلَیْهِ.

﴿آنحضرت ﷺ کی زوجہ ام سلمہؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ جب ان کے سامنے تہمد کا ذکر آیا تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ! پھر عورت کے بارے میں کیا حکم ہے۔ آپ نے فرمایا ایک بالشت کے قریب لٹکا لے۔ ام سلمہؓ نے کہا تب اس کے جسم کا کچھ حصہ (پاؤں) تو کھلا رہے گا۔ آپ نے فرمایا کہ ایک ہاتھ سمی، اس سے زیادہ نہیں کر سکتی۔﴾

وضاحت :

اسبال ازار یعنی تہمد لٹکانے کے معاملہ کا تعلق صرف مردوں سے ہے، عورتوں سے نہیں۔ حضرت ام سلمہؓ نے جب سنا کہ مردوں کو اسبال ازار سے منع کیا گیا ہے تو انہوں نے پوچھا کہ عورتوں کے لیے کیا حکم ہے۔ آنحضرت نے فرمایا کہ عورتیں اپنا ازار یا تہمد پنڈلی کے نصف سے ایک بالشت نیچے تک لٹکا سکتی ہیں۔ اگر اس سے پاؤں کھلتے ہوں تو بالشت کی جگہ زیادہ سے زیادہ ایک ہاتھ نیچے کر لیں۔ اس سے زیادہ نیچے نہ کریں۔

مَاجَاءَ فِی الْاِنْتِعَالِ

جوتا پہننے کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِی الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا یَمْشِیْنَّ اَحَدُكُمْ فِی نَعْلٍ وَاحِدَةٍ لِیُنْعِلْهُمَا جَمِیْعًا اَوْ لِیُخْفِهِمَا جَمِیْعًا.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص ایک جوتی پہن کر نہ چلے۔ یا تو دونوں پاؤں میں جوتا پہنے یا دونوں سے اتار دے۔﴾

وضاحت :

ایک پاؤں میں جوتا پہننا ایک احمقانہ حرکت ہے۔ آدمی کو جوتے دونوں پاؤں میں پہننے چاہئیں یا پھر دونوں میں نہ پہنے۔ ہاں اگر کسی کا ایک ہی پاؤں ہے یا کسی مجلس میں ایک جوتا گم ہو گیا تو مجبوری ہے۔ حدیث کا اطلاق اس صورت پر نہیں۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِی الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِذَا انْتَعَلَ اَحَدُكُمْ فَلْیَبْدَاْ بِالْیَمِیْنِ وَ اِذَا نُزِعَ فَلْیَبْدَاْ بِالشِّمَالِ وَلْتَكُنِ الْیُمْنٰی اَوَّلَهُمَا تُنْعَلُ وَ آخِرَهُمَا تُنْزَعُ.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی جوتا پہنے تو چاہیے کہ وہ دہنے پاؤں سے شروع کرے اور اتارے تو بائیں سے شروع کرے۔ داہنا پاؤں جوتا پہننے میں پہلا اور اتارنے میں آخری ہو۔﴾

وضاحت :

یہ بات اسلامی آداب میں سے ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ہر چیز میں اپنی امت کی تربیت بڑی تفصیل سے کی ہے، حتیٰ کہ یہاں جوتا پہننے اور اتارنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَمِّهِ اَبِی سُهَيْلِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ كَعْبِ الْاَحْبَارِ اَنَّ رَجُلًا نَزَعَ نَعْلَيْهِ فَقَالَ لِمَ خَلَعْتَ نَعْلَيْكَ لَعَلَّكَ تَاَوَّلْتَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِی الْمُقَدَّسِ طُوًی قَالَ ثُمَّ قَالَ كَعْبٌ لِلرَّجُلِ اَتَدْرِی مَا كَانَتْ نَعْلَا مُوسٰی قَالَ مَالِكٌ لَا اَدْرِی مَا اَجَابَهُ الرَّجُلُ فَقَالَ كَعْبٌ كَانَتَا مِنْ جِلْدِ حِمَارٍ مَيِّتٍ.

﴿کعب احبارؒ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کسی موقع پر اپنے دونوں جوتے اتارے۔ انہوں نے پوچھا کہ تم نے جوتے کیوں اتارے؟ شاید تم نے یہ کام اس آیت کی تاویل میں کیا ہے۔ فاخلع نعلیك انك بالوادی المقدس طوی (اپنے جوتے اتار دو کیونکہ تم وادی مقدس طویٰ میں ہو)۔ پھر کعب نے اس شخص سے کہا۔ کیا تم جانتے ہو کہ حضرت موسیٰ کے جوتے کس چیز کے بنے ہوئے تھے؟ مالک کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ اس شخص نے کیا جواب دیا۔ کعب نے کہا کہ وہ مردہ گدھے کی کھال کے بنے ہوئے تھے۔﴾

وضاحت:

معلوم ہوتا ہے آدمی نے جوتے کسی ایسے مقام پر اتار دیے جہاں ان کے اتارنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس پر کعب احبارؒ نے اعتراض کیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے اس حکم کی روشنی میں ایسا کیا ہے جس میں انہیں کوہ طور کی وادی طویٰ میں جوتے اتارنے کو کہا گیا تھا۔ پھر انہوں نے بتایا کہ موسیٰ کو جن جوتوں کے اتارنے کا حکم ہوا وہ مردہ گدھے کی کھال سے بنائے گئے تھے۔ کعبؒ یہودی عالم تھے۔ ان کی ساری معلومات اسرائیلیات میں سے تھیں۔ جب اسلام میں آئے تو ان کو جب شوق ہوتا اور موقع ملتا تو اسرائیلی روایات بیان کرتے تھے۔ کعبؒ کی یہ روایت بھی اسرائیلیات کی ایک مثال ہے۔ ورنہ قرآن مجید نے جوتے اتارنے کا یہ سبب بیان نہیں کیا کہ حضرت موسیٰ کے جوتے مردہ گدھے کی کھال کے تھے۔

مَا جَاءَ فِی لُبْسِ الثِّيَابِ
کپڑوں کے پہننے کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِی الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ اَنَّهُ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ

اللّٰهِ ﷺ عَنْ لِبْسَتَيْنِ وَ عَنْ بَيْعَتَيْنِ عَنِ الْمُلَامَسَةِ وَ عَنِ الْمُنَابَذَةِ وَ عَنْ اَنْ يَحْتَبِیَ الرَّجُلُ فِی ثَوْبٍ وَاحِدٍ لَيْسَ عَلٰی فَرْجِهِ مِنْهُ شَیْءٌ وَ عَنْ اَنْ يَشْتَمِلَ الرَّجُلُ بِالثَّوْبِ الْوَاحِدِ عَلٰی اَحَدِ شِقَّيْهِ.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو قسم کے لباسوں اور دو طرح کے سودوں سے منع فرمایا۔ آپ نے ملامست اور منابذت سے منع فرمایا، نیز اس بات سے کہ آدمی کمر اور ٹانگوں کو ایک ہی کپڑے میں اس طرح باندھے کہ اس کی شرمگاہ پر کوئی چیز نہ ہو، اور اس بات سے کہ آدمی اپنے چادر کو اس طرح لپیٹے کہ وہ ایک ہی پہلو پر آئے اور دوسرے پر کچھ نہ ہو۔﴾

وضاحت:

لوگوں نے جوئے کی کئی شکلوں کو رواج دیا ہے۔ جس طرح آج ریفل اور لاٹری وغیرہ کی شکلیں رائج ہیں اسی طرح زمانہ جاہلیت میں تاجر مال کو دیکھے بغیر جوئے کا سودا کرتے تھے۔ نبی ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ ملامست بیع کی وہ شکل تھی جس میں خریدار مال کو دیکھے بغیر جس چیز پر ہاتھ رکھ دیتا اس کی بیع ہو جاتی۔ منابذت میں کوئی چیز پھینکی جاتی تو وہ جس مال کو لگ جاتی خریدار کے لیے اس کو لینا لازم ہوتا۔ خریدنے والے کو دیکھنے کا اختیار نہیں تھا۔ ایسے سودوں میں فریب، زیادتی اور خطرے کے عناصر شامل ہوتے ہیں، لہٰذا ان سے حضور نے منع فرمایا ہے۔

جن دو لباسوں سے حضور نے منع فرمایا ان کو احتباء اور اشتمال سے تعبیر کیا ہے۔ ہمارے دیہات میں لوگ جب مل بیٹھتے ہیں تو اپنی رانوں کو پیٹ کے ساتھ لگا کر ایک چادر سے ٹانگوں اور کمر کو باندھ لیتے ہیں۔ یہ نشست آرام دہ ہو جاتی ہے۔ اسی کو احتباء کہتے ہیں۔ اشتمال سے مراد جسم کو ایک ہی کپڑے سے اس طرح لپیٹ لینا ہے کہ بازو بھی اس میں سے نہ نکالے جا سکیں۔ ہمارے ہاں پاجامہ یا شلوار پہنی جاتی ہے لیکن عربوں کا لباس ایک لمبی قمیص پر مشتمل ہوتا جس کے نیچے کبھی پاجامہ یا جانگیہ پہنا جاتا اور کبھی غریب لوگ محض قمیص یا سادہ چادر کو کافی سمجھتے۔ آخری شکل میں احتباء اور اشتمال کی صورتوں میں ستر کھل جانے کا امکان ہوتا۔ لہٰذا اس خدشہ کے پیش نظر آنحضرت ﷺ نے چادر اوڑھنے کی ان شکلوں کو منع فرمایا۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَاٰی حُلَّةَ

سِيَرَاءَ تُبَاعُ عِنْدَ بَابِ الْمَسْجِدِ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوِ اشْتَرَيْتَ هٰذِهِ الْحُلَّةَ فَلَبِسْتَهَا يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَلِلْوَفْدِ اِذَا قَدِمُوْا عَلَيْكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّمَا يَلْبَسُ هٰذِهِ مَنْ لَا خَلَاقَ لَهُ فِي الْاٰخِرَةِ ثُمَّ جَاءَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مِنْهَا حُلَلٌ فَاَعْطٰى عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ مِنْهَا حُلَّةً فَقَالَ عُمَرُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَكْسَوْتَنِيْهَا وَقَدْ قُلْتَ فِي حُلَّةِ عُطَارِدٍ مَا قُلْتَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَمْ اَكْسُكَهَا لِتَلْبَسَهَا فَكَسَاهَا عُمَرُ اَخًا لَهُ مُشْرِكًا بِمَكَّةَ.

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ایک ریشمی سوٹ دیکھا کہ مسجد کے دروازے پر بک رہا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا یارسول اللہ! اگر آپ اس کو خرید لیتے تو جمعہ کو بھی پہن لیتے اور وفود کے لیے بھی جب وہ آتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کو تو وہ لوگ پہنتے ہیں جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ پھر آنحضرت ﷺ کے پاس کہیں سے ایسے سوٹ آئے تو آپ نے حضرت عمرؓ کو بھی ایک سوٹ بھیجا۔ حضرت عمرؓ نے کہا یارسول اللہ، آپ نے میرے پہننے کے لیے سوٹ بھیجا حالانکہ آپ نے عطارد کے سوٹ کے بارے میں جو کہا وہ کہا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے تمہارے پہننے کے لیے نہیں دیا۔ تو حضرت عمرؓ نے اپنے ایک مشرک بھائی کے پہننے کے لیے مکہ بھیج دیا۔﴾

وضاحت :

حلہ کہتے ہیں ایک چادر اور ایک تہمد کو یا قمیص اور تہمد کو۔ یہ وہی عمر بن خطابؓ ہیں جن کے اپنے کپڑوں میں بیوند لگے رہتے تھے۔ لیکن اس وقت ابھی اس طرح کا جذبہ باقی تھا۔

اس بات میں اختلاف ہے کہ حضرت عمرؓ کا کوئی بھائی تھا یا نہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے آنحضرت ﷺ کو وہ بات یاد دلائی تو آپ نے وضاحت کر دی کہ تم اسے کسی اور کام میں لاؤ۔ مثلاً وہ اپنی بیوی کو دے سکتے تھے یا کسی اور کو تحفہ دے سکتے تھے تو انہوں نے اپنے مشرک بھائی کو بھیج دیا۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک دنیاوی معاملات کا تعلق ہے مسلمان اپنے کافر و مشرک بھائیوں کا بھی خیال رکھتے تھے، اس لیے کہ یہ الگ

ایک خیر کا کام ہے۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ اِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِي طَلْحَةَ اَنَّهُ قَالَ قَالَ اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ رَاَيْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ وَ هُوَ يَوْمَئِذٍ اَمِيْرُ الْمَدِيْنَةِ وَقَدْ رَقَعَ بَيْنَ كَتِفَيْهِ بِرِقَاعٍ ثَلَاثٍ لَبَدَ بَعْضَهَا فَوْقَ بَعْضٍ.

﴿انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر بن خطابؓ کو دیکھا، اور وہ اس زمانے میں مدینہ کے امیر تھے، کہ انہوں نے اپنے دونوں کندھوں کے درمیان تین پیوند ایک دوسرے کے اوپر چپکائے ہوئے تھے۔﴾

وضاحت :

ایک وہ عمر ہیں جو رسول اللہ ﷺ کو ریشمی سوٹ خریدنے کا مشورہ دیتے ہیں اور ایک یہ کہ اپنی قمیص کو تین تین پیوند لگائے ہوئے ہیں۔ امیر مدینہ ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خلیفہ بننے کے بعد کی بات ہے۔ حضرت عمرؓ بیت المال سے اپنے اوپر کم سے کم خرچ کرتے تھے تاکہ غرباء کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ نیز یہ چیز اپنے دوسرے امراء اور بعد کے لوگوں کے لیے نمونہ ہو۔ یوں بھی خلفائے راشدین اپنا معیار زندگی عوام الناس سے زیادہ بلند نہیں کرتے تھے تاکہ لوگوں کے درمیان معیار بلند کرنے کے مقابلہ کی خواہش نہ پیدا ہو جائے۔

مَا جَاءَ فِي صِفَةِ النَّبِيِّ ﷺ

نبی ﷺ کے حلیہ کے بارے میں

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ رَبِيْعَةَ بْنِ اَبِي عَبْدِالرَّحْمٰنِ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّهُ سَمِعَهُ يَقُوْلُ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَيْسَ بِالطَّوِيْلِ الْبَائِنِ وَلَا بِالْقَصِيْرِ وَلَا بِالْاَبْيَضِ الْاَمْهَقِ وَلَا بِالْاٰدَمِ وَلَا بِالْجَعْدِ الْقَطَطِ وَلَا بِالسَّبْطِ بَعَثَهُ اللّٰهُ عَلٰى رَاْسِ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً فَاَقَامَ بِمَكَّةَ عَشْرَ سِنِيْنَ وَ بِالْمَدِيْنَةِ عَشْرَ سِنِيْنَ وَتَوَفَّاهُ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ عَلٰى رَاْسِ سِتِّيْنَ سَنَةً وَ لَيْسَ فِي رَاْسِهِ وَلِحْيَتِهِ عِشْرُوْنَ شَعْرَةً بَيْضَاءَ ﷺ وَعَلَيْهِ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ.

﴿ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ انہوں نے انس بن مالک سے سنا۔ وہ فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نہ تو بہت لمبے تھے، نہ پستہ قد تھے، نہ بالکل چٹے سفید تھے اور نہ زیادہ گندم گوں۔ نہ آپ کے بال بالکل گھنگریالے تھے اور نہ بالکل سپاٹ۔ چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا۔ آپ نے مکے میں دس سال قیام کیا اور مدینہ میں دس سال اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ساٹھ سال کے خاتمے پر وفات دی جب آپ کے سر پر یا داڑھی میں بیس بال بھی سفید نہیں تھے۔ اللہ آپ پر رحم فرمائے اور سلامتی دے۔ آپ پر اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں۔﴾

وضاحت :

جہاں تعریف کرنا مشکل ہو رہا ہو وہاں نفی واثبات دونوں کو جمع کیا جاتا ہے۔ حضور طویل البائن یعنی لمبے تڑنگے نہ تھے اور نہ ہی پستہ قد تھے۔ مطلب یہ ہوا کہ درمیانہ قد تھے۔ اسی طرح آپ کا رنگ نہ بالکل سفید اور نہ ہی ایسا جو مائل بہ سیاہی ہو بلکہ سفیدی مائل گندمی تھا۔ بال بھی نہ بہت پر شکن تھے اور نہ ہی بالکل سپاٹ، جیسے معلوم ہو کہ پٹ سن کو دھو کر کسی چیز پر لٹکا دیا گیا ہے کہ اس میں نہ کوئی شکن ہے نہ گرہ۔

آنحضرت ﷺ کی عمر کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض لوگ آپ کے تیرہ سال شمار کرتے ہیں جبکہ اس روایت میں دس سال شمار کیے گئے ہیں۔ اسی ماہ پر یہاں عمر تریسٹھ برس کے بجائے ساٹھ برس بتائی گئی ہے۔ باقی رہ گیا یہ سوال کہ نبوت کے لیے چالیس سال کی عمر متعین ہے تو اس مفروضہ کی کوئی بنیاد نہیں۔ عمر اس سے کم وبیش بھی ہو سکتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ ان کو اس سے کم عمر میں نبوت ملی۔ لہٰذا اس سوال کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔

مَاجَاءَ فِي صِفَةِ عِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَالدَّجَّالِ

حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اور دجّال کے حلیہ کے بارے میں

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَرَانِي اللَّيْلَةَ عِنْدَ الْكَعْبَةِ فَرَاَيْتُ رَجُلًا اٰدَمَ كَاَحْسَنِ مَا اَنْتَ رَاءٍ مِنْ اُدْمِ الرِّجَالِ لَهٗ لِمَّةٌ كَاَحْسَنِ

مَا اَنْتَ رَاءٍ مِنَ اللِّمَمِ قَدْ رَجَّلَهَا فَهِيَ تَقْطُرُ مَاءً مُتَّكِئًا عَلٰى رَجُلَيْنِ اَوْ عَلٰى عَوَاتِقِ رَجُلَيْنِ يَطُوْفُ بِالْكَعْبَةِ فَسَاَلْتُ مَنْ هٰذَا قِيْلَ هٰذَا الْمَسِيْحُ بْنُ مَرْيَمَ ثُمَّ اِذَا اَنَا بِرَجُلٍ جَعْدٍ قَطَطٍ اَعْوَرِ الْعَيْنِ الْيُمْنٰى كَاَشْبَهِ مَنْ رَاَيْتُ بِابْنِ قَطَنٍ فَسَاَلْتُ مَنْ هٰذَا فَقِيْلَ لِي هٰذَا الْمَسِيْحُ الدَّجَّالُ.

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں رات میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں کعبہ کے پاس ہوں۔ پھر ایک گندمی رنگ کے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کا رنگ گندمی لوگوں کے رنگ میں سے سب سے خوبصورت ہے۔ اس کی زلفیں بہترین ہیں جو کوئی دیکھنے والا دیکھ سکتا ہے۔ ان میں کنگھا کیے ہوئے ہے اور ان میں سے پانی ٹپک رہا ہے۔ وہ دو آدمیوں پر ٹیک لگائے یا دو آدمیوں کے کندھوں کا سہارا لیے ہوئے کعبہ کا طواف کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون حضرت ہیں؟ تو جواب ملا کہ یہ عیسیٰ بن مریم ہیں۔ پھر ناگاہ میری نظر ایک شخص پر پڑی جس کے بال حبشیوں کی طرح پر شکن گھنگھریالے تھے۔ اس کی داہنی آنکھ اندھی تھی اور ابھری ہوئی جیسے گول انگور کا دانہ۔ میں نے پوچھا یہ کون ہے تو جواب ملا کہ یہ مسیح دجال ہے۔﴾

وضاحت :

اس روایت میں آنحضرت ﷺ کے ایک رویا کا ذکر ہے جس میں آپ نے دو اشخاص کو دیکھا۔ ایک عیسیٰ علیہ السلام کو بیت اللہ کا طواف کرتے اور دوسرا دجال کو۔ حضرت عیسیٰ کے اس حلیہ کی تائید انجیلوں سے بھی ہوتی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ سیدنا مسیح کی زلفیں اس طرح کی نہیں تھیں جیسے سردی کے بے رونق، خشک اور پراگندہ بال ہوتے ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ ابھی نہا کر نکلے ہیں اور ابھی تیل لگا کر کنگھا کیا ہے یا یوں معلوم ہوتا تھا کہ تیل ٹپک رہا ہے۔

جعد قطط کا مطلب ہے بہت ہی گھنگریالے بالوں والا شخص۔ حبشی لوگوں کے بال اس طرح کے ہوتے ہیں۔ دوان میں انگوٹھیاں بھی الجھا لیتے ہیں اور نہایت ہی بدنما معلوم ہوتے ہیں۔ دجال کے متعلق روایت صحیح بخاری میں بھی ہے۔ اس بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ مدینہ کے ایک شخص ابن صیاد کے متعلق آنحضرت کو شبہ ہوتا تھا کہ یہ وہی دجال نہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں اس کو قتل نہ کر دوں؟ آپ نے فرمایا کہ اگر یہ واقعی دجال ہوگا تو تم

اس پر قابو نہیں پاؤ گے اور اگر وہ نہیں ہے تو کسی کی جان لینے سے کیا فائدہ؟ بہر حال یہ ایک شخصیت ہے جس کے آنے کی روایت مشہور ہے لیکن وہ اب تک آئی نہیں۔ اگر آئی ہوتی تو پکڑی گئی ہوتی کیونکہ اتنی واضح علامات کے ہوتے ہوئے وہ چھپ تو نہیں سکتی۔ ایسی شخصیت سے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آئے گی، ابھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب آئے گی دیکھا جائے گا۔ اس کا انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

حدیث کی کتابوں میں دجال اور حضرت عیسیٰ کا ذکر بالعموم ایک ساتھ آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت عیسیٰ کی شخصیت کو اکثر مدعیوں نے استعمال کیا ہے۔ چونکہ آنجناب کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دوبارہ زندہ ہوں گے، تو جو مدعی اٹھتا ہے ان کا نام لیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دجال بھی آئے گا تو انہی کے پردے میں آئے گا اور کہے گا کہ میں مسیح موعود ہوں۔ لیکن کہاں حضرت عیسیٰ کی زلفیں اور ملائم اور چمکتے بال اور کہاں یہ ذات خبیث کہ جس کی آنکھ پھولی ہوئی اور بال جھٹیوں جیسے ہوں گے۔

مَاجَاءَ فِي السُّنَّةِ فِي الفِطرَةِ

فطرت کی سنت کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِي سَعِيدٍ الْمَقْبُرِيِّ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ خَمْسٌ مِنَ الْفِطْرَةِ تَقْلِيمُ الْأَظْفَارِ وَ قَصُّ الشَّارِبِ وَ نَتْفُ الْإِبِطِ وَ حَلْقُ الْعَانَةِ وَالْاِخْتِتَانُ.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ پانچ چیزیں فطرت میں سے ہیں۔ ناخن ترشوانا، مونچھوں کا منڈوانا، بغل کے بال اتارنا، ناف کے نیچے کے بال مونڈنا اور ختنہ کروانا۔﴾

وضاحت :

یہاں یہ روایت موقوف ہے لیکن اسے مرفوع بھی بیان کیا گیا ہے۔ فطرت سے مراد وہ تقاضے ہیں جو خیر و شر کے اس علم پر مبنی ہیں جو انسان کے اندر ہے اور پہلے سے موجود ہے۔ شریعت اس کے علاوہ ہے اور یہ فطری نور کے اوپر ایک اور نور ہے۔ یعنی فطرت کے احکام قدیم ترین ہونے چاہئیں جو ازل سے چلے آ رہے ہوں۔ گویا فطرت کے کام حضرت آدم بھی کرتے رہے ہوں گے اور ان کی اولاد میں بھی وہ چیزیں رائج رہی ہوں گی۔ روایت میں بیان کردہ پانچ باتوں میں پہلی بات ناخن ترشوانا ہے۔ اچھی انسانی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ ناخن ترشوائے جائیں۔ ناخن

بڑھانا درندوں کی صفت ہے۔ مونچھوں کا منڈوانا مالکیہ کے نزدیک یہ ہے کہ لبوں کے اوپر سے مونچھیں منڈوا دی جائیں۔ حضرت عمرؓ کے متعلق آتا ہے کہ ان کو جب کوئی مہم پیش آتی تو اپنی مونچھوں کو بڑھا دیتے ہوئے غور کرتے تھے۔ میرا دل کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ ایسا کرتے ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب مشکل پیش آتی ہے تو آدمی کمزور سا ہو جاتا ہے۔ اس کا چہرہ فق ہو جاتا ہے۔ لیکن صاحب عزم مشکل سے نکلنے کے لیے سوچتا ہے کہ کیا راستہ اختیار کیا جائے تو وہ مونچھوں کو بڑھا دیتا ہے۔ حضرت عمرؓ ایک مثالی صاحب عزم آدمی اور اسلامی تہذیب کے نمونہ کامل ہیں۔ اگر وہ مونچھیں رکھتے تھے تب قص شارب کے معنی یہ ہیں کہ لب کھلا ہونا چاہیے، اس سے اوپر رکھنے میں مضائقہ نہیں۔ مالکیہ کا مذہب میرے نزدیک ٹھیک ہے اور اہل حدیث اس معاملہ میں متشدد ہیں۔

بغل کے بال لینا اور ناف کے نیچے کے بال مونڈنا بھی فطرت کا تقاضا ہے۔ یہ بال بڑھ جائیں تو گھن آتی ہے۔

ختنہ بھی سنت فطرت میں سے ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق یہ روایت نہایت عجیب سی ہے کہ انہوں نے اسی سال کی عمر میں ختنہ کرایا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب یہ حکم فطرت کے احکام سے ہے تو یہ بالکل شروع ہی سے انسانوں کے عمل میں رہا ہوگا۔ عیسائیوں میں ختنہ کا رواج نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے پال کے پیچھے لگ کر اپنی شریعت ہی کو بالائے طاق رکھ دیا۔ یہی حال ہندوؤں کا ہے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّهُ قَالَ كَانَ إِبْرَاهِيمُ أَوَّلَ النَّاسِ ضَيَّفَ الضَّيْفَ وَ أَوَّلَ النَّاسِ اخْتَتَنَ وَ أَوَّلَ النَّاسِ قَصَّ الشَّارِبَ وَ أَوَّلَ النَّاسِ رَأَى الشَّيْبَ فَقَالَ يَا رَبِّ مَا هَذَا فَقَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى وَقَارٌ يَا إِبْرَاهِيمُ فَقَالَ يَا رَبِّ زِدْنِي وَقَارًا.

﴿سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام پہلے شخص تھے جنہوں نے مہمانوں کی میزبانی کی۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے ختنہ کیا۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے مونچھیں ترشوائیں اور وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے بڑھاپے کے سفید بال دیکھے۔ اس پر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا یا رب یہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ وقار ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اے رب، میرے وقار میں اضافہ کر۔﴾

وضاحت :

یہ ایک تابعی کا قول ہے۔ بعض علماء نے اس کو حضرت ابوہریرہؓ تک پہنچایا ہے لیکن بہر حال یہ مرفوع حدیث نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا مضمون پچھلی روایت سے ٹکراتا ہے۔ اس قول میں کچھ کاموں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولیت کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ اس مضمون کو دیکھتے ہوئے بہت سے لوگوں نے کچھ مزید کاموں میں ان کی اولیت بتائی ہے اور اس فہرست کو طویل کر دیا ہے۔

ابن مسیب نے جن باتوں میں حضرت ابراہیمؑ کی اولیت بیان کی ہے ان میں پہلی چیز مہمان نوازی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان سے پہلے کئی جلیل القدر پیغمبر گزرے تو کیا وہ مہمانوں کی میزبانی نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی امتوں کو اس کی تعلیم نہیں دی تھی۔ اسی طرح جب ختنہ کروانا اور مونچھیں ترشوانا خصال فطرت میں سے ہے تو کیا حضرت ابراہیم سے پہلے جو سلیم الفطرت لوگ گزرے کیا انہیں اس کا سلیقہ نہیں آتا تھا۔ پھر اگر حضرت ابراہیم پہلے شخص تھے جنہوں نے بڑھاپا دیکھا تو کیا حضرت نوح علیہ السلام جنہوں نے تقریباً ایک ہزار برس عمر پائی ان پر بڑھاپا طاری نہیں ہوا اور وہ جوان ہی رہے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام کاموں میں سے کوئی کام ایسا نہیں جس کا حضرت ابراہیم سے پہلے وجود نا ممکن کہا جا سکتا ہو۔

ہو سکتا ہے ابن مسیب کے قول کا اصل مفہوم یہ ہو کہ جہاں تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم اور خاندان کا تعلق ہے ان کے اندر ابراہیم سے قبل اعلیٰ خصال کی روایت نہیں تھی اور سیدنا ابراہیم پہلے شخص تھے جنہوں نے ان پر عمل کیا۔ مثال کے طور پر ان سے پہلے انبیاء توحید کی دعوت دیتے رہے تھے لیکن جس طرح انہوں نے بحث و مباحثے میں لوگوں کو دلائل دی اس کی مثال پہلے نہیں ملتی۔ توجیہ اگر اس طرح کی جائے تو ابن مسیب کی بات کا ایک محمل سمجھ میں آتا ہے ورنہ یہ روایت اوپر والی روایت کی نفی کرتی ہے۔

□ قَالَ يَحْيٰى وَ سَمِعْتُ مَالِكًا يَقُوْلُ يُؤْخَذُ مِنَ الشَّارِبِ حَتّٰى يَبْدُوَ طَرَفُ الشَّفَةِ وَهُوَ الْاِطَارُ وَلَا يَجُزُّهُ فَيُمَثِّلُ بِنَفْسِهٖ.

﴿یحییٰ کہتے ہیں کہ امام مالک سے میں نے سنا۔ وہ کہتے تھے کہ مونچھوں میں سے اتنے بال لیے جائیں گے کہ آدمی کے ہونٹوں کے کنارے کھل جائیں اور اس کو اطار بھی کہتے ہیں۔ نیز مونچھوں کو

اتنا نہ گھونٹ دیا جائے کہ آدمی اپنے آپ کا مثلہ کر لے۔﴾

وضاحت :

یہ امام مالک کا فتویٰ ہے اور ماثور کا عمل اسی پر ہے۔ گویا ان کے نزدیک مونچھیں اتنی تو ہونی چاہئیں کہ کسی مشکل کے وقت آدمی ان کا سہارا لے سکے اور حضرت عمرؓ کی طرح اپنی مونچھوں کو تاؤ دے سکے۔

اَلنَّهْيُ عَنِ الْاَكْلِ بِالشِّمَالِ

بائیں ہاتھ سے کھانے کی ممانعت کے بارے میں

□ حَدَّثَنِيْ عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِي الزُّبَيْرِ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ السُّلَمِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى اَنْ يَّاْكُلَ الرَّجُلُ بِشِمَالِهٖ اَوْ يَمْشِيَ فِيْ نَعْلٍ وَّاحِدَةٍ وَّ اَنْ يَّشْتَمِلَ الصَّمَّاءَ وَ اَنْ يَّحْتَبِيَ فِيْ ثَوْبٍ وَّاحِدٍ كَاشِفًا عَنْ فَرْجِهٖ.

﴿جابر بن عبداللہ سلمیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ آدمی اپنے بائیں ہاتھ سے کھائے، یا ایک ہی پاؤں میں جوتا پہنے چلے، یا ایک ہی کپڑے میں اشتمال یا احتباء کرے جس سے اس کی شرمگاہ کے ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو۔﴾

وضاحت :

بائیں ہاتھ سے کھانے کی دو صورتیں مجبوری کی ہیں۔ ایک یہ کہ کسی کا ایک ہی ہاتھ ہو اور دوسری یہ کہ دائیں میں کوئی تکلیف ہو، ورنہ میرے نزدیک فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ داہنے ہاتھ سے کھانا چاہیے۔ اس کے علاوہ جتنے بھی صاف ستھرے کام ہیں وہ داہنے ہاتھ سے کیے جائیں اور جتنے کام دوسرے لگاؤ لپیٹ کے ہیں وہ بائیں ہاتھ سے کیے جائیں۔

ایک پاؤں میں جوتا پہننے کے متعلق بھی یہی ہے کہ اگر کسی کا ایک ہی پاؤں ہے اور وہ ویسا بھی پر چلتا ہے تو اعتراض نہ ہوگا لیکن اگر کوئی فیشن بنانا چاہے تو یہ حماقت ہے۔

اشتمال اور احتباء کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ اس کے ممنوع ہونے کا ہمارے ہاں سوال پیدا نہیں ہوتا

کیونکہ شلوار یا جامہ کے ساتھ ستر نہیں کھلتا۔ البتہ دیہاتی لوگ اگر تہمد میں ہوں یا ایک چادر میں ہوں تو ان کے ستر کے کھل جانے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں احتیاط لازم ہو گی۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ اَبِي بَكْرِ بْنِ عُبَيْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِذَا اَكَلَ اَحَدُكُمْ فَلْيَاْكُلْ بِيَمِيْنِهٖ وَلْيَشْرَبْ بِيَمِيْنِهٖ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ يَاْكُلُ بِشِمَالِهٖ وَيَشْرَبُ بِشِمَالِهٖ.

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو چاہیے کہ داہنے ہاتھ سے کھائے اور پانی پیئے تو داہنے سے پیئے کیونکہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا اور پیتا ہے۔﴾

وضاحت :

احادیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام شر، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس کا منبع شیطان ہے۔ تو یہاں پر آنحضرتؐ نے بائیں ہاتھ سے کھانے کو اصل مرکز کی طرف منسوب کر دیا کہ یہ شیطانی طریقہ ہے۔ چونکہ محرک اول وہی ہوتا ہے تو یہ فعل بھی شیطان کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ مہذب قوموں کو یہ کام نہیں کرنا چاہیے۔

مَاجَاءَ فِي الْمَسَاكِيْنِ

مساکین کے بارے میں

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَيْسَ الْمِسْكِيْنُ بِهٰذَا الطَّوَّافِ الَّذِيْ يَطُوْفُ عَلَى النَّاسِ فَتَرُدُّهُ اللُّقْمَةُ وَاللُّقْمَتَانِ وَالتَّمْرَةُ وَالتَّمْرَتَانِ قَالُوْا فَمَا الْمِسْكِيْنُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ الَّذِيْ لَا يَجِدُ غِنًى يُغْنِيْهِ وَلَا يَفْطَنُ النَّاسُ لَهٗ فَيُتَصَدَّقُ عَلَيْهِ وَلَا يَقُوْمُ فَيَسْاَلُ النَّاسَ.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسکین وہ نہیں ہے جو لوگوں کے آگے گردش کرتا ہے۔ کوئی اس کو ایک لقمہ دے دیتا ہے کوئی دو لقمے اور کوئی ایک کھجور دے دیتا ہے

کوئی دو کھجوریں۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ، پھر مسکین ہوا کون؟ آپ نے فرمایا جو اتنے مال سے تو محروم ہے جو اس کو غنی کر دے، لیکن اس کے استغناء کے باعث لوگ سمجھ نہیں پاتے کہ اس پر صدقہ کریں اور وہ خود نکلتا نہیں کہ لوگوں سے سوال کرے۔﴾

وضاحت :

یعنی ضرورت مند ہوتے ہوئے بھی کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتا اور اس حال میں رہتا ہے کہ لوگ سمجھ نہیں پاتے کہ آیا یہ مسکین ہے کہ اس کو کچھ دیا جائے۔ وہ بلند حوصلہ ہوتا ہے جو یہ زحمت نہیں اٹھانا چاہتا کہ کوئی کہے کہ جاؤ یا معاف کرو۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنِ بْنِ بُجَيْدٍ الْاَنْصَارِيِّ ثُمَّ الْحَارِثِيِّ عَنْ جَدَّتِهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ رُدُّوا الْمِسْكِيْنَ وَلَوْ بِظِلْفٍ مُحْرَقٍ.

﴿ابن مجید انصاری اپنی دادی سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسکین کو اپنے دروازے سے لوٹاؤ اگرچہ ایک جلی ہوئی کھری ہی سے کیوں نہ ہو۔﴾

وضاحت :

مراد وہ کھری ہے جو ہنڈیا میں چڑھائی گئی تھی اور وہ جل گئی۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی حقیر سے حقیر چیز ہی کیوں نہ میسر ہو مسکین کو کچھ دے دلا کر واپس کرنا چاہیے۔ ویسے ہی لوٹانا نہیں چاہیے۔

مَاجَاءَ فِي مِعًى الْكَافِرِ

کافر کی آنتوں کے بارے میں

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَاْكُلُ الْمُسْلِمُ فِي مِعًى وَاحِدٍ وَالْكَافِرُ يَاْكُلُ فِي سَبْعَةِ اَمْعَاءٍ.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان ایک آنت میں کھاتا ہے

اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔﴾

وضاحت :

یہ روایت ظاہر کے خلاف ہے اس لیے اس کی توجیہ اگلی روایت کی روشنی میں کرنی چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ راوی نے اس روایت سے اتنے ٹکڑے کو لے کر الگ روایت کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روایت اپنے موقع و محل سے کٹ گئی۔ اس وجہ سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ سُهَيْلِ بْنِ اَبِي صَالِحٍ عَنْ اَبِيهِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ ضَافَهُ ضَيْفٌ كَافِرٌ فَاَمَرَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِشَاةٍ فَحُلِبَتْ فَشَرِبَ حِلَابَهَا ثُمَّ اُخْرٰى فَشَرِبَهُ ثُمَّ اُخْرٰى فَشَرِبَهُ حَتّٰى شَرِبَ حِلَابَ سَبْعِ شِيَاهٍ ثُمَّ اِنَّهُ اَصْبَحَ فَاَسْلَمَ فَاَمَرَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِشَاةٍ فَحُلِبَتْ فَشَرِبَ حِلَابَهَا ثُمَّ اَمَرَ لَهُ بِاُخْرٰى فَلَمْ يَسْتَتِمَّهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْمُؤْمِنُ يَشْرَبُ فِي مِعًى وَاحِدٍ وَالْكَافِرُ يَشْرَبُ فِي سَبْعَةِ اَمْعَاءٍ.

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ہاں ایک کافر مہمان ہوا۔ آنحضرتؐ نے ایک بکری اس کے لیے دوہنے کا حکم دیا۔ دودھ دی گئی تو اس نے اس کا دودھ پیا۔ پھر دوسری دوہی گئی وہ بھی پی گیا۔ پھر تیسری دوہی گئی وہ بھی پی گیا۔ یہاں تک کہ سات بکریوں کا دودھ پی گیا۔ صبح کو یہ آدمی مسلمان ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک بکری دوہنے کا کہا۔ دودھ دی گئی تو اس نے اس کا دودھ پی لیا۔ پھر آپ نے دوسری بکری کا کہا تو اس کے کچھ گھونٹ پی کر اس کر دیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مومن ایک آنت میں پیتا ہے اور کافر سات آنتوں میں۔﴾

وضاحت :

یہ ایک خاص واقعہ ہے۔ اس میں مومن اور کافر کی طبع، خواہش اور حرص کا فرق نمایاں کیا ہے۔ مومن کے اندر صبر، قناعت اور غنا ہوتی ہے اور وہ تھوڑے پر کفایت کر لیتا ہے۔ اور کافر کے اندر یہ بات ہوتی ہے کہ معلوم نہیں پھر ملے یا نہ ملے، ابھی سے بھر لو۔ یہ بات اس کے کردار پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس طرح مومن کے ایمان کا

کردار پر یہ اثر پڑتا ہے کہ اس میں قناعت اور صبر اور اللہ پر بھروسہ ہوتا ہے کہ جس نے اب دیا ہے وہ آئندہ بھی دے گا۔ کافر کی یہ سوچ نہیں ہوتی۔

اس روایت میں متعین طور پر یہ بتانا مقصود نہیں کہ سب کافر ایسے ہی ہوتے ہیں بلکہ تمثیل کے طور پر واضح کیا ہے۔ کتنے کافر ہیں جن کی خوراک کم ہوتی ہے۔ اسی طرح سے بہت سے مسلمان ہیں جو کافروں کا حصہ بھی کھا جاتے ہیں۔ لیکن یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ کھانے پینے کے معاملہ میں ایک صاحب ایمان آدمی کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ اس روایت سے پچھلی روایت کا حکم واضح ہو گیا۔ کیونکہ اس روایت کے آخری ٹکڑے کو الگ کر کے روایت کر دی گئی۔ دونوں کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہی ہیں۔ لیکن مجلس مختلف ہیں۔ جب آخری ٹکڑا اپنے موقع و محل سے کٹ گیا تو روایت ظاہر کے خلاف ہو گئی۔ البتہ اب بات ٹھیک ہو گئی۔

اَلنَّهْيُ عَنِ الشُّرْبِ فِي آنِيَةِ الْفِضَّةِ وَالنَّفْخِ فِي الشَّرَابِ

چاندی کے برتن میں پینے اور پینے کی چیز میں پھونک مارنے کی ممانعت

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيْقِ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ الَّذِي يَشْرَبُ فِي آنِيَةِ الْفِضَّةِ اِنَّمَا يُجَرْجِرُ فِي بَطْنِهِ نَارَ جَهَنَّمَ.

﴿عبداللہ بن عبدالرحمٰن نبی ﷺ کی زوجہ ام سلمہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص چاندی کے برتن میں پیتا ہے وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ غٹ غٹ اتارتا ہے۔﴾

وضاحت :

اونٹ پانی پیتا ہے تو جب اپنی گردن اوپر اٹھاتا ہے تو اس سے غٹ غٹ کی آواز آتی ہے۔ اس کے لیے "جرجر" کا لفظ آتا ہے۔ جہنم کی آگ اگرچہ پینے کی چیز نہیں لیکن عربیت کے قاعدے کے لحاظ سے یہ تعبیر، اس خاص آواز کے لیے جو پانی پینے سے نکلتی ہے، ٹھیک ہے۔ کھانے میں، پینے میں، سواری میں، مکان میں اور ہر چیز میں غیر ضروری تکلف اخلاق کے خلاف ہے۔ زندگی سادہ ہونی چاہیے۔ آدمی اپنی وسعت اور حوصلے کے مطابق اسے جتنا بھی بڑھا لے لیکن حدود سے کبھی تجاوز نہیں ہونا چاہیے۔ اگر چاندی کے برتن آپ کی میز پر ہوں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے

ریشمی سوٹ آپ کے سوٹ کیس میں ہوں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے چاندی کے برتنوں کی ممانعت اس لیے فرمائی کہ عربوں کی معاشرت سادہ تھی تو ان کی یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ایران اور مصر کی تہذیب کا عربوں کی زندگی پر خاصا اثر تھا اور ان کے برتنوں کے نام تک کافی تعداد میں معرب ہیں۔ حضرت عمرؓ کا طرز عمل بھی یہ بتاتا ہے کہ مشقت کی زندگی اختیار کی جانی چاہیے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَيُّوْبَ بْنِ حَبِيْبٍ مَوْلٰى سَعْدِ بْنِ اَبِي وَقَّاصٍ عَنْ اَبِي الْمُثَنّٰى الْجُهَنِيِّ اَنَّهُ قَالَ كُنْتُ عِنْدَ مَرْوَانَ بْنِ الْحَكَمِ فَدَخَلَ عَلَيْهِ اَبُوْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيُّ فَقَالَ لَهُ مَرْوَانُ اَسَمِعْتَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنَّهُ نَهٰى عَنِ النَّفْخِ فِي الشَّرَابِ فَقَالَ لَهُ اَبُوْسَعِيْدٍ نَعَمْ فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّي لَا اَرْوٰى مِنْ نَفَسٍ وَاحِدٍ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَاَبِنِ الْقَدَحَ عَنْ فِيْكَ ثُمَّ تَنَفَّسْ فَقَالَ لَهُ اَرَى الْقَذَاةَ فِيْهِ قَالَ فَاهْرِقْهَا.

﴿ابوالمثنی جہنی کہتے ہیں کہ میں مروان بن حکم کے پاس موجود تھا تو وہاں ابو سعید خدریؓ آ گئے۔ مروان نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ نے پینے کے پانی میں پھونک مارنے سے منع کیا ہے۔ ابو سعید نے کہا کہ ہاں۔ اس پر ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ، میں ایک سانس میں تو آسودہ نہیں ہو پاتا (لہذا لگاتار پیتا ہوں)۔ آپ نے فرمایا کہ پیالہ ہونٹ سے الگ کر کے سانس لے لیا کرو۔ اس نے کہا میں اس میں تنکا دیکھ لیتا ہوں تو؟ آپ نے فرمایا کہ پیالہ الٹ دو۔﴾

وضاحت :

نبی ﷺ نے جس چیز سے منع فرمایا وہ یہ ہے کہ آدمی پانی پیتا ہی چلا جائے اور سانس بھی پیالہ کے اندر ہی لے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر آدمی تھوڑا تھوڑا پانی پینے سے آسودہ نہ ہوتا ہو تو پیالہ کو منہ سے ذرا ہٹا کر سانس لے لے۔ پیالہ میں ہی سانس نہیں لینا چاہیے۔ آنحضرت کی یہ ہدایت طبی لحاظ سے بالکل درست ہے۔ پانی میں سانس لینے سے پانی سانس کی نالی میں چلے جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ یہ نبی کا مقام ہے کہ حضور نے ہر معاملے میں امت کی رہنمائی فرمائی۔

مَاجَاءَ فِي شُرْبِ الرَّجُلِ وَهُوَ قَائِمٌ

کھڑے کھڑے پانی پینے کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ وَعَلِيَّ بْنَ اَبِي طَالِبٍ وَ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ كَانُوا يَشْرَبُوْنَ قِيَامًا.

﴿امام مالک کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ عمر بن خطابؓ، علی ابن ابی طالبؓ اور عثمان بن عفانؓ کھڑے ہو کر پانی پیتے تھے۔﴾

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ اَنَّ عَائِشَةَ اُمَّ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ سَعْدَ بْنَ اَبِي وَقَّاصٍ كَانَا لَا يَرَيَانِ بِشُرْبِ الْاِنْسَانِ وَهُوَ قَائِمٌ بَاْسًا.

﴿ابن شہاب سے روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ ام المومنین اور سعد بن ابی وقاصؓ دونوں آدمی کے کھڑے ہو کر پانی پینے میں کوئی قباحت نہیں خیال کرتے تھے۔﴾

☐ عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِيْ جَعْفَرٍ الْقَارِي اَنَّهُ قَالَ رَاَيْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ يَشْرَبُ قَائِمًا.

﴿ابو جعفر قاری روایت کرتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمرؓ کو کھڑے ہو کر پانی پیتے دیکھا۔﴾

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّهُ كَانَ يَشْرَبُ قَائِمًا.

﴿عامر بن عبداللہ بن زبیر اپنے باپ کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ کھڑے ہو کر پیتے تھے﴾

وضاحت :

مذکورہ چاروں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مالک کے زمانے میں یہ مسئلہ زیر بحث آ گیا تھا کہ کیا کھڑے ہو کر پانی پینا جائز ہے یا نہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس بارے میں دو رائیں رہی ہوں گی۔ اس سلسلہ میں امام مالک نے تعامل صحابہ کا حوالہ دیا ہے کہ تمام اکابر صحابہ کھڑے ہو کر پینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے۔ ان روایات میں یہ مسئلہ تو بالکل واضح ہو گیا کہ کھڑے ہو کر پانی پینے میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ کھڑے ہو کر کھانا کھانے کا مسئلہ قابل غور ہے۔ صحابہؓ کے دور میں یہ تصور بھی نہ تھا کہ کبھی ہوٹلنگ کا وقت بھی آئے گا اور لوگ کھڑے ہو

کر کھانا کھایا کریں گے۔

اَلسُّنَّةُ فِي الشُّرْبِ وَمُنَاوَلَتِهِ عَنِ الْيَمِيْنِ

پینے اور دینے سے پکڑانے کے بارے میں سنت

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اُتِيَ بِلَبَنٍ قَدْ شِيْبَ بِمَاءٍ مِنَ الْبِئْرِ وَ عَنْ يَمِيْنِهِ اَعْرَابِيٌّ وَ عَنْ يَسَارِهِ اَبُوْبَكْرٍ الصِّدِّيْقُ فَشَرِبَ ثُمَّ اَعْطَى الْاَعْرَابِيَّ وَقَالَ الْاَيْمَنَ فَالْاَيْمَنَ.

﴿انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس دودھ لایا گیا جس میں کنویں کا پانی ملایا گیا تھا۔ آپ کے داہنے ایک بدو تھا اور بائیں حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے۔ آپؐ نے پیا اور بدو کو دے دیا اور کہا کہ داہنا داہنا ہی ہے۔﴾

وضاحت :

جس طرح کھانا کھانے میں داہنے ہاتھ سے کھانے کا حکم ہے یا جو تا پہننے میں دائیں پاؤں سے آغاز کرنے کا حکم ہے اسی طرح مجلس میں کوئی چیز تقسیم کی جارہی ہو تو اس میں دائیں بیٹھے ہوئے لوگوں کا حق مقدم ہوگا۔ ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ جب ابوبکر صدیقؓ کو نظر انداز کر کے بدو کو پہلے دے رہے ہیں تو یہ بڑی چیز ہے اور اس کا سبب داہنے کا احترام ہے۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِي حَازِمِ بْنِ دِيْنَارٍ عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ الْاَنْصَارِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اُتِيَ بِشَرَابٍ فَشَرِبَ مِنْهُ وَ عَنْ يَمِيْنِهِ غُلَامٌ وَ عَنْ يَسَارِهِ الْاَشْيَاخُ فَقَالَ لِلْغُلَامِ اَتَاْذَنُ لِيْ اَنْ اُعْطِيَ هٰؤُلَاءِ الْاَشْيَاخَ فَقَالَ الْغُلَامُ لَا وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَا اُوْثِرُ بِنَصِيْبِيْ مِنْكَ اَحَدًا قَالَ فَتَلَّهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِي يَدِهِ.

﴿سہل بن سعد انصاری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے کوئی پینے کی چیز لائی گئی۔ آپؐ نے اس میں سے پیا۔ آپ کے داہنے ایک چھوکرا تھا اور بائیں بڑے عمر رسیدہ لوگ۔ آپ نے لڑکے

سے پوچھا کیوں بھئی، تم اجازت دیتے ہو کہ میں ان بزرگوں کو دے دوں۔ لڑکے نے کہا نہیں یارسول اللہ، میں آپ کا حصہ کسی کے لیے ایثار کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔﴾

وضاحت :

معلوم ہوتا ہے کہ لڑکا نہایت ہی سلیم الطبع تھا۔ جو حصہ اس کو رسول اللہ ﷺ سے مل رہا تھا وہ کسی کو دینے پر تیار نہ ہوا اور اکابر صحابہ دیکھتے ہی رہ گئے۔ یہ بھی داہنے کا احترام تھا جو نبی ﷺ نے ملحوظ رکھا۔

جَامِعُ مَاجَاءَ فِي الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ

کھانے اور پینے کے بارے میں جامع باب

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ اِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِي طَلْحَةَ اَنَّهٗ سَمِعَ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يَقُوْلُ قَالَ اَبُو طَلْحَةَ لِاُمِّ سُلَيْمٍ لَقَدْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ ضَعِيْفًا اَعْرِفُ فِيْهِ الْجُوْعَ فَهَلْ عِنْدَكِ مِنْ شَيْءٍ فَقَالَتْ نَعَمْ فَاَخْرَجَتْ اَقْرَاصًا مِنْ شَعِيْرٍ ثُمَّ اَخَذَتْ خِمَارًا لَهَا فَلَفَّتِ الْخُبْزَ بِبَعْضِهٖ ثُمَّ دَسَّتْهُ تَحْتَ يَدِي وَ رَدَّتْنِي بِبَعْضِهٖ ثُمَّ اَرْسَلَتْنِي اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ فَذَهَبْتُ بِهٖ فَوَجَدْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ جَالِسًا فِي الْمَسْجِدِ وَمَعَهُ النَّاسُ فَقُمْتُ عَلَيْهِمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَرْسَلَكَ اَبُو طَلْحَةَ قَالَ فَقُلْتُ نَعَمْ قَالَ لِلطَّعَامِ فَقُلْتُ نَعَمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِمَنْ مَعَهٗ قُوْمُوْا قَالَ فَانْطَلَقَ وَانْطَلَقْتُ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ حَتّٰى جِئْتُ اَبَا طَلْحَةَ فَاَخْبَرْتُهٗ فَقَالَ اَبُوْطَلْحَةَ يَا اُمَّ سُلَيْمٍ قَدْ جَاءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِالنَّاسِ وَ لَيْسَ عِنْدَنَا مِنَ الطَّعَامِ مَا نُطْعِمُهُمْ فَقَالَتِ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ فَانْطَلَقَ اَبُو طَلْحَةَ حَتّٰى لَقِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَاَقْبَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَ اَبُو طَلْحَةَ مَعَهٗ حَتّٰى دَخَلَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ هَلُمِّي يَا اُمَّ سُلَيْمٍ مَا عِنْدَكِ فَاَتَتْ بِذٰلِكَ الْخُبْزِ فَاَمَرَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَفُتَّ وَ عَصَرَتْ عَلَيْهِ اُمُّ سُلَيْمٍ

عُكَّةً لَهَا فَادَمْتُهُ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَقُوْلَ ثُمَّ قَالَ ائْذَنْ لِعَشَرَةٍ بِالدُّخُوْلِ فَاذِنَ لَهُمْ فَاكَلُوا حَتّٰى شَبِعُوْا ثُمَّ خَرَجُوْا ثُمَّ قَالَ ائْذَنْ لِعَشَرَةٍ فَاذِنَ لَهُمْ فَاكَلُوا حَتّٰى شَبِعُوْا ثُمَّ خَرَجُوْا ثُمَّ قَالَ ائْذَنْ لِعَشَرَةٍ فَاذِنَ لَهُمْ فَاكَلُوا حَتّٰى شَبِعُوْا ثُمَّ خَرَجُوْا ثُمَّ قَالَ ائْذَنْ لِعَشَرَةٍ فَاذِنَ لَهُمْ فَاكَلُوا حَتّٰى شَبِعُوْا ثُمَّ خَرَجُوْا ثُمَّ قَالَ ائْذَنْ لِعَشَرَةٍ حَتّٰى اَكَلَ الْقَوْمُ كُلُّهُمْ وَ شَبِعُوْا وَالْقَوْمُ سَبْعُوْنَ رَجُلًا اَوْ ثَمَانُوْنَ رَجُلًا.

﴿عبداللہ بن ابی طلحہؓ کہتے ہیں کہ انہوں نے انس بن مالکؓ سے سنا۔ وہ کہتے تھے کہ ابو طلحہؓ نے اپنی بیوی ام سلیمؓ سے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی آواز میں کمزوری محسوس کی ہے۔ میرے خیال میں آپ بھوک میں مبتلا ہیں۔ کیا تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں۔ انہوں نے چند ٹکیاں جو کی نکالیں، ان کو اپنی اوڑھنی کے کچھ حصہ میں لپیٹا اور میری بغل میں دے دیا اور اوڑھنی کا کچھ حصہ میرے اوپر ڈال دیا۔ پھر مجھے رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف فرما ہیں۔ آپ کے پاس اور لوگ بھی ہیں۔ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ کیا ابو طلحہ نے بھیجا ہے؟ میں نے کہا جی ہاں۔ آپ نے پوچھا کھانے پر بلایا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں۔ رسول اللہ ﷺ نے ساتھیوں سے کہا چلو۔ سب لوگ چل پڑے اور میں ان کے آگے آگے تھا۔ یہاں تک کہ میں ابو طلحہ کے پاس آیا اور ان کو خبر دی۔ ابو طلحہ نے ام سلیم سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں اور ہمارے پاس اتنا کھانا تو نہیں کہ ان کو کھلا سکیں۔ انہوں نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسول خوب جانتے ہیں۔ انسؓ کہتے ہیں کہ ابو طلحہ گئے اور رسول اللہ ﷺ سے ملے۔ پھر رسول اللہ ﷺ اور ابو طلحہؓ ساتھ ساتھ گھر میں داخل ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے کہا ام سلیم لاؤ کیا ہے تمہارے پاس۔ انہوں نے وہی روٹیاں پیش کیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تو وہ چورا کی گئیں اور ام سلیم نے اپنی چمڑے کی کپی اوپر انڈیل دی اور اس کو سالن دار کر دیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اس پر جو چاہا دعا کی۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ دس آدمیوں کو اندر بلاؤ۔ آپ کی اجازت سے انہوں نے کھایا،

آسودہ ہو گئے اور نکل گئے۔ آپ نے پھر کہا کہ دس آدمیوں کو بلاؤ۔ آپ کی اجازت سے انہوں نے کھایا، آسودہ ہو گئے اور نکل گئے۔ آپ نے پھر کہا دس آدمیوں کو بلاؤ۔ آپ کی اجازت سے انہوں نے کھایا، آسودہ ہو گئے اور نکل گئے۔ آپ نے پھر فرمایا کہ دس آدمیوں کو بلاؤ، آپ کی اجازت سے انہوں نے کھایا، آسودہ ہوئے اور نکل گئے۔ آپ نے پھر فرمایا کہ دس آدمیوں کو بلاؤ۔ یہاں تک کہ سب لوگوں نے کھایا اور آسودہ ہو گئے۔ یہ تمام لوگ ستر یا اسی آدمی تھے۔﴾

وضاحت:

یہ روایت صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دوسری کتابوں میں بھی آئی ہے لیکن الفاظ ہر جگہ بدلے ہوئے ہیں۔ زرقانی نے دس روایتوں کا حوالہ دیا ہے اور ان سب میں الفاظ مختلف ہیں۔ ان کے خیال میں موقع ایک ہی ہے البتہ واقعات مختلف ہو سکتے ہیں جن کو اکٹھا کر کے ایک واقعہ بنانے میں کامیابی نہیں ہوتی۔ بعض محدثین کا خیال ہے کہ ان تمام روایات کے مواقع الگ الگ ہوں گے، حالانکہ واقعات کا اختلاف اس بات کا قرینہ نہیں ہوتا کہ ان کا موقع الگ الگ ہو۔

بعض روایات کی رو سے یہ واقعہ غزوہ خندق کے دوران پیش آیا۔ اس روایت میں جو کی روٹیوں کا ذکر ہے جن کا چورا بنایا گیا اور اس میں گھی یا تیل ملا کر نرم کیا گیا، دوسری روایات میں بکری ذبح کر کے شوربے کے ساتھ روٹی کھلانے کا۔ اگر یہ واقعہ غزوہ خندق کا ہے تو مسجد سے مراد مسجد نبوی نہیں ہو گی بلکہ وہ جگہ ہو گی جہاں سب لوگ نماز کے لیے جمع ہوتے ہوں گے۔ اس روایت کے مطابق روٹیاں تیار تھیں جبکہ دوسری روایت میں یہ ہے کہ مزدوری کے معاوضہ سے غلہ خرید کر پیسا گیا اور اس سے روٹی بنائی گئی۔ روایات میں کھانے والوں کی تعداد کا فرق بھی ہے۔ بعض کے نزدیک یہ تعداد اسی تھی۔

باقی رہ گئی یہ بات کہ کھانے میں برکت ہو سکتی ہے تو یہ مشاہدہ کی بات ہے کہ برکت ہوتی ہے۔ آنحضرتؐ کی دعا کے بعد اس میں ہر برکت کی توقع ہو سکتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جو معجزات بائبل میں بیان ہوئے ہیں ان میں بھی ہے کہ بعض اوقات لوگوں کی بھیڑ ہوتی تھی کہ آپ ان کو کھانے کی دعوت دے دیتے۔ ان کا خادم پوچھتا کہ ان کو کہاں سے کھلائیں گے۔ وہ کہتے کہ تم کھلاؤ گے۔ وقت آنے پر پوچھتے کہ تمہارے پاس کتنی روٹی ہے وہ

کتے تین بیاتی۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ اپنا معجزہ دکھاتے اور تمام گروہ کھا کر آسودہ ہو جاتا اور اس کے بعد بھی روٹی کے کئی ٹوکرے اٹھائے جاتے۔ لہٰذا پیغمبر کی دعا کی برکت سے ایسا ہونا ممکن ہے۔

❐ حدثنی عن مالك عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی هريرة ان رسول الله ﷺ قال طعام الاثنين كافی الثلاثة و طعام الثلاثة كافی الاربعة.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دو آدمیوں کا کھانا تین آدمیوں کے لیے کافی اور تین کا کھانا چار آدمی کے لیے کافی ہونا چاہیے۔﴾

وضاحت :

واقعہ یہ ہے کہ اگر دل میں جگہ ہو تو کھانے میں بھی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر دل تنگ ہو تو پھر کھانے کی برکت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ ہر روز تجربہ ہوتا رہتا ہے کہ کھانا اگرچہ دو آدمی کا ہوتا ہے لیکن تین چار کھا لیتے ہیں۔ روایت کا یہ مطلب نہیں کہ یہ حکم ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ ایسا ہونا چاہیے۔ آدمی کے دل میں فیاضی اور وسعت ہو، قناعت اور ایثار ہو، خود غرضی اور طمع نہ ہو۔

❐ حدثنی عن مالك عن ابی الزبير المكی عن جابر بن عبدالله ان رسول الله ﷺ قال اغلقوا الباب و اوكوا السقاء و اكفئوا الاناء او خمروا الاناء و اطفئوا المصباح فان الشيطان لا يفتح غلقا ولا يحل وكاء ولا يكشف اناء و ان الفويسقة تضرم على الناس بيتهم.

﴿حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سونے سے پہلے دروازہ بند کر لو، مشکیزہ باندھ دو، برتن ڈھانک دو اور چراغ گل کر دو۔ کیونکہ شیطان بند دروازے کو نہیں کھولتا، نہ مشکیزہ کا بند حسن کھولتا اور نہ برتن کو کھولتا ہے۔ جبکہ چوہیا لوگوں کے گھروں کو آگ لگا دیتی ہے۔﴾

وضاحت :

روزمرہ زندگی سے متعلق آنحضرت ﷺ نے یہ ہدایات دی ہیں جو بے حد قیمتی ہیں۔ یہ حکمت کی تعلیم

ہے۔ چھوٹی چھوٹی بے پروائیاں بعض اوقات بہت سنگین نتائج تک پہنچا دیتی ہیں۔ لہٰذا آدمی کو محتاط رویہ رکھنا چاہیے۔ قرآن مجید کی روشنی میں شیطان کو جو اختیار حاصل ہے وہ اس اتنا ہے کہ صرف وسوسہ اندازی کرے۔ وہ عملاً کچھ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ وہ لوگوں میں غلط فہمیاں ڈال کر فتنہ اندازی کرتا ہے۔ اگر اسے عملاً نقصان پہنچانے کا اختیار ہو تو کوئی گھر سلامت نہ رہے۔ اسی حقیقت کی تعبیر نبی ﷺ نے کی ہے۔

فویسقہ کا لفظ بہت ہی عمدہ ہے۔ طبیعت پھڑک اٹھی۔ یہ فاسقہ (چھنال) کی تصغیر ہے اور حضور نے اس سے مراد چوہیا کو لیا ہے جو گھروں میں بڑے نقصانات کر دیتی ہے۔ گزشتہ زمانے میں اور آج بھی دیہاتوں میں سرسوں کے تیل کے دیے استعمال ہوتے ہیں۔ چوہیا کی غذا اس میں ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ بستی بستی لے اڑتی اور گھر میں آگ لگا دیتی ہے۔

❐ حدثنی عن مالك عن سعيد ابن ابی سعيد المقبری عن ابی شريح الكعبی ان رسول الله ﷺ قال من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليقل خيرا او ليصمت و من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم جاره و من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه جائزته يوم وليلة و ضيافته ثلاثة ايام فما كان بعد ذلك فهو صدقة" ولا يحل له ان يثوی عنده حتی يحرجه.

﴿ابو شریح الکعبیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ بھلی بات کرے یا چپ رہے۔ اور جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے۔ اور جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے، ایک دن اور ایک رات اس کی خاطر تواضع کرے اور تین دن تک میزبانی کرے۔ اس کے بعد جو ہے وہ صدقہ ہے اور مہمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس کے پاس اتنا ٹھہرے کہ میزبان کو تنگ کر دے۔﴾

وضاحت :

زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کو آنحضرت ﷺ نے روشن نہ فرمایا ہو۔ اس روایت میں زندگی کے

بعید گوشوں کے متعلق رہنمائی فرمائی ہے۔ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ زبان کھولے تو خیر کے لیے ورنہ خاموش رہے کیونکہ سارے فتنے زبان کے بے جا استعمال سے جنم لیتے اور بالآخر آدمی کو جہنم میں لے جاتے ہیں۔ فضول بحث، لغویت، تہمت، تحقیر نہیں کرنی چاہیے۔ کلمہ خیر ہے تو ٹھیک ورنہ خاموشی اختیار کرنا ہی بھلے لوگوں کا طریقہ ہے۔

اللہ اور یوم آخر پر ایمان کا تقاضا یہ بھی ہے کہ پڑوسی کی عزت اور مہمان کی قدر کرے ورنہ اس کا ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت معتبر نہیں۔ مہمان کے متعلق حضورؐ نے یہ بھی فرمایا کہ پہلے دن اور رات کو آدمی اس کی خاطر تواضع کرے اور اس کے بعد تین دن تک ضیافت کرے یعنی جو کچھ خود کھاتا ہے وہ اسے بھی کھلائے۔ اس کے بعد اس کو کھانا کھلانا صدقہ ہے یعنی وہ مہمان نہیں بلکہ سائل کے درجہ میں ہوگا۔ مہمان کے لیے آپ نے یہ نصیحت فرما دی کہ وہ اتنا قیام نہ کرے کہ میزبان کی زندگی اجیرن کر دے۔

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ سُمَيٍّ مَوْلَى اَبِی بَكْرٍ عَنْ اَبِی صَالِحٍ السَّمَّانِ عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ بَيْنَمَا رَجُلٌ يَمْشِی بِطَرِيْقٍ اِشْتَدَّ عَلَيْهِ الْعَطَشُ فَوَجَدَ بِئْرًا فَنَزَلَ فِيْهَا فَشَرِبَ وَ خَرَجَ فَاِذَا كَلْبٌ يَلْهَثُ يَاْكُلُ الثَّرٰی مِنَ الْعَطَشِ فَقَالَ الرَّجُلُ لَقَدْ بَلَغَ هٰذَا الْكَلْبَ مِنَ الْعَطَشِ مِثْلُ الَّذِی بَلَغَ مِنِّی فَنَزَلَ الْبِئْرَ فَمَلَاَ خُفَّهُ ثُمَّ اَمْسَكَهُ بِفِيْهِ حَتّٰی رَقِیَ ثُمَّ سَقَی الْكَلْبَ فَشَكَرَ اللّٰهُ لَهُ فَغَفَرَ لَهُ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ اِنَّ لَنَا فِی الْبَهَائِمِ لَاَجْرًا فَقَالَ فِی كُلِّ ذِی كَبِدٍ رَطْبَةٍ اَجْرٌ.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک شخص راستے میں جا رہا تھا کہ اس کو سخت پیاس لگی۔ اس نے ایک کنواں پایا تو اس میں اتر گیا۔ اس نے پانی پیا اور نکلا تو دیکھا کہ ایک کتا ہانپتا ہوا پیاس کے باعث مٹی چاٹ رہا ہے۔ اس کو خیال آیا کہ اس کتے کو بھی وہی پیاس ہے جس سے مجھے سابقہ تھا۔ وہ کنویں میں اترا، اپنا موزہ پانی سے بھرا اور منہ میں پکڑ لیا، یہاں تک کہ اوپر چڑھ آیا۔ پھر پانی کتے کو پلایا۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی یہ خدمت پسند آئی تو اس کو بخش دیا۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا جانوروں کی خدمت کرنے میں بھی اجر ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، ہر زندہ جانور میں کہ جس کے اندر

جگر ہے، اس کا اجر ہے۔﴾

وضاحت:

بعض اوقات جس جذبے کے تحت کوئی کام کرتا ہے وہی اس کی اصل فطرت ہوتا ہے۔ جس شخص کا یہ جذبہ تھا کہ کتے کی پیاس دیکھ کر یہ کہے کہ اس کو بھی میرے جیسی پیاس لگی ہے وہ یقیناً بھلا آدمی ہو سکتا ہے، فاسق و فاجر شخص نہیں ہو سکتا۔ یہ ہر آدمی کا کام نہیں۔ اس شخص نے ایک ایسی خدمت کر دی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور اس کو معاف کر دیا۔ میرے خیال میں اس طرح کے آدمی نہایت شریف اور بنیادی طور پر نیک ہوتے ہیں۔ ان کے اندر رحم کا جذبہ ہوتا ہے۔ اس طرح کے آدمی کی غلطیاں ایسی نہیں ہوتیں کہ اس کو جہنم میں لے جائیں بلکہ ان کی اس طرح کی نیکیوں سے دھل جاتی ہیں۔

لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ کوئی زانیہ فاسقہ عورت ایسا کام کرے تو بخش دی جائے گی تو بحث پیدا ہوتی ہے۔ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ اس طرح کے لوگ کبھی توفیق نہیں پاتے۔ جو بھلے لوگ ہوتے ہیں ان کو ہی اللہ تعالیٰ توفیق دیتا ہے کہ کوئی چھوٹی سی نیکی بھی وہ اس شان سے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خوش ہو جاتا ہے۔ اور اس کی خوشی ان کی بخشش کے لیے کافی ہوتی ہے۔

ایک بات یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آدمی کی اس نیکی نے اس کے اچھے اعمال کے پلڑے کو اتنا بھاری کر دیا کہ اس کے گناہوں کا پلڑا اعتباراً ہلکا ہو گیا۔ جس خلوص سے اس نے نیکی کی اللہ تعالیٰ نے اپنی خوشنودی اس میں شامل کر کے اس کے نیکیوں کے پلڑے کو بھاری کر دیا۔ ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء.

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ وَهْبِ بْنِ كَيْسَانَ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ اَنَّهُ قَالَ بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَعْثًا قِبَلَ السَّاحِلِ فَاَمَّرَ عَلَيْهِمْ اَبَا عُبَيْدَةَ بْنَ الْجَرَّاحِ وَ هُمْ ثَلَاثُمِائَةٍ قَالَ وَ اَنَا فِيْهِمْ قَالَ فَخَرَجْنَا حَتّٰی اِذَا كُنَّا بِبَعْضِ الطَّرِيْقِ فَنِیَ الزَّادُ فَاَمَرَ اَبُوْعُبَيْدَةَ بِاَزْوَادِ ذٰلِكَ الْجَيْشِ فَجُمِعَ ذٰلِكَ كُلُّهُ فَكَانَ مِزْوَدَیْ تَمْرٍ قَالَ فَكَانَ يَقُوْتُنَا كُلَّ يَوْمٍ قَلِيْلًا قَلِيْلًا حَتّٰی فَنِیَ وَلَمْ نُصِبْنَا مِنْهُ اِلَّا تَمْرَةً تَمْرَةً فَقُلْتُ وَمَا تُغْنِی تَمْرَةٌ فَقَالَ لَقَدْ وَجَدْنَا فَقْدَهَا حَيْثُ فَنِيَتْ قَالَ ثُمَّ انْتَهَيْنَا اِلَی الْبَحْرِ فَاِذَا حُوْتٌ مِثْلُ الظَّرِبِ فَاَكَلَ مِنْهُ ذٰلِكَ الْجَيْشُ ثَمَانِیَ عَشْرَةَ لَيْلَةً ثُمَّ اَمَرَ

اَبُوْعُبَيْدَةَ بِضِلْعَيْنِ مِنْ اَضْلَاعِهٖ فَنُصِبَتَا ثُمَّ اَمَرَ بِرَاحِلَةٍ فَرُحِلَتْ ثُمَّ مَرَّتْ تَحْتَهُمَا وَلَمْ تُصِبْهُمَا

﴿جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ساحل کی جانب ایک مہم بھیجی اور اس پر ابو عبیدہ بن جراحؓ کو امیر بنایا۔ یہ پوری پارٹی تین سو آدمیوں کی تھی اور میں بھی ان میں شامل تھا۔ کہتے ہیں کہ جب ہم راستے میں ہی تھے تو زادِ راہ ختم ہو گیا۔ لشکر کے پاس جتنا غذائی سامان تھا، حضرت ابو عبیدہؓ نے کل کا کل جمع کرنے کا حکم دیا۔ یہ کھجور کے دو توشہ دان تھے۔ کہتے ہیں کہ امیر ہمیں روزانہ تھوڑا تھوڑا راشن دیتے تھے، یہاں تک کہ وہ بھی ختم ہو گیا اور ہمیں اس میں سے ایک ایک کھجور ملنے لگی۔ میں نے کہا، "اس ایک کھجور سے کیا بنتا ہے؟" انہوں نے کہا کہ ہم نے اس کی کمی کو اس وقت محسوس کیا جب وہ بھی ختم ہو گئی۔ پھر ہم ساحل پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پہاڑی کی طرح کی ایک مچھلی پڑی ہوئی ہے۔ لشکر نے اس سے اپنی غذائی ضرورت پورے اٹھارہ دن پوری کی۔ پھر ابو عبیدہؓ نے حکم دیا تو اس کی دو پسلیاں کھڑی کی گئیں، پھر انہوں نے سواری کے اونٹ پر کجاوہ کھولا، پھر وہ سواری ان کے نیچے سے گزاری گئی اور وہ ان پسلیوں کو چھوئی نہیں۔﴾

وضاحت :

یہ واقعہ سریہ سیف البحر کا ہے۔ زادِ راہ ختم ہو جانے پر ایک عظیم الجثہ مچھلی کا ملنا مجاہدین کے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد تھی جو غیر متوقع طور پر ان کو حاصل ہوئی اور انہوں نے اٹھارہ روز تک مچھلی کھائی۔ اس زمانے میں آج کل کے فریزر تو نہیں تھے۔ گوشت خشک کر کے رکھتے تھے۔ مچھلی کا بھی اور دوسرے جانوروں کا بھی۔ شریعت میں سمندر کا جانور حلال ہے اور اس کے لیے زندہ پکڑے جانے کی کوئی شرط نہیں۔ ہمارے ہاں فقہاء میں دو گروہ ہیں، جو دو انتہاؤں پر ہیں۔ احناف کے ہاں معروف مچھلی کے سوا اور کوئی چیز جائز نہیں، حالانکہ مچھلیاں بہت بڑی بڑی بھی ہوتی ہیں۔ شوافع کے ہاں شاید چند جانوروں کے سوا باقی سب سمندری جانور جائز ہیں۔ سمندری گھوڑے اور خنزیر، کچھوا اور کیکڑے بھی ان کے مذہب میں حلال ہیں۔ عام تصورِ دین میں بھی ان کی فقہ میں بڑی وسعت ہے۔ احناف نے

بالکل پابند کر دیا ہے۔ میرے خیال میں دونوں میں تھوڑی سی افراط و تفریط ہے۔ اصل میں دیکھا یہ گیا ہے کہ خشکی کے جانوروں میں جیسے ریچھ، سانپ اور بچھو بھی ہیں، اسی طرح پرندے بھی ہیں اور درندے بھی۔ پھر پرندوں میں بھی درندے ہیں، جو گوشت کھانے والے جانور ہیں۔ مذاقِ سلیم کے ساتھ یہ فیصلہ ہو جاتا ہے کہ کون سی چیزیں کھانے کی ہیں اور کون سی کھانے کی نہیں ہیں۔ چوپایوں میں بہت سے جانور جو جنگل میں پائے جاتے ہیں، مثلاً ہرن، گورخر، نیل گائے وغیرہ، یہ سب موشی چوپایوں کے حکم میں ہیں۔ اسی طرح سمندری جانوروں میں بہت سے ہیں جو خشکی کے درندوں (سباع) یا سانپوں کے مشابہ ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو انسی جانوروں کی مانند ہیں جن کو ہم کھاتے ہیں۔ مؤخر الذکر کا کھانا تو بلاشبہ جائز ہے لیکن جو جانور سانپوں اور بچھوؤں کے مشابہ ہیں، ان کو نہیں کھانا چاہیے۔ علیٰ ھذا القیاس سمندری پرندے مچھلیوں کے حکم میں نہیں آتے، بلکہ ان کا ذبح ہونا ضروری ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ سمندر میں بھی رہتے ہیں اور خشکی پر بھی رہتے ہیں۔ ان کا دونوں طرف آنا جانا ہوتا ہے۔ ان میں بھی بہت سے پرندے ایسے ہیں کہ جن کے گوشت میں حلت و حرمت کی حد پیدا ہوتی ہے۔ میں نے سمندر کا سفر کیا ہے اور دیکھا ہے کہ غول کے غول پرندے ہوتے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ کھانے کے نہیں ہیں اور ایسے بھی ہیں کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کھانے کے ہیں۔

باقی رہ گئی یہ بات کہ کیا اتنی بڑی مچھلی ہو سکتی ہے جس کی پسلیوں کو کھڑا کیا جائے تو ان کے نیچے سے اونٹ گزر سکے تو ایسا ہونا بعید نہیں۔ وہیل مچھلیاں بہت بڑی ہوتی ہیں۔ ان کے پیٹ میں کئی ہاتھی سما سکتے ہیں اور یہ مچھلیاں بعض اوقات سمندروں کے ساحلوں پر مردہ پائی بھی جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کوئی ایسی ہی مچھلی مجاہدین کی خوراک بنی۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ عَمْرِو بْنِ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ عَنْ جَدَّتِهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ يَا نِسَاءَ الْمُؤْمِنَاتِ لَا تَحْقِرَنَّ جَارَةٌ لِجَارَتِهَا وَلَوْ كُرَاعَ شَاةٍ مُحْرَقًا.

﴿عمرو بن سعد کی دادی روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مومنین کی بیویو، تم میں سے کوئی بھی اپنی پڑوسن کے لیے حقیر نہ سمجھے، اگرچہ بکری کی ایک جلی ہوئی کھری ہی کیوں نہ ہو۔﴾

وضاحت :

یہ آنحضرت ﷺ نے نصیحت کی ہے کہ اے مومن خواتین، تم میں سے کوئی بھی اپنی پڑوسن کے لیے

اپنے تحفہ کو حقیر نہ جانے، اگرچہ یہ تحفہ بکری کی جلی ہوئی کھری ہی کیوں نہ ہو۔ بکری کا جلا ہوا کھر یہ ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ہو تو یہ نہ سوچنا چاہیے کہ ایسا تحفہ کیا دینا۔ جو کچھ بھی میسر ہو، اس میں سے تحفہ بھیجنا چاہیے۔ یہ محبت کا اظہار ہے۔ محبت کے اسی اظہار کے لیے دوسری روایت میں آیا ہے کہ تحفے دیا کرو۔ یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ کوئی اچھی سی چیز ہو تو تحفہ بھیجوں۔ اپنے اظہار تعلق کے لیے یہ ضروری ہے کہ کچھ بھی ہو بھیجنا چاہیے اور تحفہ وصول کرنے والے کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ کسی بھی تحفہ کو حقیر نہ خیال کرے۔ "کراع" بکری کے کھر کو کہتے ہیں اور اس کو تیار کرنے کے لیے آگ پر جلاتے ہیں۔ جب اس کا سوپ نکلتا ہے تو وہ کوئی حقیر چیز نہیں ہوتا۔ وہ قیمتی ہوتا ہے، اگرچہ کھر خود اتنا قیمتی نہیں ہوتا۔ آج کل تو کھر کے بھی اتنے دام ہیں کہ حضرت عمرؓ اگر ہوتے تو اتنی قیمتی ڈش کبھی نہ کھاتے۔ نفسیاتی طور پر یہ حقیقت ہے کہ تحفے تحائف محبت بڑھانے کا قابل اعتماد ذریعہ ہیں۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِي بَكْرٍ اَنَّهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ نُهُوا عَنْ اَكْلِ الشَّحْمِ فَبَاعُوْهُ فَاَكَلُوا ثَمَنَهُ.

﴿عبداللہ بن ابی بکر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ یہود کو غارت کرے کہ ان کو چربی کھانے سے منع کیا گیا تو انہوں نے (یہ حیلہ کیا کہ) اس کو بیچا اور اس کی قیمت کھا گئے۔﴾

وضاحت :

قرآن مجید میں ہے کہ یہود کی سرکشی کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے اصر والاغلال کی نوعیت کی جو چیزیں ان پر حرام کیں، ان میں چربی بھی تھی، تو انہوں نے یہ طریقہ ایجاد کر لیا کہ چربی بیچ کر اس کی قیمت کھا جاتے۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ جو چیز کھانے کے لیے حرام ہے تو اس کی تجارت کر کے فائدہ اٹھانا بھی حرام ہے۔ جس چیز کا کھانا ممنوع نہیں، اس کی بیع کی حرمت کی بھی کوئی وجہ نہیں۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ كَانَ يَقُوْلُ يَا بَنِي اِسْرَائِيْلَ عَلَيْكُمْ بِالْمَاءِ الْقَرَاحِ وَالْبَقْلِ الْبَرِّيِّ وَ خُبْزِ الشَّعِيْرِ وَ اِيَّاكُمْ وَ خُبْزَ الْبُرِّ فَاِنَّكُمْ لَنْ تَقُوْمُوا بِشُكْرِهِ.

﴿امام مالک کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ عیسیٰ ابن مریم فرماتے تھے کہ اے بنی اسرائیل،

تمہارے لیے صاف پانی، کھیتی کی سبزی اور جو کی روٹی ہے، یہ کھایا کرو اور گیہوں کی روٹی سے بچو کہ تم اس کا شکر نہیں ادا کر پاؤ گے۔﴾

وضاحت :

یہ امام مالک کے بلاغات میں سے ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ یہ بات انہوں نے کہاں سے سنی۔ اس پر نہ ہی حدیث کا اطلاق ہوتا ہے، اور نہ ہی یہ بات انجیلوں میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معروف اقوال جو انہوں نے سنے، ان میں سے یہ ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امام مالک سند کو اہمیت نہیں دیتے، اگر بات مفید ہو تو روایت کر دیتے ہیں۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَوَجَدَ فِيْهِ اَبَابَكْرٍ الصِّدِّيْقَ وَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ فَسَاَلَهُمَا فَقَالَا اَخْرَجَنَا الْجُوْعُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَ اَنَا اَخْرَجَنِي الْجُوْعُ فَذَهَبُوْا اِلٰى اَبِي الْهَيْثَمِ بْنِ التَّيِّهَانِ الْاَنْصَارِيِّ فَاَمَرَ لَهُمْ بِشَعِيْرٍ عِنْدَهُ يُعْمَلُ وَقَامَ يَذْبَحُ لَهُمْ شَاةً فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نَكِّبْ عَنْ ذَاتِ الدَّرِّ فَذَبَحَ لَهُمْ شَاةً وَاسْتَعْذَبَ لَهُمْ مَاءً فَعُلِّقَ فِي نَخْلَةٍ ثُمَّ اَتَوْا بِذٰلِكَ الطَّعَامِ فَاَكَلُوْا مِنْهُ وَشَرِبُوْا مِنْ ذٰلِكَ الْمَاءِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَتُسْئَلُنَّ عَنْ نَعِيْمِ هٰذَا الْيَوْمِ.

﴿مالک کہتے ہیں کہ یہ بات ان کو پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں داخل ہوئے تو انہوں نے ابوبکر صدیقؓ اور عمر بن خطابؓ کو مسجد میں پایا۔ ان سے پوچھا (کہ کیسے آنا ہوا) تو انہوں نے کہا کہ ہم بھوک کے ستائے ہوئے نکلے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے بھی بھوک ہی نے نکالا ہے۔ پھر وہ ابوالہیثم بن التیہان انصاری کے پاس گئے تو ان کے پاس جو کا آٹا تھا۔ آپ نے حکم دیا کہ اس کو ملایا جائے۔ وہ اٹھے کہ مہمانوں کے لیے بکری ذبح کریں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دیکھو دودھ والی سے بچنا۔ انہوں نے ایک بکری ذبح کی اور ٹھنڈا پانی لائے اور اس کا مشکیزہ کھجور کے تنے سے لٹکا دیا۔ پھر کھانا لایا گیا اور اس میں سے سب نے کھایا اور پانی پیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آج جو نعمت نصیب ہوئی ہے اس کے متعلق قیامت میں تم سے پوچھا جائے گا۔﴾

وضاحت :

یہ حدیث امام مسلمؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ لیکن موطا میں یہ امام مالکؒ کے بلاغات میں سے ہے۔

اس روایت میں کچھ چیزیں قابل غور ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہی تین ہستیاں امت کا سرمایہ ہیں۔ روایت کی رو سے ان تینوں کا حال یہ تھا کہ بھوک سے لاچار ہو کر گھر سے نکل پڑیں۔ بھوک تو بلاشبہ لگ سکتی ہے لیکن یہ کیا کہ کھانے کی طلب میں گھر سے نکل پڑیں۔ آخر مقصد کیا تھا؟ کیا یہ تھا کہ کوئی ہمارے چہرے کو دیکھ کر پوچھے کہ کیا بات ہے تو کہہ دیں کہ خیر نہیں ہے، کچھ کھلاؤ۔ یا یہ کہ کوئی ہماری حالت کو دیکھ کر ہی ترس کھا جائے اور کچھ لا کر کھلا دے۔ یہ باتیں میں اپنے متعلق گمان نہیں کر سکتا چہ جائیکہ آنحضرت ﷺ کے متعلق گمان کروں۔ آنحضرتؐ کو بھوک لگتی رہی ہے لیکن اور کوئی واقعہ ایسا نہیں پایا کہ گھر سے اس مقصد کے ساتھ نکلے ہوں کہ کوئی کھانا کھلا دے۔

علماء کا ایک گروہ کہتا ہے کہ ایک اور روایت کے مطابق آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میرا رب مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو بھوک پیاس نہیں لگتی تھی جبکہ اس روایت میں یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھے بھوک نے گھر سے باہر نکالا ہے۔

اسی طرح کی ترمذی کی روایت میں بیان ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ابوبکر صدیقؓ سے جب پوچھا کہ وہ کیسے آئے تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے سوچا کہ آپ کی زیارت ہو جائے گی۔ یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ یہاں یہ روایت امام مالک کے بلاغات میں سے ہے لیکن مسلم میں یہ حدیث موصول ہے اور اس کے راوی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کا اسلام غزوۂ خیبر کے بعد کا ہے۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کا یہ حال نہیں رہا تھا کہ ایسی فاقہ کشی پیش آتی ہو۔ آنحضرتؐ کے حصہ میں تو خیبر کی کافی جائداد آئی تھی۔ دوسرے مسلمان بھی اس زمانہ میں خوشحال ہو گئے تھے۔ لہٰذا روایت میں بیان کی گئی کیفیت امر واقعی کے خلاف ہے۔ اگر یہ بات ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے کسی سے سن کر پچھلے دور کا واقعہ بیان کیا ہے تو انہیں بتانا چاہیے تھا کہ فلاں سے یہ سنا ہے، کیونکہ وہ خود واقعہ کے شاہد نہ تھے۔ ایک ایسے واقعہ کے متعلق جو اس زمانے میں پیش آیا جب وہ مسلمان بھی نہ تھے تو ان کا راوی ہونا ہی ثابت نہیں ہوتا۔

تیسری بات یہ ہے کہ بالفرض اگر یہ تینوں اکابر امت بھوکے تھے تو اس وقت کے معاشرے میں یہ کس

کے ہاں مہمان بن کر جا سکتے تھے؟ جن صحابی کا نام یہاں لیا گیا ہے ان کے ہاں آنحضرت کا آنا جانا معروف نہیں ہے۔ نیز ان کی شخصیت پر بھی راویوں کا اتفاق نہیں ہے۔ دوسری روایت میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے ہاں جانے کا ذکر ہے تو ان کے پاس کھجور کا ایسا باغ نہیں تھا جیسا کہ یہاں بیان کیا گیا ہے۔ کھجور کا باغ حضرت ابوطلحہ کے پاس تھا۔ وہاں حضور جاتے تو وہ کھجور اور لحضذ اپنی پیش کیا کرتے۔ زرقانی نے روایت کے کئی طریقے نقل کیے ہیں اور ہر ایک میں الگ الگ بیان ہے اور یہ متعین نہیں ہوتا کہ یہ کس کا قصہ ہے۔

یہ اس روایت کی مشکلات ہیں۔ جہاں تک واقعہ کا تعلق ہے تو اس سے ملتا جلتا کوئی واقعہ پیش آیا ہوگا۔ اور آنحضرت کا یہ فرمانا نہایت برمحل ہے کہ اس نعمت کے متعلق سوال ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ ہی فضل ہوا کہ اپنے گھر سے بھوکے نکلے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اچھا خاصا گوشت کھلا دیا۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ كَانَ يَأْكُلُ خُبْزًا بِسَمْنٍ فَدَعَا رَجُلًا مِنْ أَهْلِ الذِّمَّةِ فَجَعَلَ يَأْكُلُ وَيَتْبَعُ بِاللُّقْمَةِ وَضَرَ الصَّحْفَةِ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ كَأَنَّكَ مُقْفِرٌ فَقَالَ وَاللّٰهِ مَا أَكَلْتُ سَمْنًا وَلَا لُكْتُ أَكْلًا بِهِ مُنْذُ كَذَا وَ كَذَا فَقَالَ عُمَرُ لَا آكُلُ السَّمْنَ حَتّٰى يَحْيَا النَّاسُ مِنْ أَوَّلِ مَا يَحْيَوْنَ.

﴿حضرت عمر رضی اللہ عنہ روغن کے ساتھ روٹی کھا رہے تھے کہ اہل ذمہ میں سے ایک آدمی کو (کھانے میں شریک کرنے کے لیے) بلا لیا۔ وہ رکابی میں سے وہ روغن کھانے لگا جو ادھر ادھر کونوں میں لگا پڑا رہ گیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم عرصے سے فاقے میں رہے ہو۔ اس نے کہا کہ نہ میں نے روغن کھایا اور نہ فلاں زمانہ کے بعد سے کسی کو اس کے ساتھ روٹی کھاتے دیکھا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اب میں روغن نہیں کھاؤں گا جب تک لوگوں پر پہلی بارش کا چھینٹا نہ پڑ جائے۔﴾

وضاحت :

معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت اس قحط کے زمانے سے متعلق ہے جو حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں پڑا تھا۔ "حیا الناس من اول ما یحیون" کا یہ ترجمہ بھی کیا گیا ہے کہ جب تک لوگوں کی حالت پہلے جیسی نہ ہو جائے یعنی قحط کی حالت ختم نہ ہو جائے۔ بارش بھی قحط دور کرنے اور زندگی کی ہماہمی کا ذریعہ بنتی ہے اس لیے میں نے لوگوں پر

بارش کا چھینٹا پڑنے کے معنی لیے ہیں۔ حضرت عمرؓ اس ذمی کی حالت دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور قحط کے ختم ہونے تک روغن کھانا ترک کر دیا۔ یہ خلیفہ وقت نے مسلمانوں کے لیے مثال قائم کی۔ اگر ملک کے سربراہ کے دل میں عوام کا واقعی درد ہو تو وہ اپنے اوپر اس طرح کی پابندیاں عائد کرتا ہے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ إِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّهُ قَالَ رَأَيْتُ عُمَرَ ابْنَ الْخَطَّابِ وَهُوَ يَوْمَئِذٍ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ يُطْرَحُ لَهُ صَاعٌ مِنْ تَمْرٍ فَيَأْكُلُهُ حَتّٰى يَأْكُلَ حَشَفَهَا.

﴿انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو دیکھا، اور وہ اس وقت امیر المومنین تھے، کہ ان کے آگے ایک صاع بھر کھجور ڈال دیے جاتے اور وہ ایسے کھجور بھی کھاتے جو خراب ہوتے۔﴾

وضاحت:

حشف اس کھجور کو کہتے ہیں جو سوکھ کر خراب ہو گئی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے سامنے جب کھجوریں رکھی جاتیں تو وہ ایسی کھجور بھی کھا لیتے تھے جو قدرے خراب ہوتی۔ ان کا وہ حصہ جو کھانے کے قابل نہ ہوتا صرف اسی کو پھینکتے۔ ان کے سامنے کھجور پیش کرنے میں بھی رکھ رکھاؤ کا خیال نہیں ہوتا تھا کیونکہ انہوں نے بالکل سادہ عوامی انداز زندگی اپنا رکھا تھا۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّهُ قَالَ سُئِلَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عَنِ الْجَرَادِ فَقَالَ وَدِدْتُ أَنَّ عِنْدِي قَفْعَةً نَأْكُلُ مِنْهُ.

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ سے ٹڈی کے متعلق ان کا فتویٰ پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میری خواہش تو یہ ہے کہ ایک ٹوکری میرے آگے رکھ دی جائے کہ ہم اس میں سے کھائیں۔﴾

وضاحت:

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق آتا ہے کہ وہ جنگل کے شہد اور ٹڈیوں پر گزارا کرتے تھے۔ یہ ضرورت

[illegible] منحصر ہے۔ اگر کوئی دوسری چیز میسر نہ ہو تو ٹڈی کھانا ٹھیک ہے۔ جس چیز کو حضرت یحییٰ علیہ السلام نے کھایا اور حضرت عمرؓ نے اس کے کھانے کی خواہش ظاہر کی تو اس کا کھانا بہر حال جائز ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ ٹڈی جو [illegible] سے ہاں آتی ہے اس میں اور صحرا کی ٹڈی میں یہ فرق ہوتا ہے لیکن یہ بات کچھ درست نہیں معلوم ہوتی۔ صرف [illegible] ٹڈی کا فرق ہو سکتا ہے۔

حضرت عمرؓ کی یہ وہ چیزیں ہیں جن کے پیش نظر حضرت علیؓ نے ان سے کہا تھا کہ آپ نے اپنے بعد آنے والے تمام خلفاء کو شکست دے دی۔ اب کس کی طاقت ہے کہ آپ کی تقلید کر سکے گا۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَلْحَلَةَ عَنْ حُمَيْدِ بْنِ مَالِكِ بْنِ خُثَيْمٍ أَنَّهُ قَالَ كُنْتُ جَالِسًا مَعَ أَبِي هُرَيْرَةَ بِأَرْضِهِ بِالْعَقِيقِ فَأَتَاهُ قَوْمٌ مِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ عَلَى دَوَابَّ فَنَزَلُوا عِنْدَهُ قَالَ حُمَيْدٌ فَقَالَ أَبُوهُرَيْرَةَ اذْهَبْ إِلَى أُمِّي فَقُلْ إِنَّ ابْنَكِ يُقْرِئُكِ السَّلَامَ وَ يَقُولُ أَطْعِمِينَا شَيْئًا قَالَ فَوَضَعَتْ لَهُ ثَلَاثَةَ أَقْرَاصٍ فِي صَحْفَةٍ وَ شَيْئًا مِنْ زَيْتٍ وَ مِلْحٍ ثُمَّ وَضَعَتْهَا عَلَى رَأْسِي وَ حَمَلْتُهَا إِلَيْهِمْ فَلَمَّا وَضَعْتُهَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ كَبَّرَ أَبُوهُرَيْرَةَ وَ قَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَشْبَعَنَا مِنَ الْخُبْزِ بَعْدَ أَنْ لَمْ يَكُنْ طَعَامُنَا إِلَّا الْأَسْوَدَيْنِ الْمَاءَ وَالتَّمْرَ فَلَمْ يُصِبْ مِنَ الطَّعَامِ شَيْئًا فَلَمَّا انْصَرَفُوا قَالَ يَا ابْنَ أَخِي أَحْسِنْ إِلَى غَنَمِكَ وَامْسَحِ الرُّغَامَ عَنْهَا وَ أَطِبْ مُرَاحَهَا وَصَلِّ فِي نَاحِيَتِهَا فَإِنَّهَا مِنْ دَوَابِّ الْجَنَّةِ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَيُوشِكَنَّ أَنْ يَأْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ تَكُونُ الثُّلَّةُ مِنَ الْغَنَمِ أَحَبَّ إِلَى صَاحِبِهَا مِنْ دَارِ مَرْوَانَ.

﴿حمید بن مالک کہتے ہیں کہ میں حضرت ابوہریرہؓ کے پاس ان کے رقبے العقیق میں تھا۔ اہل مدینہ میں سے کچھ لوگ اپنی سواریوں پر آئے اور ان کے پاس اترے۔ حمید کہتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے مجھے کہا کہ تم میری امی کے پاس جاؤ اور کہو کہ بیٹا آپ کو سلام کہتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم کو کچھ کھلائیے۔ کہتے ہیں کہ والدہ نے تین ٹکیاں اور کچھ روغن اور نمک رکابی میں رکھا۔ پھر اس کو میرے سر پر رکھا اور میں ان کے پاس لے کر آیا۔ جب میں نے رکابی ان کے آگے رکھی تو حضرت ابوہریرہؓ نے

اللہ اکبر کہا اور کہنے لگے کہ شکر ہے اس اللہ کا جس نے ہمیں روٹی کا کھانا کھلایا جبکہ پہلے ہماری غذا صرف دو سیاہ چیزیں تھیں یعنی پانی اور کھجور، اور کھانے کی قسم کی کوئی چیز نہ ملتی تھی۔ جب لوگ چلے گئے تو ابو ہریرہؓ نے کہا کہ اے میرے بھتیجے، اپنی بکریوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کرو، ان کی ناک صاف کیا کرو، ان کے ڈیرے کی خوب صفائی رکھو اور اسی ڈیرے میں نماز پڑھ لیا کرو۔ کیونکہ یہ جنت کے جانوروں میں سے ہے۔ اور اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے، قریب ہے کہ وہ زمانہ آئے کہ بکریوں کا ایک ریوڑ اس کے مالک کو مروان کے محل سے زیادہ مرغوب ہوگا۔﴾

وضاحت :

یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے متعلق ہے۔ وہ اپنے ماضی کے احوال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا جب غربت کا یہ عالم تھا کہ کھانے کے لیے صرف کھجور اور پانی میسر تھے۔ اب اللہ کا شکر ہے کہ کھانے کو روٹی اور رہ فن ملتا ہے۔ کھجور اور پانی کے لیے انہوں نے لفظ اسودین (دو سیاہ چیزیں) استعمال کیا ہے، جبکہ پانی سیاہ نہیں ہوتا۔ البتہ کھجور بالعموم سیاہی مائل ہوتی ہے۔ یہ لفظ کا استعمال علی سبیل التغلیب ہے اور عام بول چال کی بات ہے۔

* حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مستقبل کے متعلق ایک پیشگوئی کرتے ہیں کہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ جس آدمی کو اپنے ایمان کی سلامتی عزیز ہوگی اسے مروان بن الحکم (اموی خلیفہ) کے محل کا قرب عزیز نہیں ہوگا بلکہ وہ پسند کرے گا کہ اپنی بکریوں کا ریوڑ پہاڑوں میں جا کر چرائے اور اس طرح اپنی روزی کمائے۔ حضرت ابو ہریرہؓ یہ بھی فرماتے ہیں کہ بکریاں جنت کے جانور ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ پیشگوئی اور بکریوں کے جنت کے جانور ہونے کے امور کی بنیاد کیا ہے۔ محدثین کا کہنا یہ ہے کہ اس طرح کی تمام روایات میں کوئی صحابی بات اپنی طرف سے نہیں کہہ سکتے۔ لازماً انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے ایسا سنا ہوگا۔ لہٰذا اسی بنا پر ان کا بیان حدیث بن جاتا ہے۔ بعض جگہ تو محدثین کی یہ بات درست بیٹھتی ہے لیکن کہیں کہیں اس میں تردد ہوتا ہے۔ اس بات کو بطور اصول ماننا آسان نہیں۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَبِي نُعَيْمٍ وَهْبِ ابْنِ كَيْسَانَ قَالَ أُتِيَ رَسُولُ اللهِ ﷺ

بِطَعَامٍ وَ مَعَهُ رَبِيبُهُ عُمَرُ بْنُ سَلَمَةَ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ سَمِّ اللهَ وَ كُلْ مِمَّا يَلِيكَ.

﴿وہب بن کیسان کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کھانا لایا گیا اور آپ کے ساتھ آپ کے ربیب عمر بن سلمہ بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کا نام لے کر کھاؤ اور جو تمہارے سامنے ہے اس میں سے کھاؤ۔﴾

وضاحت :

ربیب اس بچے کو کہتے ہیں جو بیوی کا اس کے سابق شوہر سے ہو۔ عمر بن سلمہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے پہلے شوہر ابو سلمہ کے بیٹے تھے اور نبی ﷺ ان کی پرورش کرتے تھے۔ جب وہ پلیٹ میں ادھر ادھر ہاتھ مار رہے ہوں گے تو آنحضرت نے ان کو کھانے کے آداب بتاتے ہوئے فرمایا کہ کھانا شروع کرتے وقت بسم اللہ پڑھا کرو اور جب بہت سے لوگ مل کر کھائیں تو ہر ایک کو اس بات کا خیال کرنا چاہیے کہ دوسرے بھی کھا رہے ہیں لہٰذا دست درازی نہیں کرنی چاہیے، اور پلیٹ کے اس حصہ میں سے کھانا چاہیے جو اپنے سامنے ہو۔

بسم اللہ سے مراد بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا ہے۔ کچھ لوگوں نے یہ جو کہا ہے کہ پہلے لقمہ پر بسم اللہ اور دوسرے پر الرحمٰن الرحیم پڑھنا چاہیے اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پورا پڑھنا چاہیے۔ ہاں شروع میں اگر بھول جائے تو جب یاد آئے پڑھ لے یا پھر آخر میں پڑھ لے۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ أَنَّهُ قَالَ سَمِعْتُ الْقَاسِمَ بْنَ مُحَمَّدٍ يَقُولُ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى عَبْدِاللهِ بْنِ عَبَّاسٍ فَقَالَ لَهُ إِنَّ لِي يَتِيمًا وَلَهُ إِبِلٌ " أَفَأَشْرَبُ مِنْ لَبَنِ إِبِلِهِ فَقَالَ لَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ إِنْ كُنْتَ تَبْغِي ضَالَّةَ إِبِلِهِ وَ تَهْنَأُ جَرْبَاهَا وَتَلِطُّ حَوْضَهَا وَ تَسْقِيهَا يَوْمَ وِرْدِهَا فَاشْرَبْ غَيْرَ مُضِرٍّ بِنَسْلٍ وَلَا نَاهِكٍ فِي الْحَلَبِ.

﴿یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ میں نے قاسم بن محمد سے سنا۔ وہ کہتے تھے کہ ایک شخص عبداللہ بن عباس کے پاس آیا اور ان سے پوچھا کہ میری نگرانی میں ایک یتیم ہے اور اس کے کچھ اونٹ ہیں، تو کیا میں اس کی اونٹنیوں کے دودھ میں سے کچھ پی سکتا ہوں۔ تو ابن عباس نے اس سے کہا کہ اگر تم اس کے کھوئے

ہوئے اونٹ کو تلاش کرتے ہو، خارش زدہ اونٹوں کو تیل ملتے ہو، ان کے حوض کی لپائی کرتے ہو اور ان کی باری کے دن پانی پلاتے ہو تو بے شک پیو، بشرطیکہ ان کے بچے کو نقصان نہ پہنچے اور سارا دودھ نچوڑنے والے نہ ہو۔﴾

وضاحت :

قرآن مجید میں یہ اجازت دی گئی ہے کہ حیثیت کے مطابق یتیم کے مال سے اس کا ولی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اسی اجازت کی روشنی میں یہ وضاحت کر دی ہے کہ اگر یہ تمام خدمات انجام دیتے ہو تو دودھ بھی لے سکتے ہو بشرطیکہ اونٹنی کے بچوں کو اس سے محروم کرنے والے نہ ہو۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّهُ كَانَ لَا يُؤْتَى اَبَدًا بِطَعَامٍ وَلَا شَرَابٍ حَتّٰى الدَّوَاءُ فَيَطْعَمُهُ اَوْ يَشْرَبُهُ اِلَّا قَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدَانَا وَ اَطْعَمَنَا وَ سَقَانَا وَ نَعَّمَنَا اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُمَّ اَلْفِنَا بِنِعْمَتِكَ بِكُلِّ شَرٍّ فَاَصْبَحْنَا مِنْهَا وَ اَمْسَيْنَا بِكُلِّ خَيْرٍ فَنَسْاَلُكَ تَمَامَهَا وَ شُكْرَهَا لَا خَيْرَ اِلَّا خَيْرُكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ اِلٰهَ الصَّالِحِيْنَ وَ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيمَا رَزَقْتَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ.

﴿ہشام اپنے باپ عروہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب ان کے سامنے کوئی چیز کھانے یا پینے کی لائی جاتی، یہاں تک کہ دوا بھی، اور وہ کھاتے یا پیتے تو یہ دعا ضرور کرتے۔ اللہ کا شکر ہے جس نے ہم کو ہدایت دی اور ہم کو کھلایا اور پلایا اور نعمت بخشی۔ اے اللہ تو بہت بڑا ہے۔ اے اللہ تیری نعمت نے ہم کو پایا ہماری تمام برائیوں کے باوجود اور ہم صبح و شام اس کے خیر سے متمتع ہونے لگے۔ اے اللہ ہم تجھ سے اس نعمت کا اتمام اور اس کے شکر کی توفیق مانگتے ہیں۔ نہیں ہے کوئی خیر تیرے سوا اور کوئی معبود نہیں تیرے سوا۔ اے نیکوں کے اللہ اور اے عالم کے خدا۔ شکر ہے اللہ کے لیے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ جو اللہ چاہے وہی ہوتا ہے۔ اے اللہ تیرے سوا کوئی قوت نہیں۔ اے اللہ تو نے ہمیں جو رزق دیا ہے اس میں برکت دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔﴾

وضاحت :

روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ عروہ نے یہ دعا آنحضرت ﷺ سے سیکھی، نہ ہی خود انہوں نے اس کا کوئی حوالہ دیا ہے۔ یہ ان کی اپنی دعا معلوم ہوتی ہے۔ الفاظ کی ترتیب سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کی دعاؤں سے اس کو کوئی مناسبت نہیں۔ اس میں آنحضرت ﷺ کی دعاؤں والی چستی نہیں پائی جاتی۔ بہر حال وہ شکر نعمت کے طور پر یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

□ قَالَ يَحْيٰى سُئِلَ مَالِكٌ هَلْ تَاْكُلُ الْمَرْاَةُ مَعَ غَيْرِ ذِي مَحْرَمٍ اَوْ مَعَ غُلَامِهَا فَقَالَ مَالِكٌ لَيْسَ بِذٰلِكَ بَاْسٌ اِذَا كَانَ ذٰلِكَ عَلٰى وَجْهِ مَا يُعْرَفُ لِلْمَرْاَةِ اَنْ تَاْكُلَ مَعَهُ مِنَ الرِّجَالِ قَالَ وَقَدْ تَاْكُلُ الْمَرْاَةُ مَعَ زَوْجِهَا وَ مَعَ غَيْرِهِ مِمَّنْ تُوَاكِلُهُ اَوْ مَعَ اَخِيْهَا عَلٰى مِثْلِ ذٰلِكَ وَ يُكْرَهُ لِلْمَرْاَةِ اَنْ تَخْلُوَ مَعَ الرَّجُلِ لَيْسَ بَيْنَهُ وَ بَيْنَهَا حُرْمَةٌ.

﴿یحییٰ کہتے ہیں کہ امام مالک سے فتویٰ پوچھا گیا کہ عورت کسی غیر محرم یا اپنے غلام کے ساتھ کچھ کھا پی سکتی ہے؟ امام مالک نے کہا کہ اس میں کوئی قباحت نہیں بشرطیکہ وہ اس طریقے سے کھائے جو عورت کے لیے معروف ہے۔ انہوں نے کہا کہ عورت کبھی کبھی اپنے شوہر کے ساتھ اور کبھی کسی دوسرے کے ساتھ جس کے ساتھ اس کا کھانا پینا ہوتا ہے یا اپنے بھائی کے ساتھ کھانا کھا لیتی ہے۔ لیکن یہ مکروہ ہے کہ عورت کسی ایسے آدمی کے ساتھ تنہا ہو جس کی اس کے ساتھ حرمت نہیں ہے۔﴾

وضاحت :

یہ امام مالک کا فتویٰ ہے کہ نامانوس غیر محرم آدمی کے ساتھ تنہائی کر عورت کے کھانے پینے میں حرج ہے۔ لیکن اعزہ و اقربا میں سے اور دوستوں میں سے بھی جو اعتماد کے لوگ ہوتے ہیں، اگر کھانے میں شریک ہو جاتے ہیں تو ان کی موجودگی میں کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ نہ ہو تو معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے۔

قرآن مجید کی روشنی میں پردے کے احکام میں اپنے رسالہ میں بیان کر چکا ہوں۔ مزید تفصیل کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ کر لیں۔

مَاجَاءَ فِی اَکْلِ اللَّحْمِ

گوشت کھانے کے بارے میں

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اَدْرَكَ جَابِرَ بْنَ عَبْدِاللّٰهِ وَ مَعَهٗ جِمَالٌ لَحْمٍ فَقَالَ مَا هٰذَا فَقَالَ يَا اَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ قَرِمْنَا اِلَى اللَّحْمِ فَاشْتَرَيْتُ بِدِرْهَمٍ لَحْمًا فَقَالَ عُمَرُ اَمَا يُرِيدُ اَحَدُكُمْ اَنْ يَطْوِيَ بَطْنَهٗ عَنْ جَارِهٖ اَوْ ابْنِ عَمِّهٖ اَيْنَ تَذْهَبُ عَنْكُمْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِی حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا.

﴿یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی ملاقات جابر بن عبداللہ سے ہو گئی جبکہ وہ گوشت کی ایک گٹھڑی اٹھائے ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا امیر المومنین! گوشت کھانے کو بہت جی چاہا تو ایک درہم کا گوشت خریدا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم میں سے کسی کے اندر یہ ولولہ پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اپنے پڑوسی کی خاطر یا اپنے بھائیوں کی خاطر اپنے پیٹ کو لپیٹے رکھے۔ آخر تم لوگ اس آیت کو کیوں بھول گئے ہو "تم نے اپنی تمام نعمتیں دنیا میں ختم کر لیں اور ان سے فائدہ اٹھا چکے"۔﴾

وضاحت :

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ تھا کہ اگر تمہارے ہاں گوشت پکے گا تو اس کی خوشبو پڑوسیوں کو بھی پہنچے گی، ان کے بچوں کو بھی پہنچے گی، ان کا دل چاہے گا کہ ان کے ہاں بھی گوشت پکے۔ وہ حسرت کریں گے تو اس سے بہتر یہ ہے کہ اپنے پڑوسی اور اپنے بھائیوں کے خیال سے اپنے پیٹ کو لپیٹے رکھے۔ لیکن اگر آپ کا بھائی ہی پڑوسی ہو، اس کے مالی حالات اچھے نہ ہوں اور آپ کی حیثیت ایسی ہو کہ آپ روز گوشت کھا سکیں تو اپنے بچوں کو تو آپ محروم نہیں رکھ سکتے۔ اس صورت میں اس حدیث پر عمل اس طرح کریں کہ کھانے میں سے اپنے پڑوسی کو تحفہ بھجوائیں۔

آیت کا مطلب بھی یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں یہ نہیں ہونا چاہیے کہ جتنی بھی نعمتیں ہیں وہ سب کی سب

یہیں ختم کر لی جائیں اور آخرت کے لیے کوئی سرمایہ محفوظ نہ کیا جائے۔

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ اِيَّاكُمْ وَاللَّحْمَ فَاِنَّهٗ لَهٗ ضَرَاوَةً كَضَرَاوَةِ الْخَمْرِ.

﴿یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ گوشت سے بچو کیونکہ اس کا چسکا شراب کا سا چسکا ہے۔﴾

وضاحت :

مطلب یہ ہے کہ گوشت کثرت سے نہیں کھانا چاہیے اور دسترخوان پر اس کا زیادہ اہتمام نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس کا چسکا لگ جائے تو پھر دوسری چیزوں کی طرف رغبت نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ بہت سے لوگ ہوتے ہیں جن کو مہینے کے مہینے گوشت کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ اسلام کے منافی ہے کہ آپ تو روز بھنا ہوا گوشت کھائیں اور صرف ایک ڈش نہیں بلکہ کئی کئی، اور دوسرے لوگ اس سے محروم رہیں۔ کتنے لوگ گوشت کھاتے ہیں لیکن ان کے گوشت کھانے کی خواہش ختم نہیں ہوتی۔ یہ بات سیدنا عمرؓ کی ہے اور واقعتاً ان کی باتیں ایسی ہیں کہ ہر مسلمان کو سمجھنی بھی چاہئیں اور ماننی بھی چاہئیں۔ ان سے زیادہ جرأت کے ساتھ اسلام کی خدمت کرنے کا موقع کسی کو مشکل ہی ملا ہے۔ وہ مسلمانوں کی ذہنی و اخلاقی تربیت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

مَاجَاءَ فِی لُبْسِ الْخَاتَمِ

انگوٹھی پہننے کے بارے میں روایات

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَلْبَسُ خَاتَمًا مِنْ ذَهَبٍ ثُمَّ قَامَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فَنَبَذَهٗ وَ قَالَ لَا اَلْبَسُهٗ اَبَدًا فَنَبَذَ النَّاسُ بِخَوَاتِيمِهِمْ.

﴿عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سونے کی انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔

پھر رسول اللہ ﷺ اٹھے اور اس کو پھینک دیا اور کہا کہ میں اب اس کو کبھی نہیں پہنوں گا۔ عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ اس پر سب لوگوں نے اپنی انگوٹھیاں پھینک دیں۔﴾

وضاحت :

پھینک دینے کا یہ مطلب نہیں کہ جو بڑ میں پھینک دی بھی یہ ہے کہ اتار دی۔ ہو سکتا ہے کہ اپنی کسی اہلیہ کو دے دی یا کسی اور کو۔ اسی طرح دوسرے لوگوں نے بھی اپنی سونے کی انگوٹھیاں اتار دیں۔ یا تو اپنی عورتوں کو دے دیں یا بیچ کر کسی اور مصرف میں استعمال کر لیں۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ صَدَقَةَ بْنِ يَسَارٍ اَنَّهُ قَالَ سَاَلْتُ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ عَنْ لُبْسِ الْخَاتَمِ قَالَ الْسُنَّةُ وَ اَخْبَرَ النَّاسَ اَنِّي اَفْتَيْتُكَ بِذٰلِكَ.

﴿صدقہ بن یسار کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن مسیب سے انگوٹھی پہننے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اس کو پہنو اور لوگوں کو بتاؤ کہ تم کو میں نے اس کا فتویٰ دیا ہے۔﴾

وضاحت :

اس سے صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انگوٹھی اتاری تو لوگوں نے سمجھ کر ہاتھ مارا اور کہا کہ انگوٹھی پہننا حرام ہے۔ حالانکہ سونے کی انگوٹھی مردوں کے لیے پہننا حرام تھی، چاندی کی حرام نہیں تھی۔ سعید بن مسیب کو یہ بات معلوم رہی ہو گی تو انہوں نے سونے کے سوا دھات کی انگوٹھی کا فتویٰ دے دیا کہ پہنو۔ ظاہر ہے کہ وہ سونے کی انگوٹھی کا فتویٰ نہیں دے سکتے تھے۔ راوی نے موقع کا ذکر نہیں کیا۔ موقع متعین نہ ہونے کی وجہ سے حدیث کی بڑی بڑی شکلیں پیدا ہو گئیں اور دین میں اتنے بڑے فتنے پیدا ہو گئے کہ الامان والحفیظ۔

مَاجَاءَ فِي نَزْعِ الْمَعَالِيقِ وَالْجَرَسِ مِنَ الْعَيْنِ

نظر بد سے بچنے کے لیے پٹے اور گھنٹیاں اتارنے کے بارے میں

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِي بَكْرٍ عَنْ عَبَّادِ بْنِ تَمِيمٍ اَنَّ اَبَا بَشِيرٍ الْاَنْصَارِيَّ اَخْبَرَهُ اَنَّهُ كَانَ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فِي بَعْضِ اَسْفَارِهِ قَالَ فَاَرْسَلَ رَسُولُ اللّٰهِ

ﷺ رَسُولًا فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ اَبِي بَكْرٍ حَسِبْتُ اَنَّهُ قَالَ وَالنَّاسُ فِي مَقِيلِهِمْ لَا تَبْقَيَنَّ فِي رَقَبَةِ بَعِيرٍ قِلَادَةٌ مِنْ وَتَرٍ اَوْقِلَادَةٌ اِلَّا قُطِعَتْ قَالَ يَحْيٰى سَمِعْتُ مَالِكًا يَقُولُ اَرٰى ذٰلِكَ مِنَ الْعَيْنِ.

﴿عباد بن تمیم کہتے ہیں کہ ابوبشیر انصاری نے ان کو خبر دی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ایک سفر میں آپ کے ساتھ تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو بھیجا (اور عبداللہ بن ابی بکر کہتے ہیں کہ میرا گمان یہ ہے کہ عباد نے یہ بھی کہا کہ اس وقت لوگ قیلولہ کر رہے تھے) کہ کسی اونٹ کی گردن میں نہ چھوڑیں باروں کا کوئی پٹہ مگر یہ کہ وہ کاٹ دیا جائے۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک سے سنا کہ وہ کہتے تھے کہ میرے خیال میں یہ حکم ان پٹوں کے بارے میں تھا جو نظر بد سے بچنے کے لیے باندھے گئے تھے۔﴾

وضاحت :

جانوروں کے گلے میں پٹے اور گھنٹیاں باندھنے کا ہر ملک میں رواج ہے۔ دیہاتوں میں کسان صبح کے وقت کے میں مویشی لے کر نکلتے ہیں تو پھر نظر نہیں آتے۔ امکان ہوتا ہے کہ کوئی بے خبر آدمی جانوروں سے ٹکرا جائے۔ گھنٹیاں ایسے لوگوں کو متنبہ کر دیتی ہیں۔ تو یہ اہتمام ضرورت کے تحت کیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کے نظر زیب و زینت کا پہلو ہوتا ہے۔ کچھ لوگ شان اور فخر کے اظہار کے لیے پٹے اور گھنگھریاں باندھتے ہیں۔ ایک طبقہ وہ بھی ہے جو اوہام پرست ہوتا ہے۔ ان کو وہم ہوتا ہے کہ ان کے جانوروں کو نظر لگ جائے گی تو وہ جانوروں کے بالوں سے بنے ہوئے پٹے یا تعویذ جانوروں کے گلے میں لٹکاتے ہیں۔ امام مالک کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کا یہ حکم اس آخری قسم کے پٹوں کے بارے میں تھا۔ یہ ان کا قیاس ہے اور درست معلوم ہوتا ہے۔

اَلْوُضُوءُ مِنَ الْعَيْنِ

نظر بد کے سبب سے وضو کا حکم

❐ حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اَبِي اُمَامَةَ بْنِ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ اَنَّهُ سَمِعَ اَبَاهُ يَقُولُ اغْتَسَلَ اَبُو سَهْلِ بْنُ حُنَيْفٍ بِالْخَرَّارِ فَنَزَعَ جُبَّةً كَانَتْ عَلَيْهِ وَ عَامِرُ بْنُ رَبِيعَةَ

يَنْظُرُ قَالَ وَ كَانَ سَهْلٌ رَجُلًا أَبْيَضَ حَسَنَ الْجِلْدِ قَالَ فَقَالَ لَهُ عَامِرُ بْنُ رَبِيعَةَ مَا رَأَيْتُ كَالْيَوْمِ وَلَا جِلْدَ عَذْرَاءَ قَالَ فَوُعِكَ سَهْلٌ مَكَانَهُ وَاشْتَدَّ وَعْكُهُ فَأَتَى رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَأُخْبِرَ أَنَّ سَهْلًا وُعِكَ وَ أَنَّهُ غَيْرُ رَائِحٍ مَعَكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَأَتَاهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَأَخْبَرَهُ سَهْلٌ بِالَّذِي كَانَ مِنْ أَمْرِ عَامِرٍ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَامَ يَقْتُلُ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ أَلَا بَرَّكْتَ إِنَّ الْعَيْنَ حَقٌّ تَوَضَّأْ لَهُ فَتَوَضَّأَ لَهُ عَامِرٌ فَرَاحَ سَهْلٌ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ لَيْسَ بِهِ بَأْسٌ".

﴿ابو اسامہ روایت کرتے ہیں کہ میرے باپ سہل بن حنیف نے خرار میں غسل کیا۔ وہ ایک جبہ پہنے ہوئے تھے۔ اسے اتارا تو عامر بن ربیعہ ان کو دیکھ رہے تھے۔ سہل بہت گورے اور خوبصورت جسم کے آدمی تھے۔ عامر بن ربیعہ نے کہا کہ آپ جیسا جسم آج تک میں نے کسی کنواری کا بھی نہیں دیکھا۔ سہل کو اسی وقت بخار آگیا اور بخار شدید ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس آدمی آیا اور ان کو بتایا کہ سہل بن حنیف کو تپ چڑھ گیا ہے اور وہ تو اب آپ کے ساتھ جانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ رسول اللہ ﷺ ان کے پاس آئے تو سہل نے جو بات عامر بن ربیعہ کی طرف سے ہوئی تھی وہ آپ کو بتائی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کیوں بلاوجہ قتل کرتا ہے۔ تم نے ان کو برکت کی دعا کیوں نہیں دی۔ نظر تو حق ہے۔ اس کے لیے وضو کرو۔ عامر نے اس کے لیے وضو کیا تو سہل ٹھیک ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ اس حال میں روانہ ہو گئے کہ ان کو کوئی تکلیف نہ تھی۔﴾

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ'' عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ أَبِي أُمَامَةَ بْنِ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ أَنَّهُ قَالَ رَأَى عَامِرُ بْنُ رَبِيعَةَ سَهْلَ بْنَ حُنَيْفٍ يَغْتَسِلُ فَقَالَ مَا رَأَيْتُ كَالْيَوْمِ وَلَا جِلْدَ مُخَبَّأَةٍ فَلُبِطَ سَهْلٌ فَأُتِيَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَقِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ هَلْ لَكَ فِي سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ وَاللَّهِ مَا يَرْفَعُ رَأْسَهُ فَقَالَ هَلْ تَتَّهِمُونَ لَهُ أَحَدًا قَالُوا نَتَّهِمُ عَامِرَ بْنَ رَبِيعَةَ فَتَغَيَّظَ عَلَيْهِ وَقَالَ عَلَامَ يَقْتُلُ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ أَلَا بَرَّكْتَ اغْتَسِلْ لَهُ فَغَسَلَ عَامِرٌ وَجْهَهُ وَيَدَيْهِ وَمِرْفَقَيْهِ وَرُكْبَتَيْهِ وَأَطْرَافَ رِجْلَيْهِ وَدَاخِلَةَ إِزَارِهِ فِي قَدَحٍ ثُمَّ صُبَّ عَلَيْهِ فَرَاحَ سَهْلٌ مَعَ النَّاسِ لَيْسَ بِهِ بَأْسٌ.

﴿ابو اسامہ بن سہل کہتے ہیں کہ عامر بن ربیعہ نے سہل بن حنیف کو غسل کرتے دیکھا تو انہوں نے کہا کہ میں نے آج تک اتنا خوبصورت جسم کسی پردہ نشین کا بھی نہیں دیکھا۔ اس پر سہل وہیں گر پڑے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس کوئی آیا اور پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ کو کچھ سہل کا حال بھی معلوم ہے؟ خدا کی قسم، وہ تو سر بھی نہیں اٹھا رہے ہیں۔ آپؐ نے پوچھا کیا تم ان کے بارے میں کسی کو متہم کرتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم تو عامر بن ربیعہ کو متہم کرتے ہیں۔ آپ عامر پر غصے ہوئے اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کیوں ناحق قتل کرتا ہے۔ تو نے ان کو برکت کی دعا کیوں نہ دی، اب اس کے لیے غسل کرو۔ تو عامر نے دھویا اپنا چہرہ، دونوں ہاتھ، کہنیاں، دونوں گھٹنے، پاؤں کے اطراف اور تہمد کا اندرون ایک برتن میں۔ پھر یہ سارا پانی سہل کے اوپر ڈال دیا تو وہ ٹھیک ہو گئے اور لوگوں کے ساتھ اس حال میں نکلے کہ ان کو کوئی تکلیف نہ تھی۔﴾

وضاحت :

یہ دونوں روایتیں ایک ہی واقعہ سے متعلق ہیں۔ عامر بن ربیعہ نے سہل بن حنیف کو غسل کرتے دیکھا تو ان کی خوش رنگ جلد پر ایسی نگاہ ڈالی کہ وہ نظر بد کا شکار ہو کر اسی وقت گر پڑے اور انہیں شدید بخار آگیا۔ نظر بد ایک شیطانی کام ہے۔ انسان کے اندر جو شیطان ہوتا ہے وہ اس کا ذریعہ بنتا اور دوسرے قوی کو متاثر کرتا ہے۔ نظر بد بھی اعمال سفلیہ کی طرح کی ایک چیز ہے۔ اس میں اتنی ہی تاثیر ہوتی ہے جتنی سحر میں ہوتی ہے۔ سحر قوت عقلیہ کو متاثر کرتا ہے لیکن اتنا نہیں کہ قومی اس کے نتیجہ میں مر جائے یا مخبوط الحواس ہو جائے۔ اس کا اثر وقتی طور پر پڑتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ جو فرمایا کہ تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کیوں قتل کرتا ہے تو اس سے ذہن اس طرف جاتا ہے کہ نظر بد قتل تک متعدی ہو سکتی ہے۔ اسی لیے اس روایت کی بنا پر یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ نظر بد کے نتیجہ میں اگر کوئی قتل ہو جائے تو کیا نظر بد ڈالنے والا قصاص میں قتل کر دیا جائے گا۔ فقہا کے ایک گروہ کے خیال میں وہ قتل کر دیا جائے گا جبکہ دوسرے گروہ کا کہنا یہ ہے کہ شریعت میں قتل کی تحقیق کا ایک ضابطہ ہے۔ اس کے لیے شہادتیں لی جاتی ہیں، آلۂ قتل دیکھا جاتا ہے، مقتول کا جائزہ لیا جاتا ہے، اس کے بعد قاضی اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے۔ نظر بد میں شریعت کے ان ضابطوں پر عمل کرنا ممکن نہیں۔ امام نوویؒ کی رائے

میں نظر بد کے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔

دوسری طرف قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اعمال خبیثہ میں شیطان کو کسی پر سلطان یا کامل اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ آدمی کی جان ہی لے لے۔ زیادہ سے زیادہ وہ وسوسہ اندازی کر سکتا ہے، گناہ پر ابھار سکتا ہے اور وقتی طور پر کسی مشکل میں ڈال سکتا ہے۔ اس کی روشنی میں قتل سے مراد حقیقی قتل نہیں ہو سکتا جس کا آنحضرتؐ نے حوالہ دیا ہے۔

اگرچہ دونوں روایتیں ایک ہی واقعہ کو بیان کرتی ہیں لیکن ان میں بڑا فرق میرے نزدیک اس وجہ سے پیدا ہو گیا ہے کہ پہلی روایت کے راوی محمد بن ابی اسامہ ہیں جبکہ دوسری محمد بن شہاب زہری سے مروی ہے۔ پہلی روایت کے مطابق نبی ﷺ نے عامر بن ربیعہ کو وضو کرنے کا حکم دیا اور سہل بن حنیف کے لیے برکت کی دعا کرنے کو کہا جس سے سہل اچھے ہو گئے۔ یہ بات قرین قیاس اور شریعت کے مزاج کے مطابق ہے۔ دوسری روایت میں ابن شہاب نے اس کو ایک نوٹکا بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق جس آدمی سے نظر بد لگی ہو اس کو نہلایا جائے۔ تمام اعضاء حتیٰ کہ زیر جامہ کے اعضاء کو بھی دھو کر پانی ایک برتن میں جمع کیا جائے اور وہ تمام کا تمام مریض کے اوپر ڈالا جائے تو نظر بد کا اثر ختم ہو جائے گا اور مریض تندرست ہو جائے گا۔ یہ سب اوہام ہیں۔ ان کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ زہری کے مقاصد میں یہ بات بھی رہی ہے کہ یہود کے اعمال سفلیہ کو اسلام میں کھسایا جائے اور ایمان بالغیب (یا اعمال صالحہ پر ایمان) یہود کی خصوصیت رہی ہے۔ ٹونے ٹوٹکے وغیرہ سب جہت کے قبیل سے ہیں۔

روایت میں فصل کے اس طریقہ کے لیے شاہ ولی اللہؒ نے بھی لکھا ہے کہ یہ ابن شہاب کی اپنی گڑھت ہے۔ وہ یہ فرماتے ہیں کہ ان باتوں کا عقل سے کوئی تعلق نہیں۔ ٹونے ٹوٹکے دل سے مان لینے کی چیزیں ہیں۔ میرے نزدیک یہ قرآن کے خلاف اور یہود کے بتایا میں سے ہیں۔ صوفیوں کے ذریعے ان کو فروغ حاصل ہوا ہے۔

اَلرُّقْيَةُ مِنَ الْعَيْنِ

نظر بد کے لیے جھاڑ پھونک کرنا

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ" عَنْ حُمَيْدِ بْنِ قَيْسٍ الْمَكِّيِّ اَنَّهُ قَالَ دَخَلَ عَلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بِابْنَيْ جَعْفَرِ بْنِ اَبِي طَالِبٍ فَقَالَ لِحَاضِنَتِهِمَا مَالِي اَرَاهُمَا ضَارِعَيْنِ فَقَالَتْ حَاضِنَتُهُمَا يَا

رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّهُ تَسْرَعُ اِلَيْهِمَا الْعَيْنُ وَلَمْ يَمْنَعْنَا اَنْ نَسْتَرْقِيَ لَهُمَا اِلَّا اَنَّا لَا نَدْرِي مَا يُوَافِقُكَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اسْتَرْقُوْا لَهُمَا فَاِنَّهُ لَوْ سَبَقَ شَيْءٌ الْقَدَرَ لَسَبَقَتْهُ الْعَيْنُ.

حمید بن قیس مکی کہتے ہیں کہ جعفر بن ابی طالبؓ کے دو بیٹے رسول اللہ ﷺ کے پاس لائے گئے۔ آپ نے ان کو دودھ پلانے والیوں سے کہا کہ میں ان کو کمزور کیوں دیکھتا ہوں، تو ان کی دودھ پلانے والیوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول، ان کو نظر بہت جلد لگ جاتی ہے اور ہم ان کے لیے ٹونے ٹوٹکے نہیں کرتے کیونکہ معلوم نہیں کہ آپ اس کو پسند کریں گے یا نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ان کو جھاڑ پھونک کراؤ کیونکہ تقدیر پر اگر کوئی چیز سبقت کرنے والی ہوتی تو نظر بد اس پر سبقت کر لیتی۔

وضاحت:

"ضارع" کمزور کو کہتے ہیں۔ استرقاء کا لفظ جھاڑ پھونک کروانے کے لیے آتا ہے۔ حدیث اپنے مفہوم میں واضح ہے۔ جس کی آیاؤں نے ان کی کمزوری کو نظر بد پر محمول کیا۔ ہمارے یہاں بھی عورتیں بچے کی پرورش میں اپنا کوئی قصور ماننے کو تیار نہیں ہوتیں۔ اگر کسی کمزور بچے کے متعلق پوچھا جاتا ہے تو یہی جواب دیتی ہیں کہ اس پر نظر بد کا اثر ہے۔

اس روایت میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آنحضرت ﷺ نے یہ کیوں فرمایا کہ ان کے لیے جھاڑ پھونک کراؤ۔ بچوں کی صحت کے لیے آپ خود دعا کر سکتے تھے۔ آپ کی دعا سے بہتر اور پاکیزہ کس کی دعا ہو سکتی تھی اور آپ کی دعا کے لیے حضرت علیؓ کے بھتیجوں سے زیادہ اور کون محبوب ہو سکتا تھا۔ آپ فرما دیتے کہ میں ان کے لیے دعا کرتا ہوں۔ اس کے بجائے آپ نے فرمایا کہ جھاڑ پھونک کراؤ۔ نظر بد کے اثر کو زائل کرنے کا یہ بڑا اکسیر نسخہ ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا آپ روایتی جھاڑ پھونک کرنے والوں کے عمل کی تاثیر کے قائل تھے؟ یہ بالکل ناممکن بات ہے۔ آنحضرت کا دعا بھی اگر ہو سکتا ہے تو دعا کا ہو سکتا ہے جو ایک مشروع چیز ہے۔ روایت میں اگر استرقاء کا لفظ آگیا ہے تو اسے دعا ہی پر محمول کرنا چاہیے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ" عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ اَنَّ عُرْوَةَ بْنَ الزُّبَيْرِ حَدَّثَهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ دَخَلَ بَيْتَ اُمِّ سَلَمَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ وَ فِي الْبَيْتِ صَبِيٌّ يَبْكِي

فَذَكَرُوا لَهُ اَنَّ بِهِ الْعَيْنَ قَالَ عُرْوَةُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلَا تَسْتَرْقُوْنَ لَهُ مِنَ الْعَيْنِ.

﴿عروہ بن زبیر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی زوجہ ام سلمہؓ کے گھر میں داخل ہوئے تو گھر میں ایک بچہ رو رہا تھا۔ آپ کو بتایا گیا کہ اس کو نظر لگ گئی ہے۔ عروہؒ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم اسے نظر بد سے جھاڑ پھونک کیوں نہیں کراتے؟

وضاحت :

یہاں بھی روایت میں وہی مشکل ہے جو پچھلی روایت میں تھی۔ قرآن مجید میں اور خود رسول اللہ ﷺ کے عمل میں جو چیز ہے وہ دعا ہے، جھاڑ پھونک نہیں۔ دعا میں کلمات طیبہ کا ہونا ضروری ہے۔ کوئی شرکیہ کلمہ نہ ہو، ان کو پڑھ کر مریض پر پھونک دیں تو یہ عمل درست ہوگا۔ اگر اس کو استرقاء کہا گیا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

مَاجَاءَ فِي أَجْرِ الْمَرِيْضِ

بیمار کے اجر کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ" عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِذَا مَرِضَ الْعَبْدُ بَعَثَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى اِلَيْهِ مَلَكَيْنِ فَقَالَ انْظُرَا مَاذَا يَقُوْلُ لِعُوَّادِهِ فَاِنْ هُوَ اِذَا جَاءُوْهُ حَمِدَ اللّٰهَ وَ اَثْنٰى عَلَيْهِ رَفَعَا ذٰلِكَ اِلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَهُوَ اَعْلَمُ فَيَقُوْلُ لِعَبْدِي عَلَيَّ اِنْ تَوَفَّيْتُهُ اَنْ اُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ وَ اِنْ اَنَا شَفَيْتُهُ اَنْ اُبْدِلَ لَهُ لَحْمًا خَيْرًا مِنْ لَحْمِهِ وَدَمًا خَيْرًا مِنْ دَمِهِ وَ اَنْ اُكَفِّرَ عَنْهُ سَيِّاٰتِهِ.

﴿عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی بندہ بیمار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف دو فرشتے بھیجتا ہے اور کہتا ہے کہ دیکھو کہ وہ اپنی عیادت کرنے والوں سے کیا کہتا ہے۔ اگر وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہو، اس کی ثنا کرتا ہو، تو وہ دونوں فرشتے خدا کے پاس اس کی خبر لے جاتے ہیں، حالانکہ خدا خود جانتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے کا میرے اوپر ذمہ ہے کہ اگر میں اس کو وفات دوں تو اس کو جنت میں داخل کروں گا اور اگر اس کو شفا دوں تو اس کے گوشت کو اس سے بہتر

گوشت سے اور خون کو اس سے بہتر خون سے بدل دوں گا اور اس کے گناہ بھی معاف کر دوں گا۔﴾

وضاحت :

اللہ اپنے شاکر و صابر بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ ایسے بندوں کو اگر کانٹا بھی چبھتا ہے تو وہ اس کو ان کے لیے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہم لوگ جو قدم قدم پر گناہ کرتے ہیں وہ کس طرح سے معاف ہوں گے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ" عَنْ يَزِيْدَ بْنِ خُصَيْفَةَ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ اَنَّهُ قَالَ سَمِعْتُ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ تَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يُصِيْبُ الْمُؤْمِنَ مِنْ مُصِيْبَةٍ حَتّٰى الشَّوْكَةُ اِلَّا قُصَّ بِهَا اَوْ كُفِّرَ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ لَايَدْرِي يَزِيْدُ اَيَّهُمَا قَالَ عُرْوَةُ.

﴿عروہ بن زبیر روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ زوجہ نبی ﷺ سے سنا کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ مومن کو کوئی دکھ نہیں پہنچتا یہاں تک کہ کانٹا چبھنے کا بھی مگر یہ کہ اسے اس کا قصاص دیا جاتا ہے یا یہ اس کی خطاؤں کا کفارہ بن جاتا ہے۔ یزید کو یہ معلوم نہیں کہ عروہ نے ان دونوں میں سے کون سی بات کہی۔﴾

وضاحت :

یہ روایت امام مسلم نے بھی لی ہے۔ پچھلی روایت میں یہی بات دوسرے حوالے سے بیان ہوئی ہے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ" عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِي صَعْصَعَةَ اَنَّهُ قَالَ سَمِعْتُ اَبَاالْحُبَابِ سَعِيْدَ بْنَ يَسَارٍ يَقُوْلُ سَمِعْتُ اَبَاهُرَيْرَةَ يَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُصِبْ مِنْهُ.

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس بندے کی بہتری چاہتا ہے تو اس کی طرف سے اس کو آزمائش پہنچتی ہے۔﴾

وضاحت :

اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے، اور قرآن مجید میں اس کی وضاحت یوں ہے، کہ خیر سے یا تکلیف سے اللہ تعالیٰ انسان کا امتحان لیتا رہتا ہے۔ خیر سے اس کے شکر کا اور تکلیف سے اس کے صبر کا امتحان ہوتا ہے۔ زندگی بھر یہ سلسلہ

رہا اور جاری رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر کسی آزمائش میں ڈالتا ہے تو اس سے خیر ہی مطلوب ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارے ساتھ کوئی دشمنی تو ہو نہیں سکتی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں غفلت سے جھنجھوڑنا مقصود ہو۔ ہم جاگ رہے ہوں تو کسی طرح سے وہ ہمیں ابتلا میں ڈال کر خواب غفلت سے جگا کر متوجہ کردے، تو یہ بہت بڑا خیر ہے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ أَنَّ رَجُلًا جَاءَهُ الْمَوْتُ فِي زَمَانِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ رَجُلٌ هَنِيئًا لَهُ مَاتَ وَلَمْ يُبْتَلَ بِمَرَضٍ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَيْحَكَ وَمَا يُدْرِيكَ لَوْ أَنَّ اللّٰهَ ابْتَلَاهُ بِمَرَضٍ يُكَفِّرُ بِهِ عَنْهُ مِنْ سَيِّئَاتِهِ.

﴿یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص کی موت کا وقت آگیا تو ایک شخص نے کہا کتنا مبارک ہے یہ شخص، مرا اور کسی بیماری میں مبتلا نہیں ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تیرا ناس ہو۔ تم کو کیا معلوم کہ اگر اللہ اس کو مرض میں مبتلا کرتا تو وہ اس کے گناہوں کو جھاڑنے والا ہوتا۔﴾

وضاحت :

معلوم ہوا کہ یہ نہیں چاہنا چاہیے کہ ہم کو کوئی مرض نہ لاحق ہو، مگر یہ دعا ضرور کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ موت دے تو آسان دے۔ میں یہ دعا ضرور کرتا ہوں۔ مرض تو آزمائش ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت اس کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس میں گھبرانا نہیں چاہیے۔

اَلتَّعَوُّذُ وَالرُّقْيَةُ مِنَ الْمَرَضِ

مرض سے پناہ مانگنا اور جھاڑ پھونک کرنا

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَزِيدَ بْنِ خُصَيْفَةَ أَنَّ عَمْرَو بْنَ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ كَعْبٍ السُّلَمِيَّ أَخْبَرَهُ أَنَّ نَافِعَ بْنَ جُبَيْرٍ أَخْبَرَهُ عَنْ عُثْمَانَ بْنِ أَبِي الْعَاصِي أَنَّهُ أَتَى رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ عُثْمَانُ وَبِي وَجَعٌ قَدْ كَادَ يُهْلِكُنِي قَالَ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ امْسَحْهُ بِيَمِينِكَ سَبْعَ مَرَّاتٍ وَقُلْ أَعُوذُ بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَقُدْرَتِهِ مِنْ شَرِّ مَا أَجِدُ قَالَ فَفَعَلْتُ ذٰلِكَ فَأَذْهَبَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى

مَا كَانَ بِي فَلَمْ أَزَلْ آمُرُ بِهَا أَهْلِي وَغَيْرَهُمْ

﴿عثمان بن العاص سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ ان کو اتنا شدید درد اٹھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ انہیں ہلاک کردے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس پر مسح کرو اپنے دائیں ہاتھ سے سات مرتبہ اور دعا کرو کہ میں اللہ کی عزت اور قدرت کی پناہ مانگتا ہوں اس شر اور دکھ سے جو مجھے پہنچا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ایسا کیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے میری وہ تکلیف دور کردی۔ اس کے بعد میں برابر اپنے گھر والوں اور دوسرے لوگوں کو اس دعا کی تلقین کرتا ہوں۔﴾

وضاحت :

یہ دعا آنحضرت ﷺ نے سکھائی ہے۔ مسنون الفاظ یہی ہیں۔ نہایت مختصر اور آسان ہے۔ سب کو یاد کر لینی چاہیے۔ یہ استرقاء کا مسنون طریقہ ہے۔ اس طریقے سے دعا مانگ کر پانی پانے یا تکلیف کے مقام پر پھونک مارنے یا ہاتھ پھیرنے کا نفسیاتی اثر پڑتا ہے اور مریض کے لیے نفسیاتی اثر کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ اس طرح کے جھاڑ پھونک میں کوئی برائی نہیں۔ جو چیز بری ہے وہ یہ ہے کہ کلمات نحس ہوں۔ جتنی بھی معروف و مسنون دعائیں ﴿خبر﴾ کی ہیں وہ اختیار کرنی چاہئیں۔ سات مرتبہ کا جو عدد ہے یہ بہت سی روایتوں میں آیا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دین میں اعداد کا کچھ اعتبار ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن میں اعداد کا لحاظ ہے۔ آخر نماز کے پانچ اوقات ہیں۔ بعض نمازوں کی رکعتیں دو، بعض کی تین اور بعض کی چار ہیں۔ تو یہ سب بغیر حکمت کے نہیں۔ دین میں ان کا لحاظ ہے۔ اگر کوئی چیز قرآن مجید سے یا صحیح حدیث سے ثابت ہو تو ہر چند اس کی حکمت نہ معلوم ہو اس کی پیروی کرنی چاہیے۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بلا حکمت بات ہے۔ ہاں اگر کسی ایرے غیرے کی بنائی ہوئی ہو تو اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ إِذَا اشْتَكَى يَقْرَأُ عَلَى نَفْسِهِ بِالْمُعَوِّذَاتِ وَيَنْفُثُ قَالَتْ فَلَمَّا اشْتَدَّ وَجَعُهُ كُنْتُ أَنَا أَقْرَأُ عَلَيْهِ وَأَمْسَحُ عَلَيْهِ بِيَمِينِهِ رَجَاءَ بَرَكَتِهَا.

﴿حضرت عروہ بن زبیر روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کہتی تھیں کہ آنحضرت ﷺ جب بیمار ہوتے تو آپ اپنے اوپر معوذات پڑھتے اور پھونکتے۔ فرماتی ہیں کہ جب آپ کی تکلیف زیادہ

ہوئی تو میں آپ پر پڑھ کر پھونکتی اور برکت کے خیال سے آپ کے ہاتھ پر مسح کرتی۔﴾

وضاحت :

معوذات سے قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس مراد ہیں۔ یہ دونوں سورتیں ہر طرح کے شر سے، آفت اور شیطان کے حملوں سے اللہ کی پناہ طلب کرنے کی دعا ہیں۔ اس لیے تمام تکالیف میں معوذتین پڑھنا اللہ کی مدد و نصرت کو آواز دینے کے مترادف ہے۔ دعا کے ساتھ پھونک مارنا اور ہاتھ پھیرنا خلاف عقل ہے نہ خلاف دین۔ مریض پر اس کا بھی اثر ہوتا ہے۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّ اَبَابَكْرٍ الصِّدِّيقَ دَخَلَ عَلَى عَائِشَةَ وَهِيَ تَشْتَكِي وَيَهُودِيَةٌ تَرْقِيهَا فَقَالَ اَبُوبَكْرٍ ارْقِيهَا بِكِتَابِ اللّٰهِ

﴿عمرہ بنت عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق حضرت عائشہؓ کے پاس آئے، وہ بیمار تھیں اور ایک یہودی عورت ان کو جھاڑ پھونک کر رہی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا کہ کتاب اللہ سے جھاڑ پھونک کرو۔﴾

وضاحت :

قرینہ ہے کہ یہ ہجرت کے بعد شروع زمانے کا واقعہ ہے۔ حضرت عائشہؓ کی شادی کے بعد کا نہیں۔ شادی کے بعد تو آنحضرت ﷺ سے بڑا کوئی دعا کرنے والا نہیں تھا۔ اس وقت ابھی مسلمانوں میں علاج کرنے والے نہیں ہوں گے اور پرانی روایت یہ چلی آرہی ہوگی کہ بعض لوگ ایسے لوگوں سے عمل کروا لیتے ہوں گے جن کو جوگی یا مستجاب الدعوات خیال کرتے رہے ہوں گے۔ تو اسی طرح کی یہ یہودی عورت ہوگی۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ فرمایا کہ کتاب اللہ سے جھاڑ پھونک کرو۔ کتاب اللہ سے یہاں مراد تورات معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ یہودی عورت قرآن مجید کو تو جانتی نہیں ہوگی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں آکر استرقاء کے حکم میں یہ ترمیم ہوئی ہے کہ اب جھاڑ پھونک یونہی نہیں کہ جو چاہے کر دے بلکہ کتاب اللہ کے کلمات سے ہو، اگرچہ وہ کتاب پہلے ہی کی ہو۔

تَعَالُجُ الْمَرِيْضِ

مریض کے علاج کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ اَنَّ رَجُلًا فِی زَمَانِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ اَصَابَهُ جُرْحٌ فَاحْتَقَنَ الْجُرْحُ الدَّمَ وَ اَنَّ الرَّجُلَ دَعَا رَجُلَيْنِ مِنْ بَنِی اَنْمَارٍ فَنَظَرَا اِلَيْهِ فَزَعَمَا اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَهُمَا اَيُّكُمَا اَطَبُّ فَقَالَا اَوَ فِی الطِّبِّ خَيْرٌ يَا رَسُولَ اللّٰهِ فَزَعَمَ زَيْدٌ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اَنْزَلَ الدَّوَاءَ الَّذِی اَنْزَلَ الْاَدْوَاءَ۔

﴿زید بن اسلم روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایک شخص زخمی ہوا اور اس کے زخم نے خون جمع کر لیا (یعنی خون نکلا نہیں) اس نے بنی انمار کے دو آدمیوں کو بلایا، انہوں نے اسے دیکھا۔ انہوں نے خیال کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم دونوں میں سے کون سا اعلیٰ طبیب ہے۔ انہوں نے کہا، یا رسول اللہ! کیا طب میں بھی کوئی خیر ہے؟ زید کا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے بیماریاں اتاری ہیں اس نے دوا بھی اتاری ہے۔﴾

وضاحت :

یہ روایت مرسل ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ راوی پورے اعتماد کے ساتھ اسے روایت نہیں کر رہے ہیں۔ معاملہ کسی شخص کے جسم میں خون بھر جانے کا تھا۔ اس کے علاج کے لیے دو معالج بلائے گئے تو نبی ﷺ نے پوچھ لیا کہ تم میں اچھا معالج کون ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ کچھ چونک گئے اور طب کے بارے میں آنحضرت ﷺ کی رائے دریافت کی۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ جس نے بیماریاں اتاری ہیں اس نے دوائیں بھی پیدا کی ہیں۔

علاج معالجہ جائز ہے۔ یہ ایسا معاملہ نہیں جس میں کچھ شبہ ہو۔ بعض لوگ علاج کو صبر اور توکل کے خلاف سمجھتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے بیماری دی ہے تو اس کو صبر سے جھیلنا چاہیے۔ لیکن نبی ﷺ نے تعلیم دی کہ اللہ تعالیٰ نے اگر بیماری دی ہے تو دوا بھی دی ہے۔ لہٰذا مریض کو علاج کرانا چاہیے۔ البتہ یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ شفا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ معلوم ہوا کہ اس وضاحت کی ضرورت تھی ورنہ لوگ بیماری کا علاج کرانے کے

معاملہ میں وہم میں مبتلا ہو جاتے۔

❐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ قَالَ بَلَغَنِی اَنَّ سَعْدَ بْنَ زُرَارَةَ اشْتَكٰى فِی زَمَانِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مِنَ الذَّبْحَةِ فَمَاتَ۔

﴿یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ سعد بن زرارہؓ نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں حلق کی بیماری سے داغ لگوایا اور مر گئے۔﴾

وضاحت

ذبحہ سے مراد گلے کی ایک بیماری ہے جس میں گلے میں ایک دانہ نکل آتا ہے۔ اس سے گلا گھٹتا ہے اور ایسی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں جو بہت تکلیف دہ ہوتی ہیں اور مریض کے لیے سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس زمانے میں اس بیماری کا علاج کسی گرم چیز سے داغنا تھا۔ ہمارے زمانے میں بھی بعض زخموں کو جلانے کے لیے یہ طریق علاج استعمال ہوتا ہے۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے یہ علاج کبھی کروایا یا نہیں۔ لیکن علاج کا جہاں تک تعلق ہے اس زمانے میں یہ ایک عام علاج تھا اور بدوی زندگی میں اسی طرح کے علاج تھے۔ معلوم ہوتا ہے سعد بن زرارہؓ اس بیماری سے شفایاب نہ ہو سکے اور ان کا انتقال ہو گیا۔

❐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ اكْتُوِیَ مِنَ اللَّقْوَةِ وَرُقِیَ مِنَ الْعَقْرَبِ۔

﴿نافع سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ نے لقوہ کے لیے داغ لگوایا اور بچھو کے کاٹنے کا ان پر دم کیا گیا۔﴾

وضاحت

معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو لقوہ کا عارضہ ہو گیا تو انہوں نے بھی داغ لگوا کر اس کا علاج کیا۔ نیز بچھو نے کاٹا تو اس کے لیے دم کیا۔ ان کاموں کو انہوں نے خلاف شریعت نہیں سمجھا۔

اَلْغُسْلُ بِالْمَاءِ مِنَ الْحُمّٰی

بخار میں پانی سے غسل کے بارے میں

❐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ الْمُنْذِرِ اَنَّ اَسْمَاءَ بِنْتَ اَبِی

بَكْرٍ كَانَتْ اِذَا اُتِیَتْ بِالْمَرْاَةِ وَقَدْ حُمَّتْ تَدْعُو لَهَا فَاَخَذَتِ الْمَاءَ فَصَبَّتْهُ بَيْنَهَا وَ بَيْنَ جَيْبِهَا وَ قَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَاْمُرُنَا اَنْ نُبَرِّدَهَا بِالْمَاءِ۔

﴿ہشام بن عروہ فاطمہ بنت منذر سے روایت کرتے ہیں کہ اسماء بنت ابی بکرؓ کی خدمت میں جب کوئی بخار زدہ عورت دعا کے لیے لائی جاتی تو وہ پانی لیتیں اور اس کے اور اس کے گریبان کے درمیان چھڑکتیں اور وہ کہتی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں حکم دیتے تھے کہ بخار کو پانی سے ٹھنڈا کیا کرو۔﴾

وضاحت

اس عمل کا تعلیم لوگوں نے بڑا مذاق اڑایا ہے کہ اس علاج سے تو مریض مر جائے گا۔ لیکن واقعہ یہ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب لو لگتی ہے، اور عرب میں تو اکثر لو چلتی ہے، تو پانی سے اس کا اثر دور کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں بھی اگر بخار میں شدت آ جائے تو اکثر برف کے پانی سے علاج کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ البتہ ایسی روایتوں کے بارے میں بعض غلط فہمیوں کو صاف ہو جانا چاہیے۔ مثلاً یہ کہ آنحضرت ﷺ نے اگر ایسی ہدایت فرمائی تو ضروری نہیں کہ آپ کی یہ بات وحی پر مبنی اور شریعت کا کوئی جز ہو بلکہ عام تجربے کی بنا پر آپ نے ایک بات بتا دی۔ گرم ملک میں لو لگنے کا عارضہ عام تھا تو اس میں یہ علاج مفید ہے۔ لوگ سمجھنے میں یہ غلطی کرتے ہیں کہ ایک خاص معاملے کو عام کر دیتے ہیں۔ یعنی آنحضرت ﷺ نے ایک خاص بخار کے لیے علاج بتایا، لوگوں نے سمجھا کہ جس قسم کا بھی بخار ہو مریض کو خوب نہلا دو۔ پھر روایت میں پانی چھڑکنے کا کہا ہے تو لوگ اس پر قناعت نہیں کریں گے بلکہ جا کر ندی میں نہلائیں گے۔ ظاہر ہے کہ آدمی مر جائے گا، اس لیے کہ کچھ بخار ایسے ہیں کہ پانی ان کے لیے زہر قاتل ہے۔

حیرانی کی بات یہ ہے کہ لوگ اتنی سی بات نہیں سمجھتے کہ آنحضرتؐ جتنی باتیں بتاتے وہ سب کی سب وحی پر مبنی نہیں ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر تابیر نخل کے بارے میں آپؐ نے لوگوں سے کہا کہ درخت کا اور کھجور کے درختوں پر جو چھڑکتے ہو، اگر تم ایسا نہ کرو تو کیا حرج ہے۔ لوگوں نے اور چھڑکنا چھوڑ دیا تو پھل کم آیا۔ لوگوں نے پھل کی کمی کی شکایت آپ کے پاس کی کہ حضور، ہم نے آپ کے حکم سے ایسا کیا تھا لیکن پھل بہت کم آیا، تو آپؐ نے فرمایا کہ "انتم اعلم بامور دنیاکم" تم دنیا کے معاملات میں بہتر جانتے ہو۔ کھیتی باڑی کے معاملات تم

جاؤ- مجھے تو ایک ذوق کی بات لگی تھی تو میں نے کہہ دیا- یہ کوئی شریعت کا حکم تو نہیں تھا- علی ہذا القیاس بیماریوں کے علاج کی روایتوں کو جمع کر کے لوگوں نے طب نبوی کو باقاعدہ مرتب کر کے پیش کر دیا ہے- ظاہر ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ایک متقی قومی دوسرا علاج کیوں کرائے گا- دوا سے تقویٰ کے خلاف سمجھے گا- لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ایسی روایات کو بھی ہیر نحل کے واقعہ پر قیاس کرنا چاہیے- کیونکہ نبی ﷺ جسمانی بیماریوں کے نہیں بلکہ روحانی بیماریوں کے معالج ہو کر آئے تھے- آپ کی طرف طب روحانی کے سوا اور کسی طب کے منسوب کرنے کی گنجائش نہیں- لہٰذا اس طرح کے معاملات میں موقع و محل کا لحاظ ہونا چاہیے- یہ واقعہ ہے کہ بعض بخاروں میں پانی بہت مفید ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض میں یہ انتہائی نقصان دہ ہے- اس لیے بخار کی نوعیت کا لحاظ رکھنا ہوگا-

میرے نزدیک یہ بات قرآن مجید کی اس آیت میں بھی ملحوظ ہونی چاہیے جس میں فرمایا ہے کہ شہد میں شفا بھی ہے- یہ قرآن مجید پر ظلم ہوگا اگر آپ اس کے معنی یہ لیں کہ شہد ہر مرض کی دوا ہے- یقیناً وہ بہت سے امراض میں مفید ہے لیکن اس میں ہر مرض کا تو علاج نہیں کہ آپ ہر مرض میں مریض کو شہد ہی پانے کی کوشش کریں- خود قرآن مجید کے الفاظ نے یہ بات نہیں نکلتی کہ وہ شہد کو بطور علاج تجویز کر رہا ہے- اس نے اس نعمت کا اسی طرح ذکر کیا ہے جس طرح دوسری نعمتوں کا جن کو انسان اپنے فائدہ کے لیے استعمال کرتا ہے-

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِنَّ الْحُمّٰى مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ فَاَبْرِدُوْهَا بِالْمَاءِ- عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ الْحُمّٰى مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ فَاَطْفِئُوْهَا بِالْمَاءِ-

﴿ہشام بن عروہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بخار جہنم کی پھونک میں سے ہے، اس کو پانی سے ٹھنڈا کرو- نافع ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بخار جہنم کی پھونک میں سے ہے، اسے پانی سے بجھاؤ-﴾

وضاحت

یہ واقعہ ہے کہ جتنا خیر ہے اس کا منبع جنت ہے اور جتنا شر ہے اس کا منبع دوزخ ہے- خیر اور شر کے ذخیرے یکجا ہیں- حدیث میں بخار کی بیماری کا خاندان و نسب بتا دیا ہے کہ یہ کس خاندان سے چلی ہے- گویا یہ بیماری بھی اس

طرح کی ہے کہ تمام شر کا منبع ہے لہٰذا اس کو پانی سے ٹھنڈا کرو- روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آنحضرتؐ نے یہ بات کس موقع پر فرمائی- ہو سکتا ہے بخار کی کوئی خاص قسم مراد ہو یا کسی کے بخار کا ذکر آیا ہو اور آپ کو معلوم ہو کہ اس کو لو لگی ہے تو اس موقع پر آپ نے فرمایا ہو- بہت سی روایات کو سمجھنے میں لوگوں کو مشکل اس لیے پیش آئی کہ راوی حضرات روایت کا موقع و محل متعین نہیں کرتے- اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بڑے بڑے فتنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں-

عِيَادَةُ الْمَرِيْضِ وَالطِّيَرَةُ

مریض کی عیادت اور شگون کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ عَنْ جَابِرِ ابْنِ عَبْدِاللّٰهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِذَا عَادَ الرَّجُلُ الْمَرِيْضَ خَاضَ الرَّحْمَةَ حَتّٰى اِذَا قَعَدَ عِنْدَهٗ قَرَّتْ فِيْهِ اَوْ نَحْوَ هٰذَا-

﴿امام مالکؒ کو یہ بات جابر بن عبداللہؓ سے پہنچی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص کسی مریض کی عیادت کو جاتا ہے تو خدا کی رحمت میں ڈوب جاتا ہے (یا غوطہ لگاتا ہے) اور جب وہ اس کے پاس بیٹھ جاتا ہے تو رحمت اس کے پاس تک جاتی ہے یا اسی طرح کے اور الفاظ کہے-﴾

وضاحت

مریض کی عیادت بہت بڑی سعادت ہے- ہمدردی سے معاشرہ میں حسن و خوبی پیدا ہوتی ہے- آپس میں محبت بڑھتی ہے- عیادت مریض ایک مسلمان کا دوسرے پر حق ہے- اگر کھڑے کھڑے پوچھ کے چلے آئیں کہ کیسا مزاج ہے تو یہ بھی نیکی ہے لیکن ایسا نہ کریں، ذرا بیٹھ جائیں- مریض کے سر پر ہاتھ بھی رکھ دیں- اس کے جسم کا اندازہ کریں اور کچھ تسلی کے الفاظ بھی کہہ دیں تو پھر کیا کہنے- اللہ تعالیٰ کی رحمت ایسے شخص کو گھیر لیتی ہے-

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ عَنْ بُكَيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الْاَشَجِّ عَنِ ابْنِ عَطِيَّةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا عَدْوٰى ، وَلَا هَامَ وَلَا صَفَرَ ، وَلَا يُحْلَلُ الْمُمْرِضُ عَلَى الْمُصِحِّ ، وَلْيُحْلَلِ الْمُصِحُّ حَيْثُ شَاءَ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَمَا ذَاكَ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّهٗ اَذًى-

﴿ابن عطیہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ متعدی، ہام اور صفر کا کوئی تصور (اسلام

میں) نہیں اور یہ ٹھیک نہیں کہ کوئی اپنے مریض جانوروں کو ان پر لے جائے جو تندرست ہوں۔ البتہ یہ درست ہے کہ تندرست جانور کو جہاں چاہے لے جائے۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ یہ کیا بات ہوئی؟ تو آپ نے فرمایا ایسا کرنا باعث تکلیف ہوتا ہے۔

وضاحت

حدیث میں عدوی، ھام اور صفر کے تین الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کے بارے میں عربوں کے اندر بڑے اوہام پائے جاتے تھے۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ ایسے اوہام کا اسلام میں کوئی تصور نہیں۔ عدوی کے معنی بیماری کا متعدی ہونا ہے۔ عربوں کا خیال تھا کہ ایک بیمار اونٹ دوسرے تندرست اونٹوں کو بھی بیمار کر دیتا ہے لہٰذا وہ اس کو گلے سے الگ کر دیتے۔

ھام کے متعلق مختلف روایتیں ان لوگوں کے ہاں تھیں۔ مثلاً یہ کہ کوئی شخص اگر قتل ہو جائے اور اس کا قصاص نہ لیا جائے تو اس کی روح ایک پرندے کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور وہ استوفی، استوفی کا نعرہ لگاتی رہتی ہے یعنی مجھے پلاؤ، میں پیاسی ہوں، جب تک کہ اس کا انتقام نہ لے لیا جائے۔ یا یہ کہ فلاں پرندہ اگر گھر کی چھت پر بیٹھ جائے تو اس گھر سے میت نکلتی ہے۔ اوہام پرست معاشرہ میں اس طرح کے شگون لینے کا رواج ہوتا ہے۔

صفر کے مہینے کے اوہام میں بھی بڑے اختلافات ہیں۔ بعض لوگ اس مہینے کو بیماریوں کا گھر سمجھتے۔ اسی طرح اس مہینہ میں شادی کرنے پر بھی بدشگون لیتے۔ نسی کے قاعدہ کے تحت ماہ محرم کو حلال قرار دے دیتے اور ماہ صفر کو شہر حرام قرار دے دیتے تھے۔ شادی کے معاملہ میں تو ہمارے ہاں بھی ایک وہم پایا جاتا ہے کہ محرم میں شادی نہ کی جائے۔ اس زمانے میں صفر بدنام تھا اب محرم بدنام ہو گیا۔ میرے نزدیک اس میں کچھ حرج نہیں۔ یہ اسی طرح کا وہم ہے جس طرح کے وہم کو اسلام نے آکر دور کیا۔

اسلام میں کوئی چیز بذات خود مؤثر نہیں مانی جاتی۔ ہر کام اللہ کے حکم سے ہوتا ہے اور اسی طرح ہوتا ہے جو مقدر کر دیا گیا ہے۔ عدوی میں بھی فیصلہ کن بات مرض کا متعدی ہونا نہیں بلکہ اللہ کا حکم ہی ناطق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی بڑی متعدی وباؤں میں مریضوں کی تیمارداری کرنے والے مرض کے حملہ سے بچ جاتے ہیں اور جہاں وبا کے کوئی آثار نہیں ہوتے وہاں بیماری پھیل جاتی ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ نبی ﷺ کے پاس لوگوں کی خارش کے متعدی ہونے کا ذکر ہوا تو آپ نے پوچھا کہ سب سے پہلے جس اونٹ کو خارش ہوئی اس کو کس سے

چھوت لگی تھی۔

اس دور میں ایڈز وغیرہ کا جو پروپیگنڈا کیا گیا ہے اس کے باعث اسلام کا یہ تصور قبول کرنے میں لوگوں کو دقت پیش آئے گی۔ بہر حال اسلام کی تعلیم یہ بھی نہیں ہے کہ آپ کسی وبا زدہ علاقہ میں خواہ مخواہ کود پڑیں۔ اجتناب کرنا ہی صحیح ہے۔ لیکن اگر فرائض کا تقاضا ہو تو محض اس وہم کے باعث کہ بیماری لگ جائے گی، وبا زدہ علاقہ میں جانے سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔

نبی ﷺ نے جب یہ ہدایت دی کہ آدمی اپنے بیمار جانوروں کو تندرست جانوروں میں نہ لے جائے تو لوگوں کو حیرانی ہوئی کہ جب عدوی کی کوئی حقیقت نہیں تو پھر اس ممانعت کا کیا سبب ہے۔ تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ایسا کرنے سے تندرست جانوروں کا مالک رامنائے گا۔ یہ اسی طرح ہے کہ جس طرح مرض کے مریض کو مسجد میں جانے کی ممانعت ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ مرض دوسروں کو لگ جائے گا بلکہ یہ ہے کہ لوگ ایسے شخص سے ناگواری محسوس کریں گے تو خود اس کی دل شکنی ہو گی۔

اَلسُّنَّةُ فِی الشَّعَرِ

بالوں کے بارے میں سنت

❐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِی بَكْرِ بْنِ نَافِعٍ عَنْ اَبِیهِ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ اَمَرَ بِاِحْفَاءِ الشَّوَارِبِ وَ اِعْفَاءِ اللِّحَی۔

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مونچھوں کو منڈوانے اور داڑھیوں کو بڑھانے کا حکم دیا۔﴾

وضاحت

مونچھوں کو شوارب (پینے والی) اس لیے کہتے ہیں کہ اگر بڑھ جائیں تو یہ آپ کی چائے، شربت اور کھانے کی چیز میں شریک ہو جاتی ہیں۔ احفاء سے مطلب یہ ہے کہ ان کو اچھی طرح مونڈ دیا جائے۔ اہل حدیث کا یہ مذہب ہے کہ استرے سے صاف کر دیا جائے لیکن بعض اس کو مثلہ کہتے ہیں اور وہ اس کی اجازت نہیں دیتے۔ بعض لوگ احفاء کا تقاضا یہ سمجھتے ہیں کہ مونچھوں کے بالوں کو ہونٹوں کی طرف نہ بڑھنے دیا جائے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے

متعلق آیا ہے کہ جب وہ کسی اہم مسئلہ پر غور کر رہے ہوتے تو وہ اپنی مونچھوں کے بالوں کو چبتے رہتے۔

اعفاء اللحی کا ظاہر مطلب تو یہ ہے کہ داڑھی کو بڑھنے دیا جائے اور بالکل ہاتھ نہ لگایا جائے۔ لیکن ایک روایت میں آیا ہے کہ "کان یاخذ عن یمینہ و شمالہ" کہ آپ دائیں اور بائیں سے بال کاٹتے تھے۔ اگر دائیں اور بائیں جانب سے بالوں کو کاٹ دیا جائے اور نیچے کی جانب ان کو بڑھنے کے لیے چھوڑ دیا جائے تو خدا جانے آدمی کیا بن جائے۔ لہٰذا روایت کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ داڑھی حسین ہو۔ بال دائیں بائیں اور طول و عرض میں کاٹے جائیں گے۔ اس کو ٹھیک کیا جائے گا۔ بعض صحابہ مثلاً ابن عمرؓ اور ابوہریرہؓ کی داڑھی ایک مشت ہوتی تھی۔ امام مالک کا بھی یہی فتویٰ ہے۔

میرے نزدیک اعفاء کا تقاضا یہ ہے کہ داڑھی چہرے پر نمایاں ہو اور اس کو سنوار کر رکھا جائے۔ اس کو دیکھ کر یہ تاثر نہیں ملنا چاہیے کہ شیو بڑھی ہوئی ہے۔

❐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ حُمَيْدِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ اَنَّهٗ سَمِعَ مُعَاوِيَةَ بْنَ اَبِی سُفْيَانَ عَامَ حَجَّ وَ هُوَ عَلَی الْمِنْبَرِ وَ تَنَاوَلَ قُصَّةً مِنْ شَعَرٍ كَانَتْ فِی يَدِ حَرَسِیٍّ يَقُوْلُ يَا اَهْلَ الْمَدِيْنَةِ اَيْنَ عُلَمَاؤُكُمْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَنْهٰی عَنْ مِثْلِ هٰذِهٖ وَ يَقُوْلُ اِنَّمَا هَلَكَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ حِيْنَ اتَّخَذَ هٰذِهٖ نِسَاؤُهُمْ۔

﴿حمید بن عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت ہے کہ انہوں نے معاویہ بن ابی سفیان سے، جس سال انہوں نے حج کیا، منبر پر خطبہ کے دوران میں سنا۔ بالوں کا ایک گچھا ان کے ہاتھ میں تھا جو انہوں نے اپنے باڈی گارڈ سے لیا تھا۔ انہوں نے کہا اے اہل مدینہ، تمہارے علماء کہاں مر گئے؟ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ اس طرح کی حرکتوں سے منع کرتے اور یہ فرماتے تھے کہ بنی اسرائیل اپنی عورتوں کی اس طرح کی حرکتوں کے باعث ہلاک ہوئے۔﴾

وضاحت

اس گچھے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جن عورتوں کے سر پر بال کم ہو جاتے ہوں گے تو مصنوعی طریقے پر بال بڑھانے کے لیے دوسری عورتوں کے بال جمع کر کے گچھے بنا کر سر پر سجاتی ہوں گی، کیونکہ عورتیں

لمبے بالوں کی بہت شوقین ہوتی ہیں۔ سو گچھا کہیں سے حضرت امیر معاویہؓ کے سیکورٹی کے آدمی نے اٹھایا تو انہوں نے منبر رسول پر خطبہ کے دوران لوگوں کو دکھایا کہ مدینہ منورہ میں اس طرح کی حرکتیں ہو رہی ہیں اور تمہارے علماء خاموش ہیں، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے ان باتوں سے منع فرمایا۔ پھر حدیث ہی کے حوالے سے انہوں نے اپنی تقریر میں یہ بھی واضح کیا کہ اسی طرح کی حرکتوں سے بنی اسرائیل تباہ ہوئے۔ ہماری عورتوں اور بہو بیٹیوں کا حال لوگوں کو نہیں معلوم کہ جو کچھ آج یہ کر رہی ہیں اس کے باعث سے اس قوم کا حشر کیا ہونے والا ہے۔

❐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ زِيَادِ بْنِ سَعْدٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ اَنَّهٗ سَمِعَهٗ يَقُوْلُ سَدَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نَاصِيَتَهٗ مَاشَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ فَرَقَ بَعْدَ ذٰلِكَ۔ قَالَ مَالِكٌ "لَيْسَ عَلَی الرَّجُلِ يَنْظُرُ اِلٰی شَعَرِ امْرَاَةِ ابْنِهٖ اَوْ شَعَرِ اُمِّ امْرَاَتِهٖ بَاْسٌ"۔

﴿زیاد بن سعد نے ابن شہاب کو بیان کرتے سنا کہ رسول اللہ ﷺ پہلے تو، جب تک اللہ نے چاہا، اپنی پیشانی پر بال چھوڑے رہتے تھے لیکن بعد میں آپ نے مانگ نکالنی شروع کر دی۔ امام مالک کا فتویٰ یہ ہے کہ کوئی شخص اگر اپنی بہو کے یا اپنی ساس کے بال دیکھے تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔﴾

وضاحت

'سدل' کے معنی بالوں کو کھلا چھوڑ دینا ہے کہ لٹکتے رہیں۔ 'فرق' سے مراد بالوں کو تقسیم کر کے مانگ نکالنا ہے۔ عربوں کے ہاں بال رکھنے کا عام رواج تھا اور لوگ بالعموم ان کو کھلا چھوڑ دیتے اور نبی ﷺ کا عمل بھی اسی پر تھا۔ جب اہل کتاب کے ساتھ قریب رہنے کا موقع ملا تو آپ نے دیکھا کہ وہ بالوں میں مانگ نکالتے ہیں۔ آپ کو یہ طریقہ بھلا لگا اور آپ نے بھی اہل کتاب کے طریقہ کے مطابق مانگ نکالنی شروع کر دی۔ کیونکہ جس معاملہ میں اسلام کی اپنی کوئی رہنمائی نہیں ہوتی تھی تو آپ اہل کتاب کے طریقہ پر عمل کرتے تھے۔ اس روایت میں آپ لوگوں کے لیے یہ تعلیم ہے کہ جو لوگ رکھیں وہ شوق سے مانگ نکالیں۔

امام مالک کا فتویٰ بالوں کے بارے میں اس روایت کے تحت معلوم نہیں کیوں نقل کر دیا گیا ہے۔

❐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ كَانَ يَكْرَهُ الْاِخْصَاءَ وَ يَقُوْلُ فِيْهِ تَمَامُ الْخَلْقِ۔

﴿نافع عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ وہ خصی کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اس (قوت) سے خلق کی تکمیل ہوتی ۔﴾

وضاحت

یہ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی رائے کردی ہے کہ خصی کرنے کو مکروہ ہی کہا ہے، حالانکہ اس سے بڑھ کر کوئی حرام فعل نہیں۔ اگر راہبوں اور صوفیوں نے ایسا کیا ہے تو یہ ان کے ان جرائم میں سے ہے جن میں راہب اور صوفی مبتلا رہے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ جس آدمی میں مردی نہ ہو وہ آدمی اسلام کی اعلیٰ صفات کا حامل ہو ہی نہیں سکتا۔ فتوت، شہامت، استقامت، ایثار، مکر کے کام وہ آدمی کر ہی نہیں سکتا جو زنخا ہے۔ اس میں یہ صفات پیدا ہی نہیں ہو سکتیں۔ جس آدمی میں رجولیت ختم ہو گئی وہ دوکوڑی کا ہے۔ اپنے آپ کو خصی کروالینا ہرگز نیکی کا کام نہیں۔ اس جوہر کا ہونا اور اس کو کنٹرول میں رکھنا اصلی رجولیت اور فتوت ہے۔

'مکروہ' بہت ہلکا لفظ ہے۔ حرام کہنا چاہیے تھا۔ فیہ تمام الخلق کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی خلقت کی تکمیل اس قوت سے ہوتی ہے۔ اور یہ مطلب بھی ہے کہ اسی سے دنیا پیدا ہوتی ہے، لہٰذا اس قوت کو باقی رہنا چاہیے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَيْمٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ اَنَا وَ كَافِلُ الْيَتِيْمِ لَهٗ اَوْ لِغَيْرِهٖ فِي الْجَنَّةِ كَهَاتَيْنِ اِذَا اتَّقٰى وَ اَشَارَ بِاِصْبَعَيْهِ الْوُسْطٰى وَالَّتِي تَلِي الْاِبْهَامَ۔

﴿صفوان بن سلیم سے روایت ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا، خواہ وہ اس کا اپنا ہو یا غیروں میں سے کوئی دوسرا، جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح ہوں گے، اگر وہ تقویٰ اختیار کرے۔ اور آپ نے اپنی درمیانی انگلی اور انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی سے اشارہ کیا۔﴾

وضاحت

فی الواقع یتیم کی کفالت کرنے والے کا بڑا درجہ ہے۔ آنحضرتؐ نے جنت میں ایسے شخص کا قرب ظاہر کرنے کے لیے فرمایا کہ ہم اس طرح قریب ہوں گے جیسے ہاتھ کی ساتھ ساتھ کی دو انگلیاں۔ ظاہر ہے اس سے بڑھ کر کوئی شخص کون سا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔

اِصْلَاحُ الشَّعَرِ

بالوں کو سنوارنے کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ اَنَّ اَبَا قَتَادَةَ الْاَنْصَارِيَّ قَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ لِي جُمَّةً اَفَارْجِلُهَا؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نَعَمْ وَ اَكْرِمْهَا۔ فَكَانَ اَبُو قَتَادَةَ رُبَّمَا دَهَنَهَا فِي الْيَوْمِ مَرَّتَيْنِ لِمَا قَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نَعَمْ وَ اَكْرِمْهَا۔

﴿یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ ابو قتادہ انصاری نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ میں بڑے بڑے بال رکھے ہوئے ہوں تو کیا میں اس میں کنگھا کر لیا کروں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں اور بالوں کی قدر کرو۔ چنانچہ ابو قتادہ کبھی کبھی دن میں دو مرتبہ بھی تیل لگایا کرتے تھے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ہاں ان کی قدر کرو۔﴾

وضاحت:

ہدایت صاف ہے کہ اگر بڑے رکھے ہیں تو ان کی قدر کرو۔ پریشان حال نہ پھرو۔ تیل بھی لگاؤ اور کنگھی بھی کرو۔ بعض لوگ دیداری کا تقاضا یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ میلے کچیلے رہتے ہیں۔ ان کے خیال میں زہد کا اعلیٰ مقام اسی سے حاصل ہوتا ہے۔ اسلام دین فطرت ہے۔ اس میں ایسے کوئی معیارات قائم نہیں کیے گئے جو انسانیت کے فطری تقاضوں کے مطابق نہ ہوں۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ اَنَّ عَطَاءَ بْنَ يَسَارٍ اَخْبَرَهٗ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِي الْمَسْجِدِ فَدَخَلَ رَجُلٌ ثَائِرَ الرَّاْسِ وَاللِّحْيَةِ فَاَشَارَ اِلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِيَدِهٖ اَنِ اخْرُجْ كَاَنَّهٗ يَعْنِي اِصْلَاحَ شَعْرِ رَاْسِهٖ وَ لِحْيَتِهٖ فَفَعَلَ الرَّجُلُ ثُمَّ رَجَعَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلَيْسَ هٰذَا خَيْرًا مِنْ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدُكُمْ ثَائِرَ الرَّاْسِ كَاَنَّهٗ شَيْطَانٌ۔

﴿زید بن اسلم سے روایت ہے کہ عطاء بن یسار نے ان کو خبر دی کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تھے تو

ایک شخص داخل ہوا جس کے سر اور داڑھی کے بال پراگندہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ مسجد سے نکل جاؤ۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ اپنی ڈاڑھی اور سر کے بالوں کی اصلاح کرو۔ تو اس شخص نے ایسا کیا اور لوٹ آیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا یہ اس سے بہتر نہیں کہ تم میں سے کوئی پراگندہ سر ہو کر آئے جیسے وہ شیطان ہو۔﴾

وضاحت :

یہ روایت مرسل ہے لیکن اس میں بات وہی اوپر والی روایت کی طرح ہے کہ بال سنوار کر رکھنے چاہئیں۔ ان کو پراگندہ نہیں چھوڑنا چاہیے کہ آدمی بھوت معلوم ہو۔ نبی ﷺ نے صفائی، ستھرائی اور نظافت کو اس قدر اہمیت دی کہ پراگندہ بال مسجد میں آنے والے شخص کو آپ نے لوٹ جانے اور اپنی حالت درست کر کے آنے کی ہدایت فرمائی۔

مَا جَاءَ فِي صَبْغِ الشَّعَرِ

بال رنگنے کے بارے میں

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ قَالَ: اَخْبَرَنِي مُحَمَّدُ بْنُ اِبْرَاهِيمَ التَّيْمِيُّ عَنْ اَبِي سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّ عَبْدَالرَّحْمٰنِ بْنَ الْاَسْوَدِ بْنِ عَبْدِ يَغُوثَ قَالَ وَ كَانَ جَلِيْسًا لَهُمْ وَ كَانَ اَبْيَضَ اللِّحْيَةِ وَالرَّاْسِ – قَالَ فَغَدَا عَلَيْهِمْ ذَاتَ يَوْمٍ وَ قَدْ حَمَّرَهُمَا– قَالَ فَقَالَ لَهُ الْقَوْمُ هٰذَا اَحْسَنُ فَقَالَ اِنَّ اُمِّي عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ اَرْسَلَتْ اِلَيَّ الْبَارِحَةَ جَارِيَتَهَا نُخَيْلَةَ فَاَقْسَمَتْ عَلَيَّ لَاَصْبُغَنَّ وَ اَخْبَرَتْنِي اَنَّ اَبَابَكْرٍ الصِّدِّيْقَ كَانَ يَصْبُغُ– قَالَ يَحْيَى سَمِعْتُ مَالِكًا يَقُوْلُ فِي صَبْغِ الشَّعْرِ بِالسَّوَادِ لَمْ اَسْمَعْ فِي ذٰلِكَ شَيْئًا مَعْلُوْمًا وَ غَيْرَ ذٰلِكَ مِنَ الصَّبْغِ اَحَبُّ اِلَيَّ قَالَ وَ تَرْكُ الصَّبْغِ كُلِّهِ وَاسِعٌ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَيْسَ عَلَى النَّاسِ فِي ذٰلِكَ ضِيْقٌ– قَالَ وَ سَمِعْتُ مَالِكًا يَقُوْلُ فِي هٰذَا الْحَدِيْثِ بَيَانٌ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لَمْ يَصْبُغْ وَ

لَوْ صَبَغَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَاَرْسَلَتْ بِذٰلِكَ عَائِشَةُ اِلٰى عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ الْاَسْوَدِ–

﴿ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن اسود بن عبد یغوث ان کے پاس بیٹھنے والے تھے۔ ان کی داڑھی اور سر کے بال سفید تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن وہ آئے تو انہوں نے سر اور داڑھی دونوں کو سرخ رنگ میں رنگ رکھا تھا۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ یہ اچھا لگ رہا ہے تو انہوں نے کہا میری امی عائشہ نبی ﷺ کی اہلیہ نے کل رات اپنی لونڈی نخیلہ کے ذریعے سے مجھے یہ پیغام بھیجا کہ تمہیں قسم ہے کہ اپنے بالوں کو ضرور رنگو۔ انہوں نے مجھے یہ بھی خبر دی کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی بالوں کو رنگتے تھے۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک کو کہتے سنا کہ میں نے بالوں کو سیاہ رنگنے کے بارے میں کوئی قطعی بات نہیں سنی اور اس کے علاوہ جو دوسرے خضاب ہیں وہ مجھے زیادہ پسند ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ بال رنگنے سے اجتناب میں ان شاء اللہ زیادہ وسعت ہے۔ اس میں لوگوں کے لیے تنگی نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے امام مالک کو یہ فرماتے سنا کہ اس حدیث میں اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بالوں کو خضاب نہیں لگایا۔ اگر آپ نے ایسا کیا ہوتا تو حضرت عائشہ عبدالرحمٰن بن الاسود کو اپنے پیغام میں اس بات کا حوالہ دیتیں۔﴾

وضاحت :

اس روایت سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ آنحضرت ﷺ نے خضاب نہیں لگایا۔ کیونکہ حضرت عائشہؓ کو یہ بتانا چاہیے تھا کہ آنحضرتؐ نے ایسا کیا۔ لیکن روایات میں اختلاف ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے خضاب لگایا۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ کی ٹھوڑی میں چند بال سفید تھے تو پھر آپ خضاب کہاں لگاتے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ کام مذاق سلیم کے خلاف ہے۔ فطرت اس سے ابا کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے یہ بعید ہے کہ آپ نے فطرت کے خلاف کیا ہو۔

حضرت ابراہیم کے متعلق یہ روایت گزر چکی ہے کہ آپ نے دعا پڑھا تو اللہ تعالیٰ سے کہا کہ یہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ وقار ہے۔ اب اس وقار کو، جو اللہ تعالیٰ کسی کو عطا فرمائے، سرخی یا سیاہی سے چھپا دینا کہاں کی

تعلق ہے۔ اگر آنحضرتؐ کے متعلق یہ بات ثابت ہو کہ آپ نے خضاب لگایا تو ہو سکتا ہے کہ آپ نے خوشبو کے لیے زعفران لگایا ہو۔ راویوں نے اس کو یہ رنگ دے دیا۔ خضاب کے متعلق اگر کسی کو شوق ہو تو مہندی کا خضاب لگا لے، اس سے زیادہ نہیں کرنا چاہیے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے متعلق اگر یہ ہے کہ وہ خضاب لگاتے تھے تو یہ پچھلے رواج کے مطابق ہو گا۔ اسلام میں اس کی کوئی ممانعت تو ہوئی نہیں۔ اگر وہ کرتے رہے تو اس کے جواز میں کوئی شک نہیں رہتا۔

امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ رنگنا اور نہ رنگنا دونوں یکساں ہیں۔ اس معاملے میں کوئی سختی نہیں۔ البتہ خضاب نہ لگانے میں سہولت ہے۔

مَا يُؤْمَرُ بِهِ مِنَ التَّعَوُّذِ

تعوذ کے بارے میں کیا حکم ہے

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ قَالَ بَلَغَنِي اَنَّ خَالِدَ بْنَ الْوَلِيْدِ قَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِنِّي اُرَوَّعُ فِي مَنَامِي، فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قُلْ اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ غَضَبِهٖ وَ عِقَابِهٖ، وَ شَرِّ عِبَادِهٖ، وَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَ اَنْ يَحْضُرُوْنِ۔

﴿یحییٰ ابن سعید سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ خالد بن ولیدؓ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ حضور میں خواب میں ڈر جایا کرتا ہوں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ دعا پڑھ لیا کرو کہ میں اللہ تعالیٰ کے کامل کلموں کے ذریعے اس کے غصے اور عتاب سے اور اس کے بندوں کے شر سے اور شیاطین کے وسوسوں سے اور اس بات سے کہ شیاطین میرے پاس آئیں، اس کی پناہ مانگتا ہوں۔﴾

وضاحت:

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ خالد بن ولید "سیف اللہ" ہیں اور وہ بھی خواب میں ڈر جاتے رہے ہیں۔ جب حضرت خالد بن ولید ڈر جاتے ہیں تو ہمارا کیا ہے۔ یہ حالت سب کو پیش آ سکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو دعا دی جو سب کو یاد کر لینی چاہیے۔ یہ دعا بُرے خوابوں کے علاوہ نظر بد کے لیے بھی ہے۔

کامل کلمات سے مراد وہی ہے جو دوسری دعا کے الفاظ بکل اسم سمیت بہ نفسک سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کی تمام صفات اور شانوں کا لحاظ کر کے ان کے حوالے سے دعا مانگنا ہوتا ہے۔ دعا ہمیشہ جامع الفاظ میں مانگنی چاہیے۔ زیر بحث دعا ان الفاظ میں ہے کہ اے اللہ، تیری رحمت کے تمام سہاروں اور تیرے تمام ناموں کی برکت کے حوالے سے میں تیرے غضب سے، تیرے عتاب سے، تیرے بندوں کے شر سے اور شیاطین کے وسوسوں سے اور اس بات سے کہ وہ میرے پاس آئیں، تیری پناہ مانگتا ہوں۔

میرے نزدیک شیاطین کو اللہ تعالیٰ کے نیک اور صالح بندوں پر اس سے زیادہ کوئی اختیار نہیں کہ وہ وسوسہ اندازی کر سکیں۔ وہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اس لیے میں ان لوگوں کی رائے کو غلط سمجھتا ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ ساحر اپنے سحر کے ذریعے یا شیطانوں کے ذریعے قتل بھی کر سکتے ہیں، دمار بھی کر سکتے ہیں، نامرد بھی بنا سکتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے کہ "اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ" اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِيْنَ" (الحجر ۴۲)

(میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا بجز ان کے جو گمراہوں میں سے تیرے پیرو بن جائیں)

بعض لوگ شیطانی عمل کرتے ہیں تاکہ شیطانوں اور جنوں کو مسخر کریں تو وہ انہی کے بھائی بند ہوتے ہیں۔ بعض مرتبہ شیطانوں کا وار چل جاتا ہے تو وہ ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ نیک لوگوں یعنی موحدین پر ان کا صرف اتنا ہی اثر ہو سکتا ہے کہ وہ وسوسہ اندازی کریں۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ اَنَّهُ قَالَ اُسْرِيَ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَرَاٰى عِفْرِيْتًا مِنَ الْجِنِّ يَطْلُبُهُ بِشُعْلَةٍ مِنْ نَارٍ كُلَّمَا الْتَفَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ رَاٰهُ، فَقَالَ لَهُ جِبْرِيْلُ اَفَلَا اُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ تَقُوْلُهُنَّ اِذَا قُلْتَهُنَّ طَفِئَتْ شُعْلَتُهُ وَ خَرَّ لِفِيْهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَلٰى فَقَالَ جِبْرِيْلُ فَقُلْ اَعُوْذُ بِوَجْهِ اللّٰهِ الْكَرِيْمِ وَ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِي لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ" مِنْ شَرِّ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَ شَرِّ مَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَشَرِّ مَا ذَرَاَ فِي الْاَرْضِ ، وَ شَرِّ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا، وَ مِنْ فِتَنِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ، وَ مِنْ طَوَارِقِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِلَّا طَارِقًا يَطْرُقُ

بِخَيْرٍ يَا رَحْمٰنُ-

﴿یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کو ایک رات لے جایا گیا تو آپ نے دیکھا کہ جنوں کا ایک بھوت آپ کا آگ کے شعلے کے ساتھ پیچھا کر رہا ہے- جب جب رسول اللہ ﷺ اس کی طرف متوجہ ہوتے آپ اس کو دیکھتے تو جبریل نے کہا کہ آپ کو ایسے کلمات نہ سکھادوں کہ وہ آپ پڑھیں تو اس کا شعلہ بجھ جائے اور وہ اپنے منہ کے بل گر پڑے- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں ضرور سکھایئے۔ تو جبریل نے کہا پڑھیے، میں اللہ کریم کے چہرے اور اس کے ان کامل کلمات کے سہارے کی جن سے آگے نہیں جا سکتا نہ کوئی نیک نہ بد، ہر اس چیز کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو آسمان سے اترتی ہے اور اس چیز کے شر سے جو آسمان میں چڑھتی ہے، ہر اس چیز کے شر سے جو زمین میں پیدا ہوتی ہے اور اس چیز کے شر سے جو اس سے نکلتی ہے اور رات اور دن کے فتنوں سے اور رات اور دن کے طوارق سے جو رات یا دن کو اچانک نمودار ہوں سوائے طارق خیر سے، اے رحمٰن-﴾

وضاحت :

یہ روایت مرسل ہے اس لیے نفس واقعہ پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا-

طارق، جس کی جمع طوارق ہے، کے معنی رات میں آنے والے کے ہیں اور یہ آنے والے اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور برے بھی-

جہاں تک دعا کا تعلق ہے تو میرا خیال یہ ہے کہ اس طرح کی دعائیں نبی ﷺ کے راویوں کے لیے ٹھیک ٹھیک یاد رکھنا آسان نہیں ہے- میرے نزدیک تعوذ کی بہت ہی جامع اور بلیغ ترین دعائیں قرآن مجید کی آخری دو سورتیں ہیں- سو وہ اتنی جامع ہیں کہ کلمات اللہ التامہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں- میں تو یہی کرتا ہوں کہ آیۃ الکرسی، قل ھو اللہ اور معوذتین پڑھنے کے بعد سونے کی دعا پڑھ کر سو جاتا ہوں- باقی اگر کسی کو یہ دعا یاد ہو جائے تو فبہا-

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ سُهَيْلِ بْنِ اَبِي صَالِحٍ عَنْ اَبِيهِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَجُلًا مِنْ

اَسْلَمَ قَالَ مَا نِمْتُ هٰذِهِ اللَّيْلَةَ ، فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ؟ فَقَالَ لَدَغَتْنِي عَقْرَبٌ" فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَمَا اِنَّكَ لَوْ قُلْتَ حِيْنَ اَمْسَيْتَ اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ لَمْ تَضُرَّكَ-

﴿ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ اسلم قبیلے کے ایک شخص نے کہا میں آج رات بھر نہیں سویا- رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: اس کا سبب کیا تھا؟ اس نے کہا کہ مجھے بچھو نے ڈنک مارا- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم شام کو سوتے وقت یہ کہتے کہ میں اللہ تعالیٰ کے کامل کلمات کی پناہ مانگتا ہوں ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی تو تم کو تکلیف نہ ہوتی-﴾

وضاحت :

یہ سونے کے وقت کی دعا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے کامل کلمات کے حوالہ سے ہر چیز کے شر سے خدا کی پناہ مانگی گئی ہے- مختصر اور جامع دعا ہے- یاد کر لینی چاہیے-

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ سُمَيٍّ مَوْلَى اَبِي بَكْرٍ عَنِ الْقَعْقَاعِ بْنِ حَكِيْمٍ اَنَّ كَعْبَ الْاَحْبَارِ قَالَ لَوْ لَا كَلِمَاتٌ اَقُوْلُهُنَّ لَجَعَلَتْنِي يَهُوْدُ حِمَارًا، فَقِيْلَ لَهُ وَ مَا هُنَّ فَقَالَ اَعُوْذُ بِوَجْهِ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ الَّذِيْ لَيْسَ شَيْءٌ" اَعْظَمَ مِنْهُ، وَبِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِي لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَ لَا فَاجِرٌ وَ بِاَسْمَاءِ اللّٰهِ الْحُسْنٰى كُلِّهَا مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَ مَالَمْ اَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَ ذَرَاَ وَ بَرَاَ-

﴿قعقاع بن حکیم سے روایت ہے کہ کعب احبار نے کہا کہ اگر میں کچھ کلمات نہ پڑھتا ہوتا تو یہود تو مجھے گدھا بنا چھوڑتے- پوچھا گیا وہ کلمات کیا ہیں تو انہوں نے کہا، میں پناہ مانگتا ہوں اللہ عظیم کی ذات کی جس سے کوئی بڑا نہیں اور اللہ کے کامل کلمات کی کہ جن سے آگے نہ کوئی نیک جا سکتا ہے نہ بد- اور اللہ کے اچھے ناموں میں سے جو میں جانتا ہوں اور جو نہیں جانتا اس شر سے جو اللہ نے پیدا کیا اور پھیلایا-﴾

وضاحت :

کعب احبار جو یہ کہتے ہیں کہ یہود مجھے گدھا بنا چھوڑتے تو یہ اشارہ ان کے جادو کے افعال کی طرف ہے۔
اس بارے میں میں اپنا نقطہ نظر قرآن مجید کی روشنی میں اوپر خالد بن ولید والی روایت کے تحت بیان کر چکا ہوں۔

کعب احبار کی اس دعا میں وہ بات نہیں جو نبی ﷺ سے سونے کے وقت اور اٹھنے کے وقت کی ماثور دعاؤں میں ہے۔ وہ ایسی ہیں کہ ان کے پڑھنے سے ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید کے سوا نبی ﷺ کے کلام سے زیادہ بلیغ کلام کوئی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر جانب سے گھیر لیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر آنحضرت ﷺ کی یہ دعا دیکھیں کتنی جامع اور موثر ہے :

اَللّٰهُمَّ اِنِّي عَبْدُكَ ابْنُ عَبْدِكَ ابْنُ اَمَتِكَ نَاصِيَتِي بِيَدِكَ مَاضٍ فِيَّ حُكْمُكَ عَدْلٌ فِيَّ قَضَاءُكَ اَسْئَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهِ نَفْسَكَ اَوْ اَنْزَلْتَهُ فِي كِتَابِكَ اَوْ عَلَّمْتَهُ اَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِيْعَ قَلْبِي وَ نُوْرَ صَدْرِي وَ جِلَاءَ حُزْنِي وَ ذَهَابَ هَمِّي وَ غَمِّي

(اے اللہ میں تیرا بندہ، تیرے غلام کا بیٹا، تیری لونڈی کا بیٹا ہوں۔ میری پیشانی تیری گرفت میں ہے۔ میرے بارے میں تیرا حکم ماضی ہے، میرے بارے میں تیرا فیصلہ عدل پر مبنی ہے۔ میں سوال کرتا ہوں ہر اس نام سے جو تیرا ہے، جو تو نے اپنی ذات کا رکھا ہے یا اپنی کتاب میں اتارا ہے یا اپنی مخلوق میں کسی کو اس کا علم دیا ہے کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار، میرے سینے کا نور، میرے دکھ کا مداوا اور میری پریشانی اور غم کا علاج بنا دے۔)

مَاجَاءَ فِي الْمُتَحَابِّيْنَ فِي اللّٰهِ

ان لوگوں کے بارے میں جو اللہ کے لیے محبت کرتے ہیں

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ مَعْمَرٍ عَنْ اَبِي الْحُبَابِ سَعِيْدِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى يَقُوْلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

اَيْنَ الْمُتَحَابُّوْنَ لِجَلَالِي اَلْيَوْمَ اُظِلُّهُمْ فِي ظِلِّي يَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلِّي۔

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ بندے جو محض میرے جلال کے اندیشے سے آپس میں محبت کرتے تھے۔ آج میں ان کو اپنے سائے میں لوں گا جس دن کہ میرے سائے کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا۔﴾

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ خُبَيْبِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ الْاَنْصَارِيِّ عَنْ حَفْصِ بْنِ عَاصِمٍ عَنْ اَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ اَوْ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّهُ، اِمَامٌ عَادِلٌ، وَ شَابٌّ نَشَاَ فِي عِبَادَةِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَ رَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ بِالْمَسْجِدِ اِذَا خَرَجَ مِنْهُ حَتّٰى يَعُوْدَ اِلَيْهِ وَ رَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللّٰهِ اجْتَمَعَا عَلٰى ذٰلِكَ وَ تَفَرَّقَا وَ رَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ، وَ رَجُلٌ دَعَتْهُ ذَاتُ حَسَبٍ وَ جَمَالٍ فَقَالَ اِنِّي اَخَافُ اللّٰهَ وَ رَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَاَخْفَاهَا حَتّٰى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِيْنُهُ

﴿ابو سعید خدری یا ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سات قسم کے آدمی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ خاص اپنے سائے میں لے گا اس دن جب اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا۔ ایک تو عادل حکمران، دوسرا وہ نوجوان جس کی اٹھان اللہ عزوجل کی عبادت میں ہوئی، تیسرا وہ شخص جس کا دل مسجد میں اٹکا رہے جب مسجد سے نکلے، اس وقت تک جب کہ لوٹ نہ آئے، چوتھے وہ دو شخص جو اللہ کے لیے محبت کرنے والے ہوتے ہیں، اللہ کے لیے جمع ہوتے ہیں اور اسی کے لیے جدا ہوتے ہیں۔ پانچواں وہ شخص جو اللہ کو تنہائی میں یاد کرے تو اس کے آنسو نکل پڑیں۔ چھٹا وہ شخص جس کو کوئی نسب و جمال والی عورت دعوت عشق دے اور وہ کہے کہ میں اپنے رب سے ڈرتا ہوں۔ اور ساتواں وہ شخص جو صدقہ دے اتنے خفیہ طریقے سے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو معلوم نہ ہو کہ اس کے دائیں نے کیا خرچ کیا۔﴾

وضاحت :

اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے - یہ روایت بخاری اور مسلم دونوں میں ہے - اس روایت کا ایک ایک لفظ اصل دُرِ گوہر سے بھی زیادہ قیمتی ہے - جن سات قسم کے آدمیوں کا یہاں ذکر کیا گیا ہے یہ وہ لوگ ہیں جن کا عمل ان کی سلیم فطرت، اللہ کے خوف اور تقویٰ اور حقیقی جذبۂ خیر کی بدولت ممکن ہوتا ہے - نیکی ان کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوتی ہے اور وہ عارضی طور پر یہ کام نہیں کر رہے ہوتے ہیں - اب دیکھیے وہ خوش نصیب لوگ جن کی قدر افزائی اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا کون ہیں :

(i) اقتدار میں آکر آدمی جب ہر سیاہ و سفید کا مالک بن جاتا ہے تو اپنی قوت کے نشہ میں من مانیاں کرنے لگتا ہے - اپنوں کو نوازتا اور مخالفوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتا ہے - اس وقت عدل کرنا بے حد مشکل کام ہوتا ہے - لیکن جو حکمران عدل کے ساتھ حکومت کر جائے تو گویا اس نے ایک بڑی آزمائش میں کامیابی حاصل کر لی - آخرت میں اللہ کی رحمت اس پر سایہ فگن ہو گی -

(ii) ایک نوجوان جس کی اٹھان اللہ کی عبادت میں ہوئی ہو تو ظاہر ہے کہ پختہ عمر ہونے پر اس کے عمل میں مزید پختگی آئے گی اور وہ مجسم نیکی بن جائے گا -

(iii) وہ شخص جو مسجد سے نکلا لیکن دل اس کا مسجد کے ساتھ اٹکا ہوا ہے کہ کب یہاں لوٹنا نصیب ہو یعنی اس کا مسجد سے نکلنا ایسا ہو جیسے اصل مامن سے نکلنا ہوتا ہے - بندۂ مومن کا اصل مامن مسجد ہی ہے اور اس کا دل وہیں اٹکا رہتا ہے -

(iv) وہ دو شخص جو للہ فی اللہ محبت کرتے ہیں، کوئی دنیاوی غرض وابستہ نہیں، کسی کاروبار میں شراکت نہیں، شادی بیاہ نہیں کرنا، قرض نہیں لینا، اپنے کسی مقصد کے لیے بے وقوف نہیں بنانا - اس ہر ایک کی یہ سوچ ہو کہ بہت نیک آدمی ہے - اس کے پاس بیٹھتا ہوں تو اللہ تعالیٰ کی یاد آجاتی ہے - اس طرح وہ دونوں اللہ کے لیے اکٹھے ہوں، جب ملیں تو اسی مقصد کے لیے کہ اللہ کو یاد کریں اور جب جدا ہوں تو کسی نیکی کے مقصد کو پورا کریں -

(v) تنہائی میں اللہ کو یاد کر کے اس کے خوف سے اور اپنی کوتاہیوں پر نظر کر کے آدمی کے آنسو نکل پڑیں تو یہ بڑا مقام ہے - تماشا کو یہ کہاں حاصل!

(vi) پاک دامنی کی یہ اعلیٰ مثال حضرت یوسف علیہ السلام نے قائم کی - یہ مشکل مقام بھی ہر شخص کو حاصل نہیں ہو تا جب وہ جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے -

(vii) صدقہ کرنے میں جس قدر اخفا ممکن ہو کرنا چاہیے - یہ ممکن تو نہیں کہ ایک ہاتھ کا دوسرے ہاتھ کو معلوم نہ ہو - مقصد یہ ہے کہ اس کا چرچا نہ ہو - لوگوں کو کانوں کان خبر نہ ہو - دکھاوے کے لیے نہیں بلکہ اللہ کے لیے دے - آج کل کی طرح نہیں کہ آگے بیٹھے ہیں یا چیک تقسیم کرتے ہیں تو فوٹو کھنچوانے کے لیے -

لیکن اس روایت کے ساتھ ایک آفت یہ لگی ہوئی ہے کہ کتنی روایتوں میں سات کا عدد آیا ہے لیکن تفصیل کسی میں کچھ اور کسی میں کچھ اور ہے - اس سے اطمینان قلب چھن جاتا ہے کہ معلوم نہیں کون سا بیان صحیح ہے - اسی طرح بعض روایتوں میں یہ اشخاص دس تک ہیں اور بعض میں چودہ پندرہ تک تعداد چلی گئی ہے - میرے خیال میں راوی حضرات نے معنی کے لحاظ سے اس کو ادا کیا ہو گا - بعد میں ان کو کچھ باتیں معلوم ہوئیں لیکن ان کو اس روایت میں یہ عمل ملا نہیں تو انہوں نے از خود اس کو نھونس دیا - اس لیے اگر معنی کا اشتراک ہو تو آپ اس عمل کو لے سکتے ہیں - چونکہ یہ روایت بخاری اور مسلم دونوں میں ہے تو اس کو ترجیح دیجیے -

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ سُهَيْلِ بْنِ أَبِی صَالِحٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِی هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: إِذَا أَحَبَّ اللَّهُ الْعَبْدَ قَالَ لِجِبْرِيلَ قَدْ أَحْبَبْتُ فُلَانًا فَأَحِبَّهُ فَيُحِبُّهُ جِبْرِيلُ ثُمَّ يُنَادِی فِی أَهْلِ السَّمَاءِ إِنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَبَّ فُلَانًا فَأَحِبُّوهُ فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ ثُمَّ يُوضَعُ لَهُ الْقَبُولُ فِی الْأَرْضِ، وَإِذَا أَبْغَضَ اللَّهُ الْعَبْدَ قَالَ مَالِكٌ: لَا أَحْسِبُهُ إِلَّا أَنَّهُ قَالَ فِی الْبُغْضِ مِثْلَ ذَالِكَ -

﴿ حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرنے لگتا ہے تو جبریلؑ سے فرماتا ہے کہ میں اس بندے سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو تو جبریل بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں - پھر وہ آسمان والوں میں منادی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں بندے کو محبوب بنا لیا ہے تو اے آسمان والو تم بھی اس سے محبت کرو تو وہ بھی محبت کرنے

لگتے ہیں- پھر اس کے لیے ساری زمین میں حسن قبول پھیلا دیا جاتا ہے تو سب اس سے محبت کرنے لگتے ہیں- اور جب اللہ کسی بندے پر غضبناک ہو تو مالک کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غضب کے سلسلے میں بھی ایسے ہی فرمایا-﴾

وضاحت :

کیا اس روایت سے یہ بات نکلتی ہے کہ جن لوگوں کو دنیا میں حسن قبول حاصل ہوتا ہے وہ حضرت جبریلؑ کی منادی سے ہوتا ہے؟ تو آج کل جو مقبولیت اداکاروں اور کرکٹرز کو حاصل ہے کیا اس کو کوئی تعلق جبریل کی منادی سے ہے- بالکل کوئی تعلق نہیں- یہ تو شیطان کی منادی ہے- تاہم حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں تو ان کے لیے آسمان میں بھی منادی ہوتی ہے اور زمین میں بھی- ظاہر ہے کہ یہ منادی صرف انہی کے لیے ہو گی جو فقط فی اللہ محبت کرتے ہیں- ہر ایرے غیرے کے لیے نہیں ہو گی- ان کے لیے اس منادی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے نیک بندوں میں ان کے لیے محبت پیدا ہو جاتی ہے اور اگرچہ روئے زمین میں تھوڑے ہیں باقی سب شیطان کی ذریت ہے تو صرف انہی تھوڑے بندوں کے اندر ان کے لیے محبت پیدا ہو گی جو اللہ سے محبت کرتے ہیں، اور وہ تھوڑے ہی ہوتے ہیں- لیکن یہ بات ہوتی ضرور ہے- اگر ان کے زمانے میں نیک بندے کم ہیں تو صرف انہی کے اندر ہو گی- لیکن اللہ تعالیٰ اگر چاہے گا تو تاریخ میں ان کا نام روشن رہے گا اور اللہ کے نیک بندے ان سے محبت کریں گے- اس کی مثال اصحاب کہف ہیں- ان کے زمانہ کے لوگوں نے ان کو قتل کرنے کی دھمکی دی تو وہ غار میں جا کر چھپ گئے- وہاں ان پر نیند طاری ہو گئی- عرصہ دراز کے بعد آنکھ اس وقت کھلی جب زمانہ بدل گیا اور دینی انقلاب آ گیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ جن کو سنگسار کرنے کی دھمکی دی گئی تھی لوگوں کے درمیان ان کی یادگار تعمیر کرنے پر جھگڑا شروع ہو گیا-

حضرت ابراہیمؑ کے لیے لسان صدق علیا یعنی دائمی شہرت کا جو ذکر ہے وہ ان کے اپنے زمانے میں تو نہ تھی، اگرچہ منادی تو جبریلؑ نے اس زمانے میں بھی کی ہو گی- لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو قبول ان کو حاصل ہوا اس کی کوئی مثال نہیں ملتی- دنیا کے تمام بڑے خاندان اور قومیں ان کی کلمہ گو ہیں- لہٰذا میرے نزدیک یہ منادی

ضرور ہوتی ہے لیکن یہ صرف اللہ کے نیک بندوں کے لیے ہوتی ہے- گویوں، کھلاڑیوں، سیاست دانوں کی شہرت اس سے الگ ہے- اس کا تعلق شیطان کی منادی اور ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کی برکات سے ہے- پھر جبریلؑ کی منادی کا اثر بھی نیک بندوں ہی پر ہوتا ہے اور اس کے لیے زمانہ کی کوئی قید نہیں-

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اللہ کی محبت کی بات تو درست ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ کسی سے غضب رکھتا ہے تو کیا ہو گا- ان کا خیال ہے کہ بغض کے بارے میں بھی یہی ہو گا- گویا اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ میں اس بندے سے نفرت کرتا ہوں تم آسمان میں منادی کر دو- لیکن یہ الفاظ روایت میں نہیں ہیں- مجھے امام صاحب کی اس رائے سے اختلاف ہے- یہ دونوں باتیں متوازی نہیں ہیں اور ہونا بھی نہیں چاہیے- اسی وجہ سے یہ الفاظ روایت میں نہیں ہیں-

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَبِي حَازِمِ بْنِ دِينَارٍ عَنْ أَبِي إِدْرِيسَ الْخَوْلَانِيِّ أَنَّهُ قَالَ: دَخَلْتُ مَسْجِدَ دِمَشْقَ فَإِذَا فَتًى شَابٌّ بَرَّاقُ الثَّنَايَا، وَ إِذَا النَّاسُ مَعَهُ إِذَا اخْتَلَفُوا فِي شَيْءٍ أَسْنَدُوا إِلَيْهِ وَ صَدَرُوا عَنْ قَوْلِهِ فَسَأَلْتُ عَنْهُ فَقِيلَ هَذَا مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ، فَلَمَّا كَانَ الْغَدُ هَجَّرْتُ فَوَجَدْتُهُ قَدْ سَبَقَنِي بِالتَّهْجِيرِ وَ وَجَدْتُهُ يُصَلِّي، قَالَ: فَانْتَظَرْتُهُ حَتَّى قَضَى صَلَاتَهُ ثُمَّ جِئْتُهُ مِنْ قِبَلِ وَجْهِهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ ثُمَّ قُلْتُ وَاللّٰهِ إِنِّي لَأُحِبُّكَ لِلّٰهِ، فَقَالَ آللّٰهِ، فَقُلْتُ آللّٰهِ، فَقَالَ آللّٰهِ، فَقُلْتُ آللّٰهِ، فَقَالَ آللّٰهِ، فَقُلْتُ آللّٰهِ، قَالَ فَأَخَذَ بِحُبْوَةِ رِدَائِي فَجَبَذَنِي إِلَيْهِ وَ قَالَ: أَبْشِرْ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى: وَجَبَتْ مَحَبَّتِي لِلْمُتَحَابِّينَ فِيَّ وَالْمُتَجَالِسِينَ فِيَّ، وَالْمُتَزَاوِرِينَ فِيَّ، وَالْمُتَبَاذِلِينَ فِيَّ-

﴿ابو ادریس خولانیؒ کہتے ہیں کہ میں مسجد دمشق میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نوجوان چمکتے دانتوں والا (یعنی ہنس مکھ) ہے- لوگ اس کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں- جب کسی معاملہ میں بحث پیدا ہوتی ہے تو سب اس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس کی بات سن کر مطمئن لوٹتے ہیں- میں نے پوچھا یہ کون حضرت ہیں، تو بتایا گیا کہ یہ معاذ بن جبلؓ ہیں- جب دوسرا دن ہوا تو میں صبح جلدی مسجد

میں چلا گیا تو دیکھا کہ وہ مجھ سے بھی پہلے پہنچے ہوئے ہیں۔ اور میں نے ان کو نماز پڑھتے پایا۔ میں نے انتظار کیا یہاں تک کہ انہوں نے اپنی نماز پوری کی۔ میں نے ان کے آگے سے ہو کر ان کو سلام کیا۔ پھر میں نے عرض کی کہ خدا کی قسم، میں آپ سے اللہ کے لیے محبت کرتا ہوں۔ تو انہوں نے کہا کیا اللہ کے لیے، تو میں نے کہا کہ اللہ کے لیے۔ انہوں نے کہا کیا اللہ کے لیے؟ میں نے کہا کہ اللہ کے لیے۔ انہوں نے کہا کیا اللہ کے لیے؟ میں نے کہا کہ اللہ کے لیے۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے میری چادر کا کونہ پکڑ لیا اور کھینچا اپنی طرف اور کہا کہ بشارت حاصل کرو کہ رسول اللہ ﷺ کو میں نے فرماتے سنا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا کہ میری محبت ان لوگوں کے لیے واجب ہے کہ جو میری خاطر محبت کرنے والے، میری خاطر مل کر بیٹھنے والے، میری خاطر زیارت کرنے والے اور میری خاطر انفاق کرنے والے ہیں۔﴾

وضاحت:

یہ حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایک دوسرے آدمی نے ان سے نقل کیا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ اس نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے کہ میں ان سے ضرور محبت کرتا ہوں جو میری خاطر آپس میں محبت کرتے ہیں، تو یہ بہت اونچا درجہ ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن فی زمانہ فی اللہ محبت کا وجود بہت ہی شاذ ہے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ اَلْقَصْدُ وَ التُّؤَدَةُ وَ حُسْنُ السَّمْتِ جُزْءٌ مِنْ خَمْسَةٍ وَ عِشْرِيْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ

﴿امام مالک کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات عبداللہ بن عباسؓ سے پہنچی ہے کہ میانہ روی، سنجیدگی اور خوش سلیقگی نبوت کے پچیس اجزاء میں سے ایک جزو ہے۔﴾

وضاحت:

نبوت کے جو مدارج اور خصائص ہیں وہ گویا پچیس ہیں۔ ان میں ایک جزو کا ذکر یہاں ہے اور اس کا تمام تر

تعلق انسان کے ظاہری اوصاف سے ہے۔ یعنی حسن کردار، خوش مزاجی، سنجیدگی، میانہ روی ہونی چاہیے۔ گویا ہر چیز میں اعتدال ہونا چاہیے۔ کپڑا پہننے میں بھی سلیقہ ہو اور داڑھی رکھنے میں بھی سلیقہ، ٹوپی پہننے میں اور تہمد باندھنے میں بھی سلیقہ ہو، گویا ہر چیز سلیقے سے ہونی چاہیے۔ دین دار آدمی کو بے ہنگم نہیں ہونا چاہیے۔ اوپر ایک روایت گزری ہے کہ نبی ﷺ نے الجھے ہوئے بالوں والے ایک شخص کو جو مسجد میں آیا تھا واپس جانے کے لیے کہا کہ جا کر پہلے اپنی حالت درست کرے، پھر مسجد میں آئے۔

آنحضرت ﷺ کے متعلق تو معلوم ہے کہ کھانے پینے میں، اٹھنے بیٹھنے میں، چلنے پھرنے میں، ہر چیز میں بہترین مظہر کے پیکر تھے۔ موجودہ زمانہ میں یہ ہے کہ اس میں تہذیب کے آداب مسجد کے آداب سے بھی زیادہ ہیں۔ دین کے آداب میں اتنی شدت نہیں جتنی ان لوگوں کے خود ساختہ آداب میں پائی جاتی ہے۔ لیکن کبھی ان کے ساتھ جنٹلمین تو ان کی پھکڑ بازی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ ظاہر ہے یہ شریفانہ آداب کے بالکل خلاف ہے۔ ان کا لباس بھی (خواہ عورتوں کا ہو یا مردوں کا) تہذیب اور شرافت دونوں کے لحاظ سے نہایت بد تمیز ہوتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ خوش سلیقگی اور چیز ہے اور خانہ بانہ بالکل دوسری چیز۔ خانہ بانہ سے ہمیں منع کیا گیا ہے کیونکہ یہ چیز تکبر پیدا کرتی ہے، اور تکبر شیطان کی صفت ہے۔

مَا جَاءَ فِي الرُّؤْيَا

خواب کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ اِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِي طَلْحَةَ الْاَنْصَارِيِّ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اَلرُّؤْيَا الْحَسَنَةُ مِنَ الرَّجُلِ الصَّالِحِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَ اَرْبَعِيْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ

﴿انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اچھے خواب، جبکہ وہ ایک نیک آدمی نے دیکھے ہوں، نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہوتے ہیں۔﴾

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بِمِثْلِ ذٰلِكَ۔

﴿حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح فرمایا۔﴾

وضاحت :

اس روایت میں نبوت سے مراد علم نبوت ہے۔ جہاں تک نبوت کا تعلق ہے اس کا کوئی حصہ اب باقی نہیں رہا۔ لیکن علم نبوت میں سے صرف وحی منقطع ہوئی ہے۔ یہ علم دوسرے ذرائع مثلاً قرآن مجید اور سنت رسول اللہ کے ذریعہ سے باقی ہے۔ اس کا ایک ذریعہ انبیاء کے خواب بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس روایت کی رو سے علم نبوت کا فیضان نیک آدمی کے خواب میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔

خواب انبیاء کے علم کا ایک معروف ذریعہ ہیں، بالخصوص وہ معاملات کہ جن کو عملاً دکھانا ہو وہ انبیاء کو القاء کی جائے رویا میں دکھائے جاتے ہیں تاکہ پورا نقشہ ان کے سامنے آجائے۔ انبیاء کے بڑے بڑے رویا میں مثلاً حضرت ابراہیمؑ کا وہ خواب ہے جو حضرت اسمٰعیلؑ کے ذبح کے متعلق تھا۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ کو جنگ بدر کا سارا نقشہ پہلے ہی دکھا دیا گیا تھا۔ قرآن مجید میں اسراء کے واقعہ کو بھی رویا سے ہی تعبیر کیا گیا ہے۔ علم نبوت ایک سمندر ہے۔ اس میں ایک نیک آدمی کا اچھا خواب کتنا حصہ ہوتا ہے، اس کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا کہ یہ علم نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہوتا ہے۔ ہم اس اشارہ کو سمجھ تو سکتے ہیں لیکن اس نسبت کی حقیقت نہیں جان سکتے۔ اس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ ہم علم غیب نہیں جانتے اور خواب کی تعبیر قطعیت کے ساتھ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ خوابوں کی تعبیر کا علم انبیاء کو خاص طور پر عطا کیا جاتا ہے۔ ہمارے لیے صرف یہ ہے کہ ہم اچھے خواب سے بشارت حاصل کر سکتے ہیں۔ قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہمارے خواب پریشان خواب بھی ہو سکتے ہیں۔

اہل علم جب خواب دیکھیں تو وہ بھی ان سے بشارت ہی حاصل کریں۔ ان پر بنا نہ کریں بلکہ خوابوں پر زیادہ اعتماد بھی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ہم علم غیب کو نہیں جانتے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ اِسْحَاقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِي طَلْحَةَ عَنْ زُفَرَ بْنِ صَعْصَعَةَ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ اِذَا انْصَرَفَ مِنْ صَلَاةِ الْغَدَاةِ يَقُوْلُ هَلْ رَاٰى اَحَدٌ مِنْكُمْ اللَّيْلَةَ رُؤْيَا وَ يَقُوْلُ لَيْسَ يَبْقٰى بَعْدِي مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جب صبح کی نماز سے فارغ ہوتے تو پوچھتے کہ کیا تم میں سے کسی نے خواب دیکھا ہے اور یہ بھی فرماتے کہ علم نبوت میں سے میرے بعد رویائے صالحہ کے سوا اور کوئی چیز باقی نہیں رہی۔﴾

وضاحت :

چونکہ خواب علم نبوت کا ایک ذریعہ تھا اس لیے آپؐ صحابہ سے نماز فجر کے بعد پوچھتے کہ کیا کسی نے کوئی خواب دیکھا۔ اگر کوئی شخص اپنا خواب بیان کرتا تو آپ اس کی تعبیر بیان فرماتے۔ تعبیر کا علم بھی علوم نبوت میں سے ہے اس لیے آنحضرتؐ کی بیان کردہ تعبیر قابل اعتبار ہوتی۔ لیکن اب یہ معاملہ بہت مشکل ہو گیا ہے۔ تعبیر میں اختلاف ہوتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ صحابہؓ نے رویا کے ذریعے بڑے بڑے مسائل حل کیے ہیں۔ اذان کا مسئلہ رویا ہی سے حل ہوا۔ اذان کے الفاظ تو الہامی ہیں لیکن یہ رویا کے ذریعے ہی سے صحابہ کرام نے دیکھے اور اس طرح یہ ہم تک پہنچے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ ابْنِ يَسَارٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَنْ يَبْقٰى بَعْدِيْ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ ، فَقَالُوْا وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ يَرَاهَا الرَّجُلُ الصَّالِحُ اَوْ تُرٰى لَهُ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَ اَرْبَعِيْنَ جُزْاً مِنَ النُّبُوَّةِ

﴿عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد علم نبوت میں سے مبشرات کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہے گی۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ وہ مبشرات کیا ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ وہ اچھے خواب ہیں جو ایک نیک آدمی دیکھے یا کوئی دوسرا اس نیک آدمی کے بارے میں دیکھے۔ یہ نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔﴾

وضاحت :

رویائے صالحہ جو ایک نیک آدمی اپنے متعلق دیکھے یا دوسرے آدمی کے لیے دیکھے تو اس سے وہ اپنے لیے یا دوسرے شخص کے لیے خوشخبری حاصل کر سکتا ہے۔ وہ دوسرے آدمی سے کہہ سکتا ہے کہ مبارک ہو، میں نے آپ

کے متعلق یہ نیک خواب دیکھا، آپ بھی اس سے خوشی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن کسی خواب کے اعتبار پر کوئی دعوے کر دینا ایک غلط کام ہے۔ باقی رہ گیا اچھے خوابوں کا علم نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہونا تو اس سے ہم بس اس نسبت کو سمجھ سکتے ہیں جو نبوت اور اچھے خواب کی بشارت میں ہے۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا ہمارے اس میں نہیں۔

❐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ اَبِی سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّهٗ قَالَ: سَمِعْتُ اَبَا قَتَادَةَ بْنَ رِبْعِی يَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ مِنَ اللّٰهِ وَالْحُلْمُ مِنَ الشَّيْطَانِ فَاِذَا رَاٰى اَحَدُكُمُ الشَّیْءَ يَكْرَهُهٗ فَلْيَنْفُثْ عَنْ يَسَارِهٖ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ اِذَا اسْتَيْقَظَ وَلْيَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّهَا فَاِنَّهَا لَنْ تَضُرَّهٗ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ ، فَقَالَ اَبُو سَلَمَةَ اِنْ كُنْتُ لَاَرَى الرُّؤْيَا هِیَ اَثْقَلُ عَلَیَّ مِنَ الْجَبَلِ ، فَلَمَّا سَمِعْتُ هٰذَا الْحَدِيْثَ فَمَا كُنْتُ اُبَالِيْهَا۔

﴿ابو سلمہ بن عبدالرحمن کہتے ہیں کہ میں نے قتادہ بن ربعی سے سنا، وہ کہتے تھے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ اچھے خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور خواب پریشان شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں۔ تو جب تم میں سے کوئی ایسا خواب دیکھے جو ناگوار محسوس ہو تو اس کو چاہیے کہ جب اس کی آنکھ کھلے تو اس کے شر سے تین مرتبہ اللہ کی پناہ مانگ کر اپنی بائیں طرف تھوکے تو انشاء اللہ اس خواب کا کچھ نقصان نہ ہوگا۔ ابو سلمہ کہتے ہیں کہ پہلے میں کوئی خواب دیکھتا جو مجھ پر پہاڑ سے بھی بھاری ہوتا لیکن جب سے میں نے یہ حدیث سنی ہے تو میں ایسے خواب کی کچھ پروا نہیں کرتا۔﴾

وضاحت :

یہ روایت بخاری میں بھی ہے اور مسلم میں بھی۔ اللہ کی پناہ مانگنے کی بہترین دعا تو قرآن مجید کی آخری دو سورتیں ہیں لیکن نبی ﷺ سے اور ماثور کلمات بھی ہیں وہ آپ پڑھ سکتے ہیں۔ یہ دعائیں شیطان کو تیر کے طریقے سے لگتی ہیں اور وہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ابو سلمہ کا اپنا اثر یہ ہے کہ وہ اگر پہاڑ سے بھی بھاری خواب دیکھتے تو اس حدیث پر عمل کر کے بالکل بے خوف ہو جاتے تھے۔

❐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ فِیْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ: لَهُمُ

الْبُشْرٰى فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ. قَالَ هِیَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ يَرَاهَا الرَّجُلُ الصَّالِحُ اَوْ تُرٰى لَهٗ

﴿ہشام بن عروہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اس آیت "ان کے لیے بشارت ہے اس دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں" کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ رویائے صالحہ ہے جو ایک شخص دیکھے یا اس کے لیے کوئی دوسرا دیکھے۔﴾

وضاحت :

رویائے صالحہ اس آیت کے مطلب میں داخل کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس آیت کا موقع و محل بہت عظیم ہے۔ لہٰذا عروہ کا یہ قول اس آیت کی تاویل نہیں ہے بلکہ اس آیت کے عظیم مطالب میں سے ایک ذرہ قلیل وہ بھی ہے جو عروہ نے مراد لیا ہے۔ سورہ یونس کی آیت نمبر ۶۴ اور ضمیر ھم کا مرجع آیت نمبر ۶۲ و آیت ۶۳ میں دیکھیے تو اس کا موقع و محل واضح ہو جاتا ہے۔

مَاجَاءَ فِی النَّرْدِ

نرد کے بارے میں روایات

❐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُوْسٰى بْنِ مَيْسَرَةَ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ اَبِیْ هِنْدٍ عَنْ اَبِیْ مُوْسٰى الْاَشْعَرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنْ لَعِبَ بِالنَّرْدِ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ

﴿حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو لوگ نرد کھیلتے ہیں وہ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتے ہیں۔﴾

وضاحت :

نرد بساط، مہروں اور پانسے کے دانہ پر مشتمل کھیل ہے جسے دو آدمی میز یا تختہ پر کھیلتے ہیں۔ اس میں کامیابی یا ناکامی کا انحصار قسمت پر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے ساتھ جوا بھی وابستہ ہو گیا ہے۔ یہ کھیل ایران کے بادشاہ اردشیر کی

ایجاد ہے۔ وہیں سے یہ کھیل عرب میں پہنچا۔ نبی ﷺ نے اس کھیل کو اللہ اور رسول کی نافرمانی قرار دیا ہے۔

بے کاری کے دور میں لوگ وقت ضائع کرنے کے لیے اس طرح کے کھیل ایجاد کر لیتے ہیں اور ان سے شیطان کے بہت سے راستے نکلتے ہیں۔ نرد کی طرح کے کئی کھیل لوگوں میں مقبول ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ شیطان نے وقت ضائع کرنے کے ان سے زیادہ کارگر نسخے ایجاد نہیں کیے۔ اور اگر اس سے بھی زیادہ نکما کام کوئی ایجاد کیا ہے تو وہ کرکٹ کا کھیل ہے۔

انسان کے پاس وقت ایک بہت بڑی دولت ہے۔ جس نے اس کو ضائع کر دیا تو اس نے بہت کچھ ضائع کر دیا۔ سب انبیاء کی تعلیم یہی ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ وہ مومن کامیاب ہو گئے جو لغویات سے بچتے ہیں۔ لغو سے مراد ہر وہ چیز ہے جو آدمی کو اس کے مقصد حیات سے غافل کر دے۔ نرد، شطرنج، تاش اور کرکٹ سے زیادہ نکما کام اور کیا ہو گا۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ أَبِي عَلْقَمَةَ عَنْ أُمِّهِ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ بَلَغَهَا أَنَّ أَهْلَ بَيْتٍ فِي دَارِهَا كَانُوا سُكَّانًا فِيهَا وَعِنْدَهُمْ نَرْدٌ. فَأَرْسَلَتْ إِلَيْهِمْ لَئِنْ لَمْ تُخْرِجُوهَا لَأُخْرِجَنَّكُمْ مِنْ دَارِي وَأَنْكَرَتْ ذَلِكَ عَلَيْهِمْ.

﴿حضرت عائشہؓ کے متعلق یہ روایت ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ ان کے گھر میں ایک خاندان کے جو لوگ رہ رہے ہیں ان کے پاس نرد ہے تو انہوں نے ان کو پیغام بھجوایا کہ اگر تم لوگ نرد کے شیطان کو نہ نکالو گے تو میں تم کو اپنے گھر سے نکال دوں گی اور اس کو انہوں نے بہت ناگوار جانا۔﴾

وضاحت:

حضرت عائشہؓ لغویات کے گناہ ہونے سے آگاہ تھیں۔ انہوں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ ان کے مکان میں لغویات کا کاروبار ہوتا رہے۔ چنانچہ انہوں نے اس کے مکینوں کو پیغام بھجوایا کہ یا تو وہ نرد کو گھر سے باہر پھینکیں یا پھر مکان خالی کر دیں۔ موجودہ کرایہ داری قانون کے تحت تو آپ کچھ نہیں کر سکتے بلکہ اس سے بڑے بڑے جرائم بھی کریں تب بھی کچھ نہیں کر سکتے اور آج کل شطرنج، تاش اور کرکٹ تو کسی طور پر جرائم میں شامل نہیں بلکہ اکثریت کا

مشغلہ ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ ہمیں ان لغویات کی سنگینی کا مطلق احساس نہیں ہے۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّهُ كَانَ إِذَا وَجَدَ أَحَدًا مِنْ أَهْلِهِ يَلْعَبُ بِالنَّرْدِ ضَرَبَهُ وَكَسَرَهَا. قَالَ يَحْيَى وَسَمِعْتُ مَالِكًا يَقُولُ: لَا خَيْرَ فِي الشَّطْرَنْجِ وَكَرِهَهَا وَسَمِعْتُهُ يَكْرَهُ اللَّعِبَ بِهَا وَبِغَيْرِهَا مِنَ الْبَاطِلِ وَيَتْلُو هٰذِهِ الْآيَةَ: فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ.

﴿نافع رضی اللہ عنہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ ان کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے اہل و عیال میں سے کسی کو نرد کھیلتے دیکھتے تو اس کو مارتے اور نرد کو بھی توڑ دیتے تھے۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ انہوں نے امام مالک کا یہ فتویٰ سنا ہے کہ شطرنج میں کوئی خیر نہیں اور مالک اس کو بہت مکروہ کہتے اور وہ خود اس سے یا اس کے سوا کسی اور چیز سے کھیلنا باطل سمجھتے تھے اور یہ آیت پڑھتے تھے کہ "حق کے بعد سوائے ضلالت کے اور کیا ہے"۔﴾

وضاحت:

آج کل شطرنج کے ساتھ ایک فلسفہ بھی لگا دیا گیا ہے کہ چونکہ شطرنج کی بساط پر جنگ لڑی جاتی ہے جس میں منصوبہ بندی اور تدبیر کو بڑا دخل ہوتا ہے اس لیے یہ کھیل بہت ذہانت پیدا کرتا ہے۔ ذہانت اگر وقت کو ضائع کرنے کا نام ہے تو ٹھیک ہے ورنہ حماقت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب شطرنج کی بازی ہو رہی ہو تو گھنٹوں کے لیے بڑے سے بڑے نقصان اور بڑے سے بڑے خطرے سے آدمی بے پروا ہو جاتا ہے اور بڑے سے بڑے خیر کے لیے بھی حوصلہ نہیں کرتا۔ اس سے بڑھ کر خطرناک کیا چیز ہو سکتی ہے۔

شطرنج کو امام مالک کا مکروہ جاننا حرمت کے قریب قریب ہے اس لیے کہ مالکیہ اگر تعریف کریں تو کہتے ہیں کہ "احب الی" مجھے یہ پسند ہے اور اگر خلاف ہوں تو کہتے ہیں "اکرہ ذالک" مجھے یہ ناگوار محسوس ہوتا ہے۔ ہمارے مولوی لوگوں کی طرح تحقیر و تحریم پر نہیں آتے۔ جو آیت امام صاحب نے نقل کی ہے اس سے دو بات بھی نکلتی ہے جو امام صاحب کہنا چاہتے ہیں۔ اس کھیل کے ضلالت ہونے میں کیا شبہ ہے۔

اَلْعَمَلُ فِی السَّلَامِ

سلام کرنے کا طریقہ

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: يُسَلِّمُ الرَّاكِبُ عَلَى الْمَاشِی، وَ اِذَا سَلَّمَ مِنَ الْقَوْمِ اَحَدٌ اَجْزَاَ عَنْهُمْ.

﴿زید بن اسلم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سوار کو چاہیے کہ وہ پیدل چلنے والے کو سلام کرے اور جب گروہ میں سے کسی ایک نے سلام کر دیا تو وہ سارے گروہ کی طرف سے کافی ہو جائے گا۔﴾

وضاحت :

اس روایت کے دو جزو ہیں۔ پہلا تو یہ ہے کہ اگر آپ گھوڑے پر یا موٹر پر سوار ہوں تو آپ کو سلام میں پہل کرنی چاہیے۔ رعونت آپ پر سوار نہ ہو کہ میں پیدل چلنے والے کو پہلے سلام کیوں کروں۔ اور واقعی سلام کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ اس ہاتھ اٹھا دیا بلکہ جہاں بھی موقع ہو سلام کرے۔ اس لیے کہ جو لوگ سوار ہوتے ہیں وہ اس خبط میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ میرے جیسا اس روئے زمین پر کوئی نہیں۔ اس خناس کو نکالنے کے لیے یہ بہترین نسخہ ہے کہ آدمی دوسروں کو سلام کر دے۔ اس سے طبیعت میں تواضع اور فروتنی پیدا ہو جائے گی۔ آدمی کے استکبار کو ضرب لگتی ہے۔ اس معاملے میں شرمیلا پن بھی نہیں ہونا چاہیے۔

دوسری بات آنحضرت ﷺ نے یہ فرمائی کہ گروہ میں سے ایک کا سلام کرنا سب کے لیے کافی ہو گا اور اگر جواب دینے والوں میں سے کسی ایک نے جواب دے دیا تو وہ بھی سب کی طرف سے ہو جائے گا۔ یہ بھی ہوئی عمومی بات ہے کہ سلام کرنے کے لیے بھی ایک آدمی کو امام بنا لیا جائے۔ زندگی امام کے بغیر کبھی نہیں گزرنی چاہیے۔ اسی طرح مصافحہ بھی اگر ایک آدمی کرلے تو سب کے لیے کافی ہو گا۔

یہ روایت اگرچہ مرسل ہے لیکن معنی کے لحاظ سے ٹھیک ہے کیونکہ ایسی بات نبی ﷺ ہی فرما سکتے ہیں۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ وَهْبِ بْنِ كَيْسَانَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَطَاءٍ اَنَّهُ قَالَ: كُنْتُ

جَالِسًا عِنْدَ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ فَدَخَلَ عَلَيْهِ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ الْيَمَنِ فَقَالَ : اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهُ، ثُمَّ زَادَ شَيْئًا مَعَ ذَالِكَ اَيْضًا. قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَهُوَ يَوْمَئِذٍ قَدْ ذَهَبَ بَصَرُهُ مَنْ هٰذَا؟ قَالُوْ هٰذَا الْيَمَانِیُّ الَّذِی يَغْشَاكَ فَعَرِّفُوْهُ اِيَّاهُ. قَالَ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ اِنَّ السَّلَامَ انْتَهٰى اِلَى الْبَرَكَةِ. قَالَ يَحْيٰى سُئِلَ مَالِكٌ هَلْ يُسَلَّمُ عَلَى الْمَرْاَةِ، فَقَالَ اَمَّا الْمُتَجَالَّةُ فَلَا اَكْرَهُ ذَالِكَ وَ اَمَّا الشَّابَّةُ فَلَا اُحِبُّ ذَالِكَ.

﴿محمد بن عطاء سے روایت ہے کہ میں عبداللہ بن عباسؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اہل یمن میں سے ایک آدمی آیا تو اس نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا۔ پھر اس کے ساتھ کچھ اور الفاظ بھی بڑھا دیے۔ ابن عباس اس زمانہ میں نابینا ہو چکے تھے۔ انہوں نے پوچھا یہ کون ہے تو لوگوں نے کہا کہ ایک یمنی ہیں جو آپ سے ملنے کو آئے ہیں۔ ان کا تعارف کرایا گیا تو ابن عباس نے کہا کہ سلام کی آخری حد برکت تک ہے۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ امام مالک سے پوچھا گیا کہ کیا عورت کو سلام کرنا چاہیے تو انہوں نے کہا کہ بوڑھی کو کر دیا جائے تو میں اسے مکروہ نہیں سمجھتا لیکن جوان عورت کو سلام کرنا میں پسند نہیں کرتا۔﴾

وضاحت :

حضرت ابن عباسؓ کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہہ دیا تو اس پر مزید کسی اضافہ کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ سلامتی، رحمت اور برکت کی دعا کے بعد اور کیا چاہیے۔ میرے نزدیک السلام علیکم خود ہی ایک مکمل دعا ہے۔ اللہ رب العزت اہل جنت کے لیے یہی لفظ استعمال کریں گے۔ نبی ﷺ انہی لفظوں سے مسلمانوں کو سلام کرتے تھے۔ اس دور میں اگر کسی کو خالی السلام علیکم لکھیں یا کہیں یا جواب میں صرف وعلیکم السلام کہیں تو اسے بالکل ناکافی سمجھا جاتا ہے۔

عورتوں کو سلام کرنے کے بارے میں امام مالک کا فتویٰ ٹھیک ہے۔ لیکن میرے نزدیک جوان عورت کو بھی سلام کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ وہ جواب نہ دینا چاہے گی تو نہیں دے گی یا اشارہ سے دے گی۔ بوڑھیوں کو سلام کرنے میں بالکل کچھ حرج نہیں۔ یہ تو کسی کو دعا دینا ہے۔

مَاجَاءَ فِي السَّلَامِ عَلَى الْيَهُوْدِيِّ وَ النَّصْرَانِيِّ

کسی یہودی اور نصرانی کو سلام کرنے کے بارے میں

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِيْنَارٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الْيَهُوْدَ اِذَا سَلَّمَ عَلَيْكُمْ اَحَدُهُمْ فَاِنَّمَا يَقُوْلُ السَّامُ عَلَيْكُمْ ، فَقُلْ عَلَيْكَ. قَالَ يَحْيٰى وَ سُئِلَ مَالِكٌ عَمَّنْ سَلَّمَ عَلَى الْيَهُوْدِيِّ اَوِ النَّصْرَانِيِّ هَلْ يُسْتَقِيْلُهٗ ذَالِكَ؟ فَقَالَ لَا.

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہود میں سے جب کوئی تم کو سلام کرتا ہے تو وہ کہتا ہے السام علیکم۔ تم جواب میں صرف 'علیک' کہہ دیا کرو۔﴾

یحییٰ کہتے ہیں کہ امام مالکؒ سے فتویٰ پوچھا گیا کہ جو شخص یہودی یا نصرانی کو سلام کے تو کیا اس کو ایسا کہنا چاہیے۔ تو انہوں نے کہا کہ نہیں۔

وضاحت :

مدینہ کے شریر یہودیوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ جب مسلمانوں کو سلام کرتے تو بظاہر وہ مسلمانوں کے طریقہ پر السلام علیکم کہتے لیکن الفاظ ادا کرنے میں سلام میں سے حرف لام نہ لیتے بلکہ السام علیکم کہتے۔ سام کا لفظ موت کے معنی میں آتا ہے۔ گویا یہود سلامتی کی دعا دینے کے بجائے سلام کو بددعا کا کلمہ بنا دیتے۔ ایسے شریروں کے حوالہ سے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم جواب میں محض 'علیکم' کہہ دیا کرو تاکہ یہ بددعا یہودی پر لوٹ جائے۔

اس روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ غیر مسلموں کے ساتھ سلام کے بارے میں کیا کلیہ ہے۔ سلام کے بہت سے پہلو ہیں۔ سلام اجازت طلب کرنے کے لیے بھی کیا جاتا ہے، سلام کسی پر محض اعتماد کے اظہار کے لیے بھی ہوتا ہے کہ ہم اپنے ہی آدمی ہیں۔ اور سلام غیر مقدم کے لیے بھی ہے۔ غیر مقدم مسلم اور غیر مسلم دونوں کا ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ اگر تم کو کوئی سلام کے ذریعہ کہے کہ "لست مومنا" (تم مومن نہیں ہو) حالانکہ یہ ممکن ہے کہ آپ نہ جانتے ہوں اور وہ کافر ہی ہو۔ وہ کچھ بھی ہو اگر اس نے سلام کیا ہے تو اس کا جواب دینا چاہیے۔ جواب دینے سے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا جو مذہب ہے میرے نزدیک وہ مضبوط ہے

یعنی سلام کا جواب دینا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ "ردوها" یعنی سلام کا جواب ضرور دو۔ اور یہ وجوب ہر حال میں ضروری ہے۔

ایک اسلامی ملک میں کچھ لوگ ذمی بھی ہوں گے اور اہل صلح یا معاہد بھی ہوں گے۔ اگر آپ کو وہ سلام کہیں تو کیا آپ منہ پھیر لیں گے۔ یہ کوئی مہذب طریقہ تو نہیں۔ سلام کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم اور آپ ایک ہیں، ایک ہی ملک کے شہری ہیں، دوست ہیں، دشمن نہیں ہیں۔ باہر کے لوگوں سے جب ملیں گے تو کیا کہیں گے کہ ہم سلام نہیں کرتے؟ منہ بنائے رہتے ہیں۔ آپ غیر مقدم کے لیے انگریزی میں گڈ مارننگ کہہ دیں گے لیکن فائدہ کیا ہوگا۔ سلام تو وہ بھی ہوگا۔ سلام میں دعا کا پہلو ہے۔ عربوں میں بھی پہلے وہی تھا جو انگریزی میں ہے۔ اسلام نے آ کر یہ تبدیلی کی کہ اس میں برکت کا اضافہ کر دیا۔ لہٰذا میرے نزدیک آپ سب کو سلام کر سکتے ہیں۔ یہ مشہور تعارف ہے، اظہار اعتماد ہے اور آپ کو اطمینان دلاتا ہے کہ ہم اور آپ دوست ہیں، دشمن نہیں۔

جَامِعُ السَّلَامِ

سلام کے بارے میں جامع باب

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ اِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِي طَلْحَةَ عَنْ اَبِي مُرَّةَ مَوْلٰى عَقِيْلِ بْنِ اَبِي طَالِبٍ عَنْ اَبِي وَاقِدٍ اللَّيْثِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بَيْنَمَا هُوَ جَالِسٌ فِي الْمَسْجِدِ وَالنَّاسُ مَعَهٗ اِذَا قَبْلَ نَفَرٌ ثَلَاثَةٌ، فَاَقْبَلَ اثْنَانِ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَ ذَهَبَ وَاحِدٌ، فَلَمَّا وَقَفَا عَلٰى مَجْلِسِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ سَلَّمَا، فَاَمَّا اَحَدُهُمَا فَرَاٰى فُرْجَةً فِي الْحَلْقَةِ فَجَلَسَ فِيْهَا، وَ اَمَّا الْاٰخَرُ فَجَلَسَ خَلْفَهُمْ، وَ اَمَّا الثَّالِثُ فَاَدْبَرَ ذَاهِبًا ، فَلَمَّا فَرَغَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اَلَا اُخْبِرُكُمْ عَنِ النَّفَرِ الثَّلَاثَةِ: اَمَّا اَحَدُهُمْ فَاٰوٰى اِلَى اللّٰهِ فَاٰوَاهُ اللّٰهُ ، وَ اَمَّا الْاٰخَرُ فَاسْتَحْيٰى فَاسْتَحْيَى اللّٰهُ مِنْهُ، وَ اَمَّا الْاٰخَرُ فَاَعْرَضَ فَاَعْرَضَ اللّٰهُ عَنْهُ.

﴿ابو واقد لیثی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے اور لوگ آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ تین آدمی آئے۔ ان میں سے دو تو رسول اللہ ﷺ کے قریب ہو گئے اور ایک چلا گیا۔ جب وہ دونوں مجلس کے قریب گئے تو دونوں نے سلام کیا۔ ان میں سے ایک نے حلقہ کے اندر

کچھ گنجائش پائی تو بیٹھ گیا۔ دوسرا لوگوں کے پیچھے بیٹھ گیا۔ رہا تیسرا تو وہ وہاں سے چلا گیا۔ رسول اللہ ﷺ جب فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ میں ان تینوں کا ماجرا تم کو بتاؤں۔ ایک نے اللہ کی پناہ لی تو اللہ نے اس کو پناہ دی۔ دوسرا شرمایا تو اللہ نے اس کی لاج رکھ لی۔ رہا تیسرا تو اس نے منہ موڑ لیا تو اللہ نے بھی اس سے بے رخی کی۔﴾

وضاحت:

اتنی مبارک مجلس میں آکر اتنی اکڑفوں نہیں دکھانی چاہیے کہ جگہ تو ہے نہیں، واپس ہی چلے جاتے ہیں۔ جہاں گنجائش ملے وہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ اگر گھس کر بیٹھنے کا موقع نہیں ملتا تو پیچھے ہی بیٹھ جائیں۔ اور نہیں تو کھڑے کھڑے ہی سن لیں۔ مجلس میں آنے والے تین قسم میں کا ذکر یہ الگ الگ تھا جس پر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ایک نے راستہ نکالنا چاہا تو اللہ نے اس کے لیے راستہ نکال دیا۔ ایک شرماشرمی سے پیچھے بیٹھ گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی لاج رکھ لی۔ اور تیسرا اپنے گھمنڈ میں واپس چلا گیا تو اللہ نے بھی اس کو رد کر دیا۔ مجلسی تعلیم کے لحاظ سے یہ بہت بڑی رہنمائی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب جماعتی زندگی کا معاملہ ہوتا ہے تو ہر جگہ اپنی شان نہیں بگھاری جاتی۔ دب کر بھی رہنا پڑتا ہے۔ انکساری میں بھی شان ہوتی ہے۔ اسلام مسلمانوں کے اندر یہ انداز فکر پیدا کرنا چاہتا ہے۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ إِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّهُ سَمِعَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ وَسَلَّمَ عَلَيْهِ رَجُلٌ فَرَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ، ثُمَّ سَأَلَ عُمَرُ الرَّجُلَ كَيْفَ أَنْتَ؟ فَقَالَ أَحْمَدُ اللّٰهَ إِلَيْكَ فَقَالَ عُمَرُ ذَالِكَ الَّذِي أَرَدْتُ مِنْكَ.

﴿انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عمر بن خطابؓ کو سنا کہ ایک شخص نے ان کو سلام کیا تو انہوں نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ آپ کیسے ہو، تو اس نے کہا کہ میں آپ کے سامنے اپنے رب کا شکر گزار ہوں۔ تو آپ نے فرمایا مجھے آپ سے یہی توقع تھی۔﴾

وضاحت:

'یہی توقع تھی' کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ اچھے ہی رہے ہوں گے لیکن اس سے زیادہ باریک یہ بات بھی ہو سکتی ہے کہ مجھے یہی توقع تھی کہ آپ یہی جواب دیں گے۔ اس لیے کہ یہ جواب عالمانہ اور عارفانہ ہے کہ

میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اچھا ہوں۔ میرے نزدیک یہی مطلب زیادہ ٹھیک ہے۔ خواہ مخواہ میں اپنا دکھ درد لے کر نہیں بیٹھ جانا چاہیے۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ إِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ أَنَّ الطُّفَيْلَ ابْنَ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ كَانَ يَأْتِي عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ فَيَغْدُوْ مَعَهُ إِلَى السُّوقِ قَالَ فَإِذَا غَدَوْنَا إِلَى السُّوقِ لَمْ يَمُرَّ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ عَلَى سَقَّاطٍ وَلَا صَاحِبِ بَيْعَةٍ وَلَا مِسْكِيْنٍ وَلَا أَحَدٍ إِلَّا سَلَّمَ عَلَيْهِ، قَالَ الطُّفَيْلُ فَجِئْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ يَوْمًا فَاسْتَتْبَعَنِي إِلَى السُّوقِ فَقُلْتُ لَهُ وَمَا تَصْنَعُ فِي السُّوقِ وَأَنْتَ لَا تَقِفُ عَلَى الْبَيْعِ وَلَا تَسْأَلُ عَنِ السِّلَعِ وَلَا تَسُوْمُ بِهَا وَلَا تَجْلِسُ فِي مَجَالِسِ السُّوقِ، قَالَ وَأَقُوْلُ اجْلِسْ بِنَا هٰهُنَا نَتَحَدَّثْ، قَالَ فَقَالَ لِي عَبْدَاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ يَا أَبَا بَطْنٍ وَكَانَ الطُّفَيْلُ ذَا بَطْنٍ إِنَّمَا نَغْدُوْ مِنْ أَجْلِ السَّلَامِ نُسَلِّمُ عَلَى مَنْ لَقِينَا.

﴿طفیل بن ابی بن کعب روایت کرتے ہیں کہ وہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں آیا کرتے تو وہ ان کو ساتھ لے کر بازار نکل جایا کرتے۔ طفیل کہتے ہیں کہ جب ہم بازار کی طرف چلتے تو عبداللہ بن عمر کا گزر جس دکاندار، جس کسی بیچنے والے اور جس مسکین پر ہوتا اور جو شخص بھی سامنے آتا وہ اس کو سلام کرتے۔ طفیل کہتے ہیں کہ میں ایک روز عبداللہ بن عمر کے پاس آیا تو انہوں نے مجھے بازار جانے کے لیے ساتھ لگا لیا۔ تو میں نے کہا حضرت، آپ بازار میں کیا لینے جاتے ہیں جب کہ آپ کسی جگہ خریدنے کے لیے رکتے نہیں، کسی جگہ مول بھاؤ نہیں کرتے، کسی جگہ آپ خرید و فروخت نہیں کرتے اور نہ مجالس بازار میں سے کسی جگہ آپ بیٹھتے ہیں۔ میں نے کہا یہیں تشریف رکھیے بات چیت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا اے حضرت پیٹ صاحب (طفیل بن ابی کا پیٹ بہت بڑا تھا) سن لو کہ ہم بازار میں اس لیے جاتے ہیں کہ ہر اس شخص کو سلام کریں جو ہم کو مل جائے۔﴾

وضاحت:

یہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا خاص ذوق تھا کہ وہ نیکی کمانے کی غرض سے بازار کو نکل جاتے۔ آپ لوگ اس مقصد کے لیے بازار نہ بھی جائیں لیکن جب جائیں تو یہ کرنا چاہیے کہ لوگوں کو سلام کریں۔ اس زمانے میں یہ چیز بالکل ختم ہو گئی ہے۔ صرف تعارف کے ساتھ سلام رہ گیا ہے۔ باقی مسلمانوں کے لیے سلام کا طریقہ بالکل ختم ہو گیا

ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق معلوم ہے کہ ان کی طبیعت میں ان معاملات میں بہت زیادہ تکلف تھا۔ وہ نیکی کے دلدادہ آدمی تھے۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ اَنَّ رَجُلًا سَلَّمَ عَلَى عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَيْكَ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهٗ وَالْغَادِيَاتُ وَ الرَّائِحَاتُ، فَقَالَ لَهٗ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ وَ عَلَيْكَ اَلْفَ ثُمَّ كَاَنَّهٗ كَرِهَ ذَالِكَ.

﴿یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عبداللہ بن عمرؓ کو یوں سلام کیا کہ آپ پر سلامتی، اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں اور صبح کو آنے والی اور رات کو آنے والی تمام فضیلتیں آپ کو حاصل ہوں۔ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ آپ کے اوپر بھی ہزاروں ہزاروں ہوں۔ معلوم ہوتا تھا کہ آپ نے اس سے ناگواری کا اظہار کیا۔﴾

وضاحت:

اگرچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق گمان تو یہ تھا کہ انہیں خوش ہونا چاہیے تھا لیکن انہوں نے بھی سلام کے الفاظ پر اس قسم کی زیادتی کو برداشت نہیں کیا۔ معلوم ہوا کہ السلام علیکم کہنا ہی کافی ہے۔ اس پر اگر اضافہ کیا جائے تو ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کا ہونا چاہیے اور بس۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اِذَا دَخَلَ الْبَيْتَ غَيْرُ الْمَسْكُوْنِ يُقَالُ السَّلَامُ عَلَيْنَا وَ عَلٰى عِبَادِاللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ.

﴿امام مالکؒ سے روایت ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ جب ایسی جگہ جائیں جہاں مکان خالی ہو جب بھی یہ کہہ دیں کہ ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر سلام۔﴾

وضاحت:

سلام اصل میں دعا ہے اور کوئی موقع دعا سے خالی نہیں جانا چاہیے۔ اللہ کو ہر وقت یاد رکھنا اور اس کی رحمت طلب کرنا ایک بابرکت کام ہے۔

بَابُ الْاِسْتِئْذَانِ

اجازت لینے کے بارے میں باب

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَيْمٍ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ سَاَلَهٗ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَسْتَاْذِنُ عَلٰى اُمِّيْ؟ فَقَالَ نَعَمْ. قَالَ الرَّجُلُ اِنِّيْ مَعَهَا فِي الْبَيْتِ، وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَسْتَاْذِنْ عَلَيْهَا فَقَالَ الرَّجُلُ اِنِّيْ خَادِمُهَا، فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَسْتَاْذِنْ عَلَيْهَا اَتُحِبُّ اَنْ تَرَاهَا عُرْيَانَةً؟ قَالَ لَا. قَالَ فَاسْتَاْذِنْ عَلَيْهَا.

﴿عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک شخص نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کیا میں اپنی ماں سے بھی اجازت لے کر گھر میں داخل ہوا کروں؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ اس نے کہا کہ میں تو اس کے ساتھ گھر میں رہتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تاہم اجازت لو۔ اس آدمی نے کہا کہ میں تو اس کا خادم ہوں۔ آپؐ نے فرمایا تو ہاں، اس کے باوجود اجازت لو۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ان کو کبھی ننگا دیکھو؟ اس نے کہا نہیں، آپ نے فرمایا تو پھر اجازت لو۔﴾

وضاحت:

آدمی کے بار بار سوال کرنے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اب اس ہدایت کی علت بیان کرنی پڑے گی تو نبی ﷺ نے علت بیان کر دی کہ ہو سکتا ہے کہ کسی ضرورت سے والدہ نے کپڑے اتارے ہوں اور آپ دندناتے ہوئے گھر میں آ جائیں۔ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو عریاں دیکھنا تو پسند نہیں کرتا۔ گھر میں داخلہ کے یہ بڑے ضروری آداب میں سے ہے۔ گھر میں صرف ایک ہی خاتون ہو خواہ وہ ماں ہی ہو تب تو اور بھی احتیاط کرنی چاہیے کیونکہ یہ سمجھ کر کہ گھر میں کوئی اور تو ہے نہیں وہ کسی ضرورت میں ہو اور آپ دندناتے ہوئے پہنچ جائیں تو یہ ٹھیک نہیں ہے۔

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ الثِّقَةِ عِنْدَهٗ عَنْ بُكَيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الْاَشَجِّ عَنْ بُسْرِ بْنِ سَعِيْدٍ

عَنْ اَبِی سَعِیدِ الْخُدْرِیِّ عَنْ اَبِی مُوسَی الْاَشْعَرِیِّ اَنَّهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اَلْاِسْتِئْذَانُ ثَلَاثٌ. فَاِنْ اُذِنَ لَكَ فَادْخُلْ وَاِلَّا فَارْجِعْ.

﴿ابو موسیٰ اشعری روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی کے گھر میں داخلہ کی اجازت تین مرتبہ مانگی جائے۔ اگر اجازت مل جائے تو داخل ہو جاؤ ورنہ لوٹ جاؤ۔﴾

وضاحت:

یہ تین مرتبہ تاکید کے لیے ہے اور روزمرہ کی ضروریات کے لیے یہ عدد کافی ہے۔ اس روایت میں ذکر نہیں لیکن دوسری روایت میں آیا ہے کہ تین مرتبہ السلام علیکم کہہ کر اجازت لینی چاہیے۔ اگر ایک مرتبہ جواب نہ ملے تو دوبارہ کرلے۔ پھر بھی نہیں تو تیسری مرتبہ کرے۔ ہو سکتا ہے کہ گھر میں کوئی مصروفیت ہو یا کوئی جواب دینے والا نہ ہو تو تین مرتبہ کے بعد لوٹ جائے۔

☐ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ رَبِیعَةَ بْنِ اَبِی عَبْدِالرَّحْمٰنِ عَنْ غَیْرِ وَاحِدٍ مِنْ عُلَمَاءِ هِمْ اَنَّ اَبَا مُوسَی الْاَشْعَرِیَّ جَاءَ یَسْتَاْذِنُ عَلَی عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَاسْتَاْذَنَ ثَلَاثًا ثُمَّ رَجَعَ فَاَرْسَلَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فِی اَثَرِهٖ ، فَقَالَ مَالَكَ لَمْ تَدْخُلْ فَقَالَ اَبُو مُوسَی سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ یَقُولُ اَلْاِسْتِئْذَانُ ثَلَاثٌ فَاِنْ اُذِنَ لَكَ فَادْخُلْ وَ اِلَّا فَارْجِعْ، فَقَالَ عُمَرُ وَمَنْ یَعْلَمُ هٰذَا لَئِنْ لَمْ تَاْتِنِی بِمَنْ یَعْلَمُ ذَالِكَ لَاَفْعَلَنَّ بِكَ كَذَا وَ كَذَا فَخَرَجَ اَبُو مُوسَی حَتّٰی جَاءَ مَجْلِسًا فِی الْمَسْجِدِ یُقَالُ لَهٗ مَجْلِسُ الْاَنْصَارِ ، فَقَالَ اِنِّی اُخْبِرْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اَنِّی سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ یَقُولُ اَلْاِسْتِئْذَانُ ثَلَاثٌ فَاِنْ اُذِنَ لَكَ فَادْخُلْ وَ اِلَّا فَارْجِعْ، فَقَالَ لَئِنْ لَمْ تَاْتِنِی بِمَنْ یَعْلَمُ هٰذَا لَاَفْعَلَنَّ بِكَ كَذَا وَ كَذَا فَاِنْ كَانَ سَمِعَ ذَالِكَ اَحَدٌ مِنْكُمْ فَلْیَقُمْ مَعِی، فَقَالُوا لِاَبِی سَعِیدِ الْخُدْرِیِّ قُمْ مَعَهٗ، وَ كَانَ اَبُو سَعِیدٍ اَصْغَرَهُمْ فَقَامَ مَعَهٗ فَاَخْبَرَ بِذَالِكَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ، فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لِاَبِی مُوسَی اَمَا اِنِّی لَمْ اَتَّهِمْكَ وَلٰكِنْ خَشِیتُ اَنْ یَتَقَوَّلَ النَّاسُ عَلَی رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ.

﴿ربیعہ بن عبدالرحمٰن متعدد علماء سے راوی ہیں کہ ابو موسیٰ اشعری حضرت عمرؓ کے دروازے پر اجازت لینے آئے تو تین مرتبہ اجازت مانگ کر لوٹ گئے۔ حضرت عمرؓ نے ان کے پیچھے آدمی دوڑایا اور پوچھا کہ آپ گھر میں داخل کیوں نہ ہوئے۔ ابو موسیٰ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ اجازت طلب کرنا تین مرتبہ ہے۔ اگر اجازت مل جائے تو داخل ہو جاؤ ورنہ لوٹ جاؤ۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اور کون آپ کی اس بات کو جانتا ہے۔ اگر تم کوئی دوسرا جاننے والا نہ لائے تو پھر میں تمہارے ساتھ ایسا ویسا کروں گا۔ حضرت ابو موسیٰ نکلے تو مسجد میں انصار کی مجلس تھی۔ ان سے کہا کہ میں نے حضرت عمر بن خطابؓ کو بتایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ اجازت تین مرتبہ ہے۔ اگر اجازت مل جائے تو داخل ہو جاؤ ورنہ لوٹ جاؤ۔ حضرت عمرؓ نے مجھ سے کہا ہے کہ اگر تم کوئی اور اس کا جاننے والا نہ لاؤ گے تو میں تمہاری اچھی طرح خبر لوں گا۔ اگر تم میں سے کسی نے یہ حکم سنا ہو تو میرے ساتھ چلے۔ لوگوں نے ابو سعید خدری سے کہا کہ آپ جائیں اور وہ ان سب سے چھوٹے تھے۔ وہ ان کے ساتھ گئے اور حضرت عمرؓ کو بتایا۔ حضرت عمرؓ نے ابو موسیٰ سے کہا کہ میں نے تم کو جھوٹا نہیں خیال کیا تھا بلکہ میں اس بات سے ڈرا کہ کہیں لوگ رسول اللہ ﷺ کی طرف جھوٹی باتیں منسوب نہ کرنے لگیں۔﴾

وضاحت:

اس روایت کے ہوتے ہوئے شوافع کا یہ مذہب کہ خبر واحد حجت ہے کس طرح صحیح ہے؟ اگر خبر واحد حجت تھی تو حضرت عمرؓ یہ کیوں کہتے کہ میں تمہاری خبر لوں گا اگر کوئی دوسرا جاننے والا نہ لائے۔ تو معلوم ہوا کہ خبر واحد میں شبہات کے بہت سے امکانات ہیں۔ اب یہاں تو راوی بہت ثقہ ہیں لیکن حضرت عمرؓ نہ مانے اور اس کی علت بھی بتادی کہ میں نے احتیاط کی ہے کہ لوگ آنحضرت ﷺ کی طرف جھوٹ روایات نہ منسوب کریں۔ معلوم ہوا کہ خبر واحد میں بڑے خطرے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے ہاں اتنی احتیاط ہے لیکن امام شافعی کو اتنی شدت سے خبر واحد پر اصرار ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس میں بڑے اندیشے ہیں۔ اس بارے میں امام شافعی کی دلیلیں بھی بہت کمزور ہیں۔

اَلتَّشْمِيْتُ فِي الْعُطَاسِ

چھینک آنے پر دعائیہ کلمات کہنے کے بارے میں

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِي بَكْرٍ عَنْ اَبِيهِ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِنْ عَطَسَ فَشَمِّتْهُ ثُمَّ اِنْ عَطَسَ فَشَمِّتْهُ ثُمَّ اِنْ عَطَسَ فَشَمِّتْهُ ثُمَّ اِنْ عَطَسَ فَقُلْ اِنَّكَ مَضْنُوكٌ" فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ اَبِي بَكْرٍ لَا اَدْرِي اَبَعْدَ الثَّالِثَةِ اَوِ الرَّابِعَةِ.

﴿عبداللہ اپنے باپ ابوبکر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کسی کو چھینک آئے تو تم تشمیت کرو۔ پھر چھینک آئے تو تشمیت کرو۔ پھر چھینک آئے تو تشمیت کرو۔ پھر چھینک آئے تو کہو کہ آپ کو زکام ہے۔ عبداللہ کہتے ہیں کہ یہ نہیں معلوم کہ تیسری چھینک پر یہ کہے کہ آپ کو زکام ہے یا چوتھی پر۔﴾

وضاحت :

تشمیت کے معنی کوئی دعائیہ کلمہ کہنا ہے کہ اللہ آپ کو ہر تکلیف سے محفوظ رکھے۔ تشمیت کی ایک معین شکل یہ ہے کہ اگر کسی کو چھینک آئے اور وہ الحمد للہ کہے تو آپ یرحمک اللہ (اللہ آپ پر رحم فرمائے) کہیں۔ ایسا کہنا مسنون ہے۔ میرے خیال میں یہ بات بھی تکلف ہے کہ اگر چھینکنے والا الحمد للہ نہ کہے تب بھی آپ یرحمک اللہ کہہ دیں تو کوئی حرج نہیں تاکہ اس کو یاد دہانی ہو جائے۔ لیکن بعض لوگ یہ نہیں مانتے وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ خود الحمد للہ کہے تب تو یرحمک اللہ کہو ورنہ چپ رہو۔

روایت کی رو سے تین چھینک تک یرحمک اللہ کہنا چاہیے لیکن اگر سلسلہ جاری رہے تو یہ زکام کی علامت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زکام میں چھینک پر چھینک آتی ہے۔ ایسی صورت میں علاج کی طرف توجہ دلانی چاہیے۔ عام حالات میں چھینک دماغی کسل کو دور کرتی ہے۔ دماغ پر حالات حاوی ہو جاتے ہیں تو یہ ان کو دور کرتی ہے۔ ایک دو چھینک آنا صحت کی علامت ہے اور مسنون طریقہ یہ ہے کہ چھینکنے والا الحمد للہ کہے۔ جس اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرے کہ دماغ کے اوپر سے بوجھ دور ہوا۔ چھینکنے والے کے پاس موجود شخص کے لیے حکم یہ ہے کہ اپنے مسلمان

بھائی کے لیے یرحمک اللہ کہے یعنی یہ کہ اللہ تجھ پر رحم فرمائے اور اپنی امان میں رکھے۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ اِذَا عَطَسَ فَقِيلَ لَهُ يَرْحَمُكَ اللّٰهُ قَالَ يَرْحَمُنَا اللّٰهُ وَاِيَّاكُمْ وَيَغْفِرُ لَنَا وَلَكُمْ.

﴿نافع روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو جب چھینک آتی اور ان کو یرحمک اللہ کہا جاتا تو وہ کہتے کہ اللہ ہم پر بھی رحم کرے اور تم پر بھی اور وہ ہم کو بخش دے اور تمہیں بھی بخش دے۔﴾

وضاحت :

اس سے میرا مسلک ثابت ہو جاتا ہے کہ باوجود اس کے کہ چھینکنے والے نے الحمد للہ نہ کہا ہو لیکن اگر کوئی شخص یرحمک اللہ کہے تو دونوں کام اس طرح ہو جائیں گے کہ وہ یرحمنا اللہ کہہ کر اس کی تلافی کر دے۔ البتہ مسنون طریقہ وہی ہے جو پہلے بیان ہو چکا۔

مَاجَاءَ فِي الصُّوَرِ وَالتَّمَاثِيلِ

تصویروں اور مورتیوں کے بارے میں روایات

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ اِسْحَاقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ اَبِي طَلْحَةَ اَنَّ رَافِعَ بْنَ اِسْحَقَ مَوْلَى الشِّفَاءِ اَخْبَرَهُ قَالَ دَخَلْتُ اَنَا وَعَبْدُاللّٰهِ بْنُ اَبِي طَلْحَةَ عَلَى اَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ نَعُودُهُ فَقَالَ لَنَا اَبُو سَعِيدٍ اَخْبَرَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اَنَّ الْمَلَائِكَةَ لَا تَدْخُلُ بَيْتًا فِيهِ تَمَاثِيلُ اَوْ تَصَاوِيرُ شَكَّ اِسْحَقُ لَا يَدْرِي اَيَّتُهُمَا قَالَ اَبُو سَعِيدٍ الْخُدْرِيُّ.

﴿رافع بن اسحٰق جو شفا کے آزاد کردہ غلام ہیں خبر دیتے ہیں کہ میں اور عبداللہ بن ابی طلحہ ابوسعید خدری کی خدمت میں ان کی عیادت کے لیے حاضر ہوئے تو ابوسعید نے فرمایا کہ ہم کو رسول اللہ ﷺ نے خبر دی کہ ملائکہ اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں مورتیں یا تصویریں ہوں۔ اسحٰق کو شک ہے کہ ابوسعید نے دونوں میں سے کون سی چیز کا ذکر کیا۔﴾

❐ حدثني مالكٌ عن ابي النضر عن عُبيدِاللّٰه بن عبداللّٰه بن عُتبة بن مسعودٍ انّهٗ دخل على ابي طلحة الانصاريّ يعودهٗ قال فوجد عندهٗ سهل بن حنيف فدعا ابو طلحة انسانًا فنزع نمطًا من تحته فقال لهٗ سهلُ بن حنيف لِمَ تنزعهٗ قال لانّ فيه تصاوير و قد قال رسولُ اللّٰه ﷺ فيها ما قد علمتَ فقال سهلٌ الم يقل رسولُ اللّٰه ﷺ الّا ما كان رقمًا في ثوبٍ قال بلى ولكنهٗ اطيبُ لنفسي.

﴿عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ کہتے ہیں کہ وہ ابو طلحہ انصاری کے گھر ان کی عیادت کے لیے گئے۔ کہتے ہیں کہ وہاں سہل بن حنیف موجود تھے۔ ابو طلحہ نے ایک آدمی کو بلایا تو اس نے ایک قالین ان کے نیچے سے کھینچا۔ سہل بن حنیف نے ان سے پوچھا کہ اس کو کیوں کھینچ رہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ اس لیے کہ اس میں کچھ تصاویر ہیں اور تصاویر کے بارے میں جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ آپ کو معلوم ہی ہے۔ سہل نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا یہ نہیں فرمایا کہ اگر وہ بناوٹ میں بنی ہوئی ہوں تو وہ مستثنیٰ ہیں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ یہ بات تو ہے لیکن میں اپنے لیے یہی پسند کرتا ہوں۔﴾

❐ حدثني مالكٌ عن نافعٍ عن القاسم بن محمدٍ عن عائشة زوج النبيّ ﷺ انّها اشترت نُمرُقة فيها تصاويرُ فلمّا رآها رسولُ اللّٰه ﷺ قام على الباب فلم يدخل فعرفتْ في وجهه الكراهية وقالتْ يا رسولَ اللّٰه اتوبُ الى اللّٰه و الى رسولهٖ فماذا اذنبتُ فقال رسولُ اللّٰه ﷺ فما بالُ هذه النُمرُقة قالت اشتريتُها لك تقعدُ عليها وتوسّدُها فقال رسولُ اللّٰه ﷺ انّ اصحاب هذه الصُوَر يعذّبون يوم القيامة يُقالُ لهم احيُوا ما خلقتُم ثمّ قال انّ البيت الذي فيه الصُوَرُ لا تدخلهُ الملائكة.

﴿قاسم بن محمد حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک قالین خریدا جس میں تصویریں تھیں۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اس کو دیکھا تو دروازے پر ٹھٹک گئے اور اندر داخل نہ ہوئے۔ حضرت عائشہؓ نے آپ کے چہرے پر ناگواری محسوس کر کے کہا کہ میں اللہ کی طرف اور اس

کے رسول کی طرف رجوع کرتی ہوں۔ میں نے کیا گناہ کیا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس قالین کا کیا معاملہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اسے خریدا کہ آپ اس پر بیٹھیں گے اور ٹیک لگائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ان تصویروں والے قیامت کے روز عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے۔ ان سے کہا جائے گا کہ اس کو زندہ کرو جو تم نے پیدا کیا ہے۔ پھر فرمایا کہ وہ گھر جس میں صورتیں ہوں فرشتے اس میں داخل نہیں ہوتے۔﴾

وضاحت :

یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس زمانے میں فوٹو کا کوئی وجود نہ تھا۔ دو ہی چیزیں تھیں۔ لوگ مٹی، تانبے، پیتل، چاندی یا پتھر کی مورتیں بناتے جن کو تماثیل کہتے ہیں یا خاکے اور تصویریں بناتے تھے۔ یہ ساری چیزیں ان کے متعلق ہوتی تھیں جن کو لوگ پوجتے تھے۔ بت پرستی کے لیے ان کو وہ گھروں میں رکھتے اور ان کو بہت عزیز جانتے تھے۔ انہی کے خاکے بھی بنتے تھے اور مورتیں بھی بنتی تھیں۔ اور یہ مختلف چیزوں مثلاً برتنوں پر اور گدے اور قالینوں پر بھی بنائی جاتیں۔ عمارتوں کی دیواروں اور چھتوں پر ملائکہ اور بزرگوں کی تصویریں بنانے کا رواج بھی رہا ہے۔ ان مورتوں اور تصاویر میں بت پرستی کا عنصر شامل ہونے کے باعث ان کے حرام ہونے میں شبہ کی کوئی وجہ نہیں۔

رہا حکم دوسری تصاویر کا تو اسلام میں ایسی چیزوں کی ممانعت بھی کر دی جاتی ہے جو کسی حرام کام کے ارتکاب کی راہ کھولنے والی اور اس کا ذریعہ بننے والی ہوں۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے ایک قبیلہ کو خاص قسم کے برتن۔۔۔ دباء، مزفت، حنتم وغیرہ۔۔۔ استعمال کرنے سے روک دیا۔ ان برتنوں میں ایک خوشگوار مشروب نبیذ تیار ہوتا لیکن ان کے مساموں کو بند کر کے اسی نبیذ کو شراب کی شکل دینا بھی ممکن تھا۔ چونکہ یہ برتن شراب کا خمیر اٹھانے کے باعث بنتے لہٰذا نبی ﷺ نے ان پر پابندی عائد کر دی۔ پھر جب پختہ طور پر مسئلہ لوگوں کے سامنے واضح ہو گیا اور شراب تیار کرنے سے لوگ رک گئے تو آپ نے برتنوں کے استعمال پر پابندی کا حکم ختم کر دیا۔ دیگر کئی معاملات ایسے ملتے ہیں جن سے پہلے آپ نے روکا، پھر اجازت دے دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابتدا میں قدیم تصورات کے تحت ان میں لوگوں کے فتنہ میں مبتلا ہو جانے کا امکان تھا۔ لیکن جب دین کی تعلیم ذہنوں میں راسخ ہو

گئی تو پھر اس بات کا امکان نہ رہا کہ لوگ دوبارہ فتنہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔

مورتوں اور تصویروں کی ممانعت کی علت میرے نزدیک یہی ہے کہ جو چیزیں بت پرستی کی ہیں ان کی تصاویر یا مورتیں نہ بنائی جائیں البتہ سدذریعہ کے لیے حکم کو عام کر دیا گیا۔ سدذریعہ کے علاوہ تقویٰ کے باعث بھی کوئی پابندی قبول کی جاتی ہے جیسے ابوطلحہ انصاری نے کہا کہ بات تو آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ منقش قالین بچھانے میں کوئی حرج نہیں لیکن میں اسے پسند نہیں کرتا۔ ابوطلحہ کا یہ فرمانا احتیاط کے لیے تھا۔ جو چیزیں سدذریعہ کے لیے ممنوع ہوتی ہیں وہ اصلاً حرام نہیں ہوتیں، لیکن تقویٰ کا بھی ایک تقاضا ہوتا ہے جس کے تحت آدمی اس سے اجتناب کرتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کئی لباس حرام کی حدود میں نہیں آتے لیکن بعض لوگوں کے نزدیک ان کا استعمال وقار کے منافی ہوتا ہے۔ میرے ایک عقیدت مند میرے لیے ایک ٹوپی لائے جو بہت اونچی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر میں یہ ٹوپی پہن کر نکلوں گا تو لوگ کیا کہیں گے۔ کہنے لگے کہ یہ تو صرف آپ کے لیے خریدی گئی ہے۔ میں نے پھر معذرت کی کہ آپ لوگوں کو مجھے جانے کے لیے بہت دن لگیں گے۔ بہت سی چیزیں ہیں جن میں تقویٰ کا نہ سہی، رکھ رکھاؤ کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔

میرے نزدیک مصریوں کا یہ فتویٰ بالکل لغو ہے کہ فوٹو تو محض ایک عکس ہے۔ اس کے عکس ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس سے کوئی چیز جائز نہیں ہو جاتی۔ جائز اگر ہو گی تو صرف دو وجہوں سے ہو گی۔ ایک تو کسی خاص ضرورت کے تحت جیسے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ کے لیے فوٹو لازم ہے۔ دوسری کسی قومی یا ملی ضرورت کے تحت فوٹو کی افادیت ہو۔ یہ جو اخبارات کے پہلے صفحے پر اداکاروں اور اداکاراؤں کی فوٹو آتی ہیں، الامان والحفیظ، اگر آپ ان کو اپنے کمرے میں لگائیں تو فرشتوں کے اس میں داخل ہونے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، کوئی شریف آدمی بھی اس میں جانا گوارا نہیں کرے گا۔ ان کی تصویریں اس لیے بھی حرام ہیں کہ یہ آوارہ لوگ ہیں۔ بدکار لوگوں کی فوٹو دیکھنا بھی بدکاری ہے۔

مَاجَاءَ فِی اَکْلِ الضَّبِّ

گوہ کے کھانے کے بارے میں

❐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِی صَعْصَعَةَ

عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ اَنَّهٗ قَالَ دَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَيْتَ مَيْمُوْنَةَ بِنْتِ الْحَارِثِ فَاِذَا ضِبَابٌ فِيْهَا بَيْضٌ وَمَعَهٗ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عَبَّاسٍ وَ خَالِدُ بْنُ الْوَلِيْدِ فَقَالَ مِنْ اَيْنَ لَكُمْ هٰذَا فَقَالَتْ اَهْدَتْهُ لِیْ اُخْتِی هُزَيْلَةُ بِنْتُ الْحَارِثِ فَقَالَ لِعَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ وَ خَالِدِبْنِ الْوَلِيْدِ كُلَا فَقَالَا اَوَلَاتَاْكُلُ اَنْتَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ اِنِّی تَحْضُرُنِی مِنَ اللّٰهِ حَاضِرَةٌ فَالَتْ مَيْمُوْنَةُ اَنْسَقِيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مِنْ لَبَنٍ عِنْدَنَا فَقَالَ نَعَمْ فَلَمَّا شَرِبَ قَالَ مِنْ اَيْنَ لَكُمْ هٰذَا فَقَالَتْ اَهْدَتْهُ لِی اُخْتِی هُزَيْلَةُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَرَاَيْتِكِ جَارِيَتَكِ الَّتِی كُنْتِ اسْتَاْمَرْتِيْنِی فِی عِتْقِهَا اَعْطِيْهَا اُخْتَكِ وَ صِلِی بِهَا رَحِمَكِ تَرْعَی عَلَيْهَا فَاِنَّهٗ خَيْرٌ لَكِ.

﴿سلیمان بن یسار سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ میمونہ بنت حارث کے گھر آئے تو وہاں گوہ رکھی ہوئی تھیں اور ان میں انڈے بھی تھے۔ آپ کے ساتھ عبداللہ بن عباسؓ اور خالد بن ولیدؓ تھے۔ آپ نے پوچھا تم لوگوں کے پاس یہ گوہ کہاں سے آئیں تو انہوں نے کہا کہ یہ میری بہن ہزیلہ بنت حارث نے تحفہ میں بھیجی ہیں۔ آپؐ نے عبداللہ بن عباسؓ اور خالد بن ولیدؓ سے کہا کہ تم دونوں کھاؤ۔ انہوں نے کہا حضور آپ نہیں کھائیں گے؟ آپ نے فرمایا میرے پاس اللہ کی طرف سے آنے والے آتے ہیں (یعنی حضرت جبریل علیہ السلام) میمونہ نے کہا یا رسول اللہ ہمارے پاس دودھ بھی ہے۔ کیا آپ کو وہ پلا دیں۔ تو آپ نے کہا ہاں۔ جب آپ نے پی لیا تو پوچھا کہ یہ آپ کے پاس کہاں سے آیا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ بھی میری بہن ہزیلہ نے تحفہ دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ لونڈی جس کے آزاد کرنے کے بارے میں تم نے مجھ سے مشورہ چاہا تھا وہ تم اس بہن کو دے دو کہ اس سے صلہ رحمی بھی ہو جائے گی اور وہ ان کی بچیوں کی بھی دیکھ بھال کرے گی اور یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔﴾

وضاحت:

آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا کہ میرے پاس آنے والے آتے ہیں یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ چونکہ مہبط وحی تھے۔ جبریل امینؑ آپ کے پاس آتے رہتے تھے اس لیے آپ نظافت کا خاص خیال فرماتے۔ حتیٰ کہ پیاز اور لہسن جیسی

چیزوں سے، جن کی وہ کھانے کے بعد بھی منہ میں باقی رہتی ہے، اجتناب فرماتے۔ اسی عادت مبارکہ کے تحت آپ نے گوہ کھانے سے بھی معذرت کر دی۔

اس روایت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غلاموں کو آزاد کرنے پر اسلام نے شروع ہی سے بہت زور دیا ہے۔ کئی سورتوں میں جہاں نیکی کے جیادی کاموں کا ذکر ہے ان میں فك رقبه (غلام آزاد کرنا) کو بھی شمار کیا گیا ہے۔ اس روایت کے مطابق آنحضرتؐ نے صلہ رحمی کو غلام کی آزادی پر ترجیح دی ہے۔ یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ اس وقت تک غلام آزاد کرنے کی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے بزیلہ بنت حارث کو بکریاں چرانے میں زحمت ہوتی ہو تو جب حضرت میمونہؓ نے نبی ﷺ سے لونڈی کو آزاد کرنے کے بارے میں مشورہ کیا تو آپ نے آزادی کو مؤخر کر کے لونڈی کو بزیلہ کے حوالہ کرنے کا مشورہ دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صلہ رحمی بھی بڑی افضل نیکی ہے۔ یہ بات یاد رہے کہ یہ روایت مرسل ہے۔ گوہ کا گوشت کھانے کے بارے میں وضاحت اگلی روایت میں آئے گی۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ اَبِي اُمَامَةَ بْنِ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ عَنْ خَالِدِ بْنِ الْوَلِيْدِ بْنِ الْمُغِيْرَةِ اَنَّهٗ دَخَلَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بَيْتَ مَيْمُوْنَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ فَاُتِيَ بِضَبٍّ مَحْنُوْذٍ فَاَهْوٰى اِلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِيَدِهٖ فَقَالَ بَعْضُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي فِي بَيْتِ مَيْمُوْنَةَ اَخْبِرُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بِمَا يُرِيْدُ اَنْ يَّاْكُلَ مِنْهُ فَقِيْلَ هُوَ ضَبٌّ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَرَفَعَ يَدَهٗ فَقُلْتُ اَحَرَامٌ هُوَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ لَا وَلٰكِنَّهٗ لَمْ يَكُنْ بِاَرْضِ قَوْمِي فَاَجِدُنِي اَعَافُهٗ قَالَ خَالِدٌ فَاجْتَرَرْتُهٗ فَاَكَلْتُهٗ وَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَنْظُرُ.

﴿خالد بن ولیدؓ روایت کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حضور کی اہلیہ حضرت میمونہؓ کے گھر میں داخل ہوئے تو بھنی ہوئی گوہ لائی گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے ہاتھ بڑھایا تو کسی عورت نے جو حضرت میمونہؓ کے گھر میں تھیں، کہا کہ رسول اللہ ﷺ کو خبر کر دو کہ آپ کیا کھانے چلے ہیں۔ آپ کو بتایا گیا کہ یا رسول اللہ، یہ گوہ کا گوشت ہے تو آپ نے ہاتھ اٹھا لیا۔ میں نے آپ سے پوچھا کہ کیا یہ حرام ہے؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، لیکن چونکہ یہ میری قوم کے علاقہ میں نہیں پائی جاتی تو میں طبیعت کے اندر کراہت محسوس کرتا ہوں۔ خالد بن ولیدؓ کہتے ہیں کہ میں نے کھینچا اور کھایا اور رسول اللہ

ﷺ دیکھتے رہے۔﴾

وضاحت :

جانوروں میں سے کچھ چیزیں صریح حرام ہیں اور کچھ صریح طیب۔ بیچ میں کچھ چیزیں مشتبہ ہیں۔ مشتبہ چیزوں کے بارے میں ہدایت یہ ہے کہ اگر آپ ان کو ناگوار پاتے ہوں تو ان کو نہ کھائیں لیکن اگر دوسرے کھاتے ہیں تو ان پر حرام خوری کا الزام نہ لگائیں۔ گوہ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن علاقوں میں گوہ نہیں پائی جاتی وہاں کے باشندے اس سے کراہت محسوس کرتے ہیں جبکہ دوسروں کے نزدیک اس کا گوشت بے حد لذیذ اور پسندیدہ بھی ہو سکتا ہے۔ شوافع کا مذہب سمندری اور ساحلی علاقوں میں خوب پھیلا ہے اور دیکھا گیا ہے کہ انہوں نے مشکل ہی سے کوئی سمندری جانور ایسا چھوڑا ہو گا جو ان کی فقہ میں کھانا ناجائز ہو۔ امام شافعیؒ کے ایک جلیل القدر امام فقہ ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا اور ان کی فقہ ایک وسیع علاقہ میں نافذ بھی رہی ہے۔ لہٰذا میرے نزدیک ایسی چیزوں کے بارے میں، جو صریح حرام نہیں، یہ کہنا ہی مناسب ہے کہ اگرچہ ہم ان کو کھانا پسند نہیں کرتے لیکن دوسرے اگر کھاتے ہیں تو ہمیں ان پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِيْنَارٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَجُلًا نَادٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا تَرٰى فِي الضَّبِّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَسْتُ بِاٰكِلِهٖ وَلَا بِمُحَرِّمِهٖ.

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کو پکارا اور پوچھا کہ گوہ کے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے تو آپ نے فرمایا کہ نہ میں اس کو کھاتا ہوں اور نہ حرام کرتا ہوں۔﴾

وضاحت :

اس روایت نے اس بات کو مؤکد کر دیا کہ گوہ کا کھانا حرام نہیں۔ اس کا کھانا آپ کو اگر گوارا نہ ہو اور دوسرے کھاتے ہوں تو آپ ان پر نکیر نہ کریں۔ گوہ جیسے جانور صحراؤں میں پائے جاتے ہیں۔ صحراؤں میں بسنے والے لوگ ان سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں اور انہیں یہ چیز ناگوار نہیں ہوتی تو نبی ﷺ نے بھی اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔

مَا جَاءَ فِي أَمْرِ الكِلَابِ

کتوں کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَزِيدَ بْنِ خُصَيْفَةَ أَنَّ السَّائِبَ بْنَ يَزِيدَ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ سَمِعَ سُفْيَانَ بْنَ أَبِي زُهَيْرٍ وَهُوَ رَجُلٌ مِنْ أَزْدِ شَنُوءَةَ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَهُوَ يُحَدِّثُ نَاسًا مَعَهُ عِنْدَ بَابِ الْمَسْجِدِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ مَنِ اقْتَنَى كَلْبًا لَا يُغْنِي عَنْهُ زَرْعًا وَلَا ضَرْعًا نَقَصَ مِنْ أَجْرِ عَمَلِهِ كُلَّ يَوْمٍ قِيرَاطٌ قَالَ أَنْتَ سَمِعْتَ هَذَا مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ إِيْ وَرَبِّ هَذَا الْمَسْجِدِ.

﴿سفیان بن ابی زہیر، جو قبیلہ ازد شنوءہ میں سے رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہیں، مسجد نبوی کے دروازے کے پاس کچھ لوگوں سے بیان کر رہے تھے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ جس نے کوئی کتا پالا جو نہ اس کی زراعت کے کام کا اور نہ اس کے گلے کی حفاظت کے کام کا ہو تو ایسے شخص کا روزانہ ایک قیراط کے برابر عمل کا اجر کم ہو جاتا ہے۔ سائب بن یزید نے ان سے پوچھا کہ کیا یہ بات آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے تو انہوں نے کہا ہاں، اس مسجد کے خداوند کی قسم﴾

وضاحت :

مطلب یہ ہے کہ کتے کو پالنا کسی مفید مقصد کے لیے ہونا چاہیے۔ یہ مقصد کھیتی یا باغ کی حفاظت یا گلے کی نگرانی یا دروازے کی پاسبانی کا ہو سکتا ہے اور اس کے لیے آپ کتا رکھ سکتے ہیں۔ اگر ایسا کوئی مقصد نہ ہو تو کتا پالنے سے آدمی کے نیک عمل کا وزن ایک قیراط یومیہ کم ہو جائے گا۔ ایک قیراط کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ ہی ٹھیک ٹھیک جانتے ہیں۔ ہم تو اس کو نہیں جان سکتے۔

روایت سننے والے صاحب نے پوچھا کہ کیا آپ نے یہ رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے تو کہا ہاں، اس مسجد کے خداوند کی قسم۔ انہوں نے قسم بھی اس مسجد کی کھائی جو مقدس ترین مساجد میں سے ہے۔

یہ معلوم ہونا چاہیے کہ عرب لوگ، شہری ہوں یا بدوی، شکاری کتے بڑے شوق سے رکھتے تھے۔ ان کو

شکار کی تربیت دی جاتی تھی۔ قرآن مجید نے ان کتوں کے شکار کردہ جانور کو حلال قرار دیا ہے۔ اس زمانہ میں کتوں کی تربیت میں مزید ترقی ہوئی ہے اور ان کو کھوج لگانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہوائی اڈوں پر لوگوں کو اور ان کے سامان کو سونگھ کر کتے منشیات کا کھوج لگا لیتے ہیں۔ یہ مقاصد بھی اچھے ہیں جن کے لیے کتوں کو پالا جا سکتا ہے۔

اس روایت میں یہ بات بھی ہے کہ ایک آدمی نے راوی کو ٹوک کر بات موکد کرائی کہ انہوں نے یہ بات فی الواقع نبی ﷺ کی زبان سے سنی۔ کسی روایت میں اگر دینی اعمال کے اجر میں کمی بیشی کا معاملہ آیا ہو تو روایت کی تحقیق کے درپے ہونا فطرت کا تقاضا ہے۔ اہل حدیث اور شافعی حضرات کے نزدیک روایت کرنے والا ایک ہی ہو تو آنکھ بند کر کے روایت کو مان لیں گے، اور اگر نہیں مانتے تو منکر حدیث ٹھہریں گے۔ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر خبر کی نوعیت ایسی ہے جو خاص اہمیت نہیں رکھتی تو اس کو اگر ایک کافر بھی بیان کرے تو مان لینے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اگر ایک شخص کوئی ایسی بات کہتا ہے جو دین میں اہمیت رکھتی ہے تو پھر شخص کا بھی سوال پیدا ہو گا اور بات کا بھی، اور تحقیق ضروری ہو گی۔ بغیر تحقیق کے ہر چیز نہیں مان لینی چاہیے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ مَنِ اقْتَنَى كَلْبًا إِلَّا كَلْبَ صَارِيًا أَوْ كَلْبَ مَاشِيَةٍ نَقَصَ مِنْ أَجْرِ عَمَلِهِ كُلَّ يَوْمٍ قِيرَاطَانِ.

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کوئی کتا پالا، الا یہ کہ وہ شکاری کتا ہو یا گلے کی نگرانی کا ہو، تو اس کے عمل کے اجر سے روزانہ دو قیراط کم ہو جاتا ہے۔﴾

وضاحت :

پہلی روایت اور اس روایت میں میرے نزدیک تناقض ہے۔ پہلی میں اجر میں ایک قیراط کی کمی بتائی گئی ہے اور اس میں دو قیراط کی۔ اس روایت کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں جو سلسلۃ الذہب میں سے ہیں۔ شارحین نے دونوں روایتوں کو جمع کرنے کی جو ترکیبیں بیان کی ہیں ان میں کوئی ایسی نہیں جس پر میرا دل مطمئن ہو۔ اور جس پر اپنا دل مطمئن نہ ہو اس کے بیان کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ پہلی روایت بخاری اور مسلم دونوں میں ہے۔ آپ لوگ خود فیصلہ کریں کہ روایت کے لحاظ سے یہ اور جس کا ہے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَمَرَ بِقَتْلِ الْكِلَابِ.

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کتوں کے قتل کا حکم دیا۔﴾

وضاحت :

اس حکم کی توجیہ شارحین یہ کرتے ہیں کہ مدینہ منورہ چونکہ وحی کا مہبط تھا اس لیے آپ نے کتوں کے قتل کرنے کا حکم دیا۔ اور یہ بھی آتا ہے کہ بعد میں آنحضرت ﷺ نے اس سے روک دیا کہ یہ جانور بھی امت من الامم ہیں۔ ہماری میونسپلٹیاں بھی کتوں کے مارنے کی مہم کبھی کبھی چلایا کرتی ہیں اور بات ان کی معقول ہوتی ہے۔ جب کتے آفت بن جاتے ہیں اور ان کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے تو ان کے لڑائی جھگڑے سے شہری زندگی تنگ ہو جاتی ہے۔ ان کے اندر لوگوں کو کاٹنے کا ولولہ بھی بڑھ جاتا ہے اور جب اکٹھے ہوتے ہیں تو حملہ بھی کر دیتے ہیں۔ میرے خیال میں مدینہ منورہ میں ایسا ہوا ہو گا جب آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہو گا کہ ان کو قتل کر دو۔ قتل کی حد بھی بتا دی ہو گی کہ نسل ختم کرنا مقصود نہیں۔ گویا اس حکم کی نوعیت یہ ہے کہ شہر مقدس ہو یا نہ ہو، نفاست اور بچوں بوڑھوں کی حفاظت کے پیش نظر کتوں کو قتل بھی کر سکتے ہیں۔ اس میں آج کل کے صاحب لوگوں کے کتے خارج از بحث ہیں۔ ان کا معاملہ ہی دوسرا ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بطل میں لینے کے دلیل مقصد کے لیے کتے نہیں پالنے چاہئیں۔

مَاجَاءَ فِي أَمْرِ الْغَنَمِ

بکریوں کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ وَأْسُ الْكُفْرِ نَحْوَ الْمَشْرِقِ وَالْفَخْرُ وَالْخُيَلَاءُ فِي أَهْلِ الْخَيْلِ وَالْإِبِلِ وَالْفَدَّادِينَ أَهْلِ الْوَبَرِ وَالسَّكِينَةُ فِي أَهْلِ الْغَنَمِ.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کفر کا گڑھ مشرق کی طرف ہے۔ فخر و غرور گھوڑوں اور اونٹوں اور خیموں کے ساکنوں کے اندر ہے اور متانت اور سنجیدگی بھیڑ بکری رکھنے والوں میں ہے﴾

وضاحت :

یہ آنحضرت ﷺ نے کوئی دینی مسئلہ نہیں بیان کیا بلکہ زندگی کے عام تجربات کے حوالہ سے ایک بات

فرمائی ہے۔ اس میں بنیادی چیز یہ ہے کہ آدمی کا جس طرح کے جانوروں سے واسطہ ہو گا تو اس کے مزاج میں انہی کی خو بو آئے گی۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ گھوڑے یا اونٹ پر سوار ہو کر چلتے ہیں تو ان میں فخر و غرور تو پیدا ہو گا۔ شان و شوکت کا مزاج پر اثر پڑتا ہے۔ جو لوگ گائے بھینس چرائیں گے اور ان کے پیچھے پھریں گے تو مزاج میں سختی اور خشونت پیدا ہو گی۔ جو لوگ کھیتی کی حفاظت کریں گے تو ان میں مسکنت، متانت، خاکساری اور تواضع پیدا ہو گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ یا تو جانوروں سے تعلق نہ رکھے اور اگر رکھیں تو بڑی احتیاط کے ساتھ، اپنے اخلاق و عادات کی نگرانی کرتے ہوئے یہ تعلق رکھیں۔ نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ کفر کا گڑھ مشرق کی طرف ہے۔ مشرق میں قریبی علاقہ تو ایران اور عراق ہی ہو سکتا ہے اور آنحضرت کا یہ فرمانا حالات کے لحاظ سے بالکل ٹھیک تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خسرو پرویز نے آپ کا نامہ مبارک پھاڑ دیا تھا۔ جب ایران فتح ہو گیا تو اس کے بعد بھی یہ علاقہ ہمیشہ سے شر و فساد کا گڑھ رہا ہے۔ عراق بھی تمام دینی فرقوں کا مرکز رہا ہے اور اب بھی ہے۔ سب فتنے وہیں سے پیدا ہوئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے یہ بات وقت کے حالات کے لحاظ سے فرمائی ہے اور اس میں تبدیلی بھی ہو سکتی ہے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَبْدِاللهِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ أَبِي صَعْصَعَةَ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ أَنَّهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُوشِكُ أَنْ يَكُونَ خَيْرُ مَالِ الْمُسْلِمِ غَنَمًا يَتْبَعُ بِهَا شَعَفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ يَفِرُّ بِدِينِهِ مِنَ الْفِتَنِ.

﴿ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قریب ہے وہ وقت کہ بہترین مال کسی مسلمان کے لیے بکریوں کا ریوڑ ہو کہ جن کو لیے ہوئے وہ پہاڑوں کی گھاٹیوں میں یا بارش کے مقامات پر پھرے۔ اس کا مقصد اپنے دین کو فتنوں سے بچانا ہو۔﴾

وضاحت :

نبی ﷺ نے امت کو مستقبل میں پیش آنے والے فتنوں سے بھی آگاہ فرمایا۔ یہ حدیث انہی فتنوں سے متعلق ہے۔ اس میں حضور نے یہ فرمایا کہ وہ زمانہ قریب ہے کہ جس شخص کو اپنے دین کی فکر ہو گی وہ اس بات پر قناعت کرنے کی کوشش کرے گا کہ کوئی چھوٹا موٹا بکریوں کا گلہ ہو اور وہ اس کو لے کر پہاڑوں میں چلا جائے اور انہی کا دودھ پی کر اور انہی کی کھال کا لباس پہن کر زندگی گزارے لیکن شہری زندگی کی شیطنت سے اپنے آپ کو بچالے۔

اس زمانہ میں جو دنیا پر سختی آئے گی اس کے نتیجہ میں جگہ جگہ فتنے اور فساد اٹھیں گے۔ چنانچہ ایک دیندار آدمی مجبور ہو گا کہ اپنے دین کو بچانے کے لیے الگ تھلگ ہو کر اپنے گلے پر ہی قناعت کرے۔ آنحضرت ﷺ نے جس زمانہ کی خبر دی وہ زمانہ غنیمت تھا کہ آپ بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ پہاڑوں میں زندگی گزار سکتے تھے۔ لیکن آج تو وہ زمانہ آ گیا ہے کہ آپ ریوڑ بھی کہیں نہیں رکھ سکتے۔ چور اور ڈاکو نہیں چھوڑتے۔ شہروں کے اندر زندگی گزارنا مشکل ہو گیا ہے۔ کسی کی حفاظت کا ذمہ اٹھانا ممکن نہیں رہا۔

اس روایت سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص کو ایمان عزیز ہو تو الگ تھلگ ہو جائے وہیں یہ حکم بھی نکلتا ہے کہ دنیا سے الگ تھلگ رہنا صرف ایمان کو بچانے کے لیے ہو ورنہ دنیا کے ساتھ رہنا اس وقت تک واجب ہے جب تک آدمی کے لیے یہ ممکن ہو کہ اپنے دین کو بچاتے ہوئے لوگوں کے کانوں میں اللہ کا کلمہ پہنچا سکتا اور اپنے دین کے جو کم سے کم حقوق ہیں وہ ادا کر سکتا ہو۔ یہ بات حدیثوں میں بھی آئی ہے اور قرآن مجید سے بھی ثابت ہے۔ اگر آدمی اپنے دین کو نہیں بچا سکتا تو اصحاب کہف کے طریقہ پر اللہ پر توکل کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ انتظام کر دے گا۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا يَحْتَلِبَنَّ اَحَدٌ مَاشِيَةَ اَحَدٍ بِغَيْرِ اِذْنِهٖ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تُؤْتٰى مَشْرُبَتُهٗ فَتُكْسَرَ خِزَانَتُهٗ فَيُنْتَقَلَ طَعَامُهٗ وَ اِنَّمَا تَخْزُنُ لَهُمْ ضُرُوْعُ مَوَاشِيْهِمْ اَطْعِمَاتِهِمْ فَلَا يَحْتَلِبَنَّ اَحَدٌ مَاشِيَةَ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِهٖ.

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص کسی دوسرے کی گائے بکری بغیر اس کی اجازت کے نہ دوہ لے۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کے کمرے میں داخل ہو کر اس کی الماری توڑی جائے اور اس کا کھانا منتقل ہو جائے۔ یاد رکھو کہ مویشیوں کے تھن لوگوں کی غذا کے خزانے ہیں تو یہ جائز نہیں کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے مویشیوں کا دودھ اس کی اجازت کے بغیر دوہ لے۔﴾

وضاحت :

حدیث کا مفہوم واضح ہے۔ ایسا کام بے تکلفی میں بھی نہیں کرنا چاہیے بلکہ اجازت لے کر کرنا چاہیے۔ اس

طرح کی احتیاط ہر مہذب قوم کو کرنی چاہیے۔ لیکن اگر آپ کسی ایسی جگہ پہنچ گئے کہ باغ آپ کے پرانے دوست کا ہے اور آپ کو بھوک لگی ہے، اس بات کا یقین ہے کہ اگر آپ نے ایک دو سیب توڑ کر کھا لیے تو وہ دوست ناراض نہیں ہو گا بلکہ خوش ہو گا تو کچھ حرج نہیں۔ لیکن جہاں پر اس طرح کا اندیشہ ہو کہ مالک ناراض ہو گا تو وہاں پرہیز کرنا چاہیے۔ اضطرار کا الگ قانون ہے۔ اگر آپ مجبور ہوں تو بقدر ضرورت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جہاں ایسی مشکل نہ ہو تو محض بے تکلفی میں کسی کی کاجریں نکال کر کھولینا ٹھیک نہیں۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَا مِنْ نَبِيٍّ اِلَّا قَدْ رَعٰى غَنَمًا قَبْلَ وَ اَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَ اَنَا.

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ پوچھا گیا آپ نے بھی یا رسول اللہؐ؟ تو فرمایا کہ ہاں میں نے بھی۔﴾

وضاحت :

انبیاء کی معلوم تاریخ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیبؑ کی بکریاں چرائیں۔ امیر انبیاء میں حضرت داؤد اور سلیمانؑ ہیں۔ حضرت داؤدؑ کے متعلق تورات میں بیان ہوا ہے کہ انہوں نے اپنے ابتدائی زمانہ میں بکریاں چرائی ہیں۔ جب اس وقت کے پیغمبر نے ان کی کم عمری کی وجہ سے اس بات کی اجازت نہ دی کہ وہ دشمن فوج کے سردار جالوت کا مقابلہ کریں تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میں فلاخن کی مدد سے اپنی بھیڑوں پر حملہ کرنے والے جانور کے دانت توڑ دیتا ہوں۔ چنانچہ اس بیان پر ان کو مقابلہ کی اجازت مل گئی۔ انہوں نے فلاخن سے جب پتھر مارا تو سپہ سالار کے سر پر چپک کر رہ گیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

حضرت سلیمانؑ کے متعلق بھی یہ بعید نہیں کہ انہوں نے بھی یہ کارنامہ انجام دیا ہو۔ ہماری تاریخ کے بہت بڑے آدمی حضرت عمرؓ نے بھی یہ کام کیا ہے۔ اور حضرت عمرؓ اور حضرت سلیمانؑ میں بڑی مشابہت ہے۔ دونوں نے ساری زندگی فقیری میں گزاری حالانکہ وہ ایک بڑی سلطنت کے حکمران تھے۔ زندگی کے تمام نشیب و فراز میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی تربیت کرتا ہے تو انسانوں کے گلے کی چرواہی کے لیے اگر بکریوں کے گلے کی نگہبانی سے تربیت دی جائے تو یہ بالکل درست ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج کے حکمرانوں کو تربیت دینے کے لیے بھی چرواہی پر لگا دیا جائے تاکہ ان کی عقل کچھ درست ہو جائے۔ لیکن ان سے تو یہ اندیشہ بھی ہے کہ گلے کو ذبح کر کے اس کا گوشت

کھا جائیں گے اور کمال بچ لیں گے۔

مَاجَاءَ فِي الْفَأْرَةِ تَقَعُ فِي السَّمْنِ وَالْبَدْءِ بِالْأَكْلِ قَبْلَ الصَّلَاةِ

چوہیا کے گھی میں گر جانے اور نماز سے پہلے کھانا شروع کرنے کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ يُقَرَّبُ اِلَيْهِ عَشَاؤُهُ فَيَسْمَعُ قِرَاءَةَ الْاِمَامِ وَهُوَ فِي بَيْتِهِ فَلَا يَعْجَلُ عَنْ طَعَامِهِ حَتّٰى يَقْضِيَ حَاجَتَهُ مِنْهُ.

﴿نافعؒ بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرؓ کے لیے شام کا کھانا لایا جاتا اور وہ اپنے گھر میں امام کی قرأت سنتے ہوتے لیکن وہ کھانے میں جلدی نہ کرتے جب تک کہ اپنی حاجت پوری نہ کر لیں۔﴾

وضاحت :

دین کے معاملات میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے زیادہ کوئی آدمی متشدد نہ تھا۔ اس لیے ان کے متعلق یہ بات مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے کہ وہ امام کی قرأت سن رہے ہوں اور گھر میں اطمینان سے کھانا کھاتے رہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی رائے یہ رہی ہو کہ کھانا اگر سامنے آجائے تو کھانا کھا کر نماز ادا کرنی چاہیے۔

دینی معاملات میں میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہیؒ بھی بے حد محتاط تھے۔ ایک مرتبہ کچھ لوگ جمع تھے تو ایک صاحب نے کہا کہ نماز پڑھ لی جائے تو کھانا اطمینان سے کھایا جائے۔ مولانا فراہیؒ نے فرمایا کہ نہیں، کھانا پہلے کھا لیا جائے، پھر نماز اطمینان سے پڑھی جائے۔ میں نے کہا استاذ کا موقف ٹھیک ہے، اطمینان نماز کے لیے مطلوب ہے، کھانا کھانے کے لیے نہیں۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ عَنْ مَيْمُوْنَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ سُئِلَ عَنِ الْفَأْرَةِ تَقَعُ فِي السَّمْنِ فَقَالَ اَنْزِعُوْهَا وَمَا حَوْلَهَا فَاطْرَحُوْهُ

﴿حضرت میمونہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ چوہیا اگر گھی میں گر جائے تو کیا کریں۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو اور اس کے ارد گرد کے گھی کو نکال کر پھینک دو۔﴾

وضاحت :

گھی اگر جما ہوا ہو تو ایسا کرنے سے مسئلہ حل ہو جائے گا لیکن اگر گھی پتلا ہو تو سارے کا سارا پھینکنا پڑے گا۔

مَا يُتَّقٰى مِنَ الشُّؤْمِ

نحوست سے بچنے کے لیے کیا کیا جائے

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ اَبِي حَازِمِ بْنِ دِيْنَارٍ عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدِ السَّاعِدِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِنْ كَانَ فِي شَيْءٍ فَفِي الْفَرَسِ وَالْمَرْاَةِ وَالْمَسْكَنِ يَعْنِي الشُّؤْمَ.

﴿سہل بن سعد ساعدی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر نحوست ہو سکتی ہے تو گھوڑے میں، عورت میں اور گھر میں ہو سکتی ہے۔﴾

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ حَمْزَةَ وَ سَالِمِ ابْنَيْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ الشُّؤْمُ فِي الدَّارِ وَالْمَرْاَةِ وَالْفَرَسِ.

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نحوست گھر میں، عورت میں اور گھوڑے میں ہوتی ہے۔﴾

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيٰى بْنِ سَعِيْدٍ اَنَّهٗ قَالَ جَاءَتِ امْرَاَةٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ دَارٌ سَكَنَّاهَا وَالْعَدَدُ كَثِيْرٌ وَالْمَالُ وَافِرٌ فَقَلَّ الْعَدَدُ وَذَهَبَ الْمَالُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ دَعُوْهَا ذَمِيْمَةً.

﴿یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئی تو اس نے کہا یا رسول اللہ ہم جس گھر میں رہتے ہیں جب اس میں آئے تو اللہ کی قسم گھر کے افراد بھی بہت تھے اور مال بھی وافر تھا۔ لیکن اب نہ تعداد ہی نہ مال رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس منحوس مکان کو چھوڑ دو۔﴾

وضاحت :

یہ تین روایتیں ہیں۔ پہلی میں اِنْ کان (اگر ہو سکتی) ہے جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ ادھوری

روایت ہے۔ اس میں آگے یا پیچھے کا کچھ حصہ چھوٹا ہوا ہے۔ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے قطعی طور پر فرمایا کہ گھوڑے، عورت اور گھر تینوں میں نحوست ہوتی ہے۔ تیسری روایت میں ہے کہ ایک خاتون نے نبی ﷺ سے شکایت کی کہ جب ہم اپنے گھر میں آئے تھے تو کنبہ بڑا اور مال وافر تھا۔ اب کنبہ بھی چھوٹا ہو گیا ہے اور مال بھی ہوا ہو گیا ہے۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس گھر کے بارے میں آپ کا یہ خیال ہو اس کو چھوڑ دو۔

اگر روایات میں بات یوں ہوتی کہ بعض گھروں، بعض گھوڑوں اور بعض عورتوں میں نحوست ہوتی ہے تب تو گوارا تھی لیکن ان میں یہ الفاظ نہیں ہیں۔ دوسری طرف قرآن میں گھوڑوں کے کردار کو نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ سورہ عادیات میں فرمایا ہے کہ نالائقو، دیکھو تمہارے گھوڑے کتنے وفادار ہیں اور تم اپنے رب کے ناشکرے ہو۔ عربوں کا گھوڑوں سے متعلق کیا ذہن ہے آپ اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے ایک حدیث میں بھی آیا ہے کہ الخیل خیر المال (گھوڑا بہترین مال ہے) یہ تو بتایا جا سکتا ہے کہ کسی گھوڑے میں نحوست ہو لیکن پوری جنس کے ساتھ اس قسم کا حکم لگا دینا، جیسا کہ روایت میں ہے، درست نہیں۔ عورتوں پر غور کیجیے تو اس میں حضرت مریم بھی ہیں اور فرعون کی بیوی بھی، جن کو قرآن نے اہل ایمان کے لیے نمونہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اسی طرح حضرت خدیجہؓ، حضرت عائشہؓ اور دوسری امہات المومنین بھی ہیں جن کی نیکی اس امت کے لیے ایک مثال ہے۔ تو کلیہ کے طور پر عورت میں نحوست ہونے کی بات صحیح نہیں اور جزوی طور پر روایت کا اطلاق کرنے کے لیے الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔ شارحین نے ان روایتوں کی جو توجیہات کی ہیں ان کو پڑھ پڑھ کر تو میرا سر چکرا گیا اور کوئی بات بھی سیدھی نہیں کی گئی۔ البتہ حضرت عائشہؓ کی ایک وضاحت مسئلہ کو کسی قدر حل کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات جو ارشاد فرمائی تو اصل میں یہود کے عقیدہ کا حوالہ دیا تھا لیکن راویوں نے اس سیاق و سباق کے بغیر روایت کر دی۔ میرے نزدیک صرف یہ توجیہ ایسی ہے جس میں بات رہ جاتی ہے۔

مَا يُكْرَهُ مِنَ الْاَسْمَاءِ

ایسے نام جن میں ناگواری ہوتی ہے

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لِلُقْحَةٍ تُحْلَبُ مَنْ يَحْلُبُ هٰذِهِ فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا اسْمُكَ فَقَالَ لَهُ الرَّجُلُ مُرَّةُ فَقَالَ لَهُ

رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اجْلِسْ ثُمَّ قَالَ مَنْ يَحْلُبُ هٰذِهِ فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا اسْمُكَ فَقَالَ حَرْبٌ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اجْلِسْ ثُمَّ قَالَ مَنْ يَحْلُبُ هٰذِهِ فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا اسْمُكَ فَقَالَ يَعِيْشُ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ احْلُبْ

﴿یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دودھ والی اونٹنی کے بارے میں پوچھا کہ اس کو کون دوہے گا تو ایک شخص کھڑا ہوا، رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے۔ تو اس شخص نے کہا مرۃ۔ آپؐ نے فرمایا کہ آپ تشریف رکھو۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اس کو کون دوہے گا تو ایک شخص کھڑا ہوا۔ آپؐ نے پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے۔ تو اس آدمی نے کہا کہ حرب۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تشریف رکھیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ اس کو کون دوہے گا تو ایک صاحب کھڑے ہوئے۔ آپؐ نے پوچھا جناب کا نام کیا ہے؟ تو اس نے کہا یعیش۔ آپ نے فرمایا کہ آپ دوہو۔﴾

وضاحت:

مرۃ کے معنی کڑوے اور تلخ کے ہیں۔ حرب جنگ کو کہتے ہیں۔ یعیش کے معنی ہیں زندگی پانے والا۔ پہلے دونوں ناموں میں بدشگونی پائی جاتی ہے جبکہ تیسرے نام کے معنی اچھے ہیں۔ نبی ﷺ نے تیسرے آدمی کو دودھ دوہنے کا حکم دیا۔ میرے نزدیک نام کی نامعقولیت پہلی چیز ہے جو سوء افعال پیدا کرتی ہے اور بعض اوقات اس سے بڑے بڑے مسائل بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ فرض کریں کہ کسی گاؤں کا نام بہت ہی برا ہے اور بعد میں اس گاؤں میں ایک پیر صاحب پیدا ہو گئے اور گاؤں کے نام کے ساتھ شریف کا لفظ لگ گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں شریف کا لفظ سر پیٹ لیتا ہو گا۔ پس برا نام رکھنے میں ایک نحوست ہے۔ نام اچھے رکھنے چاہئیں۔ مبارک نام ہوں۔ یہاں یہ روایت مرسل ہے لیکن دوسری کتابوں میں موصول ہو گئی ہے۔

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ لِرَجُلٍ مَا اسْمُكَ فَقَالَ جَمْرَةُ فَقَالَ ابْنُ مَنْ فَقَالَ ابْنُ شِهَابٍ قَالَ مِمَّنْ قَالَ مِنَ الْحُرَقَةِ قَالَ اَيْنَ مَسْكَنُكَ قَالَ بِحَرَّةِ النَّارِ قَالَ بِاَيِّهَا قَالَ بِذَاتِ لَظٰى قَالَ عُمَرُ اَدْرِكْ اَهْلَكَ فَقَدِ احْتَرَقُوْا قَالَ فَكَانَ كَمَا

قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ

﴿امام مالک یحییٰ بن سعید سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ایک شخص سے پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے تو اس نے کہا جمرہ۔ پھر پوچھا کہ آپ کے باپ کا کیا نام ہے تو اس نے کہا شہاب۔ پھر پوچھا کہ آپ کس قبیلے سے ہیں؟ تو اس نے کہا حرقہ قبیلے سے۔ حضرت عمرؓ نے پھر پوچھا کہ آپ کا دولت خانہ کہاں ہے تو اس نے کہا حرۃ النار میں۔ آپؓ نے کہا کہ کس حصے میں تو اس نے کہا ذات لظیٰ میں۔ تو حضرت عمرؓ نے کہا آپ اپنے گھر تشریف لے جائیں کیونکہ آپ کے اہل و عیال جل چکے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جیسے حضرت عمر نے فرمایا تھا ویسے ہی ہوا۔﴾

وضاحت :

جمرہ کے معنی انگارے کے ہیں۔ شہاب شعلہ ہوتا ہے۔ حرقہ جلنے کے معنی میں آتا ہے۔ حرۃ النار آگ کے الاؤ کو کہیں گے اور ذات لظیٰ کے معنی ہیں شعلہ گھر۔ گویا آدمی اور اس کے والد، قبیلہ، مسکن وغیرہ سب کے ناموں میں آگ کا ذکر ہے۔

اگرچہ اتنے سارے اتفاقات کا جمع ہونا ناممکن تو نہیں لیکن اس میں یار لوگوں کی کارستانی ضرور ہے۔ اگر اصل میں کوئی کمی تھی تو وہ پوری کر لی گئی ہے۔

جب اس واقعہ میں تمام علامات موجود ہیں تو آخر محدثین میں سے کسی نے اس مقام اور خاندان کا کوئی پتہ کیوں نہیں چلایا۔ شارحین کے ہاں ایسی کوئی تحقیق نہیں ملتی۔ میرے نزدیک یہ مکالمہ ایک لطیفے سے زیادہ نہیں۔ لیکن لطیفہ اچھا ہے۔ اس کے مطابق حضرت عمرؓ نے اس شخص کے اہل و عیال کے جل کر ہلاک ہو جانے کی پیشگوئی کی جو پوری ہوئی۔ حضرت عمرؓ کو محدث کہا جاتا ہے۔ یہ بہت بڑی صفت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بڑے بڑے واقعات اللہ میاں ان پر القا کر دیتے تھے۔ اگر اس بات کو ثابت کرنے کے لیے یہ لطیفہ بنایا گیا ہے تو بہت خوبصورت ہے۔ لیکن میرے نزدیک حضرت عمرؓ کا محدث ہونا اس روایت کا محتاج نہیں۔ وہ ذہین اور فطین انسان تھے۔ حالات پر غور کرنے والے تھے۔ وہ تاڑ جاتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔ اسی طرح اخلاقی و روحانی امور سے متعلق بہت سے واقعات ہوتے ہیں کہ بعض لوگوں کے دل میں پہلے سے بات ڈال دی جاتی ہے اور بعد میں وہ سچے ثابت ہوتے ہیں۔

حضرت عمرؓ سے متعلق بعض ایسے واقعات بھی ہیں۔ وہ بہت بڑے مدبر تھے۔ حالات پر بہت دور تک ان کی نظر تھی اور وہ اہم فیصلے کر دیتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تو ایسا معلوم ہوتا کہ بہت بڑی غلطی کر گئے لیکن نتائج سے معلوم ہوتا کہ نہیں بالکل ٹھیک فیصلہ تھا۔ حضرت خالدؓ جیسے سپہ سالار کو معزول کر دینا کوئی معمولی بات نہ تھی لیکن انہوں نے عین اس وقت ان کو معزول کیا جب کہ جنگ پورے شباب پر تھی۔

مَاجَاءَ فِي الْحِجَامَةِ وَ اِجَارَةِ الْحَجَّامِ

پچھنا لگانے اور پچھنا لگانے والے کی اجرت سے متعلق روایات

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ حُمَيْدٍ الطَّوِيلِ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّهُ قَالَ اِحْتَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حَجَمَهُ اَبُو طَيْبَةَ فَاَمَرَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِصَاعٍ مِنْ تَمْرٍ وَ اَمَرَ اَهْلَهُ اَنْ يُخَفِّفُوا عَنْهُ مِنْ خَرَاجِهِ.

﴿انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پچھنا لگوایا۔ ابو طیبہ نے پچھنا لگایا تو رسول اللہ ﷺ نے ایک صاع کھجور اجرت کے طور پر اس کو دلوائی اور اس کے مالکوں کو ہدایت کی کہ اس کا خراج ذرا کم کر دیں۔﴾

وضاحت :

پچھنا گاڑھا خون نکالنا ہوتا ہے۔ بعض گرم ممالک میں خون میں اتنا ہیجان پیدا ہو جاتا ہے جس سے سر درد اور دوسری خطرناک بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ آنحضرتؐ کے متعلق آیا ہے کہ آپ کو درد شقیقہ کی شکایت تھی۔ ایک پہلو میں شدید درد ہوتا تھا تو آپ خون نکلواتے تھے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں یہ عام طریقہ علاج تھا لیکن اس زمانے میں اس کی اہمیت باقی نہیں رہی۔ رہ گیا اس کی اجرت کا معاملہ تو نبی ﷺ نے اجرت دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ خون نکالنے کی اجرت لینا جائز ہے۔

غلاموں کے اوپر ان کے مالک ایک رقم بقایا کرتے تھے کہ جو وہ کمائیں اس میں سے اتنی رقم ان کو ادا کر دیا کریں تو آنحضرت ﷺ نے ابو طیبہ کی رقم قدرے کم کرنے کی ہدایت فرمائی۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِنْ كَانَ دَوَاءٌ يَبْلُغُ الدَّاءَ فَاِنَّ الْحِجَامَةَ تَبْلُغُهٗ.

﴿امام مالک کی بلاغات میں سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر دوا مرض تک پہنچنے والی ہے تو پچھنا لگانا بھی اپنے مرض تک پہنچ جانے والا علاج ہے۔﴾

وضاحت :

اگرچہ جملہ مشروط ہے اس وجہ سے یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ آنحضرتؐ نے پچھنا لگانے کی تعریف فرمائی ہے، لیکن موقع تعریف ہی کا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ بحث ہو رہی ہو کہ یہ طریقہ علاج مفید ہے یا نہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر کوئی دوا اپنے مرض کو پاتی ہے تو میرے نزدیک یہ بھی مرض کو پا لینے والا طریقہ علاج ہے۔ اس لیے کہ آنحضرتؐ خود پچھنا لگواتے تھے اور آپ کو فائدہ ہوتا تھا۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنِ ابْنِ مُحَيِّصَةَ الْاَنْصَارِيِّ اَحَدِ بَنِي حَارِثَةَ اَنَّهٗ اسْتَاْذَنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فِي اِجَارَةِ الْحَجَّامِ فَنَهَاهُ عَنْهَا فَلَمْ يَزَلْ يَسْاَلُهٗ وَ يَسْتَاْذِنُهٗ حَتّٰى قَالَ اَعْلِفْهُ نَضَاحَكَ يَعْنِي رَقِيْقَكَ.

﴿ابن شہاب ابن محیصہ انصاری سے جو بنی حارثہ کے قبیلے میں سے تھے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے پچھنا لگانے والے کی اجرت کے متعلق اجازت چاہی تو آپؐ نے روک دیا۔ وہ برابر پوچھتے رہے اور اجازت مانگتے رہے یہاں تک کہ آپ نے فرمایا کہ اپنے اونٹوں پر پانی لانے والے لونڈوں یعنی اپنے غلاموں کو کھلا دو۔﴾

وضاحت :

ابن محیصہ انصاری نے اتنے اصرار سے جو یہ سوال کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے کچھ غلام تھے جو پچھنا لگانے کا کام کرتے تھے اور ان پر انہوں نے خراج لگا رکھا تھا۔ آنحضرتؐ نے جس سے پچھنا لگوایا وہ بھی ابن محیصہ کے غلاموں میں سے تھا۔ نبی ﷺ اگر اجرت کو حرام قرار دے دیتے تو رزق کا یہ دروازہ بند ہو جاتا۔ لہٰذا آپ نے فرمایا اگر

وہ اپنے غلاموں کو کھلا دو۔ مطلب یہ کہ یہ کمائی پسندیدہ نہیں، کراہت کے درجے میں آتی ہے۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بعض چھوٹی موٹی خدمات ہوتی ہیں، ان کو معاش کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔ یہ لئیم ہونے کی علامت ہے۔ لیکن اگر کوئی ان کا معاوضہ دے تو قبول کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ دیہاتوں میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ بچے کو کوئی معمولی تکلیف ہو گئی اور کسی نے مشورہ دے دیا کہ یوں کرو ٹھیک ہو جائے گا۔ تو اس طرح غریبوں کے کئی کام نکلتے ہیں اور ایسے مشوروں کی اجرت مقرر نہیں ہوتی۔ فی سبیل اللہ یہ کام ہوتے ہیں۔ البتہ یہ ہے کہ جیسے رسول اللہ ﷺ نے لوطیہ کو کچھ دے دیا جو انہوں نے لے لیا تو یہ ٹھیک ہے۔ گویا اجرت مقرر کرنا اور لینا درست نہیں۔ اگر کوئی دے تو قبول کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ اس سے دونوں روایتوں کو جمع کرنے کی صورت نکل آتی ہے۔

مَاجَاءَ فِي الْمَشْرِقِ

مشرق کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِيْنَارٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يُشِيْرُ اِلَى الْمَشْرِقِ وَ يَقُوْلُ هَا اِنَّ الْفِتْنَةَ هَاهُنَا اِنَّ الْفِتْنَةَ مِنْ حَيْثُ يَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ.

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ مشرق کی طرف اشارہ کر کے فرما رہے تھے کہ اے لو فتنہ یہاں ہے۔ فتنے کا منبع وہاں ہے جہاں سے شیطان کا سینگ ابھرتا ہے۔﴾

وضاحت :

"جہاں سے شیطان کا سینگ ابھرتا ہے" سورج کے طلوع ہونے کے مقام کی تعبیر ہے۔ آپ نے مشرق کی طرف اشارہ کیا تو آپ کی مراد ایران اور عراق کے ممالک ہوں گے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان ممالک نے بڑے بڑے فتنوں کو جنم دیا ہے خواہ یہ فتنے عقائدی ہوں یا اخلاقی۔ شیعیت، تصوف، باطنیت اور فلسفیت یہ سب وہاں سے پیدا ہوئیں۔ اور ہمارے ہاں جو گمراہیاں پھیلی ہیں تو وہیں سے آئی ہیں۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اَرَادَ اَنْ يَخْرُجَ اِلَى الْعِرَاقِ فَقَالَ لَهٗ كَعْبُ الْاَحْبَارِ لَا تَخْرُجْ اِلَيْهَا يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَاِنَّ بِهَا تِسْعَةَ اَعْشَارِ السِّحْرِ وَبِهَا الْجِنُّ وَبِهَا الدَّاءُ الْعُضَالُ.

﴿امام مالک کو یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے عراق کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا تو ان کو کعب احبار نے کہا کہ اس کی طرف نہ نکلو وہاں تو دس میں سے ۹ حصے جادو ہے۔ بڑے بڑے طاقتور جنات ہیں اور نا قابل علاج بیماریاں ہیں۔﴾

وضاحت :

یہ کعب احبار کا قول ہے۔ وہ یہود کی قدیم تاریخ کے عالم تھے اور یہ معلومات اسی میں سے انہوں نے ہم کو تحفے میں دی ہیں۔ یہود کی اسیری بابل میں ہوئی اور وہیں سحر و ساحری اور بادوت و ہاروت کے علم کا چرچا ہوا۔ یہ علاقہ سحر کا گڑھ رہا۔ انہی معلومات کی بنا پر کعب احبارؒ نے حضرت عمرؓ کو عراق جانے سے روکا ہوگا۔

مَاجَاءَ فِي قَتْلِ الْحَيَّاتِ وَمَا يُقَالُ فِي ذٰلِكَ

سانپوں کے مارنے کے بارے میں کیا احکام اور اقوال ہیں

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ اَبِي لُبَابَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ قَتْلِ الْحَيَّاتِ الَّتِي فِي الْبُيُوْتِ.

﴿ابو لبابہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھریلو سانپوں کو مارنے سے روکا ہے۔﴾

وضاحت :

اس معاملہ میں ہم لوگوں کا احساس بہت شدید ہے۔ ہمارے دیار میں سانپ ایسی خطرناک چیز ہے کہ اس کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کو گھریلو مہمان بنانے کا کوئی تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ چونکہ سانپوں کی ہزاروں قسمیں ہیں جن میں زہریلے سانپ بھی ہیں اور بے ضرر بھی، اور سانپوں کے بارے میں جاننے والے تو یہ کہتے ہیں کہ اکثر سانپ زہریلے نہیں ہوتے، اس لیے ہو سکتا ہے کہ نبی ﷺ نے بے ضرر سانپوں کے

بارے میں یہ ہدایت دی ہو کہ ان کو مارا نہ جائے۔ ایک روایت میں یہ آیا بھی ہے کہ جو سانپ چوہے کھاتے ہیں اور انسانوں کو کاٹتے نہیں، آنحضرتؐ نے ان کو مارنے سے روکا۔ تاہم ایک عام آدمی کے لیے یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ کون سا سانپ خطرناک ہے اور کونسا بے ضرر۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ سَالِبَةَ مَوْلَاةٍ لِعَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ قَتْلِ الْجِنَّانِ الَّتِي فِي الْبُيُوْتِ اِلَّا ذَا الطُّفْيَتَيْنِ وَالْاَبْتَرَ فَاِنَّهُمَا يَخْطِفَانِ الْبَصَرَ وَ يَطْرَحَانِ مَا فِي بُطُوْنِ النِّسَاءِ.

﴿نافع حضرت عائشہؓ کی آزاد کردہ لونڈی سالبہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے منع کیا ہے ان سانپوں کے مارنے سے جو گھروں میں رہتے ہیں بجز ان کے جو اوپر دھاری والے ہوں یا دم کٹے ہوں اس لیے کہ یہ نگاہ اچک لیتے اور عورتوں کے حمل گرا دیتے ہیں۔﴾

وضاحت :

سانپوں کی قسموں کا کچھ شمار نہیں۔ ہو سکتا ہے مدینہ منورہ میں دھاری والے اور دم کٹے دو قسم کے سانپوں کے متعلق مشہور روایت یہ رہی ہو کہ ان کے اثرات آنکھوں پر بھی پڑ سکتے ہیں اور ان کے خوف سے عورتوں کے حمل بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آنحضرتؐ نے ان کی یہ حیثیت تسلیم کی ہو۔ یہ حضرت عائشہؓ کے قول کا حصہ ہو سکتا ہے جس میں انہوں نے مشہور روایت بیان کر دی۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ صَيْفِيٍّ مَوْلَى بَنِي اَفْلَحَ عَنْ اَبِي السَّائِبِ مَوْلَى هِشَامِ بْنِ زُهْرَةَ اَنَّهٗ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰى اَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ فَوَجَدْتُهٗ يُصَلِّي فَجَلَسْتُ اَنْتَظِرُهٗ حَتّٰى قَضٰى صَلَاتَهٗ فَسَمِعْتُ تَحْرِيْكًا تَحْتَ سَرِيْرٍ فِي بَيْتِهٖ فَاِذَا حَيَّةٌ فَقُمْتُ لِاَقْتُلَهَا فَاَشَارَ اَبُوْ سَعِيْدٍ اَنِ اجْلِسْ فَلَمَّا انْصَرَفَ اَشَارَ اِلٰى بَيْتٍ فِي الدَّارِ فَقَالَ اَتَرٰى هٰذَا الْبَيْتَ فَقُلْتُ نَعَمْ قَالَ اِنَّهٗ قَدْ كَانَ فِيْهِ فَتًى حَدِيْثُ عَهْدِهٖ بِعُرْسٍ فَخَرَجَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِلَى الْخَنْدَقِ فَبَيْنَا هُوَ بِهٖ اِذْ اَتَاهُ الْفَتٰى يَسْتَاْذِنُهٗ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ائْذَنْ لِي اَحْدِثْ بِاَهْلِي عَهْدًا فَاَذِنَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَقَالَ

خُذْ عَلَيْكَ سِلَاحَكَ فَإِنِّي أَخْشَى عَلَيْكَ بَنِي قُرَيْظَةَ فَانْطَلَقَ الْفَتَى إِلَى أَهْلِهِ فَوَجَدَ امْرَأَتَهُ قَائِمَةً بَيْنَ الْبَابَيْنِ فَأَهْوَى إِلَيْهَا بِالرُّمْحِ لِيَطْعَنَهَا وَ أَدْرَكَتْهُ غَيْرَةٌ فَقَالَتْ لَا تَعْجَلْ حَتَّى تَدْخُلَ وَ تَنْظُرَ مَا فِي بَيْتِكَ فَدَخَلَ فَإِذَا هُوَ بِحَيَّةٍ مُنْطَوِيَةٍ عَلَى فِرَاشِهِ فَرَكَزَ فِيهَا رُمْحَهُ ثُمَّ خَرَجَ بِهَا فَنَصَبَهُ فِي الدَّارِ فَاضْطَرَبَتِ الْحَيَّةُ فِي رَأْسِ الرُّمْحِ وَ خَرَّ الْفَتَى مِنَّا فَمَا يُدْرَى أَيُّهُمَا كَانَ أَسْرَعَ مَوْتًا الْفَتَى أَمِ الْحَيَّةُ فَذَكَرَ ذَلِكَ لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ إِنَّ بِالْمَدِينَةِ جِنًّا قَدْ أَسْلَمُوا فَإِذَا رَأَيْتُمْ مِنْهُمْ شَيْئًا فَآذِنُوهُ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ فَإِنْ بَدَا لَكُمْ بَعْدَ ذَلِكَ فَاقْتُلُوهُ فَإِنَّمَا هُوَ شَيْطَانٌ.

﴿ہشام بن زہرہ کے آزاد کردہ غلام ابو سائب بیان کرتے ہیں کہ میں ابو سعید خدری کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ میں انتظار میں بیٹھ گیا۔ جب انھوں نے نماز پوری کر لی تو میں نے ان کے گھر میں چارپائی کے نیچے کسی چیز کی حرکت کی آواز سنی۔ دیکھا تو ایک سانپ ہے۔ میں اٹھا کہ اس کو ماردوں تو ابو سعید نے اشارہ کیا کہ تشریف رکھو۔ جب سانپ چلا گیا تو ابو سعید نے گھر میں ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ کیا تم اس کمرے کو دیکھتے ہو۔ میں نے کہا ہاں۔ کہنے لگے کہ اس میں ایک نوجوان تھا جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خندق کی جنگ کے لیے نکلا۔ ابھی وہ وہیں تھے کہ نوجوان آنحضرتؐ کے پاس اجازت لینے حاضر ہوا۔ اس نے کہا یا رسول اللہ، مجھے اجازت دیں کہ گھر والوں سے ذرا مل آؤں۔ رسول اللہ ﷺ نے اجازت دے دی اور فرمایا کہ اپنے ہتھیار ساتھ لے جانا کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ بنی قریظہ کے لوگ تم کو نقصان نہ پہنچائیں۔ نوجوان گھر آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی دروازے کے درمیان کھڑی ہے۔ اس نے ا ، نیزہ مارنا چاہا کیونکہ اس کو غیرت لاحق ہو گئی تھی تو بیوی نے کہا جلدی نہ کرو، ذرا اندر داخل ہو کر دیکھو کہ گھر میں کیا ہے۔ وہ داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک سانپ بستر پر کنڈلی مارے ہوئے ہے۔ اس نے اپنا نیزہ اس میں جما کر اس کو صحن میں لا کر گاڑ دیا تو سانپ نیزے کی نوک پر تڑپنے لگا۔ ادھر نوجوان گرا اور مر گیا۔ کہا نہیں جا سکتا کہ کس کی موت جلد واقع ہوئی، سانپ کی یا نوجوان کی۔ اس واقعہ

کا رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ مدینہ میں جن ہیں جو اسلام لا چکے ہیں۔ تو جب ان میں سے کسی کو پاؤ تو ان کو تین دن تک کی اجازت دو۔ اس کے بعد اگر تم پر کوئی بات ظاہر ہو جائے تو قتل کر دو کہ وہ شیطان ہے۔﴾

وضاحت:

جہاں تک روایت میں بیان کردہ واقعہ کا تعلق ہے اس میں کوئی چیز وضاحت طلب نہیں۔ البتہ روایت کے آخری حصہ میں جہاں رسول اللہ ﷺ کے اس واقعہ پر تبصرہ کا بیان ہے، کئی باتیں غور طلب ہیں۔

اس میں پہلی غور طلب بات یہ ہے کہ سانپ اگر آپ گھر میں دیکھیں تو تین دن تک وہ آپ کا مہمان ہو گا۔ آپ اس کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔ اس کے بعد اگر یہ بات ظاہر ہو جائے کہ یہ سانپ جنات میں سے نہیں ہے تب آپ اس کو قتل کر سکتے ہیں۔ شارحین نے ترمذی اور ابوداؤد کی روایت کی روشنی میں اس کا جو طریق کار تجویز کیا ہے اس کے مطابق آپ سانپ کو مخاطب کر کے یہ کہتے رہیں گے کہ آپ کا جو معاہدہ نوح علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام اور فلاں اور فلاں سے ہو چکا ہے اس کے حوالہ سے ہم آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔ اس طرح واسطہ دینے کے بعد وہ اگر مکان نہیں چھوڑتے اور چوتھے دن بھی نظر آتے ہیں تو اب آپ کو ان کے قتل کا اختیار حاصل ہو جائے گا۔ اس طریق کار میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا واسطہ دینے کی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن حضرت نوح علیہ السلام کا جنات سے تعلق واضح نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی نفس واقعہ کی جو وضاحت نقل ہوئی ہے اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ مدینہ منورہ کے جن اسلام لا چکے تھے۔ اور انھی میں سے ایک جن نے سانپ کا روپ دھار رکھا تھا۔ جب نوجوان نے اس کو نیزہ مار کر قتل کر دیا تو جنات نے قصاص میں نوجوان کو بھی مار ڈالا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نوجوان کو تو سانپ کی اصلیت معلوم نہیں تھی۔ اس نے تو اس کو ایک موذی جانور سمجھ کر مقابلہ میں مار دیا تھا۔ یہ قتل عمد نہ تھا تو مسلمان جنات کو یہ حق کہاں سے حاصل ہو گیا کہ وہ قصاص میں اس کو قتل کر دیں۔ اسلامی شریعت کی رو سے ان کا اقدام تعدی کہا جائے گا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ جنات صالحین میں سے بھی ہوتے اور شیاطین میں سے بھی، تو یہ قرآن سے ثابت ہے لیکن قرآن مجید سے قطعی طور پر یہ بھی ثابت ہے کہ وہ خواہ شیاطین میں سے ہوں یا صالحین میں سے،

کسی کو ہمارے اوپر اختیار و سوسہ اندازی سے زیادہ کا نہیں دیا گیا۔ اگر یہ جنات صالحین میں سے تھے تو انہوں نے نوجوان کو قتل کر کے اسلامی شریعت کی خلاف ورزی بھی کی اور ان حدود سے تجاوز بھی کیا جو ان کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ ان کو اس بات کا اختیار ہے کہ جس کو چاہیں اندھا کر دیں، جس کو چاہیں قتل کر دیں اور جس عورت کا چاہیں حمل گرا دیں تب تو شیاطین اور جنات کو وہ مقام حاصل ہو جاتا ہے جس کی نفی قرآن مجید نے کی ہے۔

اس روایت میں یہ مفروضہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ جس طرح انسانوں کے رسول ہیں اسی طرح جنات کے بھی رسول ہیں۔ یہ بات ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔ نبوت کے جو قاعدے ہیں اس مفروضہ سے ان کی نفی ہوتی ہے۔ نبی اور رسول کے لیے ضروری ہے کہ وہ مخاطب قوم کا فرد ہو۔ انہی کی زبان بولتا ہو اور انہی کی روایات اور نظریات کے اندر رہ کر اس کی پرورش ہوئی ہو۔ اسی بنا پر قرآن نے واضح کیا ہے کہ کوئی فرشتہ بھی انسانوں کے لیے نبی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کوئی انسان جنات کے لیے رسول نہیں ہو سکتا۔ یہ اصولی باتیں ہیں اور سنت الٰہی میں ان کو تبدیل نہیں کیا جاتا۔ دو باتیں جو تمام بھی نوع انسان اور دوسری مخلوق کے درمیان مشترک ہیں جیسے ایک خدا کا تصور اور اس کی عبادت، شرک سے اجتناب وغیرہ تو ان میں اشتراک ہو سکتا ہے۔ لہٰذا آنحضرتؐ کے متعلق یہ ماننا مشکل ہے کہ آپ جنات کے بھی رسول تھے۔ جنات سے آنحضرتؐ کی ملاقات تو ثابت ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ انہوں نے قرآن کی تعریف کی لیکن تعریف کرنا الگ چیز ہے اور اس کی شریعت کا متبع ہونا الگ چیز ہے۔ ان کے تقاضے اور مطالبے اور ان کا کھانا پینا الگ ہے۔ ان کے اور ہمارے درمیان کوئی اشتراک نہیں جبکہ یہ روایت سنت اللہ کے خلاف اس اشتراک پر مبنی ہے۔ میرے نزدیک یہ روایت ہمارے ہاں اسرائیلیات کے زیر اثر آئی ہے۔ یہود کے ہاں جنات کا بڑا مقام ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے دور کے متعلق تو یہودی لٹریچر بھرا پڑا ہے جو جنات کے تصور سے بالکل آراستہ ہے۔ دوسری قوموں مثلاً ہندوؤں کے ہاں ناگ پوجا کا خاص مقام ہے۔ ناگ پوجا بڑے اہتمام سے کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے ہاں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ جنات مختلف بھیس میں نمایاں ہوتے ہیں۔ ہندوؤں کے ہاں یہ تصور ہے کہ سانپ ان کے مقدس بھگوان کے طور پر آتے ہیں اس وجہ سے خطرے کو ٹوٹا رکھ کر وہ ان کی پوجا کرتے ہیں تاکہ نقصان نہ پہنچائیں۔ ہمارے ہاں یہ پورا کا پورا تصور حضرت ابو سعید خدریؓ کے ذریعے سے آ کر رکھ دیا گیا ہے۔ پیچھے جو کعب احبار کی روایت گزری ہے اس میں بھی یہ ہے کہ عراق میں بڑا خطرناک جن

پایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ مشرکانہ تصور، تسخیر جنات کا عمل اور نقش سلیمانی کا رواج یہودی سے آیا ہے۔ اور ہمارے نیک بندوں نے ہماری کتابوں میں گھسا دیا ہے۔ ان چیزوں سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

مَا يُؤْمَرُ بِهِ مِنَ الْكَلَامِ فِي السَّفَرِ

سفر میں کلام کے بارے میں احکام

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ إِذَا وَضَعَ رِجْلَهُ فِي الْغَرْزِ وَهُوَ يُرِيدُ السَّفَرَ يَقُولُ بِاسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيفَةُ فِي الْأَهْلِ اللّٰهُمَّ ازْوِلَنَا الْأَرْضَ وَهَوِّنْ عَلَيْنَا السَّفَرَ اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَ مِنْ كَآبَةِ الْمُنْقَلَبِ وَ مِنْ سُوءِ الْمَنْظَرِ فِي الْمَالِ وَالْأَهْلِ.

﴿امام مالک کو یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب رکاب میں پاؤں رکھتے اور ارادہ سفر ہوتا تو آپ یہ دعا فرماتے۔ اللہ کے نام سے۔ اے اللہ تو ہی سفر میں ساتھی ہے اور تو ہی اہل اور مال میں پیچھے رہنے والا ہے۔ اے اللہ ہمارے لیے زمین کو تہ فرما اور ہمارے سفر کو آسان کر۔ اے اللہ، میں تیری پناہ مانگتا ہوں سفر کی کلفتوں سے اور برے لوٹنے سے اور اہل و مال میں بد نمائی سے۔﴾

وضاحت:

اس روایت کے الفاظ ہی بتاتے ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے الفاظ ہیں اور معنویت کے لحاظ سے بہت ارفع ہیں۔ البتہ یہ بات ہے کہ اس کے مختلف ٹکڑے مختلف روایات سے لیے گئے ہیں۔ اس سے ایک خوبی تو یہ پیدا ہو گئی ہے کہ تمام کلمات ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں، لیکن ایک منظم دعا کی شان اس میں نہیں رہ گئی۔ یہ ایک مشہور روایت ہے اس کے باوجود معلوم نہیں کہ کس ذریعہ سے یہ امام صاحب کو پہنچی ہے۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ الثِّقَةِ عِنْدَهُ عَنْ يَعْقُوبَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الْأَشَجِّ عَنْ بُسْرِ بْنِ سَعِيدٍ عَنْ سَعِيدِ ابْنِ أَبِي وَقَّاصٍ عَنْ خَوْلَةَ بِنْتِ حَكِيمٍ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ نَزَلَ مَنْزِلًا فَلْيَقُلْ أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ فَإِنَّهُ لَنْ يَضُرَّهُ شَيْءٌ حَتّٰى يَرْتَحِلَ.

﴿خولہ بنت حکیم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی منزل پر اترے اور یہ دعا پڑھ لے کہ میں اللہ تعالیٰ کے کامل کلمات کے ذریعہ سے اس کی مخلوق کے شر سے پناہ مانگتا ہوں، تو اس وقت تک اسے کوئی چیز شر نہیں پہنچائے گی جب تک کہ وہاں سے کوچ نہ کر جائے۔﴾

وضاحت :

اس روایت میں اتنی بات تو بالکل واضح ہے کہ آپ سفر کے دوران جہاں بھی اتریں تو یہ کلمات ادا کریں کہ اے اللہ، میں تیری تمام صفات، نشانیوں اور احکام کے حوالہ سے تیری ہر مخلوقات کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔ یہ نہایت عمدہ دعا ہے جس میں تمام آفات و مصائب کا احاطہ ہو جاتا ہے اور ان سے رب کی پناہ مانگی جاتی ہے۔

آپ خواہ کسی فائیو سٹار ہوٹل میں ہی اتریں خطرات ہر جگہ موجود ہوتے ہیں اور آپ ان سے اللہ کی مدد کے بغیر مامون نہیں ہو سکتے۔ روایت کا آخری حصہ غور طلب ہے۔ دعا کے الفاظ ادا کر لینے سے اس بات کی ضمانت سمجھ میں نہیں آتی کہ جب تک آپ کوچ نہ کریں گے آپ کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ دعا کے بعد آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ امید ہے ایسا ہو گا لیکن اس میں قطعیت کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ دعا کی قبولیت مشیت الٰہی کے تحت ہے۔ صحیح وقت پر صحیح دعا کی جائے تو اللہ تعالیٰ ضرور قبول فرماتے ہیں لیکن قبولیت کا اظہار ضروری نہیں کہ فوراً ہو۔ ہو سکتا ہے کہ کسی اور مناسب وقت پر ہو۔ یہ بات بھی ہے کہ دعا اس شکل میں قبول نہ ہو جس شکل میں آپ نے چاہا ہو۔ بلکہ اس سے بہتر شکل میں قبول ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دعا قبول نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کی قبولیت کو حکمت کے خلاف سمجھتے ہوں۔ جب تک آپ یہ بات نہ مانیں مسئلہ حل نہیں ہو گا اور بڑی مایوسیاں پھیلیں گی۔ میں نے ساری زندگی دعاؤں میں گزاری ہے۔ کتنی دعائیں ہیں جو آج تک قبول نہیں ہوئیں لیکن میں یہی کہتا ہوں کہ اے اللہ، تیرا انعام تو بھی سے مانگے گا۔ اگر دعا منظور نہیں ہوئی تو بہتر نتیجے سامنے آئے ہیں۔ اس میں برکتیں ہوئی ہیں۔

میرے نزدیک اس روایت میں لن یضروہ شیئ کا جملہ اس قطعیت کے ساتھ جو آیا ہے تو کسی راوی کی غلط ترجمانی کا نتیجہ ہے۔ اس کی ذمہ داری آنحضرت ﷺ پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ عن النقطۃ عندہ سے مراد اگر زہری ہیں تو مسئلہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان کے متعلق یہ معلوم ہے کہ اگر طبیعت میں نشاط ہو تو بات کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتے ہیں اور اگر کسل ہو تو چھوڑ دیتے ہیں۔

مَاجَاءَ فِي الْوِحْدَةِ فِي السَّفَرِ لِلرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ

مردوں اور عورتوں کے اکیلے سفر کرنے کے بارے میں روایات

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ حَرْمَلَةَ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ الرَّاكِبُ شَيْطَانٌ وَالرَّاكِبَانِ شَيْطَانَانِ وَالثَّلَاثَةُ رَكْبٌ.

﴿عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اکیلا سوار ایک شیطان اور دو سوار دو شیطان ہوتے ہیں اور تین سوار مل کر قافلہ بنتا ہے۔﴾

وضاحت :

بعض لوگوں نے اس روایت کو لغوی معنوں میں لیا ہے جو کہ درست نہیں۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ اکیلا آدمی شیطان کے زیادہ نرغے میں ہوتا ہے۔ اس صورت میں دوسرا جملہ درست نہیں ہوتا کیونکہ اگر دو آدمی ہوں تب وہ شیطان کے دوہرے نرغے میں تو نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ اس صورت میں شیطان کا زور کچھ کم ہو جاتا ہے تب بات بنتی ہے۔ اس لیے معنی کے لحاظ سے جتنی بھی توجیہیں کی گئی ہیں میرا دل ان پر مطمئن نہیں۔ الفاظ کے لحاظ سے میرے نزدیک اگلی روایت آنحضرت ﷺ کے فرمان کی ٹھیک ترجمانی کرتی ہے۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ حَرْمَلَةَ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ الشَّيْطَانُ يَهُمُّ بِالْوَاحِدِ وَالِاثْنَيْنِ فَإِذَا كَانُوا ثَلَاثَةً لَمْ يَهُمَّ بِهِمْ.

﴿سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شیطان قصد کرتا ہے اکیلے کا اور دو کا، اور اگر تین ہوں تو پھر ان کا قصد نہیں کرتا۔﴾

وضاحت :

میں اس روایت کو اصل مانتا ہوں۔ یہ بات یاد رکھیے کہ یہ تذکرہ اس سفر کا ہے جب صحراؤں کا پیدل سفر ہوتا تھا یا زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ سواری اونٹ تھی اور ہر قدم خطرناک ہوتا تھا۔ تب ساتھی کی بڑی ضرورت تھی۔ آدمی تنہا سفر کرتا تو اس کے لیے بڑے خطرات تھے، دو ساتھی ہوتے تو قدرے کم خطرہ ہوتا اور تین سے جماعت بن

جاتی تھی۔ جراحت کی شکل میں اللہ تعالیٰ برکت ڈال دیتا ہے۔ کئی بڑے اہم سفر ہیں جن میں آنحضرتؐ نے دو کے ساتھ سفر کیا ہے۔ آپ کے سفر ہجرت میں کا ئیڈ کے علاوہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ہی آپ کے ہمراہ تھے۔ لہٰذا اس روایت کی توجیہ اس طرح کرلی جائے گی کہ وقت ضرورت خاص مصالح کے پیش نظر تین سے کم کے ساتھ بھی سفر کیا جاسکتا ہے۔

□ حدثنی مالكٌ عن سعيد بن ابي سعيد المقبريّ عن ابي هريرةَ انّ رسول اللهِ ﷺ قال لايحلُّ لامرأةٍ تؤمنُ باللهِ واليومِ الآخرِ تسافرُ مسيرةَ يومٍ وليلةٍ الّا مع ذي محرَمٍ منها.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی ایسی عورت کے لیے، جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والی ہے، یہ جائز نہیں کہ وہ ایک دن اور ایک رات کا سفر کسی محرم کے بغیر کرے۔﴾

وضاحت:

حنفیہ اور شوافع کے نزدیک منظم قافلے کے ساتھ عورت بغیر محرم کے سفر کرسکتی ہے۔ کیونکہ اس میں اس کے لیے خطرات نہیں ہوتے۔ بعض فقہاء کی رائے میں بوڑھی عورتوں کے لیے قید نہیں جبکہ دوسرے ہر عورت کے لیے محرم کی قید لگاتے ہیں۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے، اس کے بوڑھی ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ البتہ آج کل کے زمانے کے لحاظ سے مدت کا تعین بھی کرنا پڑے گا اور فاصلے کا بھی۔ کیونکہ اب ایک دن میں امریکہ پہنچنا ممکن ہوگیا ہے۔ اس بارے میں فقہاء نے جو حدیں اٹھائی ہیں وہ میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ نئے حالات کے لحاظ سے اس معاملہ میں اجتہاد کی ضرورت ہے۔

مَا يُؤمَرُ بِهِ مِنَ الْعَمَلِ فِي السَّفَرِ

سفر میں کیا کرنے کا حکم ہے

□ حدثنی مالكٌ عن ابي عُبَيْدٍ مولى سليمانَ بنِ عبدِالملكِ عن خالدِ بنِ معدانَ

يرفعهُ قال انّ اللهَ تبارك و تعالى رفيقٌ يُحبُّ الرِّفقَ و يرضى به و يُعينُ عليه مالا يُعينُ على العُنفِ فاذا ركبتُمْ هذهِ الدَّوابَّ العُجمَ فانزِلوها منازِلَها فانْ كانتِ الأرضُ جدبةً فانجُوا عليها بنِقْيِها و عليكُم بسيرِ اللَّيلِ فانّ الأرضَ تُطوى باللَّيلِ مالا تُطوى بالنَّهارِ و اياكُم والتَّعريسَ على الطَّريقِ فانّها طُرُقُ الدَّوابِّ و مأوى الحيّاتِ.

﴿خالد بن معدان مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نرم ہیں، نرمی کو پسند کرتے اور اس سے راضی ہوتے ہیں، اور اس پر ایسی مدد کرتے ہیں جو وہ شدت کی صورت میں نہیں کرتے۔ تو جب تم ان بے زبان جانوروں پر سوار ہوا کرو تو ان کو ان کی منزلوں میں ٹھہرا۔ اگر زمین بنجر ہو تو نکل جانے کی کوشش کرو قبل اس کے کہ ان کی چربی گھل جائے۔ اور رات کو سفر کرنے کی کوشش کیا کرو کیونکہ رات میں زمین آسانی سے طے ہوتی ہے جو کہ دن میں نہیں ہوتی۔ اور راستے میں اترنے سے بچو اس لیے کہ وہ سواریوں کا راستہ بھی ہوتا ہے اور سانپوں کا ٹھکانہ بھی۔﴾

وضاحت:

ظاہر ہے یہ نصیحتیں اس زمانے کے اونٹوں کے سفر سے متعلق ہیں اور تجربہ پر مبنی بہت عمدہ ہدایات ہیں۔ اگر یہ راوی کے تجربات ہیں تب بھی ٹھیک ہے۔ اور اگر آنحضرتؐ نے فرمایا ہے تو نور "علیٰ نور" ہے۔ غالباً اسی خیال سے انہوں نے یرفعہ کہہ دیا تاکہ لوگ اس کو راوی کے اپنے تجربات پر محمول نہ کریں۔

یہ ہدایت کہ اللہ تعالیٰ کو نرمی پسند ہے۔ وہ بندوں کے ساتھ خود نرمی کا معاملہ کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ بندے بھی یہی صفت اپنائیں، محض اونٹوں کے سفر کے لیے نہیں بلکہ زندگی کے تمام معاملات کے لیے ہے۔ سختی پسند آدمی ہر عموم معاملات کو بگاڑ لیتا ہے۔ نرم خوئی سے وہ کام بھی نکل آتے ہیں جو سختی سے نکالنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نرمی پسند آدمی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص مدد حاصل ہوتی ہے جس سے سختی پسند آدمی محروم رہ جاتا ہے۔

جانوروں کو منزلوں پر پڑاؤ کرانے کی ہدایت اس لیے ہے کہ وہاں پانی اور چارا فراہم ہوتا ہے۔ آپ منزل کے بغیر اتریں تو آپ اپنا توشہ دان نکال کر خود تو کھالیں گے لیکن بچارے جانور بھوکے پیاسے رہیں گے۔ لہٰذا پڑاؤ

کرتے وقت موزوں جگہ کا انتخاب نہایت ضروری ہے۔

عرب میں کئی علاقے بنجر اور صحرائی ہیں اور طویل فاصلوں تک ان میں نہ سبزہ نظر آتا ہے نہ پانی ملتا ہے۔ ایسے علاقوں میں تیزی سے سفر کرنے کی ہدایت فرمائی تاکہ جب تک جانور صحت مند اور فربہ ہوں وہ بنجر علاقے سے نکل جائیں۔ اس دوران میں ان کی چربی ان کے لیے قوت کا باعث بنے اور وہ سفر کی کلفت برداشت کر سکیں۔

عرب میں رات کو سفر کرنے کی روایت بھی موجود تھی۔ متعدد روایات میں یہ بیان ہوا ہے کہ نبی ﷺ نے رات میں سفر کیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دن میں شدید گرمی ہوتی ہے، پیاس زیادہ لگتی ہے اور لو میں سفر سہولت سے نہیں کٹتا۔ صحرا کی رات خنک ہوتی ہے اور سفر تیزی سے طے ہوتا ہے۔ شب میں پڑاؤ کرنے کے بارے میں آنحضرتؐ نے ہدایت فرمائی کہ قافلہ چلتے راستہ سے ہٹ کر قیام کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جانور اپنے جانے پہچانے راستہ پر چلنے کے عادی ہوتے ہیں اور قافلے کا راستہ کے اوپر پڑاؤ ان کے لیے مشکل پیدا کر سکتا ہے۔ اسی طرح سانپ اور دوسرے خطرناک جانور بھی عموماً عام راستہ ہی اختیار کرتے ہیں۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ سُمَيٍّ مَوْلَى أَبِي بَكْرٍ عَنْ أَبِي صَالِحٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ السَّفَرُ قِطْعَةٌ مِنَ الْعَذَابِ يَمْنَعُ أَحَدَكُمْ نَوْمَهُ وَ طَعَامَهُ وَ شَرَابَهُ فَإِذَا قَضَى أَحَدُكُمْ نَهْمَتَهُ مِنْ وَجْهِهِ فَلْيُعَجِّلْ إِلَى أَهْلِهِ.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے۔ وہ تمہیں تمہاری نیند سے اور کھانے پینے سے محروم رکھتا ہے۔ تو جب کوئی شخص صحیح طریقے سے اپنی ضرورت پوری کر لے تو جلد گھر واپس لوٹے۔﴾

وضاحت :

یہ بات بھی تجربات پر مبنی اور بڑی معقول ہے۔ سفر چاہے آج کل کا ہو یا اس زمانے کا، سفر و حضر میں کچھ فرق تو ضرور ہوتا ہے۔ آدمی جب بھی گھر سے باہر ہو گا روزانہ کے معمولات میں لازماً خلل واقع ہو گا۔

بعض لوگ اپنی زندگی سفر میں گزارتے اور اسی میں لطف پاتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ لوگ وہ ہوتے ہیں جن کے لیے گھر میں پابندی ہوتی ہے ورنہ کوئی معقول آدمی ایسا نہیں کر سکتا۔

اَلْاَمْرُ بِالرِّفْقِ بِالْمَمْلُوكِ

غلام کے ساتھ نرم رویہ کا حکم

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لِلْمَمْلُوكِ طَعَامُهُ وَ كِسْوَتُهُ بِالْمَعْرُوفِ وَلَا يُكَلَّفُ مِنَ الْعَمَلِ إِلَّا مَا يُطِيقُ.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ غلام کے لیے اس کا کھانا اور اس کا کپڑا دستور کے مطابق ہے اور اس پر کسی ایسے کام کا بوجھ نہ ڈالا جائے جو اس کی طاقت سے زیادہ ہو۔﴾

وضاحت :

دستور کے مطابق کا مطلب یہ ہے کہ اس پسندیدہ طریقے کے مطابق جو معاشرہ میں رائج ہو اور یہ مطلب بھی ہے کہ جو آپ کھائیں اس کو بھی کھلائیں اور جو خود پہنیں اس کو بھی پہنائیں۔ معروف اسلامی قانون کا ماخذ بھی ہے۔ لہٰذا اس کو تھائر کی روشنی میں متعین کرنا ہو گا۔ عربوں کے ہاں معروف یہ تھا کہ کھانا پکا کر درمیان میں رکھ دیتے اور لوگ سب چھوٹے بڑے نوکر اور خود بیٹھ جاتے اور کھانا شروع کر دیتے۔ نوکر کے ساتھ جو سلوک ہے وہی غلام کے ساتھ بھی ہو گا بلکہ وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔ اشتراکیت پسندوں کے لیے یہ روایتیں قابل غور ہیں۔ اس سے بہتر طریقہ مارکس کے جد امجد بھی نہیں بتا سکتے۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ كَانَ يَذْهَبُ إِلَى الْعَوَالِي كُلَّ يَوْمِ سَبْتٍ فَإِذَا وَجَدَ عَبْدًا فِي عَمَلٍ لَا يُطِيقُهُ وَضَعَ عَنْهُ مِنْهُ.

﴿مالک کو یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ ہر ہفتے کے دن مدینہ کی بالائی بستیوں کی طرف نکل جایا کرتے تھے اور اگر دیکھتے کہ کوئی غلام ایسے کام میں لگایا گیا ہے جو اس کی طاقت سے زیادہ ہے تو اس کو کم کر دیتے۔﴾

وضاحت :

"عوالی" سے مراد مدینہ منورہ کے مشرق میں واقع مضافاتی بستیاں ہیں جو نبی ﷺ کے زمانہ میں تو شہر سے

کچھ فاصلے پر تھیں لیکن اب اس کا حصہ بن چکی ہیں۔ حضرت عمرؓ ایک بیدار حکمران تھے۔ مدینہ میں ہر وقت نگرانی ممکن تھی، مضافاتی قریوں کی نگرانی کے لیے بھی وہاں میں جایا کرتے۔ عوامی کے لیے تو انہوں نے ایک دن مخصوص کر رکھا تھا۔ وہ حالات کا جائزہ لیتے۔ اگر کسی غلام سے زیادہ مشقت لی جارہی ہوتی تو اس میں کمی کا حکم دیتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حکومت ایسے معاملات میں دخل دے سکتی ہے۔ کمزوروں کو ظالم مالکوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ جب تک اس طرح کا حاکم نہ ہو معاشرہ کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ آج کل تو اخباروں کی نگرانی ہے۔ لیڈر لوگ ان کے مشوروں پر چلتے اور ان کے پراپیگنڈے سے اسی طرح گھبراتے ہیں جس طرح اپنی دعاؤں سے گھبراتے ہیں۔ ایسے لیڈر معاشرہ کی اصلاح کیا خاک کریں گے!

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَمِّهِ اَبِي سُهَيْلِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ اَبِيهِ اَنَّهُ سَمِعَ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ وَهُوَ يَخْطُبُ وَهُوَ يَقُولُ لَا تُكَلِّفُوا الْاَمَةَ غَيْرَ ذَاتِ الصَّنْعَةِ الْكَسْبَ فَاِنَّكُمْ مَتَى كَلَّفْتُمُوهَا ذٰلِكَ كَسَبَتْ بِفَرْجِهَا وَلَا تُكَلِّفُوا الصَّغِيرَ الْكَسْبَ فَاِنَّهُ اِذَا لَمْ يَجِدْ سَرَقَ وَ عُفُّوا اِذَا اَعَفَّكُمُ اللّٰهُ وَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْمَطَاعِمِ بِمَا طَابَ مِنْهَا.

﴿امام مالک کے داوا بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عثمان بن عفان کو خطبے میں یہ فرماتے سنا کہ لوگو! اپنی لونڈیوں پر کمائی کے لیے ایسا بوجھ نہ ڈالو کہ جس کا ان کو ذہب نہیں۔ اس لیے کہ جب تم اس طرح کا بوجھ ڈالو گے تو وہ اپنی ناموس بیچ کر ہی کمائیں گی۔ بچے کو بھی کمانے پر مجبور نہ کرو اس لیے کہ اگر وہ کما نہ سکا تو چوری کرے گا۔ اور تم ان سے نرمی کرو جیسے اللہ نے تمہارے ساتھ کی ہے اور تم ان کو وہ کھانا کھلاؤ جو اچھا ہو۔﴾

وضاحت :

یہ بہت حکیمانہ باتیں ہیں۔ لونڈیوں کی کمائی کھانے کے لیے ان کو ایسے کام پر لگانا جس کی اہلیت اور تجربہ وہ نہیں رکھتیں اور پھر مطالبہ کرنا کہ اتنی رقم وہ کما کر لائیں، ایک ایسی حرکت ہے جو معاشرہ میں فساد کا باعث بن سکتی ہے۔ لونڈیاں جب اپنی محنت سے مالک کے مطالبہ کے مطابق کمائی نہیں کر سکیں گی تو کمی کو پورا کرنے کے لیے اپنی ناموس بیچنے کی راہ اختیار کریں گی۔ اسی طرح بچوں کا معاملہ ہے۔ ان پر کمائی کی ذمہ داری ڈالنا ظلم ہے۔ ان کو پڑھا

سکھا کر کمانے کے قابل کرنا چاہیے۔ یہ جائز نہیں کہ آپ ان کی کمائی کھائیں۔ اگر ایسا کرو گے تو ان کے لیے سب سے آسان راستہ تو چوری کرنے کا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے یہ بھی فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم پر فضل کیا ہے تم بھی دوسروں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرو تاکہ اللہ کے فضل کا شکر ادا ہو۔ اسی طرح کمزوروں کو وہ کھانا کھلاؤ جو تم خود پسند کرتے ہو۔

مَاجَاءَ فِي الْمَمْلُوكِ وَهَيْئَتِهِ

غلام اور اس کی ہیئت کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ الْعَبْدُ اِذَا نَصَحَ لِسَيِّدِهِ وَ اَحْسَنَ عِبَادَةَ اللّٰهِ فَلَهُ اَجْرُهُ مَرَّتَيْنِ.

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ غلام جب اپنے آقا کی خیر خواہی کرتا ہے اور ٹھیک طریقے سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے تو اس کو دوہرا اجر ملے گا۔﴾

وضاحت :

یعنی ایک اجر غلام کو آقا کی خیر خواہی کا اور دوسرا اللہ تعالیٰ کی عبادت کا ملے گا۔ قانون جو بھی ہو اس پر دیانتداری اور وفاداری سے عمل کرنے میں ہی خیر ہوتی ہے، اس لیے کہ افراد کا کام بغاوت کرنا نہیں۔ یہ معاشرے کا کام ہے کہ سسٹم کو تبدیل کرے۔ غلامی کا طریقہ اسلام کا کوئی جزو نہ تھا بلکہ بین الاقوامی حالات کے تحت مسئلے کا ایک مجبورانہ حل تھا۔ اس نظام کے تحت جو غلام وفاداری سے کام کرتے تو ان کے لیے آنحضرتؐ نے دوہرے اجر کی خبر دی۔ اسلام نے اپنے نظام کے اندر جس حد تک ضروری تھا اصلاح کر دی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ لوگوں نے اس پر عمل نہیں کیا۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ اَمَةً كَانَتْ لِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ ابْنِ الْخَطَّابِ رَآهَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَقَدْ تَهَيَّاَتْ بِهَيْئَةِ الْحَرَائِرِ فَدَخَلَ عَلٰى ابْنَتِهِ حَفْصَةَ فَقَالَ اَلَمْ اَرَ جَارِيَةَ اَخِيكِ تَخُوسُ النَّاسَ وَقَدْ تَهَيَّاَتْ بِهَيْئَةِ الْحَرَائِرِ وَ اَنْكَرَ ذٰلِكَ عُمَرُ.

﴿امام مالک کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک لونڈی تھی۔ اس کو حضرت عمرؓ نے اس حال میں دیکھا کہ وہ شریف زادیوں کے فیشن میں ہے۔ حضرت عمرؓ اپنی بیٹی حضرت حفصہؓ کے پاس گئے اور کہا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے بھائی کی لونڈی لوگوں کے اندر گھسی پڑتی ہے اور اس نے شریف زادیوں جیسی شکل بنا رکھی ہے۔ اس چیز کو حضرت عمرؓ نے ناگوار مانا۔﴾

وضاحت :

اس میں ناگواری کا پہلو یہ نہیں تھا کہ لونڈی ہو کر اس نے شریف زادیوں کا لباس پہن رکھا ہے بلکہ یہ تھا کہ وہ مردوں کے اندر گھسی پڑتی ہے اور اس مقصد کے لیے اس نے لباس بھی شریف زادیوں کا اختیار کیا ہے۔ گویا لباس پر اعتراض نہ تھا بلکہ رویے پر تھا جس کے اپنانے کے لیے اس نے لباس بھی بدلا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہیئت حرائر (آزاد عورتوں کی ہیئت) سے حضرت عمرؓ نے یہ مطلب لیا ہو کہ وہ تبرج جاہلیہ یعنی دور جاہلیت کی نمود و نمائش کی شکل اختیار کرتی ہے۔ لیکن قرین قیاس یہی بات ہے کہ مردوں میں گھسنے کا شوق پورا کرنے کے لیے فیشن کرتی ہے۔ مجرد یہ بات کہ کسی لونڈی نے شریف زادیوں کا لباس پہن لیا اعتراض کی بات نہ تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی قوم کا دوسری قوم کی نقل کرنا سفلہ پن ہے۔ حالات میں جو تغیر قدرتی طور پر ہوتا ہے وہ قابل اعتراض نہیں۔

مَاجَاءَ فِي الْبَيْعَةِ

بیعت کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ ابْنَ عُمَرَ قَالَ كُنَّا اِذَا بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ يَقُوْلُ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِيمَا اسْتَطَعْتُمْ.

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جب ہم رسول اللہ ﷺ سے سمع و طاعت کی بیعت کرتے تھے تو آپ فرماتے کہ اس شرط کے ساتھ کرو کہ اپنی استطاعت کے مطابق۔﴾

وضاحت :

سمع و طاعت سے مراد اس بات کا اقرار ہے کہ ہمیں جو حکم دیا جائے گا ہم اس کو سنیں گے اور اس کو بجا

لائیں گے۔ یہ بیعت صرف صاحب امر کے لیے ہوتی ہے۔ آنحضرت ﷺ جو بیعت لیتے وہ صاحب امر ہی کی حیثیت سے لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح آپ نے جہاد کا حکم روز اول سے نہیں دیا اسی طرح یہ بیعت بھی روز اول سے نہیں لی بلکہ مدینہ منورہ میں جب اسلامی ریاست وجود میں آگئی اس وقت آپ نے لوگوں سے سمع و طاعت کی بیعت لینا شروع کیا۔ اب ہمارے ہاں یہ بیعت ختم ہو چکی ہے۔ چیروں کے ہاں جو بیعت رائج ہے وہ سمع و طاعت کی نہیں بلکہ ہدایت کی ہوتی ہے۔

بیعت کا معاملہ ذرا سنگین ہوتا ہے۔ اس کو لفظاً و معناً دونوں طریقوں سے پورا کرنا پڑتا ہے۔ اگر استطاعت کی قید نہ لگائی جائے تو آپ اس کے پابند ہیں کہ جو حکم بھی ملے اس کو پورا کریں۔ اب اگر آپ جھوٹا عذر تراش کریں گے تو عذر تو دون جائے گا لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ نہیں بچ سکیں گے۔ ہاں جو صحیح عذر ہو گا وہی قبول ہو گا۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ عَنْ اُمَيْمَةَ بِنْتِ رُقَيْقَةَ اَنَّهَا قَالَتْ اَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فِي نِسْوَةٍ نُبَايِعُهُ عَلَى الْاِسْلَامِ فَقُلْنَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نُبَايِعُكَ عَلَى اَنْ لَّا نُشْرِكَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا نَسْرِقَ وَلَا نَزْنِيَ وَلَا نَقْتُلَ اَوْلَادَنَا وَلَا نَاْتِيَ بِبُهْتَانٍ نَّفْتَرِيْهِ بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَاَرْجُلِنَا وَلَا نَعْصِيَكَ فِي مَعْرُوْفٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِيمَا اسْتَطَعْتُنَّ وَاَطَقْتُنَّ قَالَتْ فَقُلْنَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَرْحَمُ بِنَا مِنْ اَنْفُسِنَا هَلُمَّ نُبَايِعْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنِّي لَا اُصَافِحُ النِّسَاءَ اِنَّمَا قَوْلِي لِمِائَةِ امْرَاَةٍ كَقَوْلِي لِامْرَاَةٍ وَّاحِدَةٍ اَوْ مِثْلِ قَوْلِي لِامْرَاَةٍ وَّاحِدَةٍ.

﴿امیمہ بنت رقیقہ کہتی ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عورتوں کی جماعت کے ساتھ آئیں کہ اسلام پر آپ کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ عورتوں نے کہا کہ ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتی ہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گی، چوری نہیں کریں گی، زنا کی مرتکب نہیں ہوں گی، اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی، اور اپنے ہاتھ اور پاؤں کے درمیان (یعنی ناموس پر) ایک دوسری پر بہتان نہیں لگائیں گی، اور کسی امر معروف میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جہاں تک تمہاری استطاعت اور طاقت کے اندر ہے۔ انہوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول ہم سے زیادہ ہم پر مہربان ہیں اور کہا کہ آیئے آپ کے ہاتھ پر بیعت کریں یا رسول اللہ! تو رسول اللہ

ﷺ نے فرمایا کہ میں عورتوں سے ہاتھ میں ہاتھ لے کر بیعت نہیں لیتا۔ پھر میری بات سو عورتوں سے ایسی ہے جیسی ایک عورت سے۔﴾

وضاحت :

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سورہ ممتحنہ کا حکم ان عورتوں کے سامنے تھا کہ جب آپ کے پاس مسلمان عورتیں بیعت کے لیے آئیں تو ان سے فلاں فلاں بات پر بیعت لیں تب ان عورتوں نے کہا کہ حضور ہم ان باتوں پر آپ سے بیعت کرتی ہیں۔ آپ نے ان کو یہ ہدایت کی کہ بیعت کو اپنی استطاعت اور طاقت کے مطابق مشروط کرو۔ وجہ وہی ہے کہ بیعت بڑی اہم چیز ہے۔ اس کے لیے مجمل اور مبہم الفاظ استعمال کرنے میں خطرہ ہے۔ یہ اسی طرح کی بات ہے جیسے ان شاء اللہ کہا جاتا ہے۔ اس سے معاملہ میں آپ کو مطلق اختیار حاصل نہیں ہو جاتا۔ آپ کوشش کر سکتے ہیں۔ جدوجہد کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اس پر ان عورتوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول ہم پر زیادہ مہربان ہیں کہ انہوں نے یہ قید لگا کر ادائیگی میں بڑی مہربانی کی اور ہم کو گنجائش دے کر ایک بڑی ذمہ داری سے بچا لیا۔ چنانچہ انہوں نے فوراً آنحضرتؐ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی خواہش کی۔

ان عورتوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ بیعت صرف ہاتھ میں ہاتھ دینے سے ہی مکمل ہوتی ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں، میں عورتوں سے ہاتھ نہیں ملاتا۔ اس میری بات آپ سب عورتوں کے لیے اسی طرح کافی ہے جس طرح کہ وہ ایک عورت کے لیے کافی ہے۔

بین ایدیھن و ارجلھن کی شرح بہت سے لوگوں نے مختلف کی ہے، لیکن میں نے تفسیر میں بھی یہی لکھا ہے کہ یہ ناموس ہی کے متعلق ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ناموس کی جتنی چیزیں ہیں وہ اسی دائرے میں یعنی ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان آجاتی ہیں۔ ان میں کسی قسم کی تہمت لگائی جائے تو وہ اس کے ذیل میں آجائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ واضح زنا ہی نہیں بلکہ اس کے قریب کی حرکتیں جیسی نوعیت کی بھی ہوں ان کے متعلق افترا پردازی اور بہتان نہیں لگائیں گی۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ كَتَبَ إِلَى عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ مَرْوَانَ يُبَايِعُهُ فَكَتَبَ إِلَيْهِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ أَمَّا بَعْدُ لِعَبْدِ اللّٰهِ عَبْدِ الْمَلِكِ

أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ سَلَامٌ عَلَيْكَ فَإِنِّي أَحْمَدُ إِلَيْكَ اللّٰهَ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَ أُقِرُّ لَكَ بِالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ عَلَى سُنَّةِ اللّٰهِ وَسُنَّةِ رَسُولِهِ فِيمَا اسْتَطَعْتُ.

﴿حضرت عبداللہ بن عمر نے عبدالملک بن مروان کے نام بیعت کرنے کے لیے خط لکھا تو وہ یوں لکھا۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ امابعد۔ اللہ کے بندے عبدالملک بن مروان امیر المومنین کی طرف۔ آپ پر اللہ کی سلامتی ہو۔ میں آپ کے آگے اللہ کی حمد کرتا ہوں کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور آپ کے لیے سمع وطاعت کا اقرار کرتا ہوں سنت اللہ اور سنت رسول کے مطابق، اپنی استطاعت کی حد تک"۔﴾

وضاحت :

اس روایت سے ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ سمع وطاعت کی بیعت خط کے ذریعے بھی ہو سکتی ہے اور اس زمانہ میں فون پر بھی اس کا اقرار کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے عبداللہ بن عمرؓ کے اس اثر سے معلوم ہوا کہ ان کا اثر معمولی چیز نہیں۔ احتیاط کی جو حد ممکن ہے وہ کرتے ہیں۔ تو دیکھئے اس خط میں بھی انہوں نے لکھا اللہ کے بندے عبدالملک کے لیے۔ یہ انہی کی شان ہے۔ آج کل تو لوگ بڑا ایکسیلنسی وغیرہ لکھتے ہیں۔ البتہ میری رائے میں کئی معاملات میں ان کے تشدد سے بچنا چاہیے۔

مَا يُكْرَهُ مِنَ الْكَلَامِ

کیا باتیں ہیں جو مکروہ ہیں

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ قَالَ لِأَخِيهِ كَافِرٌ فَقَدْ بَاءَ بِهَا أَحَدُهُمَا.

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اپنے بھائی کو کہا "اے کافر" تو بہر حال ایک کے اوپر وہ لوٹ کے رہے گا۔﴾

وضاحت :

یعنی اگر جس کو کافر کہا ہے وہ ایسا نہیں تو کہنے والا کافر بن جائے گا۔ مطلب یہ کہ یہ تیر بے خطا ہے۔ اگر وہ کافر نہیں تو خود مرو گے اور اگر وہ ہے تو وہ مرا۔ اس کی جتنی دوسری تاویلیں لوگوں نے کی ہیں وہ ٹھیک نہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تکفیر کے فتوے دینے والوں کا کام بے حد خطرناک ہے۔ اگر کافر قرار دیا جانے والا آدمی کافر نہیں تو ان کے فتوے انہی پر لوٹ جائیں گے۔

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ سُهَيْلِ بْنِ أَبِي صَالِحٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ إِذَا سَمِعْتَ الرَّجُلَ يَقُولُ هَلَكَ النَّاسُ فَهُوَ أَهْلَكُهُمْ.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم کسی آدمی کو سنو کہ وہ کہتا ہے کہ لوگ ہلاک ہوں تو سب سے بڑا ہلاک ہونے والا وہ خود ہے۔﴾

وضاحت :

ہم بات بات پر کہتے ہیں کہ لوگ تباہ ہو گئے، خلق تباہ ہو گئی لیکن یہ تاثر انحطاط قوم کے طور پر ہوتا ہے۔ یہاں هلك الناس کا جو کلمہ آیا ہے یہ بددعا کے طریقے پر ہے کہ لوگ تباہ ہو جائیں، جہنم میں جائیں، غارت ہوں۔ ایسی بات ہرگز نہیں کہنی چاہیے۔ اگر اپنے بھائیوں کو دعا نہیں دے سکتے تو بددعا بھی نہ دیں۔ بلکہ یہاں اس مفہوم میں یہ بات درست ہوگی کہ چاہیے کہ لوگوں کو دعا ہی دیں۔

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَا يَقُلْ أَحَدُكُمْ يَا خَيْبَةَ الدَّهْرِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الدَّهْرُ.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص یہ نہ کہے کہ ہائے زمانہ کی بدبختی اس لیے کہ خدا ہی زمانہ ہے۔﴾

وضاحت :

مطلب یہ ہے کہ بے سمجھے بوجھے زمانہ کو بدخت کہہ دیا جاتا ہے۔ دنیا میں سارے تصرفات تو اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں، زمانہ کوئی چیز نہیں۔ تو زمانے کو گالی دینا اللہ تعالیٰ کو ہی برا بھلا کہنا ہوا۔ دوسری روایت میں لا تسبوا الدهر

کا لفظ آیا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ روایت بالمعنی ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ زمانے کو گالی نہ دو کیونکہ زمانہ خود اللہ ہی ہے۔ اس میں فلسفیوں نے جو باتیں نکالی ہیں وہ ان کی موشگافیاں ہیں۔ لیکن یہ بات بالکل معقول ہے کہ گالی جتنی پڑتی ہے اللہ کو ہی پڑتی ہے۔ کیونکہ زمانہ تو اللہ تعالیٰ کے تصرفات کو ہی کہتے ہیں۔ لہٰذا زمانے کو مطعون نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کرنا ہی ہو تو اہل زمانہ کو کریں، اس لیے کہ وہ مستحق ملامت ہو سکتے ہیں۔ ان کے متعلق بھی اس طرح کی بات کہنا چاہیے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے خواہ مخواہ اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم سب لوگ زبان و رائج میں اسی طرح کی باتیں کرتے ہیں جن سے نبی ﷺ نے روکا ہے اور جو آداب کے خلاف ہیں۔

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ أَنَّ عِيسَى بْنَ مَرْيَمَ لَقِيَ خِنْزِيرًا بِالطَّرِيقِ فَقَالَ لَهُ انْفُذْ بِسَلَامٍ فَقِيلَ لَهُ تَقُولُ هَذَا لِخِنْزِيرٍ فَقَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ إِنِّي أَخَافُ أَنْ أُعَوِّدَ لِسَانِي الْمَنْطِقَ بِالسُّوءِ.

﴿یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم کے راستے میں ایک سؤر آ گیا تو انہوں نے کہا کہ خیریت کے ساتھ تشریف لے جاؤ۔ آپ سے کہا گیا کہ آپ خنزیر کو یہ کہہ رہے ہیں تو حضرت عیسیٰ نے کہا کہ میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ اپنی زبان کو بد کلامی کا عادی بنا لوں۔﴾

وضاحت :

غور کریں کہ یہ روایت کس پہلو سے حدیث ہے۔ حدیث کی کسی تعریف پر یہ پوری نہیں اترتی۔ یہ بات رائج انجیلوں میں بھی نہیں اور انجیل برنباس میں بھی نہیں۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے کی کوئی روایت رہی ہوگی۔ جو کہیں سے یحییٰ بن سعید کے کان میں پڑ گئی تو انہوں نے اس کو گرو کر لیا اور امام صاحب نے اپنی کتاب میں جڑ دیا۔ واللہ اعلم کہ حضرت عیسیٰ نے یہ کہا بھی یا نہیں۔ ان کے کلام میں جو بلاغت ہوتی ہے وہ روایت کردہ جملہ میں نہیں ہے۔ طنز ضرور ہے کہ آپ خیریت سے نکل جاؤ ہم کچھ نہیں کہتے۔

مَا يُؤْمَرُ بِهِ مِنَ التَّحَفُّظِ فِي الْكَلَامِ

بات کرنے میں احتیاط کے بارے میں حکم

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ عَلْقَمَةَ عَنْ أَبِيهِ عَنْ بِلَالِ بْنِ الْحَارِثِ

الْمُزَنِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ رِضْوَانِ اللّٰهِ مَا كَانَ يَظُنُّ اَنْ تَبْلُغَ مَا بَلَغَتْ يَكْتُبُ اللّٰهُ لَهُ بِهَا رِضْوَانَهُ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَاهُ وَ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ سَخَطِ اللّٰهِ مَا كَانَ يَظُنُّ اَنْ تَبْلُغَ مَا بَلَغَتْ يَكْتُبُ اللّٰهُ لَهُ بِهَا سَخَطَهُ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَاهُ.

﴿بلال بن حارث مزنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بعض اوقات آدمی ایک بات اپنی زبان سے اللہ کی رضا کی نکالتا ہے، اس کو معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کہاں تک پہنچے گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ قیامت تک، جب وہ اس سے ملے گا، اس کے لیے اپنی خوشنودی لکھ دیتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک آدمی زبان سے خدا کے غضب کا کلمہ نکالتا ہے تو اس کو گمان نہیں ہوتا کہ بات کہاں تک پہنچے گی لیکن اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ قیامت تک کے لیے، جب وہ اس سے ملے گا، اپنا غضب لکھ دیتا ہے۔﴾

وضاحت :

کلمہ تو ایک آدمی کہہ دیتا ہے اور اس کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی قدر و قیمت کیا ہے۔ سچی بات اگر صحیح وقت پر زبان سے نکلی تو اس کو نہیں معلوم ہوتا کہ اس کا اجر و ثواب کیا ہے اور اللہ کے ہاں اس کا کیا درجہ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ قیامت تک کے لیے اپنی رضا اس شخص کے لیے لکھ دیتا ہے۔ اسی طرح سے اس کا دوسرا رخ بھی ہے کہ زبان سے کوئی کلمہ اللہ تعالیٰ کی ہرا نعمتی کا نکلا تو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی زد کہاں تک ہے اور وہ اللہ کے غضب کو دعوت دینے والا ہوتا ہے۔ لہٰذا گفتگو میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو اس کی توفیق دے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زبان کتنی بڑی طاقت ہے۔ آدمی کی زبان سے ایک فقرہ نکل جاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ مذاق کی بات تھی جبکہ وہ چیز اس کی عاقبت کو خراب کرنے والی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ اعلیٰ طریقے سے یہ حقیقت نہیں سمجھائی جا سکتی جتنا اس حدیث میں سمجھا دیا گیا ہے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِيْنَارٍ عَنْ اَبِي صَالِحٍ السَّمَّانِ اَنَّهُ اَخْبَرَهُ اَنَّ اَبَاهُرَيْرَةَ قَالَ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مَا يُلْقِي لَهَا بَالًا يَهْوِي بِهَا فِي جَهَنَّمَ وَ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مَا يُلْقِي لَهَا بَالًا يَرْفَعُهُ اللّٰهُ بِهَا فِي الْجَنَّةِ.

﴿ابو صالح سمان نے خبر دی کہ ابو ہریرہؓ نے کہا کہ آدمی بعض دفعہ بات کر بیٹھتا ہے۔ وہ اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا جبکہ وہ اس کو جہنم میں جا گراتی ہے۔ اور آدمی بسا اوقات ایک بات کر دیتا ہے، وہ اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا جبکہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے جنت میں اس کے درجات بلند کرتا ہے۔﴾

وضاحت :

یہ پچھلی روایت والا مضمون ہے۔ اس میں روایت کے الفاظ بدل گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنے لفظوں میں بات کہی ہے۔ یہ روایت موقوف ہے جب کہ پہلے والی مرفوع ہے۔

مَا يُكْرَهُ مِنَ الْكَلَامِ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللّٰهِ

اللہ کے ذکر کے بغیر کہی ہوئی بات کا ناپسندیدہ ہونا

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ زَيْدِ ابْنِ اَسْلَمَ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّهُ قَالَ قَدِمَ رَجُلَانِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَخَطَبَا فَعَجِبَ النَّاسُ لِبَيَانِهِمَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا اَوْ قَالَ اِنَّ بَعْضَ الْبَيَانِ لَسِحْرٌ.

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دو آدمی مشرق سے آئے تو انہوں نے اپنی بات اس خوبی سے کہی کہ سب لوگ عش عش کر اٹھے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کلام میں جادو ہوتا ہے۔ یا یوں فرمایا کہ بعض کلام جادو ہوتا ہے۔﴾

وضاحت :

عرب کے مشرق میں عراق اور ایران ہیں۔ یہ دونوں شخص انہی علاقوں کے رہے ہوں گے۔ لگتا ہے یہ دونوں بڑے خطیب اور انہوں نے سامعین کو بے حد متاثر کیا۔ بلاشبہ خطابت بڑا فن ہے اور اس میں سحر ہوتا ہے جو سامعین کو مسحور کر لیتا ہے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ كَانَ يَقُوْلُ لَا تُكْثِرُوا الْكَلَامَ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللّٰهِ فَتَقْسُوَ قُلُوْبُكُمْ فَاِنَّ الْقَلْبَ الْقَاسِيَ بَعِيْدٌ مِنَ اللّٰهِ وَلٰكِنْ لَا تَعْلَمُوْنَ وَلَا تَنْظُرُوْا فِي

ذُنُوبِ النَّاسِ كَاَنَّكُمْ اَرْبَابٌ وَانْظُرُوا فِي ذُنُوبِكُمْ كَاَنَّكُمْ عَبِيدٌ فَاِنَّمَا النَّاسُ مُبْتَلًى وَ مُعَافًى فَارْحَمُوا اَهْلَ الْبَلَاءِ وَ احْمَدُوا اللّٰهَ عَلَى الْعَافِيَةِ.

﴿امام مالک کو یہ بات پہنچی کہ عیسیٰ بن مریم فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کے ذکر کے بغیر زیادہ باتیں نہ کیا کرو ورنہ تمہارے دل سخت ہو جائیں گے، اور سخت دل اللہ سے بہت دور ہوتا ہے، لیکن تم جانتے نہیں۔ اور لوگوں کے گناہوں پر آقاؤں کے طریقے پر نگاہ نہ ڈالو بلکہ اپنے گناہوں پر غلاموں کے طریقے سے نگاہ رکھو۔ ہر شخص ابتلا میں ڈالا جاتا ہے اور معافی بھی ملتی ہے۔ تو جو لوگ ابتلا میں ڈالے جائیں ان پر رحم کرو۔ اور اللہ کا شکر کیا کرو جب عافیت نصیب ہوئی ہو۔﴾

وضاحت :

اگرچہ حضرت عیسیٰ کا یہ قول انجیلوں میں موجود نہیں لیکن بات بالکل ٹھیک ہے کہ زیادہ کلام سے دل سخت ہو جاتا ہے۔ میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہیؒ بھی کہا کرتے تھے کہ زیادہ تقریریں کرنے سے آدمی کا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ جو لوگ زیادہ تقریر کرتے ہیں یہ واقعہ ہے کہ میں نے ان کو بے حد سنگدل پایا۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ كَانَتْ تُرْسِلُ اِلَى بَعْضِ اَهْلِهَا بَعْدَ الْعَتَمَةِ فَتَقُولُ اَلَا تُرِيحُونَ الْكَتَّابَ.

﴿مالکؒ کو یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عائشہؓ اپنے کچھ عزیزوں کے پاس عشاء کے بعد اپنا آدمی بھیجتیں اور کہتیں: ابھی کراماً کاتبین کو آرام نہیں کرنے دو گے!﴾

وضاحت :

معلوم ہوتا ہے حضرت عائشہؓ کے یہ عزیز عشاء کے بعد باتوں میں مصروف رہتے تھے۔ بالآخر ام المومنین کو یہ پیغام بھجوانا پڑتا کہ یہ ہوا اس کب تک جاری رہے گی۔ خدا کے بندو، اب تو کراماً کاتبین کو آرام کرنے کا موقع دو۔

ہمارے معاشرہ میں بھی یہ حال ہے کہ ۹ بجے شب کے بعد اصلی زندگی شروع ہوتی ہے۔ رات کو دکانات،

سماجی اڈیاں اور شرفاء کا گان اپنے تمام کھلونوں کے ساتھ کھیل میں لگ جاتے یا بازار کا رخ کرتے ہیں کہ ان کے لیے باہر نکلنے کا وقت یہی ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو بستر پر لیٹنے کا وقت بارہ ایک بجے شب ملتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فجر کے وقت ان کے بیدار ہونے کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ اس حیوانی زندگی میں اللہ کی یاد کے لیے کوئی وقت نہیں ہوتا۔

مَا جَاءَ فِي الْغِيبَةِ

غیبت کے بارے میں حکم

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ الْوَلِيدِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ صَيَّادٍ اَنَّ الْمُطَّلِبَ بْنَ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ حَنْطَبَ الْمَخْزُومِيَّ اَخْبَرَهُ اَنَّ رَجُلًا سَاَلَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ مَا الْغِيبَةُ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ تَذْكُرَ مِنَ الْمَرْءِ مَا يَكْرَهُ اَنْ يَسْمَعَ قَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَ اِنْ كَانَ حَقًّا قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا قُلْتَ بَاطِلًا فَذٰلِكَ الْبُهْتَانُ

﴿مطلب بن عبداللہ مخزومی نے خبر دی کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ غیبت کیا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم کسی شخص کا اس طرح سے ذکر کرو کہ اگر وہ سنے تو برا جانے۔ اس نے پوچھا یا رسول اللہ، اگر بات سچی ہو تو؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم باطل کہو گے تب تو وہ بہتان ہے۔﴾

وضاحت :

مطلب یہ ہے کہ اگر صحیح بات ہو تب غیبت ہے۔ غیبت کا لفظ یہ بتاتا ہے کہ بات پیٹھ پیچھے ہو رہی ہو، آدمی کے سامنے نہیں۔ گویا پیٹھ پیچھے کسی شخص کی ایسی بات کا ذکر غیبت ہے جس کو وہ سنے تو اس کو بری لگے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اخلاقی جرأت ہے تو اس کے منہ پر کہیں۔ اگر نہیں کر سکتے تو پیٹھ پیچھے اس کا گوشت ہی کھانا ہوا۔ البتہ ایک چیز مستثنیٰ ہے۔ لیڈر لوگ پبلک میں آتے ہیں۔ اپنی زندگی کو نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اپنے مسلک کو ہمارے سامنے رکھتے ہیں اور اتباع کی دعوت دیتے ہیں تو ان کی خرابیاں لوگوں پر واضح کرنی چاہئیں۔ یہ دین کی خدمت ہے۔ لوگوں کو بتانا چاہیے کہ یہ لغو آدمی ہے جو لوگوں کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ یہ بتانا غیبت کی تعریف میں

نہیں آسکتا۔ اس کی مثالیں نبی ﷺ کے قول و فعل میں ملتی ہیں۔

مَاجَاءَ فِيمَا يُخَافُ مِنَ اللِّسَانِ

زبان کے فتنے سے اندیشے کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ وَقَاهُ اللّٰهُ شَرَّ اثْنَيْنِ وَلَجَ الْجَنَّةَ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللّٰهِ أَلَا تُخْبِرُنَا فَسَكَتَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ ثُمَّ عَادَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ مِثْلَ مَقَالَتِهِ الْأُولَى فَقَالَ لَهُ الرَّجُلُ أَلَا تُخْبِرُنَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ فَسَكَتَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مِثْلَ ذٰلِكَ أَيْضًا فَقَالَ الرَّجُلُ أَلَا تُخْبِرُنَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مِثْلَ ذٰلِكَ أَيْضًا ثُمَّ ذَهَبَ الرَّجُلُ يَقُولُ مِثْلَ مَقَالَتِهِ الْأُولَى فَأَمْسَكَهُ رَجُلٌ إِلَى جَنْبِهِ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ مَنْ وَقَاهُ اللّٰهُ شَرَّ اثْنَيْنِ وَلَجَ الْجَنَّةَ مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ.

﴿عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کے شر سے محفوظ رکھا وہ جنت میں جائے گا۔ ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہؐ فرمایئے کہ وہ کیا ہیں۔ رسول اللہ ﷺ خاموش رہے۔ پھر آپ نے وہی بات فرمائی جو پہلے فرمائی تھی۔ اس شخص نے پھر کہا کہ حضور کیا آپ ہم کو بتائیں گے نہیں۔ رسول اللہ ﷺ پھر خاموش رہے۔ آپ نے پھر وہی پہلے والی بات دہرائی۔ اس شخص نے عرض کی، یا رسول اللہؐ، آپ ہمیں بتائیں گے نہیں؟ رسول اللہؐ نے پھر وہی بات فرمائی۔ وہ شخص بھی اپنی پہلی بات دہرانے لگا تو اس شخص کے قریب کے آدمی نے اس کو خاموش کیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کے شر سے محفوظ رکھا وہ جنت میں جائے گا۔ ایک وہ چیز جو اس کے دو جبڑوں کے درمیان ہے اور دوسری وہ جو اس کے دو

پاؤں کے درمیان ہے۔ وہ جو دو جبڑوں کے درمیان ہے اور وہ جو دو پاؤں کے درمیان ہے۔ وہ جو دو جبڑوں کے درمیان ہے اور وہ جو دو پاؤں کے درمیان ہے۔﴾

وضاحت:

یہ بڑی اہم روایت ہے۔ ایک تو اس سے حضورؐ کا طریقہ تعلیم معلوم ہوتا ہے اور دوسرے بڑی ہی حکمت کی بات ہے۔ آنحضرتؐ کا طریقہ یہ نہیں تھا کہ بغیر لوگوں کو پوری طرح متوجہ کیے کوئی اہم بات اندیل دیں۔ آپ لوگوں کو پوری طرح متوجہ کر کے اور یہ دیکھ کر کہ ان حضرات میں کتنی طلب ہے ارشاد فرمایا کرتے۔ یہ نہیں کہ طلب نہ ہو اور آپ ٹھونسے چلے جائیں جیسا کہ ہم لوگ کرتے ہیں۔ اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ میرے استاذ مولانا فراہیؒ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ از خود کوئی بات نہیں بتاتے تھے جب تک پوچھنے والے میں اتنی طلب نہ ہوتی کہ وہ جرح کرتے کرتے ان کو وہاں تک پہنچا دیتا جہاں تک سوال کرتے کرتے پہنچا جا سکتا ہو۔

جبڑوں اور پاؤں کے درمیان کی دو چیزوں سے رسول اللہؐ نے زبان اور شرمگاہ کو مراد لیا اور ان پر پہرہ لگانے والے کو جنت کی بشارت دی۔ واقعہ یہ ہے کہ معاشرتی زندگی میں بہت بڑے فتنے انہی چیزوں کے غلط استعمال سے پھوٹتے ہیں۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ دَخَلَ عَلَى أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ وَ هُوَ يَجْبِذُ لِسَانَهُ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ مَهْ غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ فَقَالَ أَبُوبَكْرٍ إِنَّ هٰذَا أَوْرَدَنِي الْمَوَارِدَ.

﴿زید بن اسلم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس گئے تو دیکھا کہ وہ اپنی زبان پکڑ کر کھینچ رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا ایسا نہ کریں، اللہ تعالیٰ آپ کو بخشے۔ تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ معلوم نہیں اس چیز نے مجھے کن کن گھاٹوں پر پہنچایا۔﴾

وضاحت:

حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ یہ اپنی زبان اس لیے مروڑ رہے ہیں کہ کہیں اس سے غلطی ہو گئی ہو گی، تو کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کر دیں گے۔ اب زبان کو سزا دینا موقوف کر دیں۔ حضرت ابوبکرؓ کا

جواب یہ تھا کہ اس زبان کی لغزشوں نے معلوم نہیں کن کن گھاٹوں میں مجھے گرایا ہے۔ ابھی پیچھے یہ روایت گزری ہے کہ ایک لمحہ زبان سے ایسا نکل جاتا ہے جس کے اجر و ثواب کی حد نہیں ہوتی۔ اور کبھی آدمی کوئی بات ایسی کر دیتا ہے جس کی ہلاکتوں کا اسے اندازہ نہیں ہوتا۔

مَاجَاءَ فِي مُنَاجَاةِ اثْنَيْنِ دُونَ وَاحِدٍ

تیسرے ساتھی کو چھوڑ کر دو آدمیوں کے سرگوشی کرنے کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ دِينَارٍ قَالَ كُنْتُ اَنَا وَعَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ عِنْدَ دَارِ خَالِدِ بْنِ عُقْبَةَالَّتِي بِالسُّوقِ فَجَاءَ رَجُلٌ يُرِيدُ اَنْ يُنَاجِيَهُ وَ لَيْسَ مَعَ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَحَدٌ غَيْرِي وَ غَيْرُ الرَّجُلِ الَّذِي يُرِيدُ اَنْ يُنَاجِيَهُ فَدَعَا عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ رَجُلًا آخَرَ حَتّٰى كُنَّا اَرْبَعَةً فَقَالَ لِي وَ لِلرَّجُلِ الَّذِي دَعَاهُ اسْتَأْخِرَا شَيْئًا فَاِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ لَا يَتَنَاجَى اثْنَانِ دُونَ وَاحِدٍ.

﴿عبداللہ بن دینار سے روایت ہے کہ میں اور عبداللہ بن عمرؓ خالد بن عقبہ کے اس گھر کے پاس تھے جو بازار میں واقع تھا۔ ایک آدمی آیا جو ان سے تنہائی میں کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔ عبداللہ بن عمرؓ کے پاس میرے اور اس شخص کے سوا جو بات کرنا چاہتا تھا اور کوئی نہ تھا۔ تو عبداللہ بن عمرؓ نے ایک دوسرے شخص کو بلایا یہاں تک کہ ہم چار ہو گئے۔ پھر انہوں نے مجھے اور اس شخص کو جسے بلایا تھا کہا تم دونوں ذرا ٹھہرو۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ دو آدمی تیسرے کو نظر انداز کر کے آپس میں سرگوشی نہ کریں۔﴾

وضاحت :

اس میں شبہ نہیں کہ اگر تین آدمی ہوں اور دو آدمی تیسرے کو چھوڑ کر آپس میں سرگوشی کرنے لگیں تو اس سے تیسرے آدمی کے دل میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں کہ نہ جانے ان دونوں نے میرے خلاف کیا سازش کی ہے کہ مجھے شامل نہیں کیا۔ یا شاید کوئی ایسی بات ہو گی جس سے یہ لوگ مجھے باخبر نہیں کرنا

چاہتے۔ اس لیے لازماً وہ میرے یا میرے کسی دوست سے متعلق ہو گی۔ ایک مہذب آدمی اس کو کبھی گوارا نہیں کرے گا۔ فوراً وہاں سے رخصت ہو جائے گا اور ممکن ہے ان دونوں پر لعنت بھی کرے۔

اس زمانے میں بعض لوگ اپنی بڑائی جتانے کے لیے ایسی حرکت کرتے ہیں، بشرطیکہ وہ آدمی جس سے سرگوشی کرنی ہو باحیثیت آدمی ہو۔ وہ اس کی طرف جھک جھک کر کان میں بات کرتے ہیں تاکہ دوسروں پر اثر پڑے کہ یہ بھی کچھ مقام رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں اسمبلیوں میں بعض حضرات وزراء اور سیکرٹریوں کے کانوں میں کچھ کہتے نظر آتے ہیں اور ان کی نظر کیمرے کی طرف بھی ہوتی ہے کہ فوٹو آ رہا ہے کہ نہیں۔ یہ سفلہ پن بھی ہے، خلاف مصلحت بھی ہے اور خلاف اخلاق بھی۔ اس سے افراد کے درمیان بدگمانی اور نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ روایت بہت اعلیٰ نصیحت ہے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِذَا كَانَ ثَلَاثَةٌ فَلَا يَتَنَاجَى اثْنَانِ دُونَ وَاحِدٍ.

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تین آدمی ہوں تو دو آدمی تیسرے کو نظر انداز کر کے سرگوشی نہ کریں۔﴾

وضاحت :

یہ وہی روایت ہے۔ وہاں ایک واقعہ کے ساتھ متعلق ہے اور یہاں حضرت ابن عمرؓ نے صرف حدیث بیان کر دی ہے۔ بخاری اور مسلم میں بھی یہ روایت آئی ہے۔

مَاجَاءَ فِي الصِّدْقِ وَالْكَذِبِ

جھوٹ اور سچ کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَيْمٍ اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ اَكْذِبُ امْرَاَتِي يَا رَسُولَ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لَا خَيْرَ فِي الْكَذِبِ فَقَالَ الرَّجُلُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ اَعِدُهَا وَ اَقُولُ لَهَا فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لَاجُنَاحَ عَلَيْكَ.

﴿صفوان بن سلیم سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا میں اپنی بیوی سے کوئی بات جھوٹ کہہ سکتا ہوں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں، جھوٹ میں کوئی خیر نہیں۔ اس نے کہا یا رسول اللہ، میں اس سے کوئی وعدہ کر لوں، کوئی بات تسلی کی کر لوں تو کیا یہ جائز ہو گا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس میں کچھ حرج نہیں۔

وضاحت :

خانگی زندگی کو خوشگوار رکھنے کے لیے آدمی کو کئی تدبیریں کرنی پڑتی ہیں۔ ہر عاقل آدمی مصالحت کی پالیسی اختیار کرتا ہے۔ بسا اوقات اس میں بات بنانی پڑتی ہے یا مغالطہ آمیزبات کرنی پڑتی ہے۔ آدمی نے جب یہ سوال کیا کہ کیا میں بیوی سے جھوٹ بول سکتا ہوں تو آپ نے اس کی صاف صاف ممانعت فرما دی کہ جھوٹ بولنے میں کوئی خیر نہیں۔ پھر اس نے پوچھا کہ میں اس سے کوئی وعدہ یا تسلی کی بات کر سکتا ہوں تو آپ نے اس کی اجازت دے دی۔

معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے پوچھنے والے کے سوال کا یہ مطلب لیا کہ اس کی پہلی بات ماضی سے متعلق ہے اور دوسری مستقبل سے متعلق۔ تو ماضی کے کسی واقعہ کے بیان کرنے میں جھوٹ نہیں بولا جائے گا لیکن مستقبل چونکہ پردہ میں ہوتا ہے، اس توقع پر کہ فلاں کام ہو جائے گا آدمی اس کے بارے میں وعدہ کر سکتا ہے۔ اس میں وعدہ پورا ہونے یا پورا نہ ہونے دونوں کا یکساں احتمال ہوتا ہے۔ پھر مستقبل کے کسی وعدہ میں یہ شرط مضمر ہوتی ہے کہ اگر حالات نے ساتھ دیا تو یوں کروں گا، اگرچہ یہ شرط الفاظ میں ادا نہ ہوتی ہو۔

اس کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ بیوی کو جھوٹے چکمے دے کر خوش رکھنا مطلوب ہے۔ البتہ ایسی شکلیں اختیار کی جا سکتی ہیں جو جواز کے اندر ہوں اور ان کی مدد سے آدمی کی گھریلو زندگی خوشگوار رہے۔

روایت میں کذب کا جو لفظ آیا ہے یہ عربی میں وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے مفہوم میں اوہ معنی بات یا مغالطہ آمیزبات کرنا بھی شامل ہے اور جو لوگ بیوی بچوں والے ہیں ان کو گھریلو ماحول سازگار رکھنے کے لیے ایسی باتیں کرنا پڑتی ہیں۔

❑ حَدَّثَنِي مَالِكٌ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ ابْنَ مَسْعُوْدٍ كَانَ يَقُوْلُ عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ فَاِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي اِلَى الْبِرِّ وَالْبِرُّ يَهْدِي اِلَى الْجَنَّةِ وَ اِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ فَاِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي اِلَى

الْفُجُوْرِ وَالْفُجُوْرُ يَهْدِي اِلَى النَّارِ اَلَا تَرٰى اَنَّهٗ يُقَالُ صَدَقَ وَ بَرَّ وَ كَذَبَ وَ فَجَرَ.

﴿عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے تھے کہ سچائی کو اختیار کرو کیونکہ سچائی خدا کی وفاداری کی راہ پر لے جاتی ہے اور خدا کی وفاداری جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اور جھوٹ سے بچو کیونکہ جھوٹ خدا کی نافرمانی کی طرف لے جاتا ہے اور خدا کی نافرمانی دوزخ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ مثل بیان کی جاتی ہے "اس نے سچ کہا اور وفاداری کی، اس نے جھوٹ کہا اور نافرمانی کی"۔﴾

وضاحت :

اس روایت کو بخاری نے بھی لیا ہے۔ وہاں یہ موصول کی شکل میں ہے اور یہاں مرسل ہے۔ سند کے لحاظ سے روایت کا جو درجہ بھی ہو فلسفہ دین کے لحاظ سے اس کا درجہ بہت اعلیٰ ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کا کہنا یہ ہے کہ سچائی اختیار کرو کیونکہ سچائی ہمیشہ تمہیں خیر، نیکی، بر، وفاداری کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور بر جنت کی طرف لے جائے گی۔ بر کے صحیح معنی وفاداری کے ہیں۔ نیکی اس کا ناقص ترجمہ ہے۔ قرآن میں ہر ابو الدیہ اپنے والدین کے وفا شعار اور فرمانبردار بیٹے کے لیے آیا ہے۔ بر اللہ تعالیٰ کی صفت بھی ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے سارے وعدے پورے کرے گا۔ حضرت ابن مسعودؓ نے جھوٹ سے بچنے کی تلقین کی۔ اگر آپ جھوٹ نہیں بولتے تو شیطان کا آپ پر کوئی زور نہیں چلے گا۔ اگر آپ عزم کر لیں کہ صداقت اختیار کریں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کی رہنمائی کریں گے۔ اس وقت آپ کی زبان سے وہ باتیں نکلیں گی جیسے قرآن حکیم کی زبان سے نکلتی تھیں۔

مزید غور کریں تو معلوم ہو گا کہ نفاق کا پردہ جھوٹ کے سوا اور کوئی نہیں اور نفاق ایمان کی ضد ہے۔ نفاق کے ساتھ کوئی چیز باقی ہی نہیں رہتی تو ایمان کیسے باقی رہے گا۔ جھوٹ عملی بھی ہوتا ہے اور قولی بھی۔ عملی جھوٹ تو یہ ہے کہ آپ نماز پڑھیں تو مجبورانہ یا ریاکاری کے لیے پڑھیں۔ قرآن مجید میں ہے کہ "اذا قاموا الی الصلوٰۃ قاموا کسالیٰ" کسل اور بے دلی کے ساتھ نماز ادا کرنا عملی جھوٹ ہے۔ قولی جھوٹ یہ ہے کہ آپ کہیں کچھ لیکن آپ کے دل میں اس کا الٹ ہو۔ منافق کے لیے ایک ہی راستہ ہوتا ہے جس پر وہ اختیار کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ قولی اور عملی جھوٹ بول دے گا۔ آپ کو بے وقوف بنائے گا۔ وعدے کی خلاف ورزی کرے گا۔ لیکن اس کی بات کا کوئی وزن

نہ ہوگا۔ سچا آدمی کسی کو اس طریقے کا دھوکا نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہوتا کیونکہ اس نے تو سچی بات کہنی ہے۔ وہ اگر کر سکتا ہے تو مغالطہ آمیز بات کر سکتا ہے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بعض جگہ مواقع پر ذو معنی بات کر کے اپنی قوم کو چھوڑ دیا۔ لیکن اس کے لیے بڑی ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں اس کی نہایت عمدہ مثال ہمارے سب سے بڑے آدمی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زندگی میں ملتی ہے۔ میں جب اس کو یاد کرتا ہوں تو عش عش کر اٹھتا ہوں۔ مدینہ منورہ کو ہجرت کے سفر میں آپ نبی ﷺ کے رفیق تھے۔ کفار مکہ نے حضور کی گرفتاری کے لیے آدمی پھیلا رکھے تھے۔ اسی دوران میں حضرت ابوبکرؓ کو جانے والا ایک شخص سر پر آپہنچا۔ اس نے انہیں مخاطب کر کے پوچھا من معك هذا (یہ آپ کے ساتھ کون ہے؟) غور کیجئے کہ ناگہانی طور پر اس سوال کا فوری جواب دینا کتنا مشکل تھا اور نبی ﷺ کی شناخت ہو جانے میں کتنے خطرات درپیش ہو سکتے تھے۔ لیکن نہایت سادگی سے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا هو رجل يهديني الطريق (ایک شخص ہے جو مجھے راستہ دکھاتا ہے) یہ کتنی سچی بات تھی۔ صحرائی سفر میں راستہ دکھائے بغیر آدمی سفر کر ہی نہیں سکتا۔ اس حوالے سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ممکن ہے آدمی کرائے پر لیا ہو تاکہ راستہ دکھائے۔ دوسری طرف پیغمبر سے بڑھ کر صحیح راستہ دکھانے والا کون ہو سکتا ہے؟ پوچھنے والے کا ذہن پہلی بات کی طرف چلا گیا اور نبی ﷺ کسی ممکن خطرہ سے محفوظ ہو گئے۔ اس طرح کی گفتگو جائے خروج پر ہی ہوتی ہے لیکن کہنے کے انداز سے دوسرا آدمی سچ سمجھا جاتا ہے۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّهُ قِيلَ لِلُقْمَانَ مَا بَلَغَ بِكَ مَا نَرَى يُرِيدُونَ الْفَضْلَ فَقَالَ لُقْمَانُ صِدْقُ الْحَدِيثِ وَ أَدَاءُ الْأَمَانَةِ وَتَرْكُ مَالَا يَعْنِينِي.

﴿امام مالکؒ کی بلاغات میں سے ہے کہ لقمان حکیم سے پوچھا گیا کہ آپ کو جو بلند درجہ ملا ہے آپ اس پر کس طرح سے پہنچے ہیں، تو لقمان نے کہا کہ بات کی صداقت سے، امانت کی ادائیگی سے اور اپنے سے غیر متعلق باتوں سے اجتناب کی بنا پر۔﴾

وضاحت:

یہ تینوں باتیں اپنی جگہ پر اہم ہیں۔ حضرت لقمان نبی نہیں تھے بلکہ عرب کے حکماء میں سے تھے۔ قرآن مجید میں ان کا ذکر اپنے بیٹے کو نصیحت کرنے کے ضمن میں ہوا ہے۔ اس میں یہ باتیں نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان

کے بعض واقعات اور اقوال عرب میں مشہور بھی تھے اور لوگ ان کو بیان کرتے تھے۔ انہی میں سے ایک واقعہ امام مالکؒ نے لیا ہے۔

حضرت لقمان حکمت کے جس بلند مقام تک پہنچے اس کو وہ تین صفات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ سچائی، امانت اور غیر متعلق باتوں سے سروکار نہ رکھنا۔ یہ تینوں نہایت بلند اخلاقی صفات ہیں۔ سچائی اور امانت کا وصف تو قرآن مجید کی رو سے ہر پیغمبر کا لازمی وصف ہوتا ہے۔ اسی طرح جس آدمی کے سامنے کوئی مقصد زندگی ہو اس کے پاس غیر متعلق باتوں میں دلچسپی لینے کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔

یہ روایت بھی کسی پہلو سے حدیث کی تعریف میں نہیں آتی۔ امام مالک کے ہاں اس طرح کی بلاغات کی کثرت کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ ابتدائی دور میں کسی بھی اچھی بات کو روایات میں جگہ دے دی جاتی تھی۔ خواہ وہ کسی سابق پیغمبر سے منسوب ہو یا اس کی نسبت کسی حکیم شخص یا صحابی کی طرف کی جاتی ہو۔ چونکہ اس طرح کی حکیمانہ باتیں عوام کی زبان پر چڑھ جاتی ہیں اس لیے امام مالک نے ان کو بلاغات کے طور پر لے لیا۔ یعنی ان کے لیے سند کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سند کا جو پہاڑا بنایا گیا یہ بعد کی بات ہے۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ مَسْعُودٍ كَانَ يَقُولُ لَا يَزَالُ الْعَبْدُ يَكْذِبُ وَ تُنْكَتُ فِي قَلْبِهِ نُكْتَةُ سَوْدَاءُ حَتّٰى يَسْوَدَّ قَلْبُهُ كُلُّهُ فَيُكْتَبَ عِنْدَاللّٰهِ مِنَ الْكَاذِبِينَ.

﴿امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے تھے کہ آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے تو ایک ایک سیاہ نکتہ اس کے دل پر پڑتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا دل بالکل سیاہ ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ جھوٹوں میں لکھا جاتا ہے۔﴾

وضاحت:

حضرت ابن مسعودؓ کا یہ قول صحیح اور اصول کے مطابق ہے۔ گناہ کرنے کے متعلق جو روایت آئی ہے اس میں یہ ہے کہ آدمی جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ نشان پڑ جاتا ہے جو توبہ و استغفار سے صاف ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر آدمی پرواہ نہ کرے اور گناہ کرتا رہے تو پورا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید سے بھی دلوں پر مہر ہو جانے کی حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے کہ دل اس طرح بند ہو جاتا ہے کہ نیکی کی کوئی کرن اس سے گزر نہیں کر پاتی۔ چونکہ

جھوٹ تمام گناہوں کی بنیاد ہے اس لیے گناہ کے بارے میں ینبغی اللہ کا اطلاق اس پر ہوگا، لہٰذا حضرت ابن مسعودؓ کا یہ قول بالکل ٹھیک ہے۔ اگرچہ روایت کی حقیقت بلاغات کی ہے اور یہ موقوف بھی ہے۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَيْمٍ أَنَّهُ قَالَ قِيلَ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ أَيَكُونُ الْمُؤْمِنُ جَبَانًا فَقَالَ نَعَمْ فَقِيلَ لَهُ أَيَكُونُ الْمُؤْمِنُ بَخِيلًا فَقَالَ نَعَمْ فَقِيلَ لَهُ أَيَكُونُ الْمُؤْمِنُ كَذَّابًا فَقَالَ لَا.

﴿حضرت صفوان بن سلیم کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کیا مومن بزدل ہو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں، پھر پوچھا گیا کیا مومن بخیل ہو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ پھر سوال کیا گیا کہ کیا مومن جھوٹا ہو سکتا ہے۔ تو آپ نے فرمایا، نہیں۔﴾

وضاحت:

سند کے لحاظ سے یہ روایت مرسل ہے اور اس لحاظ سے اس کی کوئی اہمیت نہیں لیکن بات اپنی جگہ پر ٹھیک ہے۔ بہت اعلیٰ درجے کا ایمان ہوگا تو آدمی بزدل ہو گا نہ بخیل۔ لیکن یہ کمزوریاں رکھتے ہوئے بھی مومن مختلف درجات کے ہوتے ہیں۔ البتہ نبی ﷺ نے مومن کے کذاب ہونے کی نفی کر دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جھوٹ منافق کا شیوہ ہوتا ہے اور منافق مومن نہیں ہوتا بلکہ دوہرے ہی گھٹیا قسم کا کافر ہوتا ہے۔ اخلاقی جرات کے فقدان کے باعث وہ مومن ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جہنم کے سب سے بدترین درجے میں ہوگا۔ پھر اس امت کے افراد کی منصبی ذمہ داری حق کی سچائی کی گواہی دینا ہے۔ اس لیے کوئی صاحب ایمان اس وصف سے خالی نہیں ہو سکتا۔

مَا جَاءَ فِي إِضَاعَةِ الْمَالِ وَذِي الْوَجْهَيْنِ.

مال کے ضائع کرنے اور دوہرا چہرہ رکھنے کے بارے میں

حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ سُهَيْلِ بْنِ أَبِي صَالِحٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ إِنَّ اللهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى يَرْضَى لَكُمْ ثَلَاثًا وَ يَسْخَطُ لَكُمْ ثَلَاثًا يَرْضَى لَكُمْ أَنْ

تَعْبُدُوهُ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَ أَنْ تَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا وَ أَنْ تَنَاصَحُوا مَنْ وَلَّاهُ اللهُ أَمْرَكُمْ وَ يَسْخَطُ لَكُمْ قِيلَ وَقَالَ وَ إِضَاعَةَ الْمَالِ وَكَثْرَةَ السُّؤَالِ.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے تین باتوں کو پسند اور تین باتوں کو ناپسند کرتا ہے۔ وہ تمہارے لیے یہ پسند کرتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑو اور تمہارے معاملات پر اللہ نے جن لوگوں کو مقرر کر دیا ہے ان کی خیر خواہی کرو۔ وہ تمہارے لیے قیل و قال، مال کو ضائع کرنے اور کثرت سوال کو ناپسند کرتا ہے۔﴾

وضاحت:

حبل اللہ سے مراد قرآن مجید ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اور ہمارے درمیان رسی ہے جو تعلق کا ذریعہ ہے۔ اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنے کے معنی ہیں کہ حق و باطل میں امتیاز کی یہی کسوٹی ہوگی۔ کسی چیز کے حق یا باطل ہونے میں جب بھی کوئی نزاع پیدا ہوگا تو اسی کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔ اس کسوٹی پر جو چیز پوری نہ اترے تو نہیں لی جائے گی۔

معاملات پر مامور لوگوں سے مراد حکمران ہیں۔ حکمرانوں کی خیر خواہی کے معنی ہیں کہ آپ ان کو نیک مشورے دیں۔ خوشامد سے انہیں بیوقوف نہ بنائیں اور آسمان پر نہ چڑھائیں، غلط رہنمائی نہ کریں اور ان کی حمایت محض اس لیے نہ کریں کہ ان سے آپ کی کوئی غرض وابستہ ہے۔ یہ چیزیں نصیحت اور خیر خواہی کے بالکل خلاف ہیں۔ جب بھی موقع ملے ان کو صحیح بات بتانی چاہیے۔ لیکن ادب اور وقار ملحوظ رہنا چاہیے۔ ان کو بدنام کرنے اور ذلیل کرنے کے لیے اہل سیاست کے طریقے پر بیان بازی نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیشہ ان کی اصلاح مدنظر رہنی چاہیے اس لیے کہ آپ کی عزت، آبرو، مال اور جان کی حفاظت ان لوگوں کی ذمہ داری ہے۔

قیل و قال سے مراد بحث، مناظرہ بازی، کٹ حجتی، مین میکھ نکالنا اور فضول قسم کی کریدی کرنا ہے۔ مال زندگی کے قیام و بقا کا ذریعہ ہے اس لیے اپنے مال کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ زیادہ سوال کرنے سے مطلب نکلنا نہیں بلکہ غیر متعلق اور ناپ شناپ سوال کرنا ہے۔ اس کی ممانعت قرآن مجید میں بھی آئی ہے۔ سوال وہی کرنا چاہیے جو واقعی پیدا ہو، خواہ مخواہ سوالات پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ یہ طرز عمل دین کو یہودیت کا مجموعہ بنا دیتا ہے۔

❐ وَحَدَّثَنِي مَالِكٌ" عَنْ اَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مِنْ شَرِّ النَّاسِ ذُوالْوَجْهَيْنِ الَّذِي يَاْتِي هٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ، وَهٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ.

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بدترین خلائق دو رخا آدمی ہے جو ایک کے پاس آئے تو ایک شکل میں آئے اور دوسرے کے پاس جائے تو کچھ اور بن کر جائے۔﴾

وضاحت :

آدمی کو بالکل دوٹوک ہونا چاہیے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ؎ بابا شراب خور و بدمعاملہ نماز کرد۔ آدمی کو اس حد تک صاف گو ہونا چاہیے کہ ہر دو بین آدمی اس کے معاملے میں اندازہ کر لے کہ اس کا موقف کیا ہوگا اور وہ کیا طریقہ اختیار کرے گا۔ اگر اس سے کوئی بات کہی جائے تو کیا جواب دے گا۔

مَاجَاءَ فِي عَذَابِ الْعَامَّةِ بِعَمَلِ الْخَاصَّةِ

خاص لوگوں کے گناہوں کے باعث عام عذاب نازل ہونے کے بارے میں روایات

❐ وَحَدَّثَنِي مَالِكٌ" اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ اُمَّ سَلَمَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَنَهْلِكُ وَفِينَا الصَّالِحُوْنَ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نَعَمْ اِذَا كَثُرَ الْخَبَثُ

﴿نبی ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ یا رسول اللہ، کیا ہم ہلاک کر دیئے جائیں گے درآں حالیکہ ہمارے درمیان نیک لوگ موجود ہوں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہاں، جب خباثت بڑھ جائے۔﴾

وضاحت :

یہ روایت امام مالک کی بلاغات میں سے ہے۔ ابن ابر نے کہا ہے کہ یہ حدیث حضرت ام سلمہؓ سے صرف ایک ذریعہ سے معلوم ہے اور وہ بھی قوی نہیں۔ لیکن میرے نزدیک اس کا مضمون قرآن کا مضمون ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مالکؒ نے مضمون کو اہمیت دی ہے۔ خبث بڑھ جانے کا مطلب یہ ہے کہ نیک ہوں تو سہی لیکن بہت اقلیت میں ہوں۔ شریروں کا غلبہ ہو۔ جب شریروں کا غلبہ ہو جائے تو قوم عذاب کی مستحق ہو جاتی ہے۔ انبیاء

اور رسولوں کے زمانے میں تو یہ ہوتا ہے کہ صالحین چھٹ کر رسولوں کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور وہ ان کے ساتھ بچا لیے جاتے ہیں۔ لیکن اب یہ بات نہیں ہے۔ اس لیے اگر اشرار کی کثرت ہو جائے اور کوئی آفت آجائے تو اس میں نیک بھی اشرار کی طرح پس جائیں گے لیکن وہ اگر انکار منکر کا فرض ادا کرتے رہے ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنا اجر پائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ برائی کو برائی کہتے رہیں اور اپنی قوت سے اور زبان سے اس کو روکنے کی کوشش کریں۔ فرمایا کہ من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ و ان لم یستطع فبلسانہ و ان لم یستطع فبقلبہ و ذالک اضعف الایمان. ادنیٰ درجے کا ایمان یہ ہے کہ آپ ان کی برائی سے اپنے آپ کو بچائیں۔ قلب میں برا سمجھنے کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کریں۔ لیکن آپ اگر شریروں کے قرب، ان کے تقرب، ان کے عطیات کو اپنے لیے شرف سمجھ کر قبول کریں گے تو وہ ادنیٰ ترین ایمان بھی نہیں ہوگا۔ ہاں آپ اگر اس حرکت سے بچ کر رہیں گے، اگرچہ آپ نے ادنیٰ درجہ ایمان میں انکار منکر کا حق ادا نہیں کیا تب بھی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بچا لے گا۔ یعنی آخرت میں گرفت نہیں ہوگی۔ البتہ آج اگر دنیا میں کوئی آفت آئے گی تو یہ نہیں ہوگا کہ کچھ لوگ چھانٹ کر الگ کر لیے جائیں گے بلکہ سب پس جائیں گے۔

❐ وَحَدَّثَنِي مَالِكٌ" عَنْ اِسْمَاعِيلَ بْنِ اَبِي حَكِيمٍ اَنَّهٗ سَمِعَ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيزِ يَقُوْلُ كَانَ يُقَالُ اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى لَا يُعَذِّبُ الْعَامَّةَ بِذَنْبِ الْخَاصَّةِ وَلٰكِنْ اِذَا عُمِلَ الْمُنْكَرُ جِهَارًا اسْتَحَقُّوا الْعُقُوْبَةَ كُلُّهُمْ.

﴿اسمٰعیل بن ابی حکیمؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو یہ کہتے سنا کہ کہا جاتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کچھ تھوڑے سے لوگوں کے گناہوں کے بدلے میں عام لوگوں کو عذاب نہیں دے گا لیکن اگر منکر پر کھلم کھلا عمل کیا جائے تو سب کے سب عذاب کے مستحق ہوں گے۔﴾

وضاحت :

اس روایت میں یہ بات مضمر ہے کہ اگر منکر کا ارتکاب ہو رہا ہو اور اس کے نکیر کی کوئی آواز بلند نہ ہو تو جن لوگوں کے اندر ادنیٰ درجہ کا ایمان ہو گا ان کے لیے آخرت میں بچنے کی تو امید ہے لیکن اس دنیا میں عذاب سے نہیں بچ سکیں گے۔ قوموں کے بارے میں یہی سنت الٰہی ہے جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے۔

مَاجَاءَ فِي التُّقٰى

خدا ترسی اور خشیت الٰہی کے بارے میں روایات

وَحدثنی مالك" عَنْ اسحٰق بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِی طَلْحَةَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ وَ خَرَجْتُ مَعَهُ حَتّٰی دَخَلَ حَائِطًا فَسَمِعْتُهُ وَهُوَ يَقُوْلُ وَ بَيْنِی وَ بَيْنَهُ جِدَارٌ" وَهُوَ فِی جَوْفِ الْحَائِطِ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ بَخٍ بَخٍ وَاللّٰهِ لَتَتَّقِيَنَّ اللّٰهَ اَوْ لَيُعَذِّبَنَّكَ قَالَ مَالِكٌ" : وَبَلَغَنِی اَنَّ الْقَاسِمَ بْنَ مُحَمَّدٍ كَانَ يَقُوْلُ اَدْرَكْتُ النَّاسَ وَمَا يَعْجَبُوْنَ بِالْقَوْلِ. قَالَ مَالِكٌ": يُرِيْدُ بِذٰلِكَ الْعَمَلَ اِنَّمَا يَنْظُرُ اِلَی عَمَلِهٖ، وَلَا يَنْظُرُ اِلٰی قَوْلِهٖ.

﴿حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر بن الخطابؓ سے سنا۔ میں ان کے ساتھ نکلا، تھا یہاں تک کہ وہ ایک باغ میں داخل ہو گئے تو اس حال میں کہ میرے اور ان کے درمیان دیوار حائل تھی اور وہ باغ کے بیچ میں تھے، میں نے سنا وہ کہہ رہے تھے کہ اے عمر بن الخطاب، اے امیر المومنین! کیا کہتے ہیں امیر المومنین کے! اللہ کی قسم، اللہ سے ڈرتے رہو ورنہ وہ تمہیں بہت سخت عذاب دے گا۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ قاسم بن محمد کہا کرتے تھے کہ میں نے جن لوگوں کو پایا ہے وہ بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اس سے ان کی مراد عمل تھا۔ یعنی یہ کہ آدمی کے قول کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی بلکہ اس کے عمل کو اہمیت دی جاتی تھی۔﴾

وضاحت :

بخ تحسین کے لیے آتا ہے لیکن طنز کے موقع پر بھی آسکتا ہے۔ یعنی کیا کہنے امیر المومنین کے! حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ اپنے آپ سے کہہ رہے تھے۔ یہ خود احتسابی کی بہت اعلیٰ مثال ہے۔ اصل تقویٰ کی علامت یہی ہوتی ہے۔ وہ باغ میں گئے۔ جب علیحدہ ہو کر بیٹھے تب انہوں نے اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہا کہ عمر بن الخطاب

امیر المومنین، ماشاء اللہ، بڑا امیر المومنین، مالچرتا ہے، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو گے تو خیر ہے ورنہ وہ تمہیں عذاب دے گا کہ تمہارا کچومر نکال کر رکھ دے گا۔ تمہیں ہی سخت عذاب میں پڑو گے۔

قاسم بن محمدؒ کا قول امام مالکؒ کی بلاغات میں سے ہے۔ ان کی بلاغات شہادت دیتی ہیں کہ وہ جس بات کو اچھا سمجھتے ہیں اس کو لے لیتے ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ حدیث ہے یا نہیں اور اس کی سند کیا ہے۔ میرے نزدیک ایسا کرنے میں بہت سے خطرات ہیں۔

اَلْقَوْلُ اِذَا سَمِعْتَ الرَّعْدَ

کڑکا سننے پر کیا کہنا چاہیے

□ وحدثنی مالك" عَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ اَنَّهٗ كَانَ اِذَا سَمِعَ الرَّعْدَ تَرَكَ الْحَدِيْثَ وَقَالَ سُبْحَانَ الَّذِی يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ثُمَّ يَقُوْلُ اِنَّ هٰذَا لَوَعِيْدٌ" لِاَهْلِ الْاَرْضِ شَدِيْدٌ".

﴿امام مالک عامر بن عبداللہ بن الزبیرؒ کے بارے میں بتاتے ہیں کہ جب وہ کڑکا سنتے تو بات کرنا چھوڑ دیتے اور یہ دعا پڑھتے۔ سُبْحَانَ الَّذِی يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ (پاک ہے وہ ذات کہ جس کی بھی اس کی تسبیح کرتی ہے اس کی حمد کے ساتھ اور ملائکہ بھی اس کی تسبیح کرتے ہیں اس کے ڈر کے ساتھ) پھر کہا کرتے تھے کہ یہ اہل زمین کے لیے بڑی سخت وعید ہے۔﴾

وضاحت :

یہ دعا قرآن مجید کی آیت سے ماخوذ ہے۔ اس کی وضاحت تفسیر تدبر قرآن میں سورہ الرعد کی آیت ۱۳ کے ذیل میں کر دی گئی ہے۔

مَاجَاءَ فِی تَرِكَةِ النَّبِیِّ ﷺ

نبی ﷺ کے ترکہ کے بارے میں

□ حَدَّثَنِی مَالِكٌ" عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ عَائِشَةَ اُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنَّ

أَزْوَاجَ النَّبِيِّ ﷺ حِينَ تُوُفِّيَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اَرَدْنَ اَنْ يَبْعَثْنَ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ اِلٰى اَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ فَيَسْاَلْنَهُ مِيرَاثَهُنَّ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَتْ لَهُنَّ عَائِشَةُ اَلَيْسَ قَدْ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لَا نُورَثُ مَا تَرَكْنَا فَهُوَ صَدَقَةٌ".

﴿ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو ازواج مطہراتؓ نے یہ ارادہ کیا کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں بھیجیں اور ان سے مطالبہ کریں کہ رسول اللہ ﷺ سے ان کو جو میراث ملنی چاہیے وہ دیں۔ تو حضرت عائشہؓ نے ان سے کہا کہ کیا یہ بات نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہم انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا، ہم جو چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔﴾

وضاحت:

اس حدیث کے سلسلہ روایت میں ابن شہاب زہری موجود ہیں۔ یہ اہل سنت کے بہت بڑے امام ہیں۔ وہ تمام امور جن میں اہل سنت اور شیعہ کے درمیان اختلاف ہے کسی نہ کسی طور پر ابن شہاب سے مروی ہیں۔ مگر اس کے باوجود امام بخاریؒ اور امام مالکؒ نے ان کو سر پر اٹھایا ہے۔ یہ امت کے لیے بہت بڑا حادثہ ہے۔

لَا نُورَثُ، ہمارے وارث نہیں بنتے، کوئی ہماری وراثت نہیں پاتا، جو کچھ ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس روایت کی رو سے وراثت کی کوئی شکل نہیں رہتی۔ لیکن شیعہ اس کی قرأت میں اختلاف کرتے ہیں۔ وہ اس کو لَا نُورَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ" پڑھتے ہیں اور اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ جو چیز ہم نے صدقے کے طور پر چھوڑی اس کا کوئی وارث نہیں ہوتا حالانکہ یہ بالکل ہی بے تکی سی بات ہے۔ اگلی روایت میں حدیث کے مفہوم کی اور بھی وضاحت ہو گئی ہے۔ بہر حال یہ ہمارے اور شیعوں کے درمیان ایک جیادی جھگڑا ہے۔ اس روایت کے حوالہ سے انہوں نے حضرت عائشہؓ پر یہ الزام بھی لگایا ہے کہ انہوں نے افترا کر کے گویا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور نبی ﷺ کی دیگر ازواج مطہراتؓ کو وراثت سے محروم کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ یہ بات صرف نبی ﷺ کے متعلق خاص نہیں بلکہ سب انبیاء کے لیے ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی وراثت کا ذکر سورہ مریم میں آیا ہے تو وہ دین، نیکی، تقویٰ اور نبوت کی وراثت کے متعلق ہے۔ اس لیے کہ ان کو اس بات سے اندیشہ تھا

کہ یہ لوگ خاندان کی روایت کو بگاڑ دیں گے تب انہوں نے بیٹے کے لیے دعا کی تھی۔

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ" عَنْ اَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَا يَقْسِمُ وَرَثَتِي دَنَانِيرَ مَا تَرَكْتُ بَعْدَ نَفَقَةِ نِسَائِي وَمُؤْنَةِ عَامِلِي فَهُوَ صَدَقَةٌ"

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے وارث درہم و دینار کی وراثت تقسیم نہیں کریں گے۔ میں نے جو کچھ چھوڑا ہے اس میں سے میری بیویوں کے خرچ اور گھر کے کارکن کے مصارف کے بعد جو بچے وہ صدقہ ہے۔﴾

وضاحت:

مؤنۃ کے معنی کفالت ہے اور 'عامل' سے مراد گھر کے کارکن ہیں۔ غلام ہوں یا خادم یا نوکر۔ اس سے جن لوگوں نے اور لوگ مراد لیے ہیں وہ غلط ہیں۔ فرمایا کہ ازواج مطہراتؓ کے اخراجات اور گھر کے کارکنوں کے مصارف اٹھانے کے بعد جو مال بچے گا وہ سب صدقہ ہے یعنی وہ قوم کی ملکیت یا جدید لفظوں میں سٹیٹ کی ملکیت ہو گا۔ اموال فے شروع ہی سے حقیقت میں سٹیٹ کی ملکیت تھے اس لیے کہ وہ حکومت کے مجموعی دبدبے سے حاصل ہوئے تھے اور اس سے نبی ﷺ اپنی ضرورت کے مطابق حیثیت صاحب امر اسی طرح لیتے تھے جس طریقہ سے ہر حکومت کا خلیفہ یا صدر ہوتا ہے تو اس کے مصارف کی کفالت حکومت کرتی ہے۔ یہ بات حیثیت صاحب امر یعنی حکومت کے ذمہ دار کی حیثیت سے تھی نہ کہ نبی کی حیثیت سے تھی۔ اس لیے کہ جہاں تک نبوت کا معاملہ تھا اس کے متعلق تو قرآن مجید میں آیا ہے کہ لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا (میں تم سے اجر کا طالب نہیں) چونکہ نبوت کے علاوہ آپؐ پر حکومت کی ذمہ داری بھی تھی تو ضروری تھا کہ حکومت ان کے مصارف پورے کرتی۔ کسی شخص کے مصارف پورے کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے اہل و عیال اور اس کے متعلقین کی ضروریات بھی پوری کی جائیں۔ آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہراتؓ کی ازواج نبیؐ ہونے کے علاوہ کچھ خصوصیات اور بھی تھیں۔ وہ خصوصیات تقدس کی بنا پر نہیں تھیں، تقدس تو بے شک ان کو حاصل تھا لیکن یہ خصوصیات اس بنیاد پر تھیں کہ ملت اور دین کی مصلحت کی خاطر اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے حکم دیا تھا: مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللّٰهِ وَلَا اَنْ تَنْكِحُوا اَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ اَبَدًا . اِنَّ ذٰلِكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيمًا۔ الاحزاب ۵۳۔ (اور تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم

اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ تم اس کی بیویوں سے کبھی اس کے بعد نکاح کرو۔ یہ اللہ کے نزدیک بڑی سنگین باتیں ہیں) قطع نظر اس سے کہ نکاح جائی ان کے شرف کے منافی تھا، اس میں خطرے بھی بہت تھے۔ کوئی شخص ان میں سے کسی سے نکاح کر کے معلوم نہیں کیا کیا پراپیگنڈہ کر سکتا تھا۔ اس طرح کی تمام باتوں کے سدباب کے لیے دین کی مصلحت یہی تھی کہ ان کو آئندہ نکاح سے روک دیا جائے۔ لہٰذا ان کی کفالت کی ذمہ داری حکومت پر تھی جو خلفائے راشدین اور بعد والے خلفاء نے بھی ادا کی۔

اس روایت میں ما ترکت بعد نفقة نسائی میں نساء کا لفظ جو آیا ہے وہ بیویوں کے لیے ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خاندان بنی ہاشم یا حضرت فاطمہؓ یا حضرت علیؓ کا اس سے کوئی تعلق نہیں اس لیے کہ وہ نساء میں شامل نہیں۔ البتہ ازواج مطہرات کا کوئی کارکن، غلام یا خادم ہے تو ظاہر ہے کہ اس کو شامل ہونا چاہیے۔

مَا جَاءَ فِي صِفَةِ جَهَنَّمَ

جہنم کی خصوصیات کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ" عَنْ اَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ نَارُ بَنِي آدَمَ الَّتِي يُوقِدُونَ جُزْءٌ" مِنْ سَبْعِينَ جُزْأً مِنْ نَارِ جَهَنَّمَ: فَقَالُوا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْ كَانَتْ لَكَافِيَةً. قَالَ اِنَّهَا فُضِّلَتْ عَلَيْهَا بِتِسْعَةٍ وَ سِتِّينَ جُزْأً.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ بنی آدم جو آگ جلاتے ہیں جہنم کی آگ کے مقابل میں اس کی حرارت ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔ صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ! اگر یہی آگ ہوتی تو جلانے کے لیے وہ بھی کافی تھی تو آپؐ نے فرمایا: اس کو اس کے اوپر انہتر گنا ترجیح دی گئی ہے۔﴾

وضاحت:

یہاں سوال اور جواب میں مطابقت نہیں لیکن بات اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں کی آگ کو اور وہاں کی آگ کو ایک سمجھو۔ شارحین بھی یہی لکھتے ہیں کہ یہ بات سمجھانے کے لیے ہے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ" عَنْ عَمِّهِ اَبِي سُهَيْلِ ابْنِ مَالِكٍ عَنْ اَبِيهِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّهُ قَالَ: اَتَرَوْنَهَا حَمْرَاءَ كَنَارِكُمْ هٰذِهِ لَهِيَ اَسْوَدُ مِنَ الْقَارِ.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ آگ تمہاری اس آگ کی طرح سرخ ہوگی۔ وہ تو تارکول سے بھی زیادہ سیاہ ہوگی۔﴾

وضاحت:

یہ حضرت ابوہریرہؓ کا قول ہے۔ محدثین کے ہاں یہ طریقہ رہا ہے کہ صحابی نے اگر بات کی ہوگی تو اس طرح کی بات وہ پیغمبر سے سنے بغیر نہیں کہہ سکتا اس لیے وہ ایسی روایت کو مرفوع قرار دیتے ہیں لیکن یہ تجاوز ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنی طرف سے ذہن کی ایک بات کہہ دی۔ اس کو اگر مرفوع کا درجہ دے دیا جائے تو پھر حدیث اور اس میں کیا فرق رہا۔ بہت سی مثالیں ایسی ہیں جن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی بات کو اگر مرفوع کا درجہ دے دیا جائے تو حقیقت بالکل متغیر ہو جاتی ہے۔ ابوہریرہؓ نے یہ بات اگر نبی ﷺ سے سنی ہوتی تو وہ اسے اپنی بات کی حیثیت سے کہنے کی بجائے نبی ﷺ کی طرف نسبت کر دیتے تو ان کی بات بڑی اہمیت رکھنے والی ہوتی اور ان کی عزت بھی بہت ہوتی لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اگر انہوں نے نہیں کیا تو خواہ مخواہ ان کے سر مڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔

اَلتَّرْغِيبُ فِي الصَّدَقَةِ

صدقہ کے بارے میں ترغیب

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ" عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ اَبِي الْحُبَابِ سَعْدِ بْنِ يَسَارٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ مِنْ كَسْبٍ طَيِّبٍ، وَلَا يَقْبَلُ اللّٰهُ اِلَّا طَيِّبًا كَانَ اِنَّمَا يَضَعُهَا فِي كَفِّ الرَّحْمٰنِ يُرَبِّيهَا كَمَا يُرَبِّي اَحَدُكُمْ فَلُوَّهُ اَوْ فَصِيلَهُ حَتّٰى تَكُونَ مِثْلَ الْجَبَلِ.

﴿سعد بن یسارؒ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنی پاک کمائی سے صدقہ کرے، اور اللہ پاک کمائی ہی قبول کرتا ہے، تو گویا وہ خدائے رحمٰن کے ہاتھ میں اس کو رکھتا ہے جو اس کو نشوونما

دے کر بڑھاتا ہے، جیسا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے بچھڑے کو یا اپنے اونٹ کے بچے کو بڑھاتا ہے، یہاں تک کہ وہ صدقہ پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے۔﴾

وضاحت :

فصیلہ دودھ چھوڑے ہوئے بچے کو کہتے ہیں۔

قرآن مجید میں یوں آیا ہے یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ یُرْبِی الصَّدَقٰتِ۔ البقرہ، ۲۷۶

(اللہ سود کو گھٹائے گا اور صدقات کو بڑھائے گا) جو صدقات اللہ کی راہ میں دیے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو بڑھاتا ہے، اور اللہ جتنا چاہے بڑھائے۔ یہاں وضاحت کر دی گئی ہے کہ وہ بڑھا کر پہاڑ کی مانند کر دیتا ہے۔ آپ چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے گویا آپ نے اس کو خدائے رحمان کے ہاتھ میں دے دیا کہ وہ اس کو اس طریقہ سے بڑھائے جس طریقہ سے آپ اپنے بچھڑے کو پالتے ہیں یا اونٹ کے بچے کی پرورش کرتے ہیں تو وہ بڑا ہو جاتا ہے۔

صدقات کی زیادت ہونی چاہیے اور چھوٹی یا بڑی جو چیز بھی دیں تو اس میں خلوص شامل ہونا چاہیے کیونکہ اصل قدر و قیمت تو خلوص کی ہے۔

☐ حَدَّثَنِی مَالِكٌ" عَنْ اِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِی طَلْحَةَ اَنَّهٗ سَمِعَ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ یَقُوْلُ كَانَ اَبُو طَلْحَةَ اَكْثَرَ اَنْصَارِیٍّ بِالْمَدِیْنَةِ مَالًا مِنْ نَخْلٍ، وَ كَانَ اَحَبُّ اَمْوَالِهٖ اِلَیْهِ بَیْرُحَاءَ وَ كَانَتْ مُسْتَقْبِلَةَ الْمَسْجِدِ وَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَدْخُلُهَا وَ یَشْرَبُ مِنْ مَاءٍ فِیْهَا طَیِّبٍ. قَالَ اَنَسٌ" فَلَمَّا اُنْزِلَتْ هٰذِهِ الْاٰیَةُ: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ قَامَ اَبُو طَلْحَةَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰی یَقُوْلُ: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ. وَ اِنَّ اَحَبَّ اَمْوَالِی اِلَیَّ بَیْرُحَاءُ، وَ اِنَّهَا صَدَقَةٌ" لِلّٰهِ اَرْجُوْا بِرَّهَا وَ ذُخْرَهَا عِنْدَاللّٰهِ فَضَعْهَا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ حَیْثُ شِئْتَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَبَخٍ ذٰلِكَ مَالٌ" رَابِحٌ" ذٰلِكَ مَالٌ" رَابِحٌ" وَقَدْ سَمِعْتُ مَا قُلْتَ فِیْهِ وَ اِنِّی اَرٰی اَنْ تَجْعَلَهٗ فِی الْاَقْرَبِیْنَ، فَقَالَ اَبُو طَلْحَةَ اَفْعَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَسَمَهَا اَبُو طَلْحَةَ فِی اَقَارِبِهٖ وَ بَنِی عَمِّهٖ.

﴿اسحٰق بن عبداللہ بن ابی طلحہ نے انس بن مالکؓ کو فرماتے سنا کو ابو طلحہؓ مدینہ میں کھجوروں کے باغ کے لحاظ سے سب سے زیادہ رئیس انصاری تھے۔ اور ان کا محبوب ترین باغ بیر حاء تھا جو مسجد (یعنی مسجد نبوی) کے بالمقابل تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس میں تشریف لایا کرتے اور اس میں سے شیریں اور ٹھنڈا پانی پیا کرتے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (تم خدا سے وفاداری کے مقام کو نہیں پا سکتے جب تک کہ اپنے محبوب مال میں سے نہ خرچ کرو) تو ابو طلحہ اٹھے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کی وفاداری کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ تم خرچ نہ کرو اس چیز سے جو تمہیں سب سے زیادہ محبوب ہے۔ تو میرا سب سے زیادہ محبوب مال باغ بیر حاء ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں صدقہ ہے، اب میں اس کا صلہ اور اجر اللہ کے ہاں چاہتا ہوں۔ یا رسول اللہ آپ جہاں چاہیں اس کو صرف کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سبحان اللہ! ماشاء اللہ! بہت اچھا مال ہے۔ یہ بہت نفع بخش باغ ہے۔ میں نے سن لی وہ بات جو تم نے کہی ہے۔ اب میری رائے یہ ہے کہ تم اس کو اپنے اقرباء میں تقسیم کر دو۔ ابو طلحہ نے کہا: یا رسول اللہ میں ایسے ہی کروں گا۔ تو ابو طلحہ نے اسے اپنے اقرباء اور اپنے چچازاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔﴾

وضاحت :

بخ وہی لفظ ہے جو پیچھے ایک روایت میں حضرت عمرؓ نے اپنے لیے اظہار طنز استعمال کیا۔ یہ تین چار شکلوں میں آتا ہے۔ یہاں یہ لفظ تحسین کے لیے آیا ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ قرآن مجید سے کس طرح متاثر ہوتے تھے۔ ان کے مقابلے میں آج ہمیں اپنے رویے پر نظر کرنی چاہیے کہ ہم قرآن مجید کے معاملے میں کس قدر بعید ہو گئے ہیں۔

اس حدیث سے خاص بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص چاہے تو صدقہ کے مصارف میں اپنے اعزہ اقرباء اور اپنے بعض اعمام کو، جن کی حالت محتاج اصلاح ہو، شامل کر سکتا ہے۔ ان کی بہبود کے لیے صدقہ کے

مال سے ان کی مدد کر سکتا ہے۔ محتاج کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی بالکل ہی تہی دست ہو، دو روٹی کا محتاج ہو۔ حضرت لوطؑ نے باغ اپنے جن اقرباء اور بنی اعمام میں تقسیم کیا ان کے متعلق قطعی طور پر معلوم ہے کہ ان میں سے کوئی محتاج نہیں تھا۔ حضرت حسانؓ بھی ان کے خاندان میں سے تھے۔ اس باغ میں سے ان کو جو حصہ ملا تھا وہ انہوں نے بنو امیہ کے زمانے میں ایک لاکھ درہم میں بیچا تھا۔

قرآن مجید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ اور صدقات کے مصارف میں کوئی فرق نہیں البتہ ان کے وصول کرنے میں فرق ہے۔ اگر آپ زکوٰۃ نہیں دیں گے تو حکومت وصول کرے گی لیکن صدقات کی ادائیگی آپ کی صوابدید پر ہے۔

ہمارے فقہاء نے حد مقرر کر رکھی ہے کہ اگر کسی غریب کے پاس اتنی مالیت کا مال ہو تو اس کو زکوٰۃ نہیں دینی چاہیے۔ اس زمانے میں اتنی مالیت سے تو آدمی ایک وقت کی روٹی نہیں کھا سکتا۔ یہ بات غلط ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصود لوگوں کی بہبود اور ترقی ہے۔ معاشرہ میں ان کے مقام کو بلند کیا جائے۔ اگر وہ کاروبار کرتے ہیں تو ان کو سہولت حاصل ہو جائے اور کام کرتے ہیں تو اس میں ان کو آسانیاں مل جائیں اور وہ ترقی کر کے اس کو بڑھا لیں۔ اس زمانے میں رفاہی ریاست کا بہت چرچا ہے۔ رفاہی ریاست قائم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ زکوٰۃ کے جتنے بھی احکام ہیں ان کو قرآن مجید کے مطابق ٹھیک کیا جائے۔ زکوٰۃ ہر مال میں ہے۔ اس میں سے مستثنیٰ صرف مقدار ہے۔ بڑے جانے پر جو چیز بھی کاشت ہو گی اس پر زکوٰۃ ہو گی۔ حکومت زکوٰۃ کے اموال سے اجتماعی بہبود اور رفاہیت کے کام کر سکتی ہے۔ زکوٰۃ اور صدقات کے مصارف میں کوئی فرق نہیں، دونوں کا مصرف ایک ہے۔ یہ قیموں، غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کی بہبود، ترقی اور اصلاح کے لیے خرچ ہوں گے۔

□ حَدَّثَنِي" عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ أَعْطُوا السَّائِلَ وَ إِنْ جَاءَ عَلَى فَرَسٍ

﴿زید بن اسلم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سائل کو دو اگرچہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔﴾

وضاحت:

یہ روایت موقوف ہے۔ بہر حال اس کا مطلب یہ ہے کہ جو مانگتا ہے اس کو دیں۔ اس کے بارے میں زیادہ

تحقیق نہیں کرنی چاہیے۔ سائل کے لیے یہ کیا کم ہے کہ اس نے اپنی ناموس اور اپنی قدر کو آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ جس نے اتنی بڑی قربانی دی ہے اس کی زیادہ کرید نہیں کرنی چاہیے الا آنکہ یہ واضح ہو کہ یوں ہی بھکل بنائے ہوئے ہے یا پیشہ ور ہے۔ ظاہری حالت پر قیاس کر کے انکار کرنا صحیح نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ سائل لنگڑا ہو تو سوار ہو کر آیا ہو۔ یا اس کے پاس گھوڑا تو ہے لیکن اس کی ضروریات بجائے اپنی بھی ضروریات نہیں ہیں اور حالات نے اسے مانگنے پر مجبور کر دیا ہے۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ عَمْرِو بْنِ مُعَاذٍ الْأَشْهَلِيِّ الْأَنْصَارِيِّ عَنْ جَدَّتِهِ أَنَّهَا قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَا نِسَاءَ الْمُؤْمِنَاتِ لَا تَحْقِرَنَّ إِحْدَاكُنَّ أَنْ تُهْدِيَ لِجَارَتِهَا وَلَوْ كُرَاعَ شَاةٍ مُحْرَقًا.

﴿عمرو بن معاذ الاشہلی الانصاری اپنی دادی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اے مومنہ عورتو! تم میں سے کوئی بھی اس بات کو حقیر نہ سمجھے کہ وہ اپنی پڑوسن کے لیے کوئی حقیر سے حقیر ہدیہ بھیجے اگرچہ وہ بکری کی ایک جلی ہوئی کھری ہو۔﴾

وضاحت:

یہ واقعہ ہے کہ ہدیہ محبت بڑھانے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اپنی توفیق کے مطابق جو کچھ بھی میسر ہو اور جب بھی موقع ملے ہدیہ دینا چاہیے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہدیہ شاندار ہو تب دے۔ کوئی چیز جو ذرا بھی ندرت رکھتی ہو، پڑوسی کو ضرور بھیجنی چاہیے۔ آنحضرت ﷺ نے اسی کی تلقین کی ہے اور یہ چیز معاشرت پر بہت مفید اثرات ڈالتی ہے۔

اس حدیث میں نساء المومنات کی ترکیب شاذ ہے۔ میرے نزدیک تو یہ ہے کہ جس طریقہ سے نکرہ موصوف معرفہ بن جاتا ہے اسی طریقہ سے متدای بھی معرفہ کا مقام حاصل کر لیتا ہے اس لیے اس کی صفت معرفہ آ سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّ مِسْكِينًا سَأَلَهَا وَهِيَ صَائِمَةٌ وَلَيْسَ فِي بَيْتِهَا إِلَّا رَغِيفٌ فَقَالَتْ لِمَوْلَاةٍ لَهَا أَعْطِيهِ إِيَّاهُ، فَقَالَتْ لَيْسَ لَكِ مَا

تُفطِرِينَ عليه، فقالتْ أعطِيهِ إيَّاهُ قالتْ ففعلتْ. قالتْ فلمَّا أمسَينا أهدَى لنا أهلُ بيتٍ أو إنسانٌ ما كان يُهدِي لنا شاةً و كفَنِها فدعَتْنِي عائشةُ أمُّ المؤمنينَ، فقالتْ كُلِي مِنْ هذا خيرٌ من قُرصكِ.

﴿امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مجھے نبی ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ بات پہنچی کہ ایک مسکین ان کے پاس آیا اور اس نے کچھ سوال کیا اور وہ روزے سے تھیں۔ گھر میں ایک چپاتی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی آزاد کردہ لونڈی سے کہا کہ یہ اسے دے دو۔ اس نے کہا کہ افطار کرنے کے لیے آپ کے لیے کچھ نہیں رہے گا۔ تو انہوں نے کہا کہ تم دے دو۔ وہ کہتی ہیں کہ میں نے چپاتی سائل کو دے دی۔ جب شام ہوئی تو ہمارے لیے ایک ایسے خاندان والوں نے (یا ایک شخص نے) بکری کا گوشت بھیجا جن کو ہمارے ہاں ہدیہ بھیجنے کی مستقل عادت نہ تھی۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مجھے بلایا اور کہا: لو اس میں سے کھاؤ۔ یہ اس چپاتی سے بہتر ہے جو تم نے دی۔﴾

وضاحت:

"بکری بھیجی" یہ عربیت کا اسلوب ہے کہ کل بول کر جزء مراد ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ پوری بکری بھیجی۔ آپ بھی مہمان کی تواضع کے لیے مرغی ذبح کرتے ہیں تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے مہمان کو مرغی کھلائی حالانکہ اس میں سے اور لوگوں نے بھی کھایا ہوتا ہے۔

و کفَنِها میں واؤ عطف کا نہیں بلکہ سے کا حصہ ہے۔ وکف کے معنی ہیں قطرہ قطرہ ٹپکنے کا مفہوم ہے، گویا یہ خاندان مسلسل ہدیہ نہیں بھیجتا تھا۔ بعض لوگوں نے واؤ کو حرف عطف بنا ہے اور کفن کو ڈھانکنے کے معنی میں لیا ہے یعنی اس پر روٹیاں ڈھانپ رکھی تھیں۔ لوگوں نے اور شرحیں بھی لکھی ہیں بہرحال یہ لفظ مزید تحقیق طلب ہے۔ اس بات کا امکان بھی ہے کہ یہ لفظ غلط ضبط ہو گیا ہو۔

یہ روایت امام مالکؒ کی بلاغات میں سے ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ جب کوئی سائل آئے تو اس کو دینا چاہیے اور اسی طریقہ سے دینا چاہیے جس طریقہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیا۔ تجربہ یہی ہے کہ اگر آپ اس طریقہ سے دیں گے تو اللہ آپ کو کبھی نہیں روئیں گے، اچھا کھائیں گے۔

□ حدَّثنِي عَنْ مالكٍ قال بلَغنِي أنَّ مِسكِينًا استطعَمَ عائشةَ أمَّ المُؤمنِينَ و بين يدَيْها عِنَبٌ، فقالتْ لِإنسانٍ خُذْ حبَّةً فأعطِهِ إيَّاها فجعَلَ ينظُرُ إليها و يعجَبُ، فقالتْ عائشةُ أتعجَبُ كم ترَى في هذهِ الحبَّةِ مِنْ مِثقالِ ذرَّةٍ.

﴿امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی کہ ایک مسکین نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کھانا مانگا۔ ان کے آگے کچھ انگور تھے۔ انہوں نے کسی سے کہا کہ اس میں سے ایک دانہ لے کر اس کو دے دو تو وہ تعجب سے حضرت عائشہؓ کا منہ دیکھنے لگا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ تم تعجب کرتے ہو! اس میں نہ جانے کتنے مثقال ذرہ ہوں گے۔﴾

وضاحت:

عنب" یہاں نکرہ ہے جو تحقیر کے لیے بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تھوڑے سے انگور یا کچھ انگور۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اگر کہتیں تو یہ کہتیں کہ دے دو بہتے بھی ہیں۔ سیدہ عائشہؓ کے کردار سے یہ بعید ہے کہ انہوں نے یہ کہا ہوگا کہ اس میں سے ایک دانہ اٹھا کر دے دو۔ بہر حال یہ امام مالکؒ کی بلاغات میں سے ہے۔ میں اس کی ذمہ داری نہیں لیتا۔

مَاجَاءَ فِي التَّعَفُّفِ عَنِ الْمَسْئَلَةِ

سوال سے احتراز کے بارے میں روایات

□ حدَّثنِي عَنْ مالكٍ عَنِ ابْنِ شِهابٍ عَنْ عَطاءِ بْنِ يَزِيدَ اللَّيْثِيِّ عَنْ أبِي سَعِيدٍ الخُدْرِيِّ أنَّ ناسًا مِنَ الأنصارِ سألُوا رسُولَ اللهِ ﷺ فأعطاهُمْ ثُمَّ سألُوهُ فأعطاهُمْ حتَّى نفِدَ ما عِندَهُ ثُمَّ قالَ ما يكُونُ عِندِي مِن خيرٍ فلَنْ أدَّخِرَهُ عنكُمْ، ومَنْ يستعفِفْ يُعِفَّهُ اللهُ، ومَنْ يستغنِ يُغنِهِ اللهُ، ومَنْ يتصبَّرْ يُصبِّرْهُ اللهُ وما أعطَى أحدٌ عطاءً هُوَ خيرٌ و أوسَعُ مِنَ الصَّبرِ.

﴿حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ کچھ انصار آئے۔ رسول اللہ ﷺ سے انہوں نے سوال کیا تو آپؐ نے دیا۔ پھر سوال کیا تو پھر دیا، یہاں تک کہ آپؐ کے پاس جو کچھ تھا ختم ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ بھئی! میرے پاس جو مال ہو گا میں اس کو تم سے اٹھا نہیں رکھوں گا۔ لیکن یاد رکھو کہ جو پاک دامنی اختیار کرنا چاہے گا اللہ تعالیٰ اس کو پاک دامنی بخشے گا۔ اور جو استغنا اختیار کرنا چاہے گا اللہ تعالیٰ اس کو غنی بنا دے گا۔ اور جو صبر اختیار کرنا چاہے گا اللہ تعالیٰ اس کو صابر بنا دے گا۔ اور یہ یاد رکھو کہ بہترین اور وسیع ترین عطیہ جو خدا کی طرف سے ملتا ہے وہ صبر ہے۔﴾

وضاحت :

یہ روایت ہے تو ابن شہاب کے ذریعے سے مگر نہایت لاجواب روایت ہے۔ فلسفہ دین کے لحاظ سے یہ بہت اہم روایت ہے۔ اس ایک روایت کی بدولت ابن شہاب کو اہمیت حاصل ہو گئی ہے اور ان ہی کے پردے میں وہ اپنی خرافات بھی بھر دیتے ہیں۔

اس روایت میں تمام بنیادی اخلاقیات آ گئی ہیں۔ اگر آپ پاک دامن بننا چاہتے ہیں تو امتحان ضرور پیش آئے گا۔ اگر آپ عفت قلبی سے کوشش کریں گے تو سیدنا یوسف علیہ السلام کی طرح بازی لے جائیں گے۔ اگر آپ ارادہ رکھتے ہیں کہ چاہے کچھ ہو جائے، مانگوں گا نہیں تو ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے گا اور آپ کو غنی کر دے گا۔ علیٰ ہذا القیاس کسی امتحان میں اگر آپ نے ارادہ کر لیا کہ میں بہر حال استقامت دکھاؤں گا، گردن نہیں جھکاؤں گا تو اللہ تعالیٰ آپ کے اندر وہ صبر و استقامت پیدا کر دے گا جو آپ کو بہت اونچا اٹھا دے گا۔ بہر حال کوشش آپ کی طرف سے ہونی چاہیے۔ آخر میں بتا دیا کہ سب سے وسیع تر نعمت جو خدا سے مل سکتی ہے وہ صبر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سارا دین دو ستونوں پر قائم ہے، آدھا شکر پر اور آدھا صبر پر۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ وَهُوَ يَذْكُرُ الصَّدَقَةَ وَالتَّعَفُّفَ عَنِ الْمَسْئَلَةِ اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ" مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى، وَالْيَدُ الْعُلْيَا هِيَ الْمُنْفِقَةُ، وَالسُّفْلٰى هِيَ السَّائِلَةُ.

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے صدقہ پر

ابھارتے اور سوال سے احتراز کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا کہ اوپر والا ہاتھ بہتر ہے نیچے والے ہاتھ سے۔ اوپر والے ہاتھ سے مطلب خرچ کرنے والا اور نیچے والے ہاتھ سے مراد مانگنے والا ہے۔﴾

وضاحت :

والید العلیا هی المنفقه والسفلی هی السائلة میرے نزدیک راوی کی طرف سے شرح ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد صرف اوپر والا ہاتھ یعنی الید العلیا خیر من الید السفلی ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ دینے والے ہاتھ کو لینے والے ہاتھ پر درجے اور مرتبے کے لحاظ سے ترجیح حاصل ہے۔ اس حدیث میں اس بات کی تلقین ہے کہ قومی کو جب تک برداشت کر سکے، صبر کر سکے، مانگنے سے گریز کرنا چاہیے۔ اوپر والی حدیث میں یہ بات آ چکی ہے کہ جو شخص اپنی خودداری کو بچانا چاہے گا اللہ تعالیٰ اس کی خودداری کو محفوظ رکھے گا۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَرْسَلَ اِلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ بِعَطَاءٍ فَرَدَّهُ عُمَرُ، فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِمَ رَدَدْتَهُ، فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلَيْسَ اَخْبَرْتَنَا اَنَّ خَيْرًا لِاَحَدِنَا اَنْ لَا يَاْخُذَ مِنْ اَحَدٍ شَيْئًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّمَا ذٰلِكَ عَنِ الْمَسْئَلَةِ فَاَمَّا مَا كَانَ عَنْ غَيْرِ مَسْئَلَةٍ فَاِنَّمَا هُوَ رِزْقٌ" يَرْزُقُكَهُ اللّٰهُ، فَقَالَ عُمَرُ اَمَا وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا اَسْاَلُ اَحَدًا شَيْئًا، وَلَا يَاْتِينِي مِنْ غَيْرِ مَسْئَلَةٍ شَيْءٌ" اِلَّا اَخَذْتُهُ.

﴿عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر بن الخطابؓ کے پاس کوئی چیز بھیجی تو حضرت عمرؓ نے لوٹا دی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم نے یہ کیوں لوٹا دی تو انہوں نے کہا کیا آپ نے یہ بات نہیں فرمائی تھی کہ ہمارے لئے بہتر ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص کسی سے کوئی چیز قبول نہ کرے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ تو اس شکل کے لیے ہے کہ جب کوئی آدمی سوال کرے، مگر بغیر سوال کیے کوئی چیز ملے تو وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ تمہیں دیتا ہے تو اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ خدا کی قسم، جس کی مٹھی میں میری جان ہے کہ اب میں کسی سے مانگوں گا تو نہیں، لیکن اگر

کوئی چیز بن مانگے ملے گی تو اس کو قبول کروں گا۔﴾

وضاحت :

اس میں شبہ نہیں کہ بن مانگے جو چیز ملے وہ اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا رزق ہے البتہ بن مانگے میں یہ بات بھی داخل ہے کہ دل میں اس کی تمنا نہیں ہونی چاہیے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ قوی کے لیے دل شکنی کرنا مشکل ہو جاتا ہے تو دل شکنی نہیں کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی چیز کو خواہ تواہ رد نہیں کرنا چاہیے لیکن نہ اس کا طالب ہونا چاہیے نہ خواہشمند۔

❐ حدثني عن مالك عن ابي الزناد عن الأعرج عن أبي هريرة ان رسول الله ﷺ قال: والذي نفسي بيده لأن يأخذ أحدكم حبله فيحتطب على ظهره خير له من ان يأتي رجلا أعطاه الله من فضله فيسأله أعطاه أو منعه.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خدا کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے کہ یہ بات کہ تم میں سے کوئی رسی اٹھائے اور لکڑیاں جمع کر کے اپنی پیٹھ پر ڈھو کر لائے بہتر ہے اس بات سے کہ وہ کسی ایسے شخص کے پاس جس کو خدا نے کچھ دیا ہے، آئے اور اس سے مانگے تو وہ چاہے اس کو دے یا نہ دے۔﴾

وضاحت :

یہ صحیح موقف کردار کی تعلیم ہے۔ مانگنے سے حتی الامکان احتراز کرنا چاہیے۔ البتہ وہ سوال اس سے مستثنیٰ ہوگا جو قومی، دینی، اصلاحی اور رفاہی کاموں کے لیے کیا جائے اگرچہ اس میں خطرات بہت ہیں۔ اسلام میں اس قسم کے اداروں کی کفالت کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔ عوام کے ہاتھوں میں آکر یہ کام تجارت کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔ لیکن جن ممالک میں صحیح قسم کی حکومت نہیں ہے وہاں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اپنے اہل دین لوگوں کو بھی جھوٹی انا کر دوسروں کے سامنے چندہ مانگنے کے لیے جانا پڑتا ہے۔

❐ حدثني عن مالك عن زيد بن اسلم عن عطاء بن يسار عن رجل من بني اسد انه

قال: نزلت انا و أهلي ببقيع الغرقد، فقال لي أهلي اذهب الى رسول الله ﷺ فاسأله لنا شيئا نأكله وجعلوا يذكرون من حاجتهم فذهبت الى رسول الله ﷺ فوجدت عنده رجلا يسأله و رسول الله ﷺ يقول لا أجد ما أعطيك فتولى الرجل عنه وهو مغضب، وهو يقول لعمري انك لتعطي من شئت، فقال رسول الله ﷺ انه ليغضب على ان لا اجد ما أعطيه من سأل منكم ولله أوقية أو عدلها فقد سأل الحافا. قال الأسدي فقلت اللقحة لنا خير من أوقية. قال مالك: والأوقية أربعون درهما فرجعت ولم أسأله فقدم على رسول الله ﷺ بعد ذلك بشعير وزبيب فقسم لنا منه حتى أغنانا الله عزوجل. و عن مالك عن العلاء بن عبدالرحمن انه سمعه يقول: ما نقصت صدقة من مال وما زاد الله عبدا بعفو الا عزا وما تواضع عبد الا رفعه الله. قال مالك: لا أدري أيرفع هذا الحديث عن النبي ﷺ أم لا.

﴿عطاء بن یسار بنی اسد کے ایک شخص سے روایت کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ میں اور میرے گھر والے بقیع غرقد میں اترے۔ گھر والوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ کے پاس جاؤ اور ان سے سوال کرو کہ ہمیں کچھ کھانے کو دیں، اور وہ اپنی ضرورت بیان کرنے لگے۔ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہاں دیکھا کہ ایک شخص آپ سے کچھ سوال کر رہا ہے اور رسول اللہ ﷺ اس کو فرما رہے ہیں کہ بھئی! میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ نہیں۔ وہ شخص وہاں سے مڑا اور غصے میں تھا اور یہ کہہ رہا تھا: خدا کی قسم! آپ تو اس کو دیتے ہیں جس کو چاہتے ہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دیکھئے یہ شخص میرے اوپر غصہ اس بات پر ہو رہا ہے کہ میرے پاس اس کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اور جس نے تم میں سے سوال کیا جب کہ اس کے پاس ایک اوقیہ یا اس کے برابر مال ہے تو اس کا سوال الحاف قرار پائے گا۔ اسدی شخص کہتا ہے کہ میں نے (دل میں) کہا کہ ہماری دودھ دینے والی اونٹنی تو ایک اوقیہ سے بہتر ہے۔ امام مالک کہتے ہیں کہ اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے۔ پس میں وہاں سے پلٹ

آیا اور میں نے آنحضرت ﷺ سے کچھ نہیں مانگا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ خوارک وغیرہ آئے تو آپ نے ہمارے لیے بھی اس میں سے بھیجا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں مستغنی کر دیا۔

امام مالکؒ علاء بن عبدالرحمٰن کے بارے میں بتاتے ہیں کہ انہوں نے ان کو یہ فرماتے سنا کہ کسی مال میں سے صدقہ اس میں کمی نہیں کرتا اور جو شخص عفو و درگزر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی عزت ہی میں اضافہ کرتا ہے۔ اور جو شخص تواضع کی راہ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا درجہ بلند کرتا ہے۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ یہ حدیث نبی ﷺ تک مرفوع ہے کہ نہیں۔﴾

وضاحت :

اس حدیث میں علاء بن یسار بعض اسد کے ایک شخص سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے اس شخص کا نام نہیں لیا ہے۔ محدثین کے اصول کے مطابق اس روایت میں یہ ضعف کا پہلو ہے۔ اس کو صرف امام نسائی نے لیا ہے اور کسی نے نہیں لیا۔ امام مالکؒ علاء بن عبدالرحمٰن سے روایت کے بارے میں کہتے ہیں کہ انہیں یہ معلوم نہیں کہ یہ حدیث نبی ﷺ تک مرفوع ہے کہ نہیں۔ گویا امام مالکؒ سندوں کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ بات کو اہمیت دیتے ہیں۔ اس لیے کہ سندوں میں پیوست کرنے جانے کیا کیا زہر دیا جا سکتا ہے لیکن بات اگر وزن دار ہوتی ہے، اس کو دل قبول کرتا ہے تو یہ خود اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ یہ کلام بہر حال کسی پاکیزہ منبع سے نکلا ہے۔

بقیع غرقد مسجد نبوی کے قرب میں ایک مقام ہے جس میں قبرستان بھی ہے۔

'الحاف' کے معنی لپٹ کر اور پیچھے پڑ کر سوال کرنے کے ہیں۔ لا یسئلون الناس الحافا (وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے) میں اصل مقصود سوال کرنے کی نفی ہے۔ الحافا کی قید اس کے ساتھ صرف سوال کرنے والوں کی عام حالت کی تصویر اور اس کے گھناؤنے پن کے اظہار کے لیے لگائی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ آدمی ایک اوقیہ کے برابر مال رکھتے ہوئے اگر سوال کرے گا تو وہ پیچھے پڑ کر مانگنے والے غیر مستحق سائل کے حکم میں ہوگا۔ راوی نے جب یہ سنا تو سوچا کہ میری اونٹنی کی مالیت تو اس سے زیادہ ہے۔ پھر میں کیوں نبی ﷺ سے سوال کروں۔ چنانچہ وہ بغیر اپنا مدعا بیان کیے گھر والوں کے پاس لوٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی ضرورت اس طرح پوری کر دی کہ آنحضرتؐ کے پاس کچھ جو اور مختی تقسیم کے لیے آئے تو آپ نے اس مسافر گھرانے کو بھی حصہ بھجوایا۔

امام مالکؒ نے اوقیہ کی مقدار یہ بتائی کہ یہ چالیس درہم کے برابر ہے۔ یہ تعریف المجہول بالمجہول ہے۔ درہم کے نرخ بدلتے رہتے ہیں بلکہ ہر چیز کے نرخ بدلتے رہتے ہیں اس لیے آپ کوئی حساب ٹھیک طرح سے نہیں کر سکتے۔ موجودہ تمدن کے دور میں ضروری ہے کہ اس طریقہ کی تمام چیزوں میں زیادہ سے زیادہ یکسانی پیدا کر دی جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو بہت مفید ہوگا۔

مَا يُكْرَهُ مِنَ الصَّدَقَةِ

صدقہ میں کیا چیز مکروہ ہے

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِآلِ مُحَمَّدٍ إِنَّمَا هِيَ أَوْسَاخُ النَّاسِ

﴿امام مالکؒ سے روایت ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آل محمد کے لیے صدقہ جائز نہیں۔ یہ لوگوں کے جسموں کا میل کچیل ہے۔﴾

وضاحت :

یہ روایت امام مالک کی بلاغات میں سے ہے۔ امام مالک نے اس میں راوی کا نام نہیں لکھا مگر یہ یاد رکھیے کہ یہ روایت پانچ چھ طریقوں سے مرفوع ہے اور ان سب میں ابن شہاب موجود ہے۔ یہ روایت قرآن کے بالکل خلاف ہے اور عقل کے بھی خلاف ہے۔ میرے نزدیک اس کو شیعوں کے امام ابن شہاب نے گھڑا ہے تاکہ آل محمد کی رجعت کو قائم کیا جائے۔ پہلے میرا خیال یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بات یوں فرمائی ہوگی کہ لا تحل الصدقة لآل محمد اور یہ فرمانے کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ یہودیوں میں یہ ہوا تھا کہ صدقہ اور زکوٰۃ کی جتنی رقوم ہوتی تھیں وہ یہود کے قبیلہ بنی لاوی کا حق مان لی گئی تھیں۔ قربانی کے جتنے جانور ہوتے تھے ان کے گوشت کا بہترین حصہ ان کا ہوتا تھا اور خیرات کی تمام رقمیں ان کی ہوتی تھیں۔ دوسرے لوگ ان سے محروم کر دیے گئے۔ میرا خیال یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ نے اس فتنہ کے سدباب کے لیے فرمایا لا تحل الصدقة لآل محمد کہ آل محمدؐ کے لیے صدقہ جائز نہیں۔ اس کے بعد روایت کا جتنا حصہ ہے وہ ابن شہاب کا اسی طرح کا اضافہ ہے جس طرح کا اضافہ انہوں نے پیچھے بیان ہونے والی الیمین حق (نظر بد ایک حقیقت ہے) کی روایت میں کیا ہے۔ وہاں الیمین حق کی جگہ لو ہو

سکتی ہے لیکن اس کے بعد نظر بد اتارنے کا جو ٹوٹکا ابن شہاب نے بتایا ہے کہ نظر لگانے والے شخص کو پکڑا جائے وہ اپنے تھوک کے بچے کا حصہ دھوئے اور دھوون اس شخص پر انڈیل دی جائے جس کو نظر لگی ہو۔ تو یہ ابن شہاب کا اپنا اضافہ ہے۔ لیکن اب میری رائے یہ ہے کہ یہ پوری روایت جھوٹی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر صدقہ (لوگوں کا میل کچیل) ہے تو یہ میل کچیل ان لوگوں کے لیے ہے جو مالدار ہیں اور لوگوں کا حق ادا نہیں کرتے۔ محتاج اور بیمار اگر پاتے ہیں تو اپنا حق پاتے ہیں۔ یہ بات قرآن مجید سے ثابت ہے کہ یہ حق معلوم یعنی ان کا معین حق ہے۔ قرآن مجید میں یہ بتایا گیا ہے کہ لوگوں کے پاس جو اکٹھا مال ہوتا ہے وہ اصل میں دوسروں کے حقوق ہیں جو امراء کی امانت میں دیے جاتے ہیں اور اس سے ان کا امتحان مقصود ہوتا ہے کہ وہ حقوق ادا کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ اس مال کو ہڑپ کریں تو وہ خباثت کا ذخیرہ ہے جو وہ کھا رہے ہیں۔ مستحقین کے لیے یہ خباثت کا ذخیرہ نہیں بلکہ اللہ کا دیا ہوا مال ہے۔

پھر اس روایت میں آل محمد کو بوہوں کی طرح کا ایک پورا خاندان بنا دیا گیا اور اس میں تمام بنی ہاشم کو شامل کر دیا گیا۔ تمام بنی ہاشم کے لیے صدقات حرام کر دیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوپر بیان کردہ روایت کی رو سے ید العلیا (اوپر کا ہاتھ) افضل ہے اور ید السفلی (نیچے کا ہاتھ) مفضول ہے تو آل محمدؐ کے لیے یہ کس طرح جائز ہوتا کہ ان کا ہاتھ نیچے رہے۔ چاہے وہ غریب ہوں یا بیمار۔ ان کو تو ہر حال سر پر رکھنا ہے۔ وہ نیچے کس طریقہ سے اتر سکتے ہیں۔

پھر یہ سوال بھی اہم ہے کہ تمام بنی ہاشم کس طریقہ سے آل محمدؐ میں شامل ہو گئے۔ یہ واقعہ ہے کہ عرب میں اور ہمارے ہاں بھی یہ رواج رہا ہے کہ آدمی کی نسل لڑکی سے نہیں چلتی بلکہ لڑکے سے چلتی ہے۔ بالفرض سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد کے متعلق مان لیجئے کہ وہ آل محمدؐ ہیں لیکن بنی ہاشم کے پورے خاندان کو کس طریقہ سے آل محمد ہونے کا شرف حاصل ہو جاتا ہے؟ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت صرف بنی ہاشم کا منہ نیچا کرنے کے لیے گھڑی گئی ہے ورنہ اس کی کوئی بنیاد نہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آل محمدؐ میں اگر کچھ لوگ فی الواقع محتاج ہوں اور ان کے پاس زندگی گزارنے کے وسائل موجود نہ ہوں تو کیا ان کو بھوکے مرنے دیا جائے گا اور صدقہ سے ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔ اگر اس مد کے لیے کوئی حیلے تراشے جاتے ہیں تو اس سے حقیقت تو نہیں بدل جائے گی۔ اس صورت میں بھی ان کا

باتھ تو نیچے ہی رہے گا۔

□ • حدثني عن مالك عن عبدالله بن ابي بكر عن ابيه ان رسول الله ﷺ استعمل رجلا من بني عبد الاشهل على الصدقة، فلما قدم سأله ابلا من الصدقة فغضب رسول الله ﷺ حتى عرف الغضب في وجهه و كان مما يعرف به الغضب في وجهه ان تحمر عيناه ثم قال ان الرجل ليسألني ما لا يصلح لي ولا له، فان منعته كرهت المنع، و ان اعطيته اعطيته ما لا يصلح لي ولا له، فقال الرجل يا رسول الله لا اسئلك منها شيئا ابدا.

﴿عبداللہ بن ابوبکرؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی عبدالاشہل کے خاندان میں ایک شخص کو صدقے کی وصولی پر مامور کیا۔ وہ جب واپس آئے تو انہوں نے صدقے کے اونٹوں میں سے ایک اونٹ مانگا۔ رسول اللہ ﷺ نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا، یہاں تک کہ آپ کے چہرے سے آپ کا غصہ ظاہر ہونے لگا۔ آپ کا غصہ چہرے سے اس وقت ظاہر ہوتا تھا جب آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ یہ شخص مجھ سے وہ چیز مانگتا ہے جو میرے لیے ٹھیک ہے نہ اس کے لیے۔ اگر نہ دوں تو میں نہ دینے کو برا سمجھتا ہوں، اگر دوں تو میں اس کو وہ چیز دوں گا جو میرے لیے ٹھیک ہے نہ اس کے لیے۔ تو اس آدمی نے کہا کہ یا رسول اللہ میں اب اس میں سے کبھی کوئی چیز نہیں مانگوں گا۔﴾

وضاحت:

یہ حدیث بالکل واضح ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مانگنے کی یہ شکل بھی مکروہ ہے۔

□ حدثني عن مالك عن زيد بن اسلم عن ابيه انه قال قال عبدالله بن الارقم ادللني على بعير من المطايا استحمل عليه اميرالمؤمنين؟ فقلت نعم حملا من الصدقة فقال عبدالله ابن الارقم ايحب ان رجلا باذنا في يوم حار غسل لك ما تحت ازاره و رفغيه ثم اعطاكه فشربته. قال فغضبت و قلت يغفر الله لك اتقول لي مثل هذا فقال عبدالله بن

الْاَرْقَمِ اِنَّمَا الصَّدَقَةُ اَوْسَاخُ النَّاسِ يَغْسِلُوْنَهَا عَنْهُمْ.

﴿زید بن اسلم کے والد راوی ہیں کہ عبداللہ بن الارقم نے ان سے کہا کہ مجھے سواری کے اونٹوں کی نشان دہی کرو کہ میں ان میں سے امیر المومنین سے سواری کے لیے مانگوں۔ تو میں نے کہا: اچھا! صدقہ کے اونٹوں میں سے ایک مانگئے۔ تو عبداللہ بن الارقم نے کہا کہ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایک موٹا فربہ آدمی گرمی کے دن اپنے تہمد کے نیچے کے اور اپنی رانوں کے پٹھے کے حصے کو دھوئے، پھر دو دھوون آپ کو دے اور آپ اس کو پئیں۔ کہتے ہیں میں نے بڑے غصے میں کہا اللہ آپ کو معاف کرے۔ کیا آپ مجھ سے اس طرح کی بات کہہ رہے ہیں؟ تو عبداللہ بن الارقم نے کہا کہ صدقہ لوگوں کی میل کچیل ہے جس کو وہ اپنے سے دھوتے ہیں۔﴾

وضاحت:

یہ بات ٹھیک ہے کہ ایک غیر مستحق صدقے کے مال میں سے مانگے تو وہ اس کے لیے ناجائز ہوگا لیکن یاد رکھیے کہ مستحق کے لیے وہ مال ناپاک نہیں بلکہ یہ اس کا حق ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے۔

مَاجَاءَ فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ

طلب علم کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ لُقْمَانَ الْحَكِيْمَ اَوْصٰى ابْنَهٗ. فَقَالَ يَا بُنَيَّ جَالِسِ الْعُلَمَاءَ وَ زَاحِمْهُمْ بِرُكْبَتَيْكَ فَاِنَّ اللّٰهَ يُحْيِي الْقُلُوْبَ بِنُوْرِ الْحِكْمَةِ كَمَا يُحْيِي اللّٰهُ الْاَرْضَ الْمَيْتَةَ بِوَابِلِ السَّمَاءِ.

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی ہے کہ لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو وصیت کی اور کہا: بیٹے! علماء کی صحبت اختیار کرلو اور ان کے گھٹنے کے ساتھ گھٹنا ملا کر ان کے آگے بیٹھا کرو۔ اللہ تعالیٰ حکمت کے نور سے اسی طرح دلوں کو زندہ کرتا ہے جس طرح وہ مردہ زمین کو آسمانی بارش سے زندہ کرتا ہے۔﴾

وضاحت:

یہ رسول اللہ ﷺ کا قول نہیں بلکہ لقمان حکیم کا قول ہے۔ لقمان عرب کے حکماء میں سے تھے، پیغمبر نہیں تھے۔ ان کی جرح بھی مجہول ہے۔ اگر قرآن مجید نے ان کا ذکر نہ کیا ہوتا تو ان کے متعلق ہم اچھی یا بری رائے قائم کرنے کی کسی پوزیشن میں نہیں تھے۔ لقمان حکیم کی بیٹے کو یہ نصیحت قرآن مجید میں بیان نہیں ہوئی ہے۔ امام مالکؒ نے کہیں سے سنی ہے اور حدیث کی کتاب میں اس کو درج کر دیا ہے اور ایسے نہ جانے کتنے اقوال ہیں جو انہوں نے جمع کیے ہیں۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایسے اقوال بھی نقل کیے ہیں جو ہمیں انجیلوں میں نہیں ملے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حکمت کی اچھی باتوں سے خاص دلچسپی تھی۔ نصیحت اپنی جگہ بہت قیمتی ہے۔ علماء کی صحبت میں بیٹھنے سے حکمت کی باتیں سننے کو ملتی ہیں اور آدمی میں اللہ کی صلاحیت ہو تو وہ ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ چیز دل کی زندگی کا باعث ہوتی ہے۔

مَا يُتَّقٰى مِنْ دَعْوَةِ الْمَظْلُوْمِ

مظلوم کی بد دعا سے بچنے کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اسْتَعْمَلَ مَوْلًى لَهٗ يُدْعٰى هُنَيًّا عَلَى الْحِمٰى، فَقَالَ يَا هُنَيُّ اضْمُمْ جَنَاحَكَ عَنِ النَّاسِ وَاتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ مُجَابَةٌ وَ اَدْخِلْ رَبَّ الصُّرَيْمَةِ وَالْغُنَيْمَةِ، وَاِيَّايَ وَ نَعَمَ ابْنِ عَفَّانَ وَابْنِ عَوْفٍ فَاِنَّهُمَا اِنْ تَهْلِكْ مَاشِيَتُهُمَا يَرْجِعَانِ اِلَى الْمَدِيْنَةِ اِلٰى زَرْعٍ وَ نَخْلٍ، وَ اِنَّ رَبَّ الصُّرَيْمَةِ وَالْغُنَيْمَةِ اِنْ تَهْلِكْ مَاشِيَتُهٗ يَاْتِنِي بِبَنِيْهِ فَيَقُوْلُ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَفَتَارِكُهُمْ اَنَا لَا اَبَالَكَ فَالْمَاءُ وَالْكَلَاءُ اَيْسَرُ عَلَيَّ مِنَ الذَّهَبِ وَالْوَرِقِ وَ اَيْمُ اللّٰهِ اِنَّهُمْ لَيَرَوْنَ اَنَّ قَدْ ظَلَمْتُهُمْ اِنَّهَا لَبِلَادُهُمْ وَمِيَاهُهُمْ قَاتَلُوْا عَلَيْهَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَ اَسْلَمُوْا عَلَيْهَا فِي الْاِسْلَامِ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْ لَا الْمَالُ الَّذِيْ اَحْمِلُ عَلَيْهِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا حَمَيْتُ عَلَيْهِمْ مِنْ بِلَادِهِمْ شِبْرًا.

زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے اپنے آزاد کردہ غلام، جس کا نام ہنیؒ تھا، کو سرکاری چراگاہ پر مقرر کیا تو آپ نے فرمایا کہ اے ہنی، لوگوں کو اپنے بازو سے بچا کے رکھیو اور مظلوم کی بد دعا سے ڈرتے رہیو کیونکہ مظلوم کی دعا خدا کے ہاں مقبول ہے۔ چھوٹے گلے والوں اور بکریوں کے چھوٹے ریوڑ والوں کو ضرور داخل ہونے دینا البتہ ابن عفان اور ابن عوف کے گلے آئیں تو ان کو روکنا کیونکہ اگر ان کے مواشی ہلاک ہو گئے تو وہ مدینہ میں اپنے کھیتوں اور اپنے کھجور کے باغوں میں آجائیں گے اور اگر چھوٹے گلے اور چھوٹے ریوڑ والے کا مال ہلاک ہو گیا تو وہ اپنے بچوں کے ساتھ میرے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ اے امیر المومنین! اے امیر المومنین! تو کیا میں ان کو چھوڑ دوں گا؟ خدا کے بندے! سوچ تو سہی۔ پانی اور چارہ مہیا کرنا میرے لیے زیادہ سہل ہے مقابلہ اس کے کہ میں ان کے اوپر سونا اور چاندی خرچ کروں۔ خدا کی قسم! وہ خیال کریں گے کہ میں نے ان کے اوپر ظلم ڈھایا ہے۔ یاد رکھو کہ یہ ملک ان کا ہے۔ چشمے ان کے ہیں۔ اس کے اوپر جاہلیت کے دور میں انہوں نے جنگیں لڑی ہیں اور اس کے اوپر ہی وہ اسلام لائے ہیں۔ اس خدا کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے کہ اگر ان جانوروں کی ضرورت نہ ہوتی جن کے اوپر میں لوگوں کو اللہ کے راستے میں سوار کراؤں تو میں ان کی زمین میں سے ایک بالشت برابر بھی چراگاہ نہ بناتا۔

وضاحت:

اس سے مراد وہ سرکاری چراگاہیں ہیں جو حکومت نے جگہ جگہ صدقہ کے جانوروں کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لیے بنا رکھی تھیں۔

الصرمۃ سے مطلب اونٹوں کا چھوٹا گلہ اور غنیمۃ سے مراد بکریوں کا چھوٹا ریوڑ ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہزاروں گھوڑے، اونٹ اور گائے صدقے کے تھے جنہیں ان چراگاہوں میں رکھا گیا تھا اور ان کے اوپر ان کی دیکھ بھال کے لیے آدمی مقرر تھے۔ ایک دن آپ نے اپنے آزاد کردہ غلام کو جسے سرکاری چراگاہ پر مقرر کیا تھا بلا کر تنبیہ کی کہ اپنے ہاتھ کو لوگوں پر ظلم کرنے سے روک کر رکھے

کیونکہ مظلوم کی دعا اللہ تعالیٰ کے ہاں فوراً سنی جاتی ہے۔ انہوں نے ہدایت فرمائی کہ چھوٹے گلہ والے یعنی غرباء اگر اپنے گلے لائیں تو ان کو چراگاہوں سے نہ روکا جائے کیونکہ ان ہی نے اپنی زمینوں کے لیے جاہلیت کے زمانے میں جنگیں لڑی ہیں اور ان ہی زمینوں کے اوپر وہ اسلام لائے ہیں تو میں کس طریقہ سے ان کے پانی اور ان کے چارے کو روک سکتا ہوں۔ البتہ جو لوگ، جیسے ہیں اگر ان کے گلے آئیں تو ان کو تو روک سکتے ہیں جنگیں تو ان، انہوں نے بھی لڑی ہیں مگر ان کے پاس متبادل وسائل کھیت اور باغ کی شکل میں موجود ہیں۔ ان کے لیے مویشیوں کی دیکھ بھال مشکل نہیں۔ اگر ان کا مال ہلاک ہو جائے تو وہ اس نقصان کو برداشت کر لیں گے اور وہ مدینہ میں اپنے کھیتوں اور باغوں میں آجائیں گے۔

اللہ کے راستے میں سوار کرانے سے مراد وہ اونٹ اور گھوڑے ہیں جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے مجاہدین کو مہیا کیے جاتے تھے۔

اَسْمَاءُ النَّبِی ﷺ

نبی ﷺ کے اسماء

□ حدثنی عن مالك عن ابن شهاب عن محمد بن جبير بن مطعم أن النبي ﷺ قال، لي خمسة أسماء أنا محمد، و انا احمد و انا الماحي الذي يمحو الله بي الكفر، و انا الحاشر الذي يحشر الناس على قدمي و انا العاقب.

﴿محمد بن جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: میرے پانچ نام ہیں۔ میں محمد ہوں اور میں احمد ہوں اور میں ماحی ہوں کہ میرے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کفر کو مٹائے گا، اور حاشر ہوں کہ لوگ میرے قدموں پر جمع کیے جائیں گے اور میں پیچھے آنے والا ہوں۔﴾

وضاحت:

اس روایت کے متعلق شارحین یہ کہتے ہیں کہ اس میں پانچ کی تعداد تعین کے لیے نہیں بلکہ صرف کثرت کو بیان کرنے کے لیے ہے۔ اسی لیے صوفی حضرات کے نزدیک نبی ﷺ کے کئی سو نام ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے ناموں میں سے محمد اور احمد دو نام قرآن مجید میں آئے ہیں۔ آپ کا نام اسم قدیم

صحیفوں میں چلا آرہا ہے اور قرآن مجید نے اس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

جہاں تک ماحی، حاشر اور عاقب کے الفاظ کا تعلق ہے تو یہ اسم یا نام نہیں بلکہ صفات ہیں۔ اسم کسی ذات کو متعین طریقے پر بتاتا ہے اور اس کے ساتھ صفات کا رہنا جوڑا جا سکتا ہے اور وہ اسم ان صفات کا موصوف بن سکتا ہے لیکن کسی شخص کی صفت کو اس کا نام قرار دینا صحیح نہیں۔ ورنہ آنحضرت ﷺ کی صفت تو یا مومنین رؤف رحیم بھی ہے۔ اگر صفت کی بنیاد پر حضور اپنا نام بتاتے تو آپ یہ فرماتے کہ میرا نام رؤف بھی ہے اور رحیم بھی ہے اور یہ قرآن مجید میں آیا ہے۔ اسی طرح قرآن میں خاتم النبیین کی صفت بھی حضور کے لیے آئی ہے۔ آپ اس کو بھی اپنا نام قرار دے سکتے تھے۔ لیکن اس روایت کی رو سے آپ نے چونکہ صفتی الفاظ کو تو اپنا نام بتایا لیکن باقی الفاظ کو نہیں بتایا حالانکہ وہ قرآن مجید میں موجود ہیں۔ حاشر کہ جس کے قدموں پر لوگ جمع کیے جائیں گے بالکل من گھڑت بات ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے یوم یجمع اللہ الرسل فیقول ماذا اجبتم۔ جس روز تمام رسولوں کو (جن میں آنحضرت ﷺ بھی شامل ہیں) اللہ تعالیٰ اکٹھا کرے گا تو ان سے پوچھے گا کہ تم نے کیا دعوت دی تھی اور تمہاری قوم نے کیا جواب دیا تھا۔ تو سب کہیں گے کہ آپ نے جو فرمایا تھا وہ ہم نے کہا۔ باقی ہماری قوموں نے جو کیا وہ ہمیں نہیں معلوم۔ انہوں نے جو کچھ کیا آپ جانتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ بہترین موقع تھا جہاں اللہ تعالیٰ بتا دیتا کہ میں لوگوں کو رسولوں کے قدموں پر جمع کروں گا، لیکن وہاں یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمام انبیاء و رسل کو اکٹھا کرے گا۔ 'عاقب' سے زیادہ موزوں لفظ 'خاتم' تھا کیونکہ قرآن مجید میں آپ کے لیے خاتم النبیین کا لفظ آیا ہے۔ باقی رہ گیا کہ آپ کفر کو مٹانے والے ہیں اس لیے آپ کا نام ماحی ہے۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کسی بھی فعل سے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف یا رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہو، اسم نہیں بن سکتا۔ اگر ہر فعل سے اسم بنانے لگیں تو اس میں بہت خطرے ہیں۔ مثلاً نعوذ باللہ، اس طریقے سے آپ اللہ تعالیٰ کا نام 'مضل' بھی رکھ سکتے ہیں اور 'ماکر' بھی کیونکہ قرآن میں 'یضل من یشاء و یھدی من یشاء' اور 'یمکر اللہ' بھی آیا ہے۔ یہ بہت خطرناک طریقہ ہے اور لوگوں نے یہی غلطی کی بھی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ آپ اپنے دین سے اللہ تعالیٰ کے نام نہیں رکھ سکتے۔ قرآن مجید میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے اسمائے مبارکہ محمد اور احمد اللہ تعالیٰ نے خود بتائے ہیں۔ آپ کے یہی دو نام ہیں۔ باقی آپ کی جتنی صفات یا جتنے افعال ہیں ان سے آپ کے نام نہیں بن سکتے۔

یہ روایت ابن شہاب کے ذریعے سے آئی ہے اور بالکل غلط ہے۔

اللھم ارنا الحق حقا و ارزقنا اتباعہ و ارنا الباطل باطلا و ارزقنا اجتنابہ . صلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین.

Acc. No. 3102